اپریل ۱۹۴۲

اردو اکادمی جامعہ

کا

ماہوار رسالہ

ت سالانہ صہ
مطبع جامعہ دہلی
فی پرچہ دس آنہ

لڑکوں اور لڑکیوں کا باتصویر ماہوار رسالہ

پیامِ تعلیم کا شاندار سالگرہ نمبر

پیامِ تعلیم کے سال گرہ کی اس سال جس شان و شوکت سے تیاری ہے۔ مدتوں بچوں کا کوئی پرچہ اس کی نظیر نہ پیش کر سکے گا۔ اگر آپ فوٹو بلاک، دستی تصویریں، لطیفے چٹکلے اور ملک کے بڑے بڑے لوگوں کے دل چسپ مضمون دیکھنا چاہتے ہوں تو آج ہی (۸ر) کے ٹکٹ بھیج دیجئے۔ یہ شاندار نمبر آپ کو مفت بھی مل سکتا ہے۔ اگر دسمبر ۱۹۳۲ء تک مبلغ عا بھیج کر آپ ایک سال کے لئے خریدار بن جائیں۔ سال گرہ نمبر ۲۹ اکتوبر ۳۲ء کو شائع ہو گا۔

منیجر مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

قیمت سالانہ — فی پرچہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر [illegible]

جلد — بابتہ

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ و مطبع سے شائع کیا۔

ہماری شاعری

میں عرصے سے خموش ہوگیا ہوں اور سے مدت سے جو چپ ہوں تو زباں صاف
نہیں ہے۔ چہکنا کیا، اس ملک کی موجودہ فضا میں تو بولنا حرام ہوگیا ہے۔ ایک
میں کیا، بلبلِ نالہ کش تک دم بخود ہے! مگر احباب کی فرمائش سے مجبور ہوکر
آج کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

مجھے مذہب سے محبت ہے اس لئے اس کی اس سریلی آواز یعنی شاعری سے بھی
بہت الفت۔ اس شاعری کے متعلق حد کی غلط فہمیاں ہیں۔ اس لئے اس کی
نسبت ذرا وضاحت سے کام لینا تھا۔ مگر ضیقِ وقت گلوگیر ہے۔ اندازے زیادہ
زبان ہلانا مشکل ہے۔

اس بیان میں فلسفۂ روحِ شاعری اور اُس کیف و انبساط کو بتانے کی کوشش کی
ہے جسے ملہم ہندی رَس سے تعبیر کرتا۔ اور جسے ہمارا کُن رس و سخن رَس ہی سمجھ سکتا ہے۔
افسوس کہ اتنی بڑی کہانی دو بولوں میں ختم ہوجائے گی۔ مگر اسے اہلِ علم اور اہلِ نظر
دیکھیں گے۔ میرا مدعا پوشیدہ نہ رہے گا۔ میں مطمئن ہوں۔ آج نہیں، کل لوگ آئیں
گے میرا مطلب سمجھیں گے، سمجھائیں گے اور اس مختصر کو مطول کر دکھائیں گے!!

- نہ آئینہ کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں — حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

ہمارے یہاں شعر و شاعری کو سمجھا ہی نہیں گیا ہے۔ اس مبحث پر جو کچھ لکھا گیا اس میں اس
سے گریز کر کے صرف نظم کی تعریف اور اس کی قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔ بہت ہوا تو ایک صاحب
نے فیاضی سے فرما دیا کہ سے شاعری جزویست از پیغمبری۔ اس چیستاں کا بوجھنا بھی آسان نہیں

اس سے پہلے شاعری کو سمجھنا چاہئے تاکہ اُس کے متعلق غلط فہمیاں دور ہوں اور اُس سے وہ فوائد حاصل ہو سکیں جو منشائے فطرت ہے۔

جاننا چاہئے کہ اس عالم کے ذرہ ذرہ میں ہموزنی و تقابل اور تناسب پایا جاتا ہے جس کا دوسرا نام حسن ہے۔ اصطلاح میں اس صنعت کو ترصیع کہتے ہیں اس ترتیب و نظام پر نظر کر کے عقلا اس کا خود بخود وجود میں آجانا محال اور اس سے کسی ایک صانع کا اننا [illegible] سمجھتے ہیں جن عقلا نے اس صنعت و حسن کو سمجھ کر اُس کے [illegible]
میں منقسم ہیں۔

اول، وہ جو بذریعۂ وحی اُس کی [illegible]
ہوئے اور خلق کو وہ قوانین دے گئے [illegible]
صانع کی بندگی کے لئے ضروری تھے۔ انھیں انبیا اور [illegible]

دوم، وہ جو بذریعۂ طبیعیات و مشاہدات اس مسئلے کی صداقت تک پہنچے اور [illegible] استدراک اور استدلال کو عیاں کر گئے انھیں حکما و عقلا کہتے ہیں۔

سوم، وہ جو بذریعۂ حسیات و جذبات اس مسئلے سے باخبر ہو سکے اور دلائل و براہین سے قطع نظر کر کے تخیلات و قیاسات سے کام لینے اور عوام کو اس طریقے سے متاثر کرنے لگے انھیں شعرا کہتے ہیں۔

یہاں تیسرے قسم کے حکما و عقلا یعنی شعرا سے بحث ہے۔

<u>شاعری و شاعر</u>۔ ایسا ہر وہ خیال جو بذریعۂ حسیات و جذبات، دل و دماغ میں پیدا ہو کر زبان و قلم سے نکلے وہ شاعری ہے۔ اور جو فرد اپنے حسن اور جذبے سے اس عالم مرصع کی صنعت و حسن کو سمجھے اور اس کے صانع کا عاشق و مرید ہو کر اپنے خیالات، وہ نظم میں ہوں یا نثر میں، ادا کرے وہ شاعر ہے۔

<u>شعر</u>۔ کسی فقرے یا جملے کے موزوں یعنی وزن میں ادا ہونے کا نام شعر ہے۔ ایسے

خرافات کا بے اختیار منہ سے نکل جانا ہر ناطق کی فطرت میں ہے۔ اس لیے اس کا قدیم ہونا تعجب خیز نہیں۔

نظم۔ کسی خیال یا خیالات کا سلیقے سے کسی شعر یا اشعار میں بیان کرنے کا نام نظم ہے۔ یہ ملکہ بھی فطری ہے جو مشق سے بڑھتا اور ایک موزوں طبع اس پر قادر ہو جاتا ہے۔

تاریخی عہد میں اس شاعری کا زمانہ کئی ہزار برس قبل مسیح شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی بہترین یادگار رگ وید و زبور ہیں۔ شعر کی تاریخ مشتبہ ہے۔ اس لیے نظم کا کوئی زمانہ معین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہندوستان کے بھجن (جو اکثر موزوں ہیں) اپنی عمر صدیوں قبل مسیح بتاتے ہیں۔ اور ملکوں اور دوسری قوموں میں بھی وہ جذبات جو حمد کے لئے مخصوص تھے نثر و نظم میں ظاہر ہوا کئے۔ مگر ان کا کوئی نمونہ موجود نہیں۔ اس لئے ان کے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ بے غش شاعری ایک عرصے تک قائم اور اپنے پرستار یعنی شاعر کے ذریعے سے دنیا پر ظاہر ہوتی رہی۔ لیکن اس میں رفتہ رفتہ آمیزش ہوتی چلی اور آخر وہ کم عیار ہو گئی۔ ہومر یونانی اور ورجل رومی کی نظمیں گو شاعرانہ کیف و انداز سے خالی نہیں۔ مگر ان میں بھی یونان و روم سے قریب تر ملک شام کے ان صحیح جذبات کا پرتو بہت کم نظر آتا ہے جو اس حصہ دنیا پر بصورت زبور ظاہر ہوئے۔ اور اس وجہ سے یورپین نظموں میں جو ابتدا سے زیادہ تر یونانی و رومی خیالات کے زیر اثر رہیں۔ وہ حسن نظر نہیں آتا جسے ہم شاعری یا جان شاعری کہتے ہیں۔

ہند میں یہ شاعری اور ملکوں سے زیادہ چلی۔ اور یہ ویدوں کے اثرات تھے۔ مہابھارت (نظم) میں سری کرشن جی کے عارفانہ و فصیحانہ بیانات اس کے شاہد ہیں لیکن سکندر کی بدولت جہاں اور یونانی خیالات یہاں داخل ہوئے وہاں اس خطے کے آخر وہ جذبات بھی گھر کر گئے جو ہومر و ورجل کے لئے مخصوص ہیں۔ اور اس وجہ سے والمیکی جی

کالیداس کے یہاں یونانی حکمت وتخیل زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن پھر بھی سنسکرت اور خصوصاً بھاشا کی اکثر نظمیں اُس حسن سے خالی نہیں جو شاعری کے خط و خال ہیں۔

عرب، پُر از جذبات وحیات واقع ہوئے ہیں۔ جوش آور زود حسی شاعری کی جان ہیں۔ اور یہ دونوں باتیں قدرتاً ان میں موجود تھیں۔ انھیں ابتدا سے اگر کوئی ایسا علم ملتا جو ان پر قابو کر کے انھیں روکے رہتا اور صحیح رستے پر لگاتا تو اس فن شاعری میں بھی وہ دنیا کے استاد ہو جاتے۔ مگر اُن پر کلدانیوں[1] کا اثر پڑا، اور نہ صابیوں[2] کا۔ وہ آلِ ابراہیم[3] کی گرفت سے بھی باہر رہے اور اس وجہ سے اُس نور کو ...

اس قوم کی کائنات سبعہ[4]

جاہلیت کی ایسی نظموں میں جو خیالات

مگر لاعلمی کی وجہ سے حسن اصلی سے معرا اور

والشعراء یتبعھم الغاوٗن[5]

اسلام نے عربوں کو آدمی بنایا۔ مدینۃ العلم[6] نے اُن کے حواس درست کئے اور باب مدینۃ العلم[7] نے یہ کہہ کر کہ۔ رضینا قسمۃ الجبار فینا۔ لنا علمٌ وللجہال مالٌ[8]۔ اُن میں علم ودانش

---

(۱) کلدان، عراق عرب کا وہ مقام جہاں اکثر ہادی ونبی پیدا ہوئے۔

(۲) صابیون۔ عرب کا وہ فرقہ جو موحدین کہلاتا تھا۔

(۳) آل ابراہیم۔ حضرتِ اسحاق وحضرت اسمٰعیل کی وہ اولاد جو دین ابراہیم کی علمبردار تھی۔

(۴) سبعۂ معلقہ۔ وہ مشہور عربی قصائد جو خانۂ کعبہ میں آویزاں کئے گئے تھے۔

(۵) یعنی شعرا کی پیروی بہکے ہوئے کرتے ہیں۔

(۶) مدینۃ العلم۔ حضرت رسولؐ مقبول۔

(۷) امیر المومنین حضرت علیؓ۔

(۸) ہم اپنی قسمت سے خوش دل ہیں۔ ہم کو علم ملا اور نادانوں کو دولت!

کا فقدان بھی پیدا کر دیا۔ پھر اُسی گھر نے انہیں صحیفۂ کاملہ کی سی زبور بخشی جس نے شاعری کے عہدہ کو جتا کر اُسے نوائے جوانی دے دیا۔

ایامِ جاہلیت کی شعر گوئی گو شاعری کے اُس معراجِ کمال تک نہ پہنچ سکی جو معرضِ بحث میں ہے۔ مگر بلاشک وہ اُس کیف سے بھی خالی نہیں جو ایک پرجوش اور آزاد قوم کا زیور ہے۔ انھوں نے کسی غیر مستحق کا قصیدہ کبھی نہیں پڑھا اور سردارانِ وقت کی خوشامدانہ تعریف کبھی نہیں کی۔ عویر، امرء القیس کا مشہور ممدوح ہے۔ مگر اُس فصیح اللسان نے اُس (عویر) کا قصیدہ اس وقت کہا جب کہ عویر نے اُس (امرء القیس) کے کنبہ کی جان بچائی۔ وہ صلہ کا مستحق تھا اور اسے دیا گیا۔

توہین ہوئی عربی شعر گوئی کی کہ وہ اپنی آزادی کو فراموش کر کے اموی و عباسی خلفا کی درباری ہوگئی۔ بدقسمت تھا ابو نواس کہ امین (خلیفہ) کی مسند کا حاشیہ نشین بن کر اپنے قومی شعار و وقار کو سلام کر بیٹھا۔ بدنصیب تھا ابو تمام کہ شخصی توجہات سے اس کے حاتم کا نام بلند ہو سکا۔ اور قابلِ افسوس ہے متنبی کہ سیف الدولہ اور اس کے لواحقین کی مدح میں اس کی خوش بیانی صرف ہوئی اور اُن کی بدولت وہ قصیدہ گو سمجھا گیا!

ایران، یونان کے ہاتھوں غارت ہوا۔ سکندر اور اُس کے لشکر نے جہان آور آثار و صنادید عجم شکست کئے، وہاں افسوس کہ زردشت کے بے علم کے اُس پر از نور آتشکدہ کو بھی سرد کر ڈالا جو برقِ وادئ ایمن کو چمکاتا اور دلوں کو گرماتا تھا۔ اور اس وجہ سے فارسیوں کی داستانِ باستان کا ایک ورق بھی ایسا دستیاب نہ ہو سکا جو اُن کی شاعری کی حکایت سناتا۔ اس باب میں تازیوں کی تاخت کے بعد کی روایت کے سوا کوئی اور تاریخ (نامہ) موجود نہیں۔ ناچار بہ اختصار اسی کا قصہ دہرایا جاتا ہے۔

عجم پر عرب کا اصل تسلط عباسیوں کے وقت میں ہوا۔ ہارون، فارس کا دلدادہ تھا۔

---

(۱) صحیفۂ سجادیہ۔

اور مامون اس کا عاشق۔ اس طرف او[illegible]

پر سو سال سے، اسلامی نہیں اموی اور جمہوری نہیں شخصی سلطنت کا [illegible] تھا۔ اس [illegible] فارسیوں اور ترکیوں کی زبان سے اُس وقت جو کلتا وہ شاہ[illegible] مر[illegible] تی لب و لہجے میں ہوتا۔

قصیدہ، عربی میوہ ہے۔ اُس کا نخل زمین فارس پہلی لگا یا گیا اور یوں وہاں شخصی رطب اللسانی کی تلخ بنیاد پڑگئی۔ عباس مروزی[1] نے مامون کی شان میں بہ زبان فارسی جو قصیدہ خوانی کی وہ اس کی شاہد ہے۔ بنیاد غلط پڑی۔ اس لئے آدم پرستی کی عمارت یہاں بھی کھڑی ہوگئی۔ اور وہ کجی آج بھی نمایاں ہے۔ ایسی کجروی کے بعد بھی فارسی شعر گویوں میں فردوسی و سعدی قابل تعریف ہیں کہ وہ اگر اس حُسن کو خاطر خواہ جلوہ نہیں دیتے تو اُس کے صفات سے بھی دور نہیں جاتے اور کسی کی تقلید کے بغیر دنیا کے آگے اپنا اصول پیش کرتے ہیں۔

فردوسی، پہلوی[2] کا وہ پہلا ناظم ہے جو اپنے صحیح جذبات کے بیان میں عجم یعنی گونگا نہیں۔ شہنامہ میں اس کی حمد استادانہ بلکہ مجتہدانہ ہے۔ اس کے بعد کے شعر گو اس کے تابعین ہیں اور تبع تابعین اور اُن میں کے بیشتر اس ضروری بیان کو تقلیداً و رسماً ادا کرنے والے۔ فردوسی حقیقی یزدان پرست ہے اس لئے اُس نے جمشید[3] کی نمرودیت و فرعونیت سے دنیا کو خوف دلایا وہ نشنلسٹ یعنی اپنے ملک و قوم کا طرفدار اور اُن پر کسی بیرونی حملہ و حکومت کو خلاف فطرت جانتا اور اسے ایک صانع کی صنعت کی پامالی سمجھتا ہے، اس لئے وہ (فردوسی) رستم[4] کے سے

---

(۱) مرو۔ ترکستان کا ایک مشہور مقام۔

(۲) پہلوی۔ اصلی فارسی زبان جو ساسانیوں کے زوال تک ایران میں رائج تھی۔

(۳) جمشید۔ ایران و توران کا وہ مشہور بادشاہ جس نے اخیر میں دعوئے خدائی کیا۔

(۴) رستم اُن تورانیوں سے جنگ کرتا رہا جو اُس وقت ایران پر حملہ آور ہو رہے تھے۔

یک وقوم کے فدائی کی داستان کو یوں جلوہ دیتا اور دنیا کو غلامی سے جنگ کا سبق سکھاتا ہے۔ وہ شیدائے حقیقت ہے۔ اس لئے ہراسپ[1] وگشتاسپ کا مدح خواں ہے اور[2] زردشت کے سے زبردست معلم کا ثناخواں۔ افسوس کہ اُس کا کارنامہ یعنی شہنامہ محض ایک داستان پاستان سمجھا اور اُس کے نشار، کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ بعد کے شعرگو اُس کے نقش قدم پر نہ چلے۔ اس لئے بے راہ ہوئے۔ سلاطین ایران شخصیت کے غرور میں مست تھے۔ اُن کے درباری شعرگو اُن کی اس شراب کو دو آتشہ بناتے رہے۔ آزادی روح وزبان سلب ہوئی اور فارسی ادب غلامی کا مترادف ہوگیا۔

شہنامے کے سے میوہ دار درخت کے پھلنے کے بعد زمین ایران پر گلستان کے پھول بسے۔ سعدی، یثرب وبطحا کی زبان کا نمک چش، اور خم معرفت آل محمد کا جرعہ کش ہے۔ مصلح الدین واقعی مصلح دنیا تھا۔ بد اخلاقیوں کے عہد میں اُس نے اخلاق کا سبق دیا۔ خود مختار سلاطین کو بے اختیار منوایا اور سه

رعیت چو بیخ ست سلطاں درخت ۔۔۔ درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

کا سا اصول پیش کر کے دنیا کو حکمرانی کا راز اور راعی و رعایا کے حقوق و امتیاز کو بتلایا کہ اس کے بغیر عالم میں وہ حسن یعنی تناسب قائم نہیں رہ سکتا جو اس کائنات کی خوبصورتی و دل فریبی کے لئے لازم اور جس پر اس کارخانہ کی بنیاد نظر آتی ہے!

شیخ کے کلام اور خصوصاً اس کی گلستاں کی قدر ہوئی تو صرف اس قدر کا شعر مرا بہ مدّ کہ بُرد؟ کے مقولہ کو فراموش کر کے وہ مکتبوں تک پہنچائی اور بازیٔ اطفال بنائی گئی اور یلا بالغ دماغوں تک اس کی رسائی نہ ہو سکی کہ ہماری زندگی میں کام آتی۔ اور پھر اس گلستان

---

(۱) ہراسپ اور اس کے بیٹے گشتاسپ کے زمانے میں زردشت کا ظہور ہوا اور انھوں نے زردشتی دین قبول کیا۔

(۲) زردشت ایران کا وہ معلم و ہادی جس نے دعوائے پیغمبری کیا اور جمشید وغیرہ کے اصول کو توڑ کر وحدانیت کا سبق دیا۔

فراموش قوم اور اس کے شعرگو، بعد کو، اپنے تخیلات کی وادی میں حیران و سرگردان پھرتے اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے اور ان میں سے بیشتر یتبعہم الغاوٗن کے مصداق ہو گئے!

ہند میں جس فارسی ادب نے گھر کیا وہ ترکوں کے ذریعے سے یہاں پہنچا تھا۔ اس قوم میں افراسیاب کے وقت سے لہو ولعب زیادہ پسند اور سنجیدگی ناپسند تھی۔ چنگیزیوں اور ان کے بعد کے تورانیوں کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ وہ مسلمان ہوئے پر بھی اپنے عادات و خصائل نہ بھولے۔ اور اس لئے فارس کے ادبی ... اپنے

جو بظاہر خوش نما ہو مگر بے مغز تھا۔ اس ...

اور وہ تین سو برس (یعنی غوریوں سے ...

زبان ہی کو مزا نہیں دیتا رہا بلکہ ہمارے ...

مغل یا منگول اپنی قومیت و مذاق میں ان ترکوں سے ... بیا

کے اس اثر رنگ کے آئینہ دار بھی بنے جس پر مانی[1] کی قلعیاں زیادہ چڑھیں اور حجازی قلم جس پر کم رنگ بھر سکا تھا!

بابر تیموری اس قوم کا سردار ہے جو آخر شاہ ہند بنا۔ اپنے خاندان میں اس کی گردش و فلاکت ضرب المثل رہی۔ اور اس وجہ سے اس میں وہ فروتنی ہونا چاہئے تھی جو ایک فلک زدہ کے لئے ضرور ہے۔ مگر وہ اپنی مصیبت اور دشت نوردی کے عالم میں بھی یوں بے باکانہ کہتا ہے ؎

نوروز و نو بہار و مئے دلربا خوش ست   بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

---

(۱) مانی۔ یہ علم، عراقی ہے۔ مگر اس کا اصول زیادہ تر توران و چین میں پھیلا۔ ادھر کے مسلمانوں میں دین مانی کی اکثر باتیں رائج ہیں اور اس کا اثر اب تک باقی ہے۔ مانی زیادہ تر اپنی مصوری کے باعث مشہور ہوا۔

یہ یونانی اپیکوریّنؔ⁽¹⁾ کے وہ خیالات تھے جو سکندر کی نکالی ہوئی راہ سے خراسان پہنچے اور وہاں سے آگے اور بعد کو ہند آئے۔ اس وجہ سے کہ ہمایوں سے شاہجہاں تک زیادہ تر یہی چال رہی اور شاہی اثرات سے اس ملک کی رفتار و گفتار بے قید ہوگئی اور یہاں کا درباری فارسی ادب اُسا شاعری کو جلوہ نہ دے سکا جو حسن کی مدح خوان اور اس کی وکیل رہی ہے۔ عالمگیر اس حلقے میں خالی الذہن تھا۔ ورنہ اُس کی توجہ سے جہاں اور بدعات دور ہوئے وہاں ہماری شاعری کی یہ بدعت بھی دماغوں سے خارج ہوکر اسے ایک عبادت منواتی اور مرقاتِ مقصدِ اعلیٰ تک اسے پہنچا دیتی!

اورنگ زیب کے بعد یہ ملک مخصوں میں گرفتار اور بعد کو طوائف الملوکی کا شکار ہوگیا۔ بہادر شاہ (اول) سے فرخ سیر تک عجب الجھن کا زمانہ تھا ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاران فراموش کردند عشق

عشق عاشقی کیسی، یہاں تو خود فراموشی تھی۔ مگر ہماری اردو شاعری بھی عجب سخت جان ہے کہ ٹھیک اسی عالمِ انتشار میں وہ پیدا ہوئی اور بڑھنے لگی۔

تاتاریوں کی تاخت نے توران و ایران سے صلحا، و اصفیا، کو اخراج کرکے ہندوستان پہنچا یا۔ ان کی برکت سے امید تھی کہ اب اس ملک میں بھی اس بادۂ حجاز کا دور عام اور علی الدوام ہوجائے گا جس کے وہ جرعہ کش رہے تھے۔ لیکن یہاں اس وقت تک ملک گیری و خانہ جنگی کا نشہ، اس طرح نہ اترا تھا کہ دماغ یکسو ہوکر اس کی طرف ہاتھ بڑھ جاتے۔ کوتاہ دست محروم اور پیرِ مغاں مغموم رہے۔ ہاں، سلطان بلبن کے دور میں سلطانؔ⁽²⁾ جی کی توجہ و برکت

---

(۱) اپیکورین۔ یونان کا وہ مشہور فرقہ جو حیاتِ انسانی کو اسی دنیا میں ختم سمجھتا اور اسلئے کھاؤ پیو اور خوش رہو کا سبق دیا کرتا تھا۔ (۲) سلطان جی حضرت نظام الدین اولیا۔

سے میر و خسرو کا دہلی زبان چھکا۔ اس نوا کا اثر ہو چلا تھا کہ سلطنت گردی کے ساتھ ادب(۱) و مذاق گردی بھی ہو گئی۔ اور خسرو کے ترانے قوالوں کے گلوں میں اٹر کر اس طرح بلند نہ ہو سکے کہ ہماری فضا پر چھا جاتے۔ اور اس لئے فرخ سیر و محمد شاہ کی محفلوں میں خسروی ساورا(۲) کی جگہ پوربی(۳) گونجنے لگی۔

بیدل(۴) پوربی عظیم آبادی، عالمگیری شہزادوں اعظم و معظم کے معلم تھے۔ اُن کا اور اُن کے سرود کا اثر دربار و بزار دونوں پر گو عام تھا، مگر اُن کی تعلیم عام فہم نہ تھی۔ اس لئے ہمارے دماغ اس کے اصلی فوائد سے خالی رہے۔ ہماری [illegible] تو وہ اتنا [illegible]

زیادہ تر ان اثرات میں پرورش پاتی اور [illegible]

جو نہر لبن سے نہیں بلکہ سیحون و جیحون سے

بدقسمتی سے اس ادب میں ہمارے

داخل نہ ہونے پائے جو اس عالم مرصع کو جلوہ دینے والے بلکہ اس سے [illegible]

اس وجہ سے ابتداءً ہماری نظم اُس حسن ہی سے [illegible] رہی جو شاعری کی روح ہے بلکہ اُن صحیح و فطری جذبات سے بھی محروم ہو گئی جو اُس ذاتِ حسن کے صفات ہیں!

اس میں شک نہیں کہ حافظ کے بعد سلجوقیوں بلکہ صفویوں تک ادب فارسی کے پتلے پردہ خرقہ بھی نظر آیا جو اس کا عیب پوش رہا۔ لیکن اس کے اس جامہ احرام کا ایک اچھا حصہ زمزم

---

(۱) ادب گردی و مذاق گردی، اردو کے یہ نئے الفاظ ہمارے تصرفات میں سے ہیں!

(۲) ساورا۔ بھجن کی طرح بروزن دادرا، میر خسرو کا ایک ایجاد کردہ راگ جو بھجن کی دھن میں گایا جاتا تھا۔

(۳) پوربی ایک راگ ہے۔ بیدل پوربی تھے۔ اس وقت ان کا کلام بہت مقبول تھا۔ اس مناسبت سے اُن کی غزلوں کو پوربی کہا گیا!

(۴) مرزا عبدالقادر بیدل (پوربی) عظیم آبادی تھے۔

میں نہیں بلکہ دنیا کے اُن حصّوں میں بھی غوطہ کھا گیا جو بظاہر صفا ہوں مگر باطنا قلتین[1] تھے۔ پہلی صدی ہجری سے تیسری بلکہ چوتھی صدی ہجری تک عالم اسلامی، عالم انتشار میں تھا۔ نقلیات کا مقابلہ عقلیات سے اور ان دونوں کی جنگ روحانیات سے شروع ہو گئی۔ معتزلہ[2] پیچ میں آئے لیکن اُن کے اخوان الصفا کے سر پر وہ تیشۂ سخت لگا کہ اٹھ نہ سکے۔ اور بعد کو ہماری علمی جماعت صاف صاف دو گروہ (علمائے ظاہر و علمائے باطن) میں منقسم ہو کر ایک دوسرے کی دستار اچھالنے لگی۔ اِشاعرہ[3] وحنابلہ کے آپس کے فسادات سے فائدہ اٹھا کر یہ فرقہ علمائے باطن مضبوط تر ہو گیا۔ یہی وہ گروہ ہے جو اپنی مختلف شکل وشمائل میں اور اپنی سادگی وضع کے باعث بعد کو ایک صوف کے نام سے شناخت کیا گیا۔ ابن جوزی[4] و بن تیمیہ کی شمشیر زبان گو اس فرقے پر بھی چلتی رہی مگر اُن گوشہ نشینوں کا قلع قمع نہ کر سکی۔ اہل ظاہر نے اگر انھیں لخت لخت کرنا چاہا تو انھوں نے بھی اپنے زور زبان سے انھیں پارہ پارہ کر دیا۔ ان اہل باطن کا واعظ انھیں اہل ظاہر میں سے ہے جس کی نسبت بہ بانگ دہل کہا گیا، کہ

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و ممبر می کنند　　　چوں بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند!

یہ واعظ جیسے یوں بدنام ہوا کہ ہمارے ادب وشاعری کے قصائد میں وہ ایک مستعد مشبہ بہ ہی کا کام دے کر نہیں ہنسا تا بلکہ وہ ہماری محفلوں کا خونخوار محتسب بھی بنا اور آخر اس غریب پر دروازۂ رحمت تک بند ہو گیا!

اس وقت ہماری حکومتیں زیادہ تر اُن علمائے ظاہر کے قبضے میں تھیں جن کی تائید پر اُن (سلطنت) کی ہستی منحصر تھی اس لئے ان (علمائے ظاہر) کے اصول کے خلاف تقریر و

---

(۱) قلتین۔ اس کے اصل معنی گندے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اسوقت کا فارسی ادب منزہ نہیں بلکہ نجس ہو رہا تھا!
(۲) معتزلہ۔ مسلمانوں کا وہ مشہور فرقہ جس کے مسلک کی بنیاد عقل پر رکھی گئی۔ اس فرقے نے بنی عباس کے شروع عہد میں فروغ پایا لیکن مسلمانوں کے اُن دوسرے فرقوں نے جن کے ہاتھوں میں بعد کو سلطنت کی باگ آگئی معتزلہ کو زندہ نہ رہنے دیا۔ انکی انجمن اخوان الصفا خاک میں ملائی اور انکی کتابیں تک جلائی گئیں۔ (۳) اشاعرہ مسلمانوں کا یہ بھی ایک نمایاں فرقہ تھا اور یہ حنابلہ یعنی حنبلیوں کی ضد تھا۔ (۴) ابن جوزی و بن تیمیہ مشہور محدثین ہیں، صوفیوں کے دشمن اور اپنے سوا اسلام کے دوسرے فرقوں کو بد کہنے میں مشاق و ممتاز۔

تحریر کفر و بغاوت تھی۔ اہل باطن۔ رحمت و شفقت کو قہاری سے اور عشق و محبت کو جباری سے پیدا ہوا دیکھ کر منہ بناتے مگر زبان نہ ہلا سکتے تھے۔ لیکن خیالات و جذبات کیونکر اور کب تک رکتے۔ انھوں نے اپنے بیانات کا آخر دوسرا طریقہ اختیار کیا اور اپنے تصورات کا نقشہ، مجاز کے اس پردے پر کھینچا جو حقیقت کا مظہر تھا مگر ظاہر بین کی گرفت سے باہر تھا۔

فراق و وصل و گل و بلبل و بہار و خزاں — جنون و عشق و وفا و جفا و ناز و ادا
بہار حسن و دل آویزی کرشمۂ حسن — ہجوم شوق و فور تو جشن و سودا
ریا بھرے ہوئے پند و نصائح و اعظ — شراب و ساقی و مہر و ساغر و مینا
تصور و حور و جن و انس و آسمان و زمین
یہ تشبیہات و استعارات کسی

نہیں بلکہ سامیوں (Semitics)
(Marcanalists) اور یانیوں (...)
اور عربوں (Saracenes) کے مخلوط دماغ کا وہ جوہر تھے جو رومن و فرنچ پراکلیت (Praclete) اور جرمن پائے ٹسٹ[2] کے سے داعیان عشق باطنیوں کے گھروں میں کشید ہوکر دو آتشہ و سہ آتشہ بنے اور شراب معرفت کے نام سے پئے اور پلائے گئے۔ ان ہی کنایات و استعارات کی بنیاد پر ہمارے روحانی ادب و شاعری کی خشت اول رکھی گئی اور اور ان سے وہ محل تیار ہو گیا جہاں ہمارے مزاج پرورش پاتے رہے اور پرورش پا رہے ہیں!

---

(۱) پراقلیت۔ فرنچ لفظ ہے۔ باطنیوں اور صوفیوں کی طرح یورپ کا وہ فرقہ جو وہاں اصلی عیسوی مذہب کے پھیلانے کی کوشش کرتا رہا۔

(۲) پائے ٹسٹ (Pietists) جرمنی کا وہ مشہور فرقہ جس نے پروٹسٹ (مذہب) کے خشک و قشری رویہ سے عاجز آکر، مذہب کی بنیاد عشق و محبت پر رکھی

بیانات و تعلیمات کا یہ مجازی و وجدانی (یعنی صوفی) انداز . Reasoning
یعنی عقلیات و تعینات سے گو دور نظر آئے مگر جذبات و حیات بلکہ تنزلات سے وہ قریب تر تھا
اس لیے ہمارے حواس اس کی لذت گیر رہے اور جب تک وہ ان نیچرل نہ بنا ہمارے دماغ
بے مذمت عروج پاکر کیف دکھاتی رہے۔ لیکن بے بصری یا بلند پروازی نے ایسی لاجواب
اور شیریں (طلاقت) کے لئے فضول الفاظ اور پیچ در پیچ استعارات کے وہ طوفان اٹھائے
کہ اس کا اصلی و فطری زور ہوا بلکہ غائب ہو گیا۔ فارسی ادب و شاعری اس ساز و سامان سے
اس ملک میں داخل ہوئی اور رفتہ رفتہ اتنی مضبوط ہو گئی کہ فرخ سیر کے عہد میں ہمارے ریختہ[1]
کی بنیاد آخر اسی پر قائم ہو کر پختہ ہو گئی۔

ابھی کہا جا چکا ہے کہ تاتاریوں کی سفاکیوں نے ترک و فارس کے اہل صفا کو کس طرح
ہندوستان پہنچایا اور کس خموشی و صلح جوئی سے وہ اپنے فرائض و وظائف میں مشغول تھے۔ شاہ
بو علی قلندر کا دائرۂ استغراق اگر میدان پانی پت کو گھیرے ہوئے تھا تو دیر و حرم جلوۂ وحدانیت
کی آوازے اس زمین کو فتح کر رہا تھا تو دلی میں سلطان جی کا رواق عروج بھی پروانۂ چراغ
حرم ہو یزدانہ کی صداسے یہاں کی فضا پر قبضہ کئے ہوئے تھا۔ اہل دل کی ایسی صفائیوں نے
اس ملک کے بند چشموں میں ایک طلاطم ڈالا اور یہاں کے قدیم زنگ باطنیت میں ہیجان شروع
ہو گیا۔ بابا کبیر داس انھیں صداؤں سے اٹھے اور گرو نانک بھی انھیں آوازوں سے چونکے
اور پھر ہماری زمین پر سرمد ظاہر ہو کر منصور سمجھا گیا۔ آگاہ نئی چو شیشہ، از بوئے گلاب۔ کی
خوشبو دلی کی ہوا میں جذب و تحلیل ہو کر ہمارے سروں پر نفی و اثبات کا نور برسانے لگی! اور
یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عالمگیر کے بعد جب سلطنت میں انقلاب و زوال شروع ہوا تو سختی قلب گھٹنے
اور گدازی دل بڑھنے لگی اور ہماری رنگین مزاجی شوب کھا کر آخر صوفیانہ ہو گئی:
فرخ سیر و محمد شاہ کے زمانے کو یاد کرنے والے اس عہد کی صرف ان آزادیوں ہنگامہ ریوں

---

(۱) ریختہ: یعنی اردو نظم۔

اور خصوصاً اُن رنگ[1] رلیوں کو جلوہ دیتے ہیں جو جلوخانہ دہلی میں اس وقت بظاہر آئینہ تھیں
مگر اس تصویر کا دوسرا رخ مٹا دیا جاتا اور دماغ اُس سے خالی رہ کر طرح طرح کے وسوسوں کا اڈا
بن جاتا ہے۔ اس دور میں علوم و فنون کی ترقی کا ذکر ہمارے موضوع سے باہر ہے لیکن اتنا
سن لو کہ ان شاہوں کے جلوس میں جہاں ایک طرف عیش و نشاط کے ساز چھڑے تو دوسری
طرف اخلاق و معرفت کے نعرے بھی گونجتے اور دونوں کو گرماتے اور ہلاتے رہے۔

نواب نوازش علی خاں و نواب اشرف علی خان وہان دہلی کے اُسی عہد کے
امرا میں سے ہیں جن کے گھر میں محفل میلاد و ... کی بنیاد پڑی۔ اور حضرت خواجہ ناصر
عندلیپ اور حضرت شاہ گلشن علی اُسی زما
تکیہ، مذہب و اخلاق کے درس کے
برکت و توجہ سے یہ مذہبی چرچا آخر گھر گھر
یہ انھیں بزرگوار کا فیض تھا کہ نواب اشرف ...
علی خاں فضلی (۱۱۰۵ھ) نے اردو میں اپنی کربل کتھا سنا کر اس زبان کو کوثر و تسنیم سے دھویا
اور ہمارے دماغ کو مصفا و مطہر کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ "پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا
مخترع اور اب تک ہندی نثر نہیں ہوئی مستمع"۔ اس دعوے نے ثابت کر دیا کہ آپ کی اردو
کی زبان کھلی تو اس ذکر میں جس کا اخلاق، عقلیات و جذبات دونوں کا حامل اور ممدوح
فریقین ہے!

دکھن میں آپ کی زبان بہت قبل وجود میں آئی۔ عادل شاہی (ہمعصر اکبر و جہانگیر) دربا
نے وہاں اس کی بنیاد نظم پر رکھوا دی۔ شجاع الدین نوری اُدھر کا وہ زردشت ہے جس کا نام
و کام دونوں نور علیٰ نور سمجھا گیا۔ وہ اس زبان کی پہلی نظم پر فخریہ کہتا ہے ؎

---

(۱) رنگ رلیوں بھی بولتے ہیں، مگر ہماری زبان پر رنگ رلیوں ہے۔

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا | و لے سب تعصب دیا ہم مٹا
نہ کچھ خوف کھایا، نہ جھجکا ذرا | وُہ ہم مرثیہ سے پہل کر دیا
شروع میں کیا نظم کل واقعا | وُہ ہم تک کا احوال پورا لکھا
میں جب اس کو لوگوں کے آگے پڑھا | عجب حال عاشور خانہ کا تھا
جن و انس کرتے تھے سب واہ واہ | کہ دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
زبان اپنی میں کس نے ایسا لکھا | کبھی اس سو پہلے سنانے پڑھا
(۱)ان سے اس کا ملے گا صلا | ہے نوری ہی موجد تو اس طرز کا

ملاحظہ ہو۔ وہاں بھی آپ کی زبان چھوٹتی اور اس کی نظم(۱) کی بسم اللہ ہوتی ہے تو اسی ذکر میں جو عشق و معرفت کا سرچشمہ اور ہماری حیات کے لئے آبحیات ہے!

یہ تھے وہ اذکار جو دلی کی ان معرفت گاہوں میں زبانوں اور گلوں سے رسوں سے اٹھائے اور ہند کی فضا میں پھیلائے جارہے تھے۔ شاہ ناصر عندلیب کے بعد اُن کے خانہ باغ میں وہ بلبل درد آشنا چہکا جو خواجہ میر درد کے لقب سے مشہور ہے۔ موسیقی کہ رازِ فطرت کو بلند اور شاعری کو راز فطرت کو عیاں کرتی ہے، وہاں (دلی) کے اس صومعہ میں بھی مدتوں گونجی۔ ان میر کے مضامین نے دلی ہی کو نہیں سارے ہند کو کھینچا۔ کلاونت اور اتائی سب ٹوٹے اور ان آوازوں سے اپنے مزمار(۲) بھرے جو دوسری جگہ حاتی سے خالی کئے گئے۔

درد نے اپنی واردات کے بیان میں تشبیہات و استعارات کا وہ گہرا پردہ نہ ڈالا جس میں حقیقت پوشیدہ ہو کر راز کی راز رہ جاتی۔ انھوں نے اپنا رستہ الگ نکالا۔ اور پرانے انداز میں اگر کہا بھی تو یوں کہا ؎

اے درد اس جہاں میں اگر صدائے غیب | بے پردہ ہوئے جس سے وہ پردہ ہے ساز کا

(۱) اس سے ثابت ہو گیا کہ اردو نظم ونثر کی بنیاد اخلاق پر ہے نہ کہ بداخلاقی پر۔
(۲) مزمار۔ باجہ۔ ساز

یعنی اُلکو ڈھاکو مگر رازِ حقیقت کھول ہی دیتا اور حسن و معرفت کو عیاں کر ہی دیتا ہے!

اس نعمت خدا داد کا مزا یوں تو اس وقت کسی نے نہیں چکھا مگر میر تقی میرؔ نے اُس سے جو لطف اٹھایا اُس کا کیف اُن کی بات بات سے عیاں ہے۔ یہ خواجہ میرؔ کے سجادے کے وہ دوسرے فقیر تھے جن کے قلب حزیں پر زمانے کی نیرنگیوں اور سلطنت گردیواں کا اتنا اثر پڑا کہ دلی قفس بنی، اور سے کون رو رو کے زندگی کاٹے۔ میرؔ دلی میں جی نہیں لگتا، فرما کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں کے باغ میں بیٹھ کر اپنا فسانہ سناتے رہے۔ یہ صاحب موحیٰ کے بندے نہیں۔ وہ عالم حسن پر آنکھیں

کی بہ خموشی یوں آرزو کرتے رہتے ہیں

بہ رنگ بوئے گل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے

یہ تھا وہ مذاق جو اس وقت دلی ہی تک

میں وہ دردؔ کے مشہور مرید و شاگرد (مرزا جان) تپشؔ کی سرگرمی سے گرم ہوا۔ اہل ۔۔۔ وہی آگ تھی جو کلکتہ و مرشد آباد اور خصوصاً ڈھاکے کی زبان و کلام میں مدتوں شعلہ بنی رہی اب بھی اس کا اثر کچھ باقی ہے اور وہاں کی راکھ کریدو تو دبی دبائی چنگاری[1] مل ہی جائے گی۔

بہار اور خصوصاً عظیم آباد (پٹنہ) نے دلی کے ساتھ ساتھ اس حسن پر جی قربان کیا۔ بیدلؔ ہی اس کے دلدادہ نہیں۔ راسخؔ جو معصر و ہم مرتبہ میرؔ ہیں اس کے شیدائی رہے۔ وہ ہر طرف کر منہ پھیر کر فرماتے ہیں۔ ؎

نگراں کبھو نہ یہ جابِ رخ دلفریب پری رہی ۔۔۔ مری چشم تا نگہہ پسیں تری محوِ جلوہ گری رہی

سنو۔

مجھے سونپ داغِ فراق تُو، ہوئے یوں جدا کہ نہ پھر ملے ۔۔۔ مرے دل میں تا دمِ واپسیں وہ امانت اُنکی دھری رہی

(۱) جیسے استاد وحشتؔ (خان بہادر رضا علی، کلکتوی) کی شاعری!

سلو، سنو۔

نہیں ہوش والوں سے کچھ حسد، مجھے رشک ہے تو انھوں پہ ہے　　جنھیں تیرے جلوہ کے سامنے میری طرح سے بے خبری ہے

نہ تھی چشم راسخ خستہ دل، کبھی خالی اشک سے دوستاں

شب و روز جام پر آب کی روش آنسوؤں سے بھری رہی

نادری و دُرّانی حملوں نے دلی کے چاندنی چوک اور لال قلعہ ہی کو نہیں لوٹا بلکہ وہاں کے دماغوں کو بھی اجاڑ کر تتر بتر کر دیا۔ فیض آباد اسی وقت آباد ہوا۔ صفدر جنگی و سالار جنگی لطف کے درجات عالی ہوں کہ انھوں نے دارالسلطنت (دلی) کے ان جواہر کو بھی سمیٹا جو دلی کے تخت و تاج کا کوہ[1] نور تھے اور انھیں اپنی شہ نشین کا کرسی نشین کر دیا۔ میر ضاحک، دلی سے اسی عہد میں فیض آباد آئے اور میر حسن اسی زمانے میں وہاں آباد ہو کر اُن نوابوں (صفدر جنگی و سالار جنگی) سے وابستہ ہو گئے۔

حسن، خواجہ میر ہی کی مسند فقر کے حاشیہ نشین تھے۔ ان کا گھر نشستوں سے خود ادب و اخلاق کا مدرسہ تھا جہاں اُن کی تربیت ہوئی۔ اس پر عندلیب و درد کی صحبت اور ان سے ارادت۔ اپنی اس قربت و مودت کو وہ یوں بیان کرتے ہیں: "بہ قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد کہ درد مندیہائے اوشان میان درویشان چوں فرد فرشر۔ دیگرے را بخیال خود قائم نہ کردم کہ وضع آں را پسندم و دل بہ گفتار آں پابندم"

حق ہے۔ اس صحبت سے آشنا ہونے کے بعد کدھر جاتے۔ یہ اسی مزے اور رنگینی کا نتیجہ تھا کہ اُن کے دماغ و زبان نے ہمارے یہاں آخر وہ اعلیٰ مذاق شاعری قائم کر دیا جس کا مثل ممکن نہیں۔ اس اعلیٰ فطرت اور قدرتی شاعری کا اظہار اصل انھیں کے وقت میں ہو گیا تھا۔ مگر اس کی تکمیل ان کے پوتے میر انیس کے ذریعے سے مقدر تھی اور وہ ہو کر رہی۔

---

(۱) کوہ نور۔ وہ مشہور و معروف ہیرا جو دلی کے تخت و تاج کا زیور بنا رہا۔

حسن بچپنے سے ایک عظیم الشان کام کے سرانجام کے لیے تیار ہو رہے تھے اور قدرت
نے اس کام کی خاطر انھیں منتخب کر کے ایسی تعلیم و تربیت پر لگا دیا جس کی تحصیل کے بغیر اُس
امر کا خاطر خواہ انجام ممکن نہ تھا۔ یہ عظیم الشان کام اُن کی اُس بے نظیر مثنوی کا سرانجام تھا جو
دنیا میں سحرالبیان کے نام سے ظاہر ہوئی اور بدرِ منیر بن کر چمکی۔ اس مثنوی کو جس نے بغور
پڑھا وہی سمجھ سکتا ہے کہ جب تک دنیا و مافیہا کے مختلف شعبہ د مدارج میں کسی کو دخل تام نہ ہو
ایسی کوئی شے اس کے دماغ و قلم سے نکل نہیں سکتی۔

اس عجیب و غریب تصنیف کے مختلف رنگ پہلو ہیں مگر ان میں سب سے اول اور

پختہ رنگ اس کی اُس حمد کا ہے جس

کے لئے حسن کا دست سوال یوں بلند ہو!

اگر چاہتا ہے مرے دل کا چین

وہ بادۂ خالص ملا جسے انھوں نے پیا اور پلایا ہے۔

کی یوں ستائش کرتے ہیں ؎

کروں پہلے توحید یزداں رقم ‏ ‏ ‏ ‏ جھکا جس کے سجدے میں اول قلم
سرِ لوح پر رکھ بیاضِ جبیں ‏ ‏ ‏ ‏ کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں
نہیں کوئی تیرا نہ ہوگا شریک ‏ ‏ ‏ ‏ تری ذات ہے وحدہٗ لاشریک
ورے سب ہیں اس سے وہ ہے سب سے پیش ‏ ‏ ‏ ‏ ہمیشہ سے ہے اور رہے گا ہمیش
وہی مالک الملک دنیا و دیں ‏ ‏ ‏ ‏ ہے قبضے میں اس کے زمان و زمیں
سدا ہے نمودوں کی اس سے نمود ‏ ‏ ‏ ‏ دل بستگاں کا ہے اس سے کشود
اسی کی نظر سے ہے ہم سب کی دید ‏ ‏ ‏ ‏ اسی کے سخن پر ہے گفت و شنید
نہیں اس سے خالی غرض کوئی شے ‏ ‏ ‏ ‏ وہ کچھ شے نہیں پر ہر اک شے میں ہے
نہ گوہر میں ہے وہ نہ ہے سنگ میں ‏ ‏ ‏ ‏ ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں

وہ ظاہر میں ہر چند ظاہر نہیں ۔ بظاہر کوئی اس سے باہر نہیں
تامل سے کیجئے اگر غور کچھ ۔ تو سب کچھ وہی ہو نہیں اور کچھ
اُسی گل کی بو سے ہے خوشبو گلاب ۔ بھرے ہوئے ساتھ دریا حباب
پر اس جوش میں آکے بہتا نہیں ۔ سمجھنے کی ہے بات کہتا نہیں

سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد ہندوستان میں اور سلطنتِ صفویہ کی بنیاد ایران میں تقریباً ایک ہی وقت میں پڑی۔ حکومتِ مغلیہ کا بانی ایک رندمشرب بادشاہ یعنی بابر اور سلطنت صفویہ کا بانی ایک صوفی مشرب عالم یعنی شاہ صفی الدین ہے۔ مگر یہ طرفہ تماشہ ہے کہ یہاں کے مغلیہ ہمیشہ مشائخین کا ادب و احترام کرتے ہیں اور صفویہ اپنے ہم مشربوں کے عدو ہو جاتے ہیں۔

شاہ صفی الدین، حضرتِ شیخ جیلانیؒ کے مرید تھے۔ انھوں نے اخیر میں اپنا ایک جتھا قائم کیا اور اُس کی امداد سے شمال و مغرب ایران کے اکثر بلاد پر قبضہ کر کے وہاں کے حاکم بن بیٹھے۔ ان کے اخلاف نے، بعد کو، فارس پر ہاتھ مارا اور اصفہان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اور یہ سلطنت صفویہ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

ان سلاطین کو روس و ترک سے زیادہ اپنے ہم قوم و ہم مشرب فرقہ وجاعت (صوفیین) کا خدشہ تھا۔ اس گروہ کی تعداد اس وقت غیر معمولی اور اُن کی طاقت مسلم تھی اس لئے صفویوں نے تخت پر قدم رکھتے ہی اُن کے پامال کرنے کی فکر کی۔ شاہ اسمٰعیل اور شاہ سلطان حسین کا زمانہ تاریخ ایران میں مشائخ کشی کے لئے مشہور ہے۔ اس وقت ہزاروں جاسوس مقرر ہوئے۔ انھوں نے ان گوشہ نشینوں کا سراغ لگا کر انھیں گرفتار کرایا اور حکومت نے انھیں سیاست کا شکار بنایا۔

تیسری صدی ہجری کے بن جوزی و بن تیمیہ کی سنانِ زبان کا حال ابھی سن چکے۔ مگر نویں صدی ہجری کی اس تیغ صفاپانی کی صفائیوں کی روداد بھی تاریخوں میں پڑھو کہ اہل صفا کے لئے وہ کس طرح شمشیر برّاں بنی رہی اور اُن غریبوں کے لئے اپنے ملک میں، امن و امان کا رستہ کیونکر بند ہو کر کوچہ ہائے تیغ سے بھی اُن کا گذر نامحال ہو گیا۔ مشہور علامہ سید شاہ طاہر کاشانی کا واقعہ

کسی تاریخ داں پر پوشیدہ نہیں ۔ اُن کا سا شیخ وقت، بہ سختی و مجبوری کسی طرح اپنی جان لے کر ایران سے ہندوستان چلا آیا۔ یہ وہی علامہ طاہر ہیں، جن کے دست پاک پر، بقول فرشتہ (تاریخ) برہان شاہ سلطان دکھن نے بیعت کی اور معہ اراکین سلطنت امامیہ مسلک اختیار کر کے اس مشرب کا خدمت گذار ہو گیا۔

ان سلاطین کے غیظ و غضب کی تلوار اس وقت تک نہ صرف اہل باطن ہی پر نہ چلی بلکہ اُن کے منجر مردوں کی ہڈیوں کو بھی ریتنے میان سے نکل پڑے۔ شاہ سلطان حسین وحشت و خشونت میں آکر ایران کے صلحا و عرفا کے مزاروں کے بھی پیچھے پڑا اور گڑے مردے اکھاڑنے لگا۔ اپنے جوش غضب میں ایک دفعہ اصفہان سے شیـ[illegible]
تہ خاک کرنے کھڑا ہو گیا۔ مورخین کہتے ہیں کہ
فیصلے کے لیے شیخ و خواجہ کے کلام سے تفاول

الٰہی بحق بنی فاطمہ

اور لسان الغیب نے جواب دیا کہ ۔ جوز اسحر نہاد حمائل برابرم یعنی غلام شاہم و سوگند می خورم۔ اس پر بادشاہ ٹھنڈا ہوا اور وہ تربتیں سلامت رہ گئیں!

صفویوں کے عہد میں لاریب علمی ترقیاں بھی ہوئیں اور اس کے لئے وہ لائق ستائش ہیں۔ اس وقت جید علما بھی پیدا ہوئے۔ لیکن معقولات و منقولات کی تلوار اُن میں بھی چلتی رہی اور ان دونوں کے خدنگ روحانیت کی طرف ہمیشہ سیدھے رہے۔ سلطنت کبھی معقولی تھی اور کبھی منقولی اور ان کے بل پر وہ (حکومت) باطنیت کا استیصال کرتی رہی۔ اور اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وجدان کمزور اور شاعری جو اس کا ایک زبردست آلہ کار ہے بے کار ہو جائے۔

ان حالتوں اور تزکیہ نفس کے ایسے اداروں کی تباہیوں کو دیکھ کر شیخ وقت، ملا بہاء الدین آملی، زیادہ خموش نہ رہ سکے۔ ظاہر بینوں کو وہ گھورتے، اور معقولیوں کو معقول کرتے رہے۔ شاہ عباس (صفوی)، کے عہد میں کہ اس وقت وہ قاضی القضاۃ تھے، اپنی مشہور مثنوی

نان وحلوا تصنیف کی۔ اس میں ارشاد کرتے ہیں ؎

لَیتَ شِعرِی مَا عُلُومُ الفَلسَفَہ | کَم اَرَی الاَعمَارَ فِیہَا مُتلَفَہ[1]
زاں نہ گردد بر تو ہر گز کشف راز | گر بود شاگرد تو صد فخر رازؔ[2]
اَیُّہَا القَومُ الَّذِی فِی المَدرَسَہ | کُلُّ مَا حَصَّلتُمُوہُ وَسوَسَہ[3]
دل منور کن ز انوار جلی | چند باشی کاسہ لیسِ بو علی[4]
علم نبود غیر علم عاشقی | مابقی تلبیسِ ابلیسِ شقی

یہ وہی نان وحلوائے شیخ ہے جس کی لذت سید اکرم جناب مفتی میر محمد عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ، اپنی مثنوی من وسلوی میں نہ بھولے۔ فرماتے ہیں ؎

سیدا نان بہائی خوردہ | نعمت الوان شاہی خوردہ
نظم او دریا و نظم شبنم ست | ہست ایں کشکول و آں جام جم ست
بوریا با مسند جمشید چیست | نسبت ذرات با خورشید چیست

یہ نان وحلوی، من وسلوی بنا اور اس کا مزا مدتوں ہماری زبانوں پر رہا۔ شیخ کی ؎ مرحبا اے بلبل بستانِ حیؔ[5] کی پکار نے لیلائے عشق کو پھر بے پروا اور قیس دل کو پھر مجنوں بنا دیا۔ یہ صدائے نادر سنے فارس سے ہند میں پہنچی اور جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس بستان کے بلبل، درد و میر اپنی نواسنجیوں سے باغ ہند کو فردوسِ بریں بنا رہے تھے۔ لکھنؤ میں بھی

---

(۱) یعنی فلسفہ میں وہ شعور کہاں جس سے معرفت حاصل ہو۔ اس میں عمر عزیز بیکار صرف کی۔

(۲) علامہ فخرالدین رازی۔

(۳) اے قوم مدرسوں میں جو تو نے سیکھا وہ حقیقت سے دور اور وسوسہ ہی وسوسہ ہے!

(۴) بو علی سینا مشہور حکیم۔

(۵) حی لیلی کے قبیلے کا نام ہے۔ یہاں بستان حی سے مراد گلشن عشق ہے۔ دل کو بلبل کہا اور اسے اس باغ میں چہکا دیا۔

یہ آوازیں مدتوں گونجیں اور نواب سعادت[1] علی خاں کے وقت تک کہ صحیح تعلیم و تربیت کا وہاں رواج تھا، شیخ کی یہ کڑکتی صدا کانوں میں آرہی اور ظاہر بینوں پر بجلی گرا رہی تھی ؎

علم رسمی سر بسر قیل ست و قال | نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
طبع را افسردگی بخشد مدام | مولوی باور ندارد ایں کلام
چند ازیں فقہ و کلامِ بے اصول | مغز را خالی کنی اے بوالفضول
صرف شد عمرت بہ بحثِ نحو و صرف | از اصولِ عشق ہم خواں یک دو حرف

لکھنؤ، دلی سے آزاد ہوتے ہی و.
ونصیر الدین حیدر کے دور میں وہاں کا مذاق
کی گردشِ چشم پر گھوم رہی اور وہاں کی زمین و آسمان
ہے، بے خبروں کے منہ میں پڑکر بستان حق نے کُل چکی اور نمائشی باغوں کی جولانیاں
میں گم ہو چکی تھی۔ خواجہ آتش۔ فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو وہاں کا یہ رنگ دیکھ کر دنگ ہو گئے۔
یہ دہلی نژاد اور اُسی دائرے کے فقیر تھے جو درد و میر کا تکیہ گاہ رہا تھا۔ انھوں نے اس قدیم لب و لہجے میں اپنی آواز بلند کرنا چاہی تو گلوگیر ہونے لگی۔ مگر وہ بے پروا، ایک سرد شدہ نظریۂ زندگی کو اپنی آتش بیانی سے گرم کرتے رہے۔ اس وقت اُن کے لئے ایک نہیں ہزار در کھلے تھے اور جب چاہتے ایک آغا میر نہ سہی کسی امیر کی مسند کے حاشیہ نشین ہو جاتے۔ مگر انھوں نے اپنی آزادی زبان جو انسان کا شرف ہے، کسی قیمت پر فروخت نہ کی اور یہ فرما کر کہ ؎

طلبِ دنیا کی کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی | خیالِ آبروئے ہمت مردانہ آتا ہے

---

(۱) ظاہر بیں اور قشر بین (علما) ہند اور خصوصاً لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کے بعد عروج پا سکے۔ نواب مرحوم خود ذی علم تھے۔ اس وجہ سے ان کا ودسروں کے اثر میں آنا محال تھا۔ مگر ان کے بعد ہی علمائے ظاہر کا زور شور شروع ہو گیا۔ اور پھر لکھنؤ کی خود مختاری و شاہی کی بدولت وہاں کی معاشرت و مذہبیت و شعریت اطراف ہند میں پھیل گئی۔

اپنے جھونپڑے میں بیٹھے آتش افروزی کرتے رہے۔

قدیم شامی و عراقی اور جدید ایرانی صفوی زمانے کی طرح اس وقت ہند میں بھی اہل علم کے دو گروہ ہو گئے تھے۔ اُن ملکوں کی تقلید میں یہ ملک بھی معقولیوں اور منقولیوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اور سے علم نبود غیر علم عاشقی۔ کو فراموش کر کے ان دونوں کا روے سخن اُن عشاق کی طرف بھی ہو جاتا جو معرفت کے سرخوش سمجھے جاتے ہیں۔ آتش کا سا اہل عشق ان کی زد سے کیونکر بچتا۔ زبانیں کھلیں۔ یہ سنتے اور بیٹھے جھوا کرتے!

یہ وہی وقت ہے کہ لکھنؤ کے فرنگی محل کا نام بلند ہو چکا اور بحر العلوم (مولانا عبد العلی) کی توجہ سے وہ ایک محیط علم مانا جا چکا ہے۔ خواجہ آتش بھی وہاں کے فضل و کمال پر نظر کرتے اور دیکھو کس جوش میں فرماتے ہیں سے

چھائے ہوئے ہیں کوئے فرنگی محل تمام ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام

فرنگی محل کا استعارہ علم و فضل سے ہے۔ مطلب یہ کہ علوم کا ذخیرہ ہمارے سینے میں بھی ہے اور اس لئے اس کے نتیجہ و ماحصل یعنی معرفت سے ہم بھی آشنا اور اس کے پیامبر ہیں!

خواجہ صاحب تقریباً ۱۷۷۸ء میں پیدا ہوئے اس لئے انھوں نے ملا حسن علیہ الرحمۃ کا جنھوں نے ۱۸۰۳ء میں وفات پائی، زمانہ بھی دیکھا اور بحر العلوم (علیہ الرحمۃ) جن کا وصال ۱۸۱۰ء میں ہوا، کے تو وہ ہمعصر و ہمنوا ہی ہیں۔ اس وقت وہاں منطق کا بھی بجد زور اور فرنگی محل کا میر زاہد پر حاشیہ مشہور ہو رہا تھا۔ خواجہ صاحب نے بھی سنا۔ مسکرائے اور بے تکلف فرمایا کہ سے

عالم منطق مصور ہو تری تصویر کا منہ کتابی قطبی ہو خط حاشیہ ہو میر کا

یعنی علوم اور سارے قضیہ کا نتیجہ تصویر یار کا کھینچنا اور عالم شہود میں اُسے لانا ہے۔ اور خط جو اس روئے روشن کے صفات ہیں وہ بمنزلہ حاشیہ و تفسیر ہیں اور قال اقول سے بے نیاز ہو کر ہم خود سے تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں!

خواجہ صاحب کی آتش بیانیوں نے گو ملک میں ایک آگ لگا دی۔ مگر لکھنؤ کے دل اُن سے زیادہ گرم نہ ہوئے۔ اس سرد مہری کی اصل ذمہ دار اُس وقت کی حکومت ہے اور مولیانِ لکھنؤ کی غیر عالمانہ خشونت! مگر پھر بھی اسی شہر (لکھنؤ) کا آتش پارہ[1] ایک مقام پر اسی حسن و نور کا آتشکدہ یوں سلگا دیتا ہے۔ ے

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

یہ شگوفہ بھی گل بکاؤلی سے زیادہ ہماری آنکھیں روشن کر گیا!

یہ آتشی مذاق، دلی کا تحفہ سمجھا جاتا ہے مگر جب اُدھر ذوق وہاں بھی نہ رہے تو شاعری کے خوانِ نعمت پر مکھیاں بھنکنے لگیں ے

خالِ پشتِ لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی

ذرا کراہتِ معشوق کی صفائی طبیعت کا کیا خوب جاتی ہے ے

نصیر[2] لکھی ہے کیا غزل یہ کہ دل تڑپتا ہے سن کے جس کو بندھے ہے کب یوں کسی بشر سے فلک پہ بجلی نہیں ہے یارا!

یہ تھا وہ مذاقِ شاعری جو آج سے سو سال قبل یعنی ۱۲۵۰ھ میں دلی و لکھنؤ اور ملک کے ایک اچھے حصے میں پھیل کر ہم کو اور ہماری شاعری کو بدنام اور رائے بھنگیڑیوں[3] کی گپ بنا رہا تھا۔

مگر پھر بھی اُسی اجڑے دیار اور دلی کے پرانے میکدے میں ایسی نجاستوں کی شست و شو بھی ہو جاتی ہے۔ وہاں پھر ایک سرِ وحشؔ اٹھتا اور بادۂ حجاز کا وہ سرشار طلب جام[4]...

---

(۱) پنڈت دیا شنکر نسیم (۲) شاہ نصیر مرحوم دہلوی

(۳) ظاہر ہیں اور قشری علما کی عصبیت نے جب ہمارے ادب و شاعری سے الٰہیات و تصوف کو خارج کیا اور لکھنؤ کی حکومت کے وہ شریک غالب ہے تو اردو شعرا کا بھی رنگ بدلا اس لئے کہ وہ سلطنت اور پھر قشری حکومت کے خلاف نہیں جا سکتے تھے۔ اس وجہ سے لکھنؤ کی شاعری میں انقلاب ہوا اور وہ نمائشی باتوں میں گرفتار ہو کر اتنی مسخ ہو گئی کہ اگر اُس شہر کے بعض شعرا اُس کی حالت پر نظر نہ کرتے تو یہ بدنامی کلنک کا ٹیکا بن جاتی! (۴) غالب۔

محبت کرتا ہو ۔

کل سکے اگر نہ قسمت شراب میں ... بسوئے ظن ہو ساقی کو تھکے اپنے

یعنی حکم ہو چکا ہے ۔ عدول نہ کر ۔ ہاں ابھی شے کہ یہ قطرہ سرور میں عروج پا کر دریائے حقیقت میں جلد مل جائے!

عظیم آباد (پٹنہ) ہمیشہ درد آباد رہا ہے ۔ اس وجہ سے وہاں آتش نوازی نہیں، آتش پرستی ہوا کی ہے ۔ اور یہ اسی کا صلہ ہے کہ لکھنؤ میں اگر اس دریائے نور کا یوں ذکر چھڑا

جاب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا ... نہایت غم ہو اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

(آتش)

تو وہاں (عظیم آباد) یہ سمجھ کر اس کے غمگین سننے والے کہیں بے چین ہو کے بے چین نہ ہو جائیں ان کی یوں تسلی کر دی گئی ۔

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا

دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا (شاد)

ہاں، رخ یار کی بہت شرحیں دیکھیں اور بڑی لن ترانیاں سنی گئیں ۔ اچھا اس کی ایک اور تفسیر یاد کر لو ۔

ہوا نور بار جو رخ تیرا، دلموع دجہک اعتلا

چمک اٹھے دشت وجبال و در تشعشعا متزلزلا

کوچہ یار کا ذکر ابھی خوب خوب سنا گیا ۔ اب اس حقیقی کوچہ کی بھی ذرا سیر کر لو ۔

ہیں نگاہ شوق میں تمہد ترا کوچہ ہو کہ تپل گھر ... تسے جلوہ گاہ میں دونوں ہی جو سنا ہو تو دیکھا

تو ڈری یا تو بنی بجا بجا کر ہمارے یہاں آرزو کے سے سانپ کو خوب خوب کھلایا گیا ہے ۔ اب اس مار آستین کو مارو اور اس ہفی (دفعی) کا سر کچلو، سنو ۔

ہمیں شاد جس کا بہت تھا ڈر وہی پیش آ گیا الحذر ... تمہیں کہتے تھے کہ امید سے نہ زیادہ دو رکھو خدا را!

یہ سچ ہو کہ قوموں کے عروج کے وقت یعنی جب کہ اُن کے قوائے دماغی سالم رہتے ہیں،
اُن میں بڑے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ اسی شاعری کو لیجے تو دلمیکی و کالیداس اور فردوسی و شکسپیر
اس وقت پیدا ہوئے جبکہ اُن کی قوم کی ترقیوں کا زمانہ تھا۔ مگر یہ بہت کم دیکھا گیا ہے کہ اقوام کے
زوال کے وقت یعنی جبکہ اُن کے قوائے دماغی مضمحل و پامال ہو جاتے ہیں، اُن میں بڑے لوگ
پیدا ہوں۔ اس لحاظ سے میر انیس کی سی زبردست ہستی کا اس ملک میں جبکہ وہ زوال پذیر ہو
رہا تھا، وجود میں آنا عجیب سمجھا گیا ہے۔ لیکن معلمین اخلاق ہمیشہ ایسے ہی وقت ظاہر ہوئے ہیں
جب کہ اُن کی قوموں کے اخلاق خراب ہو کر پستی کی طرف مائل ہو رہے تھے، میر انیس بھی
ایک معلم اخلاق تھے۔ اس ملک میں جب کہ وہ ۔ ۔
اس لئے حیرت انگیز نہیں کہ اُن کی زبان و کلا
کا وعدہ ہو چکا ہے
ان کے بزرگ خاندان میر امامی، ہروی ہرا ل

(نوٹ صفحہ ۲۶) سید الشعرا خان بہادر سید علی محمد شاد (عظیم آبادی) وفات ۸ جنوری ۱۹۲۷ء بعمر ۸۰ سال۔
شاد مرحوم بھی خواجہ میر درد ہی کی خانقاہ کے سجادوں میں سے ہیں۔ سلسلہ ملاحظہ ہو۔

خواجہ میر درد
|
میاں اشکی (عظیم آبادی)
|
شاہ الفت حسین فریاد (" ")
|
شاد

(۱) میر امامی صاحب سجادہ
(۲) میر برات اللہ
(۳) میر فیض اللہ
(۴) میر ضاحک
(۵) میر حسن
(۶) میر خلیق
(۷) میر انیس

(۱) میر امامی ہروی اس پائے کے بزرگوار تھے کہ امام و شیخ وقت کہلائے۔ ہرات میں
انکا سجادہ و تکیہ مشہور تھا جہاں روحانیات کا درس دیا جاتا۔ ہرات کے انقلابوں سے تنگ آکر یہ شاہجہاں
کے عہد میں ہند آئے بادشاہ نے انھیں بڑی قدر و منزلت کے ساتھ لیے تخت طاؤس کے برابر جگہ دی۔
اور دلی میں بھی ان کی تعلیم شروع ہو گئی۔ انکے بیٹے میر برات اللہ (عالمگیری) اور انکے پوتے میر فیض اللہ
(بہادر شاہی) نے بھی مناصب پائے اور اپنے خاندانی امتیاز کو سنبھالے رہے۔ ان میر فیض اللہ کے بیٹے
میر ضاحک ہیں اور اُن کے خلف الرشید میر حسن۔ ان میں بھی اپنے خاندان کے اوصاف موجود تھے۔

و ہدایت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ یہ طریقہ نسلاً بعد نسل خون میں سرایت کرتا ہوا حسن تک پہنچا اور حسن سے انیس کی رگوں میں آ گرم ہونے اور لہو کی طرح دوڑنے لگا۔ انیس کا زمانہ عجب پر آشوب زمانہ تھا۔ ہم زمانے سے کھیل رہے اور زمانہ شناس ہم پر ہنس رہے تھے۔ انھوں نے وہ دیکھا جو خدا دشمن کو نہ دکھائے، اور اس سے اُن کے دل میں وہ ہیجان ہوا جو ایک خلاق معلم و شاعر کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ وہ اپنے ملک و قوم کی ایسی پستی کے اسباب و علل پر غور اور اس کے علاج کی تدبیر کرنے لگے۔

ان کے گھر میں کئی پشت سے اخلاق پرستی یعنی(۲) مرثیہ گوئی کا رواج تھا اور اس سے متاثر تھے۔ انھوں نے اس واقعہ (جس پر مرثیہ کا مدار ہے) کے راز کو سمجھا اور ایک زبردست آئیڈیل پیش کر کے ہمارے قوائے عقلی کی درستگی میں مشغول ہو گئے۔

وہ سمجھے اور خوب سمجھے کہ پوری تول تولنے کا نام اخلاق ہے اور اس کے برعکس بداخلاقی۔ انھوں نے دیکھا اور خوب دیکھا کہ آپس کے عمدہ برتاؤ اور مساوات کا نام اخلاق ہے اور

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۷) درد کی صحبت و ارادت نے اس پر جلا کی۔ اس کا ذکر اوپر آچکا اور ان کے رنگ شاعری کو بتایا جا چکا ہے۔

(۱) انیس کے وقت کا ہندوستان بداخلاقیوں کا نمونہ اور نکبتوں میں آپ اپنی مثال ہو رہا تھا۔ ہمارے دل پستی و انقلاب ہی کی طرف نہیں بلکہ غلامی کی جانب مائل ہو رہے تھے۔ اس وقت اگر کہیں کچھ روشنی دکھائی بھی دی تو وہ ایک مریض کا سنبھالا تھا جو اُس کے پرستاروں کو غلط امید میں بہلائے رکھتا مگر اُس کی شمع حیات کو جلد گل کر دیتا ہے!

(۲) انیس کے پردادا امیر ضاحک سے مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا۔ پھر ان کے صاحبزادے میر حسن نے مرثیے کہے میر خلیق کی مرثیہ گوئی محتاج بیان نہیں اس خاندان میں میر انیس وہ چوتھے بزرگوار ہیں جنھوں نے مرثیے کے ذریعے سے اخلاق کا درس دیا۔ اس پر وہ فخر کرتے اور اپنے ایک صاحبزادے میر عسکری رئیس کی زبان سے فرماتے ہیں ع

عمریں گذریں ہیں اسی دشت کی سیاحی میں — پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

رئیس اس دشت کے پانچویں سیاح ہیں۔ "عمریں گذریں ہیں" اس سے مراد خاندان کی عمر ہے نہ کہ کسی ایک فرد کی یعنی اس مداحی میں ہمارے خانوادے کی عمریں صرف ہو گئیں!

اس کے خلاف بداخلاقی۔ ان کی طبیعت رسا اس نکتہ تک پہنچی اور خوب پہنچی کہ اخلاق، داب و تادیب یعنی ڈسپلن میں ہے اور بے ادبی و بد روی، بداخلاقی۔ ان کے پُر فکر دماغ نے طے کیا اللہ خوب طے کیا کہ اپنے کسی اصول پر قیام و استقلال میں اخلاق ہے اور اس کا نتیجہ شریفانہ آزادی اور اصول سے انحراف، بداخلاقی اور اس کا لازمی نتیجہ ذلت و غلامی۔ ان پر منجلی ہوگیا اور خوب منجلی ہوا کہ صحیح اخلاق معرفت ہے اور معرفت ؎

پیکان آبدار کہ آید ز دست دوست ۔۔۔ بر عاشقانِ سوختہ باران رحمت است

اور ؎ گردن نہادیم، الحکم للہ اور پھر ؎ موعید جو قربان ہوئے راہ خدا میں۔ یہ عمل کے بعینہٖ ممکن اور اس کے خلاف عمل جہالت و بداخلاقی۔

کی طرف جھک پڑے۔ اور ؎ ہرچہ گوئیم از ز

اپنے پاکیزہ سروں سے اخلاق کا صور پھونک

انیس وہ شاعر ہیں جنھوں نے اس عالم مثالی

غلط تصویر کبھی نہیں دیکھی! وہ ہمیشہ ؎ تو سوی من بینی و من بحیثِ تو۔ تا بروِ من اشارہا ے ابروِ کو دیکھتے، سمجھتے اور سمجھاتے رہے۔ وہ ملک و قوم کی بربادی و تباہی کو دیکھ کر بیحد متاثر ہوتے اور اس کا چارہ نہ دیکھ کر غیبی امداد کے طالب ہوتے اور گھبرا گھبرا کر بے اختیار کہتے ہیں ؎

یا منتقم ظہور امام زماں دکھا ۔۔۔ اب دم لبوں پہ ہے در امن و اماں دکھا
آنکھیں ہیں منتظر رخِ آرام جاں دکھا ۔۔۔ پھر برقِ ذوالفقار کو آتش فشاں دکھا
دشمن رہے نہ ایک شہہِ مشرقین کا
اُس دن غلام سوگ اتاریں حسین کا

ہماری بداطواریاں انھیں دکھ دیتی ہیں تو وہ ایک آنے والے کو پکارتے اور شہہ مشرقین کے اصول کے توڑنے والوں کی گردنوں پر تیغ انتقام چلانا اور اس کے دشمن یعنی بداخلاقیوں کا خرمن جمع کرنے والوں پر برقِ ذوالفقار گرانا اور اس جہاں میں ازسرِ نو

اخلاق کا علم کرنا، زور و سعت کھلوانا اور اس وقت بندہ ہائے اخلاق کا علم دور کرنا اور ان کو حکومت سے توڑانا چاہتے ہیں!

اس مضمون کے سننے والوں کے لئے یہ موزوں فقرہ سے شاعری جزویست از پیغمبری۔ غالباً بے جا نہ ہوگا بلکہ ایک شاعر، ناظم نہیں، معلم اخلاق اور صادق اللہجہ ہوتا اور اس حسن خداوند صفات حسن کو جلوہ دیتا ہے جو اس عالم مرصع کو روشن کر رہا ہے اور اس لئے وہ قدرت کا پیامبر ہے! اس خصوص میں انیس اپنے پیش روؤں سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں! اپنے بیان و کلام کا جو دائرہ وہ کھینچ گئے اس سے نکلنا محال ہے۔ اور ایسی جرات پر صاف کہدیا جائے گا

اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

ہند کا شرف کہ یہاں انیس پیدا ہوئے۔ شاعری کی معراج کو وہ اس کی طرف مخاطب ہوئے۔ اور ان کے زور زبان سے "پہنچی یہ زمین آسمان تک"! اور اردو کی عزت کہ انھوں نے اسے منہ لگایا اور ان کے خیالات کا وہ بار اٹھاسکی اور ان کے سروں کا ارگن بن سکی!

اس بیان کے شروع میں کہا گیا ہے کہ۔ اس عالم کے ذرہ ذرہ میں ہموزنی و تقابل اور تناسب پایا جاتا ہے جس کا دوسرا نام حسن ہے۔ اصطلاح میں اس صنعت کو ترصیع کہتے ہیں۔ اس ترتیب و انتظام پر نظر کر کے عقلا اس کا خود بخود وجود میں آجانا محال اور اس لئے کسی صناع کا ماننا فرض سمجھتے ہیں۔

اسی ترصیع نے مادہ پرستوں کو خدا پرست، حکما کو صفات پرست و قدرت پرست اور شعرا کو حسن پرست بنادیا۔ اور ان سب نے مختلف لب و لہجہ میں اس کی ثنا کی ہے۔ مگر یہ حسن جہاں واقعی کندن کی طرح چمکا وہ کان کہیں اور ہی ہے۔ اس حسن کے ذخیرے میں سے ایک ذرہ پر نظر کرو۔ پرکھو اور دیکھو کہ وہ صنعت (ترصیع) کس طرح چمکتی اور اس صانع کے یہاں کیونکر صفت کی جاتی ہے۔

صبح کاذب کافور ہوئی اور عاشور محرم کی صبح صادق بے حجاب ہو چلی۔ پو پھٹ رہی

اور سے ڈوبتے جاتے ہیں دریائے فلک کے تارے ! نور برس رہا اور اُس دھند کے میں پنہاں و آشکار اور قدرت کا تماشا ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کیفیت کا اثر پڑتا اور اُڑنی گوئے اوج طور میں اس وقت غش سے چونک کر کلمہ پڑھتا اور سارا عالم اُس صناع کی یوں حمد کہنے لگتا ہے ؎

قربانِ صنعتِ قلمِ آفریدگار　　تھی ہر ورق پہ صنعتِ ترصیعِ آشکار
عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار　　ان صنعتوں کو پائے کہاں عقلِ سادہ کار

عالم تھا محوِ قدرتِ ...
مینا کیا تھا واد ...

صاحبو ؎

بدیں نامہ بر عمرہا بگذرد　　بخواند ہر آنکس کہ دارد خرد

قدر اول کے ستارے

جب مطلع آسمان اندھیری رات میں ابر و باراں سے بالکل پاک ہو تو ہمیں ایسے لاتعداد چھوٹے بڑے منور اجرام سے مزین نظر آتا ہے جو ابتداءً منتشر و بے قاعدہ سے معلوم ہوتے ہیں مگر چند روز دلچسپی و توجہ سے مشاہدہ فلکی کرنے کے بعد ان کی ترتیب بخوبی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔

مقدمین ہیئت و نجوم نے آسانی کے لئے ان کے متعدد مجامع النجوم قرار دیے۔ نیز اپنی گرد و پیش کی اشیا کی مشابہت سے ان کی فرضی شکلیں قائم کیں اور نام رکھے بارہ برج جو منطقۃ البروج کے نام سے معروف ہیں ترتیب دئے اور انکے درمیان ایک فرضی خط کھینچا جس پر آفتاب ہمیشہ حرکت کرتا رہتا ہے۔ اس کی حرکت کی وجہ سے موسمی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ اس خط کو طریق الشمس کہتے ہیں۔ اس کا دور تین سو ساٹھ درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

منطقۃ البروج کے شمال میں اکیس مجامع النجوم اور جنوب میں پندرہ مجامع قرار دئے گئے ہیں۔

ستارے اپنی چمک دمک کے لحاظ سے درجوں میں منقسم ہیں جنھیں اصطلاح میں قدر کہتے ہیں۔

قدما نے چودہ ستاروں کو جو ان کے خیال میں کل کرات فلکی کے روشن ترین ستارے تھے قدر اول میں رکھا مگر متاخرین نے ان میں چھ ستاروں کا اضافہ کرکے قدر اول کے بیس ستارے کر لئے اور ان ستاروں کو مختلف مجامع میں ترتیب دیا۔ ان نئے مجامع کے نام ان لوگوں نے اپنے مذاق کے مطابق رکھے۔ مثلاً شمال میں دوربین عظیم ہرشل

اور جنوب میں منظار اکبر یا دوربین Telescopium . اور منظار اصغر یا خوردبین
Microscopium وغیرہ۔

خالی آنکھ سے نظر آنے والے ستارے چھٹی قدر تک کے ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد قدماء کے نزدیک
۳۲۹۱ تھی۔ مگر اب پانچ ہزار شمار کئے جاتے ہیں۔ چونکہ سب ستارے بلحاظ نوع یکساں نہیں ہیں۔ اس
لئے ان کی مسافت سے متعلق ہم سطحی رائے قائم کرکے کہہ سکتے ہیں کہ مدھم اجرام بہ نسبت روشن اجرام
کے بعید تر ہیں اور جو ستارے ہمیں نظر نہیں آتے وہ محتاج دوربین ہیں۔ زمانہ حال کی عظیم ترین
دوربینیں اب تک بیسویں قدر تک کے ستارے دیکھ سکی ہیں جن کی تعداد کم و بیش ایک ارب اسّی
کروڑ ہے۔ لیکن امید کی جاتی ہے کہ آئندہ اس ...
کے ستارے دیکھ سکیں گی جن کی تعداد تین چا
ہم ان دوربینی اجرام سے قطع نظر کرکے خالی آ
نور و حرارت کا مقابلہ اپنے آفتاب سے کریں تو ...
چراغ بجائے خود بڑے بڑے آفتاب ہیں اور بعض بعض کے سامنے تو ہمارے آفتاب کی وہی
حقیقت ہے جو کرہ ارض کی آفتاب کے مقابلے ہیں۔

یہ بڑے بڑے اجرام باہم ایک دوسرے کی کشش سے جکڑے ہوئے اس فضائے
لامحدود میں ایک دوسرے کے گرد آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہیں۔ ان کی گردش باہمی بعینہ ایسی
ہے جیسے زمین کے گرد چاند کی یا آفتاب کے گرد زمین و دیگر سیاروں کی۔ کُلٌّ فِی فَلَکٍ یَّسبَحُون۔

اب ہم مختصراً قدر اول کے ستاروں اور ان کے مجامع کے حالات ناظرین کی دلچسپی کے
لئے لکھتے ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے ہم آفتاب اور اس کے نظام کو لیتے ہیں جو خود ایک روشن ستارہ
ہے اور ہمارے نظام شمسی کا مرکز ہے۔ بظاہر اسی کے وجود سے ہماری دنیا آباد ہے اور ہم
زندہ ہیں۔

آفتاب | یہ کل ثوابت میں زمین سے نزدیک تر اور سب سے چھوٹا ستارہ ہے۔ ہمارا نظام شمسی اسی

نے متعلق ہے۔ زمین سے ساڑھے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ اس کی روشنی زمین تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔ یہ کسی دوسرے جرم سماوی سے کسب نور و حرارت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے ہی نور سے زمین اور دوسرے سیاروں کو منور کرتا ہے۔ جرم آفتاب کرۂ ارض سے بارہ لاکھ اکتیس ہزار سات سو گنا بڑا ہے۔ اس کا قطر آٹھ لاکھ بانوے ہزار پانسو اسی اور محیط چھبیس لاکھ اکتر ہزار پانسو ہے۔ اس کی خارج شدہ حرارت کا $\frac{۱}{۲۲۲۱۸۰۰۰۰۰۰}$ حصہ زمین تک پہنچتا ہے۔ اگر اس کی حرارت کو منتشر ہونے نہ دیا جائے تو یہ اتنی مقدار یخ کو بہ آسانی پگھلانے کے لئے کافی ہے جس سے ساری زمین ڈھکی ہوئی ہو۔ اور جس کی ضخامت گیارہ بارہ میل ہو۔ اس میں بھی مثل زمین کے متعدد عناصر کا وجود ہے۔ مثلاً لوہا۔ نکل۔ تانبا۔ چاندی۔ کاربن۔ ایلومینیم، پوٹاسیم وغیرہ ان کے علاوہ دیگر عناصر کا بھی گمان کیا جاتا ہے۔ مگر ہنوز ان کے وجود کا پتہ نہیں چلا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ آفتاب کے کسی ایسے گوشے میں ہوں جہاں ہماری موجودہ تحقیقات کی رسائی نہ ہو اور آئندہ پتہ لگے۔ مثلاً گندھک فاسفورس۔ نائٹروجن۔ آرسنک۔ کلورین برومین وغیرہ۔ اس میں کچھ مہیب غار بھی موجود ہیں۔

سوائے حکیم فیثاغورث کے کل فلاسفہ قدیم زمین کے گرد آفتاب کی گردش کے قائل تھے۔ چنانچہ یہ خیال ایک عرصۂ دراز تک رہا یہاں تک کہ کوپرنیکس[1] کا زمانہ آیا۔ یہ حکیم ۱۴۷۳ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے پیش رو حکیم کے قول کی تائید کی اور اس کے قائم کردہ نظام کی تجدید زمین کو مرکزیت سے ہٹا کر آفتاب کو مرکز تسلیم کیا اور بجائے سماوی گردش کے ارضی گردش ثابت کی۔

متاخرین نے مطالعے کو وسعت دی۔ جدید انکشافات کئے اور مندرجہ ذیل سیارے معلوم کئے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں۔

عطارد۔ زہرہ۔ مریخ اور پلوٹو زمین سے باعتبار حجامت چھوٹے اور مشتری۔ زحل

---

(۱) کوپرنیکس ۱۴۷۳ء میں بمقام تھارن پولینڈ میں پیدا ہوا اور ۱۵۴۳ء میں بعمر ستر سال فوت ہوا۔

[illegible] نمبروں چلتے ہیں۔ اب ہم اسی ترتیب سے ان کے مختصر حالات لکھتے ہیں۔

عطارد | اس کا مدار، مدار ارض میں واقع ہے۔ یہ اس قدر چھوٹا ہے کہ اگر اس جیسے سولہ سترہ اجسام باہم مل جائیں تو زمین کے برابر ہوں۔ اس کا قطر صرف تین ہزار میل ہے۔ آفتاب کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس لئے بہ آسانی نظر نہیں آتا کیپلر(۱) غریب کو تا دم مرگ تمنا ہی رہی کہ اس کو دیکھے۔ مگر یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

زہرہ | جسامت میں زمین سے کچھ ہی چھوٹا ہے۔ چونکہ اس کا مدار بھی مثل عطارد کے مدار ارض میں واقع ہے۔ اس لئے اثنائے گردش میں بہ نسبت دیگر سیاروں کے زمین سے زیادہ قریب چلا آتا ہے۔ اس حالت میں راصدین کو [illegible]
اس کی فضا ابر وغیرہ سے ڈھکی رہتی ہے۔ [illegible]
اور خوبصورت ہے۔ چنانچہ جب یہ آسمان پر ہوتا [illegible]
کر سکتی ہے اور نہ کسی ثابت کی۔ علما کا خیال ہے کہ [illegible]
سب سے پہلے زہرہ ہی اہل زمین کا مسکن بنے گا۔ واللہ اعلم۔ آفتاب سے اوسطاً چھ کروڑ ستر لاکھ میل پر گردش کرتا ہے۔

زمین | اس کا قطر آٹھ ہزار میل ہے۔ مثل دیگر سیاروں کے آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے۔ اس کی گردش سالانہ ¼ ۳۶۵ دن میں تمام ہوتی ہے۔ یہ زمانہ سال کہلاتا ہے۔ حکمائے قدیم زمین کو مسطح اور ساکن سمجھتے تھے۔ مگر در اصل یہ کروی اور متحرک ہے۔ اور قطبین پر دونوں طرف ساڑھے تیرہ میل چپٹی ہو گئی ہے۔ اس کا ایک تابع بھی ہے جسے چاند کہتے ہیں۔ یہ زمین کے گرد گردش کرتا ہے اور ستائیس دن سات گھنٹے تینتالیس منٹ میں اس کے گرد گھوم جاتا ہے۔ اس زمانے کو قمری مہینہ کہتے ہیں۔ چاند کا قطر دو ہزار ایک سو ساٹھ میل ہے۔

---

(۱) کیپلر ۲۷ر دسمبر ۱۵۷۱ء میں پیدا ہوا اور بعمر ۵۹ سال ۱۶۳۰ء میں فوت ہوا۔

گلیلیو[1] نے جملہ دیگر اجرام کے اس کا معائنہ بھی اپنی دوربین سے کیا تھا پہلی ہی نظر میں اس نے چاند کی ہر چیز بہ آسانی دیکھ لی۔ مثلاً پہاڑ، وادیاں، آتش فشاں پہاڑ، کشادہ میدان، سمندر اور چٹانیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اگر ہم چاند پر سے زمین کو دیکھیں تو یہ بھی مثل چاند کے چمکدار اور روشن نظر آئے گی۔ مثلاً اس نے زہرہ کے ابر آلود کرے کو پیش کیا جو باوجود بادلوں کے بھی زمین سے کہیں زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ حالانکہ بذات خود روشن نہیں ہیں بلکہ آفتاب سے اخذ نور کرتا ہے جیسے زمین اور دیگر سیارے۔ چاند بظاہر سورج کے برابر نظر آتا ہے۔ حالانکہ جرم آفتاب سے چھ کروڑ انتیس لاکھ گنا چھوٹا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کا فاصلہ زمین سے دو لاکھ اڑتالیس ہزار اور سورج کا نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔

مریخ | اس کا قطر چار ہزار میل ہے۔ گلیلیو نے اس کا معائنہ اپنی نو ایجاد دوربین سے ۱۶۱۰ء میں کیا تھا۔ اس نے قرص مریخ پر بحر و بر کی علامات دیکھیں۔ پھر وقتاً فوقتاً ہیئت داں اس کا مطالعہ کرتے رہے۔ جب اس کی رویت بہتر ہو تو اس کی سطح پر بعض بعض مقامات پر سیاہ خطوط کا جال سا بچھا معلوم ہوتا ہے۔ جس کا طول تین سے چار ہزار میل تک ہے۔ ریگستانوں کا بھی پتہ لگتا ہے قطبین پر برف پوش چوٹیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی سالانہ گردش تقریباً دو سال میں تمام ہوتی ہے۔ اس کے دو تابع قمر ہیں جن کا قطر دس سے بیس میل تک ہے۔

نجیمے۔ تین چار سو کی تعداد میں مریخ و مشتری کے درمیان گردش کر رہے ہیں۔ ان سب میں بڑا سیریس جس کا قطر چار سو اسی میل ہے اور باقی چھوٹے ہیں۔

مشتری | نظام شمسی کا سب سے بڑا سیارہ ہے۔ اس کا قطر تقریباً اٹھاسی ہزار چھ سو چالیس میل

---

(۱) گلیلیو ۱۸ فروری ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا ۱۶۱۰ء میں دوربین ایجاد کی۔ ۸ جنوری ۱۶۱۰ء کو مشتری کے اقمار معلوم کئے۔ اور اسی زمانے میں خوردبین ایجاد کی ۱۶۳۷ء میں اندھا ہو گیا اور ۸ جنوری ۱۶۴۲ء میں فوت ہوا۔

ہے۔ یہ اتنا بڑا سیارہ ہے کہ اس کے جرم میں کرۂ ارض جیسے اجرام چودہ سو سما سکتے ہیں۔ اس کے نو قمر ہیں جن کا انکشاف سنہ ۱۶۱۰ء سے ۱۹۱۴ء تک ہوا۔ ابھی تک ان میں مزید اضافہ نہیں ہوا۔ مشہور ہے کہ اس نے اپنی کشش سے تقریباً پچاس دمدار سیارے نظام شمسی میں داخل کر دئے ہیں۔ یہ زہرہ کے بعد سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔

زحل | مشتری کے بعد سب سے بڑا سیارہ ہے۔ اس کا قطر تقریباً ستر ہزار میل ہے۔ سالانہ گردش ساڑھے انتیس برس میں تمام ہوتی ہے۔ اس کے آٹھ قمر ہیں۔ مثل مشتری کے اس نے بھی چار دمدار سیارے نظام شمسی میں داخل کئے ہیں۔ اس کے دو قمر سر ولیم ہرشل[1] نے سنہ ۱۷۸۹ء میں دریافت کئے۔

یورینس | یہ ستارہ جدید دریافت ہوا ہے۔ اس کہ

کیا۔ اس کا سال ہمارے ۸۴ برس کے برابر ہوتا۔

پر گردش کرتا ہے۔ بوجہ بُعد آفتاب اس میں روشنـ

کافی ہے۔ یعنی چونسٹھ اجسام مثل زمین کے اس میں سما سکتے ہیں۔ اس کے چار قمر ہیں۔ دو دمدار سیارے اس کے متعلق ہیں۔

نیپچون | اس کا فاصلہ آفتاب سے دو ہزار آٹھ سو ملین میل ہے۔ سنہ ۱۸۴۶ء میں اس کا انکشاف ہوا۔ اس کی گردش سالانہ ایک سو سو اپینسٹھ سال میں تمام ہوتی ہے۔ اس میں بھی چونسٹھ اجسام مثل زمین کے سما سکتے ہیں۔ اس کا صرف ایک قمر ہے۔ اس کے متعلق نو دمدار سیارے ہیں۔

پلوٹو | اس کا تعارف ہم سے ابھی ابھی ہوا ہے۔ یعنی جنوری سنہ ۱۹۳۰ء میں انکشاف ہوا۔ باعتبار جسامت مریخ کے برابر خیال کیا جاتا ہے۔ تین ارب بہتر کروڑ میل آفتاب سے دور ہے۔ اس

---

(۱) سر ولیم ہرشل ۱۷۳۸ء میں پیدا ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں انگلستان گیا۔ ۱۷۷۴ء میں اپنی دوربین بنائی اور مطالعہ آسمان شروع کیا۔ آٹھ سو چھپن ستارے معلوم کئے اور ستاروں کی فہرست مرتب کی۔ پانسو اسی شہاب دریافت کئے اور ثابت کیا کہ آفتاب الجاثی کے ایک نقطے کی طرف جا رہا ہے۔ ۱۸۲۲ء میں فوت ہوا۔

کی گردش آفتاب کے گرد تین سو سال میں تمام ہوتی ہے۔ جس قدر نور و حرارت آفتاب سے زمین حاصل کرتی ہے اس کا $\frac{1}{[illegible]}$ حصہ پلوٹو آفتاب سے لیتا ہے۔ اس کی ہندسی یعنی $\frac{1}{[illegible]}$ کی نسبت رکھتی ہے۔

دمدار سیارے ان کے اجسام ٹھوس نہیں ہوتے کبھی کبھی نظر آتے ہیں اور بعض بعض تو نظام شمسی کو قطع کرتے ہوئے اس طرح باہر نکل گئے ہیں کہ اب شاید واپس نہ آئیں۔ اسی طرح یہ دمدار سیارے مختلف نظاموں کی سیر کرتے پھریں گے۔ یہاں تک کہ کسی ایسے زبردست نظام میں چلے جائیں جہاں کا آفتاب اپنی قوت جاذبہ سے انھیں مقید کرکے پھر باہر نہ نکلنے دے اور یہ گویا ہمیشہ کے لئے پابزنجیر ہو جائیں۔ بعض دمدار سیارے کئی کئی مرتبہ نظر آتے ہیں چنانچہ ایک ہی سیارہ ۱۷۸۶ء، ۱۷۹۵ء، ۱۸۰۵ء اور ۱۸۲۲ء میں متواتر دیکھا گیا۔ فضا کسی وقت دمدار سیاروں سے خالی نہیں رہتی۔ ممکن ہے کہ وہ ہمیں نظر نہ آئیں۔ مگر راصدین ان کی حرکات و سکنات کا ہر وقت معائنہ کر سکتے ہیں۔

کیپلر کا قول ہے کہ آسمان میں دمدار سیاروں کی تعداد سمندر کی مچھلیوں سے بھی زیادہ ہے۔ یعنی کسی وقت فضا ان کے وجود سے خالی نہیں رہتی۔ وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں نے انھیں معلوم کیا۔ منجملہ ان لوگوں کے سر ولیم ہرشل کی بہن[1] بھی ہیں۔ جنھوں نے آٹھ دمدار سیاروں کا انکشاف کیا۔

شہاب ثاقب عوام کی اصطلاح میں تارے ٹوٹنا مستعمل ہے۔ دراصل یہ چھوٹے چھوٹے سیارے ہیں جو آفتاب کے گرد نہایت سرعت سے چکر لگا رہے ہیں۔ کبھی منتشر ہوتے ہیں۔ اور کبھی غول کے غول نظر آتے ہیں۔ جب یہ کرۂ ہوا میں اتفاقاً داخل ہو جاتے ہیں تو تیز

---

(۱) caroline کارولائن سر ولیم ہرشل کی بہن ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئی ۱۷۷۲ء میں انگلستان آئی۔ اور آخر تک ولیم ہرشل کی مددگار بنی رہی۔ اس نے آٹھ دمدار سیاروں کا پتہ لگایا اور آخر کار ۱۸۴۸ء میں اٹھانوے برس کی ہوکر فوت ہوئی۔

رفتاری کے باعث ہوا جیسی لطیف شے کی مزاحمت بھی گوارا نہیں کر سکتے اور ذرا سی رگڑ سے مشتعل ہو کر شعلہ فشاں ہو جاتے ہیں عظیم الجثہ شہاب تو کرۂ ہوا کو قطع کر کے اپنی راہ لیتے ہیں مگر چھوٹے شہاب اپنی تیزی و شعلہ فشانی سے خود جل کر بخارات بن جاتے ہیں اور ایک روشن خط کچھ دیر نظر آ کر غائب ہو جاتا ہے. بعض وقت بڑے شہاب بھی کرۂ ہوا کو قطع کرتے وقت کشش ارضی سے کھچ کر زمین پر آ رہتے ہیں. ان کے گرنے اور پھٹنے کی آواز نہایت ہیبتناک ہوتی ہے. چنانچہ ۱۸۶۶ء میں ایک نہایت زبردست شہاب باشندگان ہنگری پر بلائے آسمانی بن کر نازل ہوا. زمین کے قریب آتے آتے پھٹا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا. منجملہ ان ٹکڑوں کے ایک ٹکڑا جس کا وزن دس گیارہ من تھا کسی جگہ [illegible]
نزول ہوا ہے. پارہ ہائے شہاب کا تجزیہ [illegible]
نکل. لوہا وغیرہ.

ہم نظام شمسی میں داخل ہو کر اپنی منزل مقصود سے دور ہو گئے. ابھی ہمیں بہت راستہ طے کرنا ہے. لہٰذا اب ہم نظام شمسی کو چھوڑ کر نظام انجم کی راہ لیتے ہیں. امید ہے کہ عزیز ناظرین کو اصل سلسلہ تحریر یاد ہو گا.

ہم اول لکھ آئے ہیں کہ سلف نے قدر اول کے صرف چودہ ستارے شمار کئے تھے. بعد کو ان کی تعداد میں چھ کا اضافہ کیا گیا. چنانچہ اب قدر اول کے بیس ستارے مانے جاتے ہیں اب ہم ان بیس ستاروں اور ان کے مجامع النجوم کے حالات بہ اختصار لکھتے ہیں.

قنطورس | اس مجمع النجوم کی ہیئت مجموعی ایک ایسے حیوان سے مشابہ ہے جس کا اوپر کا جسم آدمی سے اور نیچے کا حصہ گھوڑے سے ملتا ہو. اس مجمع النجوم میں دو نہایت روشن ستارے ہیں. اول ستارہ جو ساڑھے چار سال[1] دور کے فاصلے پر واقع ہے ربل قنطورس کہلاتا ہے. اور بلحاظ نور تیسرا ستارہ ہا

---

(۱) یعنی یہ ستارہ اتنی دور واقع ہے کہ اسکی روشنی زمین تک ساڑھے چار برس میں آتی ہے جبکہ روشنی کی رفتار فی سکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے.

جاتا ہے۔ اس کا فاصلہ زمین سے دو نیل تریسٹھ کھرب پچانوے ارب ترپن کروڑ بیس لاکھ میل ہے۔ یہ ہم سے سورج کے بعد دیگر ثوابت کے مقابلے میں قریب تر ہے۔ بہ اعتبار جسامت یہ آفتاب سے بڑا ہی مانا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا ستارہ بھی قدر اول کا ہے۔

یہ مجمع النجوم جنوری و فروری میں بالکل جنوبی مشرقی افق سے طلوع ہوتا ہے اور جون اور جولائی میں جنوب مغرب میں غروب ہوجاتا ہے۔

دجاجہ | صلیب شمالی بھی کہلاتا ہے۔ اس کا روشن ستارہ قدر اول سے ذرا کم ہے۔ مگر پہلی قدر کے ستاروں ہی میں شمار ہوتا ہے۔ اس کو ذنب الدجاجہ یا الرّوف بھی کہتے ہیں۔ یہ بہ اعتبار مسافت بہ استثنیٰ سہیل رجل الجوزا تمام قدر اول کے ستاروں سے زیادہ ہے۔ یعنی زمین سے دو پدم چوبیس نیل باسٹھ کھرب اٹھتر ارب چالیس کروڑ میل دور ہے۔ اس پر بھی روشن نظر آتا ہے ہمارے آفتاب سے ہزار گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ روشن ہے۔

دجاجہ میں ایک ستارہ ۶۱ دجاجہ کہلاتا ہے جس کی رفتارِ پرواز دو سو میل فی ثانیہ ہے اس کو کرہ شمالی کا نزدیک ترین ستارہ تسلیم کرتے ہیں جسے جنوبی کرہ میں رجل قنطورس مانا جاتا ہے۔ مجمع النجوم دجاجہ اپریل و مئی میں شمال مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور نومبر و دسمبر میں شمال مغرب میں غروب ہوجاتا ہے۔ دجاجہ ۶۱ کا بعد زمین سے بیسل نے ۱۸۳۸ء میں معلوم کیا۔

النہر | اس کو دریا بھی کہتے ہیں۔ نہایت وسیع مجمع النجوم ہے۔ الجبار کے مغربی پہلو سے شروع ہوکر مغرب جنوب میں بڑھتا چلا گیا ہے۔ مگر اس کے اکثر ستارے مدہم ہیں۔ مگر ایک ستارہ قدر اول کا ہے جو آخر النہر یا الف نہر کہلاتا ہے۔ یہ برج حمل کے بالکل جنوب میں جنوبی افق پر ٹمٹاتا نظر آتا ہے۔ مجمع النجوم نہر کا طلوع ستمبر، اکتوبر میں ہوتا ہے اور فروری، مارچ میں بالکل غروب ہوجاتا ہے۔

سفینہ | یہ بھی وسیع مجمع النجوم ہے۔ چنانچہ ولیم ہرشل نے اس کو چار حصوں میں منقسم کیا اور سب

(۱) بیسل ۱۷۸۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۴۶ء میں بعمر ۶۲ سال فوت ہوا۔

[illegible] علیحدہ سکے۔ لنگر سفینہ کا روشن ترین ستارہ سہیل کہلاتا ہے۔ بلحاظ نور آسمان پر دوسرے
[illegible] کا ستارہ مانا جاتا ہے۔ اس کے سال نور کا اندازہ پانسو اور ہزار سال کے درمیان کیا
جاتا ہے۔ اور یہ روز بروز ہم سے دور ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر سال تین سو ساڑھے اٹھتر ملین میں
دور ہوجاتا ہے۔ باوجود اس کے بھی اس کی روشنی میں فرق نہیں آتا۔ ہزاروں برس سے ایسا
ہی روشن نظر آتا ہے اور واللہ عالم کب تک ایسا ہی نظر آئے گا۔ اس کے متعلق عوام الناس
کا خیال ہے کہ جب یہ طلوع ہوتا ہے تو تمام حشرات الارض مرجاتے یا چھپ جاتے ہیں۔ اور
چمڑے میں خوشبو پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کو سہیل یمانی بھی کہتے ہیں۔ نومبر دسمبر میں طلوع اور
فروری میں غروب ہوجاتا ہے۔ سہیل برج جوزا کے [illegible] نظر آتا ہے۔
اور شعرائے یمانی سہیل کے شمال میں واقع ہے۔ [illegible]
نشین کرلینا چاہئے۔ تاکہ شناخت میں آسانی ہو۔

حوت جنوبی | یہ مجمع النجوم کچھ روشن نہیں۔ اس [illegible]
کہتے ہیں۔ زمین سے چودہ نیل چھیاسٹھ کھرب بیالیس ارب [illegible]
یہ سمت الراس سے گزرتا ہے۔ یہ مجمع النجوم برج دلو کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ جولائی
میں طلوع اور نومبر تک غروب ہوجاتا ہے۔

عنک الاعنہ | شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس میں ایک قدر اول کا ستارہ ہے جسے عیوق کہتے ہیں۔ یہ
بلحاظ نور آسمان پر چھٹا ستارہ شمار کیا جاتا ہے۔ زمین سے اٹھائیس نیل چوہتر کھرب انیس ارب
دس کرور چالیس لاکھ میل ہے اور ہر سال اٹھاون کرور چونتیس لاکھ سولہ ہزار میل ہم سے دور
ہوجاتا ہے۔ سورج سے ایک ہزار گنے سے بھی زیادہ ہے۔ اس کو رقیب الثریا بھی کہتے ہیں۔ عیوق
ستمبر میں طلوع اور اپریل تک غروب ہوجاتا ہے۔

شلیاق | شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کا نام نسر واقع ہے شمالی کرہ میں
سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ اس کا فاصلہ زمین سے بیس نیل باون کھرب ننانوے ارب

چھتیس کروڑ میل ہو۔ آفتاب سے سو گنے سے بھی زیادہ بڑا ہو۔ اس کا طلوع اپریل میں ہوجاتا ہے۔ اور نومبر میں بالکل شمال مغرب میں غروب ہوجاتا ہے۔

عقاب | شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کی ہیئت ایک ایسے عقاب سے مشابہ ہو۔ جو پر تولے ہوئے اڑنے کی کوشش کر رہا ہو اور منہ بجانب مشرق ہو۔ اس روشن قدر اول کا ستارہ نسر طائر کہلاتا ہے۔ یہ بلحاظ نور کرۂ فلکی پر گیارہواں ستارہ قرار دیا گیا ہے۔ زحل کے برابر روشن نظر آتا ہے۔ ہمارے آفتاب سے باعتبار جسامت و نور چھ سات گنا زیادہ ہوگا۔ زمین سے آٹھ نیل باکیس کھرب انیس ارب اٹھتر کروڑ چالیس لاکھ میل ہو۔ مجمع النجوم عقاب برج قوس کے شمال میں واقع ہے۔ نسر طائر کا طلوع مئی میں اور غروب نومبر میں ہوتا ہے۔ نسر طائر کے ادھر اُدھر دو چھوٹے ستارے بحیثیت نمایاں واقع ہیں۔ جن سے یہ بہ آسانی شناخت کیا جاسکتا ہے

کلب اکبر | یہ جنوبی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کا نام شعرائے یمانی ہے۔ اس کو عرب عبور بھی کہتے تھے۔ اور قبیلۂ قیس اس کی عبادت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ نے سورۂ نجم میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ انّہٗ ہُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی۔ اس کو کلب الجبار بھی کہتے ہیں۔ چونکہ عرب میں اس کا مطلع غرب بجانب یمن ہے اس لئے یمانی کہلاتا ہے۔ باعتبار نور کرۂ فلکی کے تمام قدر اول کے ستاروں سے زیادہ روشن ہے۔ اس کی روشنی ساڑھے آٹھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔ اس کا بعد زمین سے پانچ نیل ستر کھرب اکانوے ارب چھبیس کروڑ چالیس لاکھ میل ہو۔ آفتاب سے تقریباً بیس بائیس گنا بڑا ہو۔ پانچ میل فی ثانیہ ہم سے قریب ہو رہا ہے۔ اس کا ایک سیارہ بھی معلوم کیا گیا ہے۔ اس کی پیشین گوئی بیسل نے کی تھی اس کا انکشاف ۱۸۶۲ء میں بمقام امریکہ ہوا۔ خیال ہے کہ یہ سیارہ شعرائے یمانی کے گرد پچاس برس میں اپنی حرکت سالانہ تمام کرتا ہے اور یہ بھی روز بروز مثل مشتری وغیرہ کے سرد ہوتا جارہا ہے۔ یہ شعریٰ کی روشنی کا دس ہزارواں حصہ روشنی دیتا ہے۔ ممکن ہو کہ اسی کی طرح اور بھی سیارے ہوں۔ شعرائے یمانی کا طلوع نومبر میں ہوتا ہو اور مارچ یا شروع اپریل میں بالکل غروب ہوجاتا ہے۔ نہایت روشن چمکدار ستارہ ہے۔ اس

[کی] النجوم میں چار ستارے ایسے ہیں جن کا وزن مجموعی آفتاب سے نو سو چالیس گنا زیادہ ہے۔
[کل]ب اصغر | یہ جنوبی مجمع النجوم ہے اور کلب اکبر کے شمال قدرے مشرق میں واقع ہے اس
[مج]مع النجوم کا قدر اول کا ستارہ شعرائے شامی کہلاتا ہے۔ بلحاظ نور آٹھواں شمار کیا جاتا ہے۔ عرب میں
اس کا مطلع عرب بجانب شام ہے۔ اس لئے شامی مشہور ہے۔ تقریباً دس سال میں اس کی روشنی
زمین تک پہنچتی ہے۔ زمین سے پانچ نیل چھیاسی کھرب چھپن [ار]ب چھیانوے کروڑ میل ہے یہ بھی
مثل شعرائے یمانی کے ہم سے روز بروز قریب ہوتا جا رہا ہے چنانچہ اس کی رفتار ڈھائی میل فی
ثانیہ ہے۔ اس کے بھی ایک سیارے کی پیشین گوئی کی گئی ہے [مگر] ہنوز [ان]کشاف نہیں ہوا شعرائے
شامی کا طلوع نومبر میں ہوتا اور غروب مارچ [میں ہوتا ہے]

ثور | منطقۃ البروج میں ہے اور دوسرا برج ہے

ثریا۔ دوم فردو۔ ثریا کو خوشہ پروین بھی کہتے ہیں
نہایت خوشنما اور مشہور مجمع النجوم ہے۔ اس کا [بڑا ستارہ]
وسط الثریا کہلاتا ہے۔ یہ تیسری قدر کا ہے۔ رنگ سبزی مائل ہے۔ اگر دوربین سے دیکھیں تو
بہت سے ستارے نظر آتے ہیں۔ خالی آنکھ سے دس تک گن سکتے ہیں۔ ثریا منازل قمر میں سے
ہے اور چاند کی تیسری منزل ہے۔

دوسرا نسق فردو ہے۔ اس کی شکل بالکل وی (V) سے مشابہ ہے۔ اس
مجمع کا روشن قدر اول کا ستارہ الدبران کہلاتا ہے۔ چونکہ یہ ثور مذکور کی آنکھ پر واقع ہے۔
اس لئے اسے عین الثور بھی کہتے ہیں۔ دو ہزار چالیس میل فی منٹ ہم سے دور ہو رہا ہے۔ زمین
سے چھبیس نیل اڑتالیس کھرب چھپن ارب تیئیس کروڑ میل ہے۔ الدبران چاند کی چوتھی منزل ہے
عرب اس کو منحوس خیال کرتے تھے۔ قبیلۂ بنی تمیم دبران کی پرستش کیا کرتا تھا۔
شروع اکتوبر میں طلوع اور آخر مارچ میں غروب ہوتا ہے۔

الجبار | جنوبی مجمع النجوم ہے۔ نہایت روشن ستاروں سے مزین ہے۔ اس کے سات روشن ستارے شمالی آنکھ سے جگ مگ جگ مگ کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ خط معدل النہار پر واقع ہے۔ اس لئے شمالی و جنوبی دونوں نیم کروں کے لوگ اسے خوب پہچانتے ہیں۔

اس مجمع النجوم میں دو قدر اول کے ستارے ہیں۔ پہلا ابط الجوزا اور دوسرا رجل الجوزا کہلاتا ہے۔ ابط الجوزا بلحاظ نور نواں ستارہ مانا جاتا ہے اور زمین سے اٹھاون نیل چھپن کھرب اٹھتر ارب ساٹھ کروڑ میل ہے۔ اور رجل الجوزا زمین سے دو پدم ترپن نیل پچانوے کھرب بہتر ارب بیس کروڑ میل ہے۔ اور یہ سہیل کے بعد قدر اول کے تمام ستاروں سے زیادہ مسافت رکھتا ہے۔ جبار کا سر تین ستاروں سے بنتا ہے۔ وہ منازل قمر میں سے ہیں اور چاند کی پانچویں منزل مانے جاتے ہیں۔ جبار کا طلوع اکتوبر میں اور غروب شروع اپریل میں ہوتا ہے۔

جوزا یا توامین | یہ تیسرا برج ہے۔ اس کی برج کی ہیئت ایسے دو آدمیوں سے مشابہ ہے جو توام ہوں۔ اسی وجہ سے اس کو توامین کہتے ہیں۔ اس میں بھی مثل جبار کے دو قدر اول کے ستارے ہیں پہلے کا نام مقدم التوامین یا الف توامین ہے۔ اور دوسرے کا نام موخر التوامین یا ب توامین ہے۔ مگر مقدم التوامین بہ نسبت موخر التوامین کے مدہم ہے۔ یہ دن بدن ہم سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اور موخر التوامین روز بروز نزدیک آ رہا ہے۔ یہی وجہ مقدم کے موخر ہونے کی ہے۔ چنانچہ مقدم التوامین کا فاصلہ زمین سے ارسٹھ نیل چار کھرب بیس ارب تہتر کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہے اور موخر کا فاصلہ انیس نیل اکاسی کھرب پچاس ارب انچاس کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہے۔ اس مجمع میں توام ثانی کے پستان پر ایک ستارہ ہے جسے الہنعہ کہتے ہیں۔ یہ چاند کی چھٹی منزل ہے۔ وہ تین ستارے جوزا کے سر پر واقع ہیں جنھیں عرب الذراع المبسوط کہتے ہیں۔ یہ چاند کی ساتویں منزل مانے جاتے ہیں۔ برج جوزا کا طلوع اواخر اکتوبر میں ہوتا ہے، اور غروب اواخر اپریل میں۔

اسد | پانچواں برج ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کا نام قلب الاسد ہے۔ اس کی روشنی زمین تک ایک سو پچاس برس میں پہنچتی ہے۔ یہ زمین سے ستاسی نیل اٹھانوے کھرب چون ارب چالیس کروڑ میل ہے۔ ہمارے آفتاب سے ہزار گنا ضخیم و روشن ہوگا۔

برج اسد میں الجبہہ ایک شمسی ستارہ ہے۔ یہ چاند کی دسویں منزل مانا جاتا ہے۔ مگر مسلمان ہیئت داں الجبہہ سے مراد اسد کی پیشانی کے تین چار ستارے لیتے ہیں۔ الجبہہ کو ہندو نجومی منحوس خیال کرتے ہیں۔

ذنب الاسد | اس کو زبرہ بھی کہتے ہیں اور یہ چاند کی گیارھویں منزل ہے۔ اسد میں ایک ستارہ قدر دوم کا ہے۔ اسے صرفہ کہتے ہیں
۔ کا خیال تھا کہ جب صرفہ طلوع ہوتا ہے تو گرمی
تو سردی۔ چونکہ اسد نہایت وسیع برج ہے
اسد کا طلوع شروع دسمبر میں اور غروب آخر [illegible]

عوا | یہ شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدر اول کے روشن ستارے کو سماک رامح یا حارس شمالی کہتے ہیں۔ بلحاظ نور چھٹا ہے اور سوا تین میل فی منٹ کی رفتار سے برج سنبلہ کی طرف جا رہا ہے۔ زمین سے اناسی نیل اٹھارہ کھرب۔ اڑسٹھ ارب چھیانوے کروڑ میل ہے۔ ہمارے آفتاب سے لحاظ نور و جسامت ہزار گنا سے بھی زیادہ ہوگا۔ اس مجمع النجوم میں پانچ ستارے جن کی شکل ایل (L) کی سی ہے۔ چاند کی تیرھویں منزل شمار کئے جاتے ہیں۔ عوا کا طلوع شروع فروری اور غروب وسط ستمبر تک ہوتا ہے۔

عذرا یا سنبلہ | منطقۃ البروج میں سے ہے اور چھٹا برج ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کو سماک المنزل کہتے ہیں۔ یہ السماک اور ساق اور سر بھی کہلاتا ہے۔ یہ بلحاظ نور سولھواں ستارہ ہے۔ اور چاند کی چودھویں منزل ہے۔ ہمارے آفتاب سے ہزار گنا ضخیم اور روشن ہوگا۔

برج سنبلہ کی ہیئت ایک ایسی لڑکی سے مشابہ ہے جس کا دامن لٹکا ہوا ہے۔ الٹا ہاتھ نیچے کی طرف اور سیدھا ہاتھ کندھے کی طرف اٹھا ہوا ہے۔ ہاتھ میں گیہوں کی بال ہے۔ یہی سنبلہ کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس کا طلوع شروع فروری اور غروب اگست تک ہوتا ہے۔

عقرب آٹھواں برج ہے جسے لوگ نحس جانتے ہیں۔ اس کے قدر اول کے تارے کو قلب العقرب کہتے ہیں۔ یہ سرخ رنگ ستارہ مریخ سے مشابہ ہے۔ بتدی اس پر مریخ کا گمان کرتے ہیں۔ برج عقرب میں چاند کی تین منزلیں ہیں۔ اس کا سر جسے اکلیل کہتے ہیں۔ چاند کی سترھویں منزل ہے۔ قلب اٹھارھویں اور دم کے دو تین ستارے انیسویں منزل شمار ہوتے ہیں۔ اس کا طلوع اپریل میں اور غروب اگست دسمبر تک ہوجاتا ہے۔

اب ہم اکتوبر میں دس گیارہ بجے نظر آنے والے صرف قدر اول کے ستاروں کا ایک نقشہ پیش کرتے۔ امید ہے کہ اس سے یہ چند ستارے بہ آسانی پہچانے جاسکیں گے۔ اختر شناسی کے لئے ہمیں سب سے زیادہ موزوں قطب تارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ہمیں ساکن نظر آتا ہے اور باقی ستاروں کے مقامات بدلتے معلوم ہوتے ہیں۔ لہذا ہم اس کو مرکز قرار دیتے ہیں تاکہ آسانی

اکتوبر میں قدر اول کے ستارے[1]
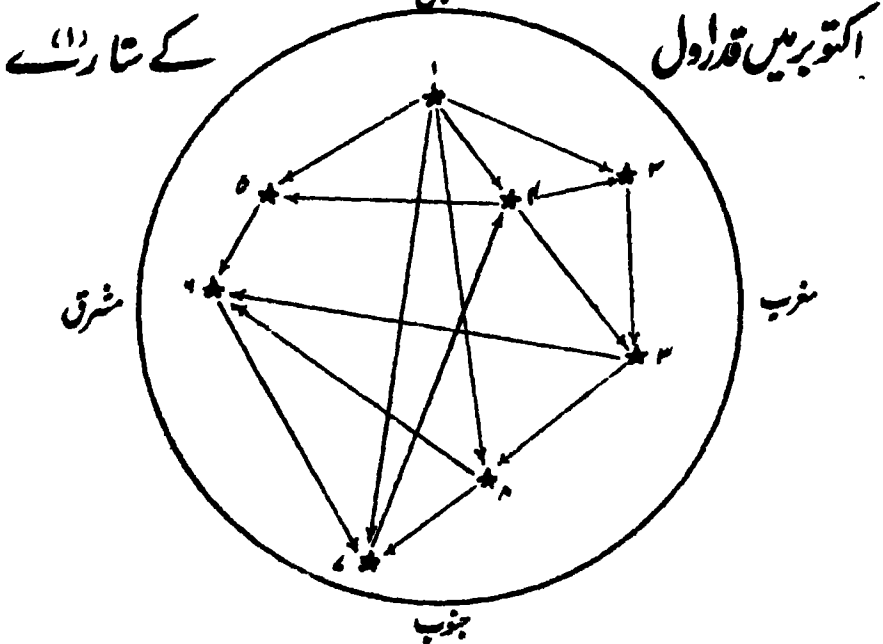
(۱) قطب تارا

(۲) نسر واقع

(۳) نسر طائر

(۴) ذنب الدجاجہ

(۵) عیوق

(۶) الدبران

(۷) آخر النہر

(۸) فم الحوت

ہم بخوف طوالت مضمون ختم کرتے ہیں

بیان نہیں ہوا ۔ ربنا ما خلقت ہذا باطلا ۔

نوٹ صفحہ ۴۶) ارض البلد کی کمی بیشی کے لحاظ سے اگر ہمارے نقشہ میں کچھ اختلاف واقع ہو تو اس کو اپنے ذوق تحقیق سے صحیح کر لینا چاہیئے ؛

تدوین علوم

"حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے اپنے بعض شاگردوں کے کہنے سے علوم کی تالیف اور ان کی موجودہ شکل کے متعلق ایک مختصر سا رسالہ "السر المکتوم" کے نام سے تصنیف فرمایا تھا۔ اس رسالے میں علوم کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے۔ عربیہ۔ شرعیہ۔ فلسفیہ۔ محاضریہ۔ یہ رسالہ اگرچہ بہت مختصر ہے۔ مگر پوری جامعیت کے ساتھ تمام جزئیات کو حاوی ہے۔ اس رسالہ کا پہلے بھی ترجمہ ہو چکا ہے جس کا بالاستیعاب تو میں نے مطالعہ نہیں کیا مگر کہیں کہیں سے دیکھا ضرور ہے۔ لیکن خود میں نے ترجمے کے وقت اسے پیش نظر نہیں رکھا بلکہ اپنے طور پر حتی الامکان بہت آسان الفاظ اور ترکیبوں کے ساتھ نیز ہر مفہوم کو الگ الگ پیراگراف میں ترتیب دیا ہے۔ اور آخر میں تمام علوم کی فہرست اجمالی طور پر اپنی طرف سے بڑھا دی ہے۔"

علوم عربیہ | علوم عربیہ کو اس لئے مرتب کیا گیا کہ ان کے ذریعے سے کلام عرب کو سمجھا جائے۔ کلام عرب کی چند حالتیں ہیں، یا تو مفردات سے بحث کی جائے گی۔ اس کی چند صورتیں ہیں۔

(۱) مفرد سے بحث کی جائے اس کے معنی کے لحاظ سے اسے علم اللغۃ کہتے ہیں۔

(۲) مفرد سے بحث کی جائے اس طور پر کہ لفظ کس طریقہ سے ادا کیا جائے اسے علم المخارج کہتے ہیں۔

(۳) مفرد سے بحث کی جائے اس لحاظ سے کہ وہ کس ہیئت اور شکل پر ہے اسے علم الصرف کہتے ہیں۔

(۴) مفرد سے بحث کی جائے اس حیثیت سے کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ کیا نسبت ہے یعنی کون اصل ہے اور کون فرع اسے علم الاشتقاق کہتے ہیں یا مرکبات سے بحث کی جائے گی اس کی بھی چند صورتیں ہیں۔

۱۔ مرکب سے بحث کی جائے اس حیثیت سے کہ کلموں کی آخر کی حالت ترکیب کے وقت ہونا چاہئے۔ اسے علم الاعراب کہتے ہیں۔
۲۔ مرکب سے اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ کلموں کو آپس میں کس طور پر مرکب ہونا چاہئے۔ اسے علم التالیف کہتے ہیں۔
۳۔ مرکب سے بحث کی جائے کلام کی خوبی اور عمدگی کے لحاظ سے تو اسے علم البدیع کہتے ہیں۔
یا اشعار کے حالات سے بحث کی جائے گی اس کی بھی چند صورتیں ہیں۔
۱۔ حالت شعر سے بحث کی جائے باعتبار وزن شعر کے تو اسے علم عروض کہتے ہیں۔
۲۔ حالت شعر سے بحث کی جائے شعر کے آخر ...

ہیں۔

اسی کے ساتھ وہ علوم بھی شامل ہیں جن میں
بحث کی جائے اسے علم الخط کہتے ہیں۔

آنحضرت صلعم سے پہلے یہ علوم ترقی یافتہ صورت میں نہ تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے نقوشِ کتابت کی تشکیل کی ابوالاسود تھا۔ اس نے اشعار اور ان کے علاوہ دوسری کتابوں پر زیر زبر اور پیش کی علامتیں بنائیں۔

پھر خلیل ابن احمد نے لغت میں کتاب العین تصنیف کی اور عروض وقافیہ کو مکمل صورت میں بنایا اس کے بعد سیبویہ کا زمانہ آیا اس نے اپنی مشہور کتاب علم نحو میں لکھی اسی کے ساتھ اس نے علم مخارج۔ صرف۔ علم التالیف، اور تھوڑا سا معانی کا حصہ شامل کر دیا۔ کچھ دنوں بادشاہوں کے مصاحبوں اور دوسرے ادیبوں نے قصوں اور فصیح وبلیغ شعرا کے کلام کی باریکیوں کو ایک جا اکٹھا کرنا شروع کر دیا اور یہی چیزیں علوم معانی۔ بیان اور بدیع کے استنباط کا سبب بنیں۔

علوم شرعیہ | وہ علوم جن کے ذریعے سے ایسی باتیں معلوم ہوں جنھیں آنحضرت صلعم نے خدا کی طرف سے لوگوں تک پہنچایا۔ ایسی باتوں کا سرچشمہ کتاب (قرآن) اور سنت (حدیث) ہے یا جو کچھ قرآن

وحدیث سے عقل کے ذریعے حاصل کیا گیا ہو۔ علما نے علوم شرعیہ کو چار پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) فقہ جس میں عبادات لین دین۔ میراث۔ گھر کا انتظام۔ ملکی انتظام اور آداب زندگی کا ذکر ہوتا تھا۔

(۲) تفسیر جس میں قرآن کے نادر الفاظ کی شرح۔ اسباب نزول۔ تعارض کا حل مشکل کی توجیہ، ناسخ ومنسوخ کا بیان وغیرہ وغیرہ۔

(۳) سیر۔ جس میں رسول مقبول کی عادات شریفہ۔ آمد ورفت، جنگوں اور شواہد وغیرہ کا بیان۔

(۴) رقائق۔ جس میں رقت آمیز وعظ۔ دعائیں جنت دوزخ کا ذکر۔ عمل کی فضیلت صحابۂ کرام کے اوصاف اور پرہیزگاری کا ذکر ہو۔

ان علوم کے حاصل کرنے والے علما کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے۔

(۱) بعض ایسے علما تھے جنھوں نے ایک ہی فن میں مہارت پیدا کی۔

(۲) بعضوں نے دو میں۔

(۳) اور بعضوں نے تمام فنون میں۔

ضحاک بن مزاحم نے تفسیر، امام ابوحنیفہ۔ مالک اور شافعی نے فقہ۔ ابن اسحاق اور واقدی نے غزوات (جنگ نامے)، واعظوں اور صوفیوں نے رقت آمیز مواعظ تصنیف کئے۔ ابن عباس رضؓ بہت سے علموں کے جامع تھے۔

صحابۂ کرام میں عبداللہ بن عباس رضؓ امام تفسیر۔ عمرؓ۔ علیؓ۔ ابن مسعودؓ۔ ابن عباسؓ امام فقہ تھے۔ اس زمانے کے بعد اور علما نے ان علوم پر غور وفکر کی نظر ڈالی لیکن ان کے پیش نظر صرف دو ہی چیزیں تھیں۔ قرآن اور حدیث۔ لہٰذا انھوں نے قرأت قرآن کے مختلف طریقوں پر کتابیں تصنیف کیں (جسے علم قرأت سبعہ۔ عشرہ وغیرہ کہتے ہیں)، ان میں سات یا اس سے زائد مذہب پیدا ہوگئے۔ چند مذاہب تو روایتہً حاصل کئے گئے اور بعض کا علم کلام عرب اور علم المخارج کے ذریعے سے ہوا۔ مصحف عثمانی کو سامنے رکھ کر انھوں نے قرآن کا رسم الخط ایجاد کیا۔

پہلے پہل ان علما نے بلا داو غیرہ سے احادیث کی جمع وترتیب کا کام شروع کر دیا پھر ان کی
[illegible] نے دوسرے فنوں کی طرح ڈالی ۔ (دوسرے فنون یہ ہیں)
(۱) وہ جو حدیث صحیح کو سقیم سے ۔ مشہور کو غیر مشہور سے ۔ معلول کو اس کے غیر سے ممتاز کر دے
جیسے بخاری ۔ مسلم ۔ مستدرک حاکم ۔ مسند احمد ۔ ترمذی ۔ ابوداؤد ۔ نسائی اور دارقطنی ۔
(۲) وہ جو حدیثوں کو فقہ اور اس کے ابواب پر تقسیم کر دے ۔ جیسے کتب شافعی ۔ ابن ماجہ
بیہقی ۔ شرح سنہ وغیرہ ۔
(۳) وہ جو حدیثوں کی تقسیم صحابہ کے لحاظ سے کرے اور یہ کتب مسانید کہلاتی ہیں جیسے مسند
ابی یعلی ۔ مسند بزار وغیرہ ۔
(۴) ایک فن اسماء الرجال کا ہے ۔ (راویان
ضعیف و عادل کی بحث اور حدیث کے نادر الفاظ)
(۵) کتب احادیث کی ترتیب دوسری کتابوں
(۶) کتب صحاح کے نمونے پر جیسے صحیح ابی عوانہ اور اسمٰعیلی ۔
(۷) مشکل حدیثوں کی یادداشت ۔ دو مختلف حدیثوں میں تطبیق ۔ اور اصول حدیث کا بیان ۔
(۸) متن حدیث کی شرح جیسے ابن حجر کی شرح بخاری پر ۔ نووی کی مسلم پر اور اس کے علاوہ
بہت سی شروح جو حد شمار سے باہر ہیں ۔
(شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ " خدا کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے اسرار حدیث کی
مجمل اور مفصل طور پر بیان کرنے کی توفیق عنایت کی ۔ میں نے ان اسرار کو اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ
میں جمع کر دیا ہے)
پھر یہ علما مذکورہ چاروں علموں کی طرف متوجہ ہوئے ۔ خاص طور پر تفسیر کی طرف زیادہ توجہ
کی اور ہر فن کے عالم نے تفسیر لکھی لیکن اس طرح پر کہ نحوی نے نحو کو ۔ لغوی نے لغت کو ۔ مؤرخ
نے مناسب قصوں کو ۔ قاری نے قرأت کو فقیہ نے فقہ کو ۔ معانی جاننے والے نے معانی کو ۔

کلام جاننے والے نے کلام کو۔ اور صوفی نے تصوف کو زیادہ دخل دیا۔ اس وجہ سے تصانیف کی کثرت ہو گئی اور ہر جگہ پھیل گئیں

اس کے بعد ان تمام فنون کو علما نے ایک جا جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ رازی، بیضاوی اور نیشاپوری نے ایسا ہی کیا۔

علم فقہ میں غور و فکر نے انھیں اس نتیجے پہ پہنچایا کہ اصول فقہ اور علم جدل یا معرفۃ خلاف کو مستقل علم کی صورت دے دی۔ لیکن ہونے والے واقعات چونکہ کسی خاص حد پہ پہنچ کر رک نہیں جاتے اس لئے متقدمین کی تصانیف کافی نہ ہو سکیں۔ لہذا نصوص کے ذریعے استنباط کیا فتاویٰ اور واقعات جمع کئے۔ پھر اقوال و اسباب کی باہمی ترجیح و اولیت کو پیش نظر رکھا۔ پھر علم المذاہب کی تحریر اور حکایت اقوال و اسباب کے یقینی ہونے کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر ہر فرقہ کی تائید میں عقلیات و نقلیات کے پیش نظر تصنیفات کیں۔

وہ مذاہب جن میں تخریج و ترجیح کو بکثرت استعمال کیا گیا تھا چار تھے۔

(۱) لوگوں کے دلوں کو پاکیزہ بنانے کے لئے دو طریقے اختیار کئے۔

(الف) وعظ و نصیحت اور رقت آمیز قصوں کو کتابی صورت میں مرتب کیا۔ منبروں پر بیٹھ کر پر اثر وعظ کہنا شروع کیا۔

(ب) آخرت کو درست کرنے کے لئے چند قواعد کی بنا ڈالی اور انھیں (عام کتابوں کی طرح) فصلوں اور بابوں کی شکل میں مرتب کیا۔ جیسے احیاء العلوم (غزالی) صحابۂ کرام تابعینؒ علما اور صوفیا کی تاریخ کی طرف توجہ کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے یا تو ہر ایک شیخ کی سیرت اور اس کے اقوال کو الگ الگ لکھا۔ ایسی کتابوں کو مقامات اور ملفوظات کہتے ہیں۔ یا سب کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ جیسے مشائخ چشتیہ۔ علما احناف یا ایک زمانہ اور ملک کے لوگوں کے حالات لکھے گئے ایسی کتابوں کو طبقات کہتے ہیں۔ اس میں کچھ تو تاریخ اور کچھ حصہ اسماء الرجال کا شامل کر دیا گیا۔ اس خاکسار (شاہ صاحب) نے بھی اپنے محترم باپ۔ چچا اور بعض اور اہل حرمین کے چند حالات

نے اپنی کتاب انفاس العارفین میں جمع کیا ہے۔

(۲) بعض لوگوں نے اوراد وظائف میں۔

(۳) بعض نے حالات وکیفیات میں۔

(۴) بعض نے صوفیا کرام کے رموز (جو تغیر حالات کی صورت میں ہوتے ہیں) کے بیان میں کتابیں لکھیں۔

پھر خود صوفیا کرام ہی کے طریقت میں مختلف گروہ ہو گئے۔ اور ہر مسلک پر رسائل لکھے گئے۔

(الف) بعض نے آنحضرت صلعم پر درود شریف پڑھنے کی [illegible] تصنیف کیں جیسے دلائل الخیرات۔

(ب) بعض نے حزب اور مناجات [illegible]

جب مذہبی تشتت وانتشار ہوا۔ [illegible] تک پہنچا۔ یہ مباحثہ معتزلہ، شیعہ۔ فلاسفہ اور اہل کتاب سب ہی کے درمیان [illegible] تھا۔ ان مباحثوں کی ضرورت کبھی نصرت دین کے خیال سے بھی ہوتی تھی۔ اس کے لئے باقاعدہ سوسائٹیاں قائم ہوئیں۔ لیکن (چونکہ یہ کوئی معمولی کام نہ تھا اس لئے) قطعی اصول وفروع خوش بیانی اور خوش فکری کی بھی ضرورت تھی۔ اور اس کمال کا بغیر تعلیم وتعلم حاصل ہونا بظاہر ناممکن ہی سا ہے۔ لہذا علم کلام (اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے) مرتب کیا گیا۔

علم کلام کی ایجاد کی طرف سب سے پہلے معتزلہ نے توجہ کی۔ اس طرح پر کہ فلسفہ سے حدود رسم۔ قیاس ومقولات عشر اور الٰہیات سے امور عامہ کی بحثوں کو لے لیا اور اس کے ساتھ صفات۔ نبوت اور معاد کی شرعی بحثوں کو شامل کر دیا۔ پس فلاسفہ کے وہ اصول جو شرعی قواعد کے خلاف نہ تھے انھیں باقی رکھا۔ اور جو ایسے نہ تھے انھیں نکال کر دوسرے اصول ان کی جگہ قائم کر دئے۔ علم کلام کو فلسفہ سے مستنبط کرنے کے یہی معنی ہیں۔

اہل سنت والجماعت میں سب سے پہلے جس شخص نے علم کلام کے بارے میں غور کیا وہ ابوالحسن اشعریؒ ہیں۔ مذہب اعتزال سے آپ کے رجوع کرنے کا قصہ مشہور ہے۔ نیز آپ جانتے تھے کہ اصول کس طرح بنائے جاتے ہیں اور پھر ان سے فروعات کس طرح اخذ کی جاتی ہیں۔ آپ اسی طریقے پر چلتے رہے۔

پھر ابونصر اور ابوعلی وغیرہ نے ان اصولوں کی جو اسلام کے مخالف تھے تاویل کر کے اسلامی قواعد کی صورت میں فلسفہ سے مطابقت دی۔ اس لئے مسلمانوں کو ان کے کلام کی نقل و تردید کی ضرورت ہوئی۔ علم کلام اسی طرح بڑھتا گیا۔ اس کی وسعت روزافزوں تھی۔ لیکن متکلمین کا قلبی تذبذب دور نہیں ہوا۔ وہ اسی کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے۔ نوبت بایں جا رسید کہ وہ علم کلام "حق صریح" سمجھنے لگے۔

جب اصحاب حدیث نے یہ دیکھا تو اہل سنت کے عقیدے کے موافق بہت سے رسائل لکھے اور ان میں صرف وہی حدیثیں لیں جن سے یہی مسائل استنباط ہوتے ہوں۔

صوفیائے کرام نے ابتداءً انھیں رموز و اشارات کی طرف توجہ کی جن کو حالات سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر حالات سے معارف کی طرف پیش قدمی ابن عربی اور آپ کے شاگرد صدرالدین (رحمہما اللہ) نے کی۔ اور اس وقت سے اس علم کی بہت سی شاخیں ہوگئیں جن کا تعلق علوم اشراقیہ سے ہے۔ اس لئے مثال۔ ناسوت اور لاہوت وغیرہ کا استعمال ان کی اصطلاح میں بہ کثرت ہوتا ہے۔ (شاہ صاحب فرماتے ہیں) کہ صوفیائے کرام کے نزدیک جس شخص نے سب سے پہلے لوح۔ قلم۔ امر اور خلق کا ان مذکورہ معانی پر اطلاق کیا ہے وہ فارابی ہے۔

پھر ان کے تبعین نے حسب ضرورت ہر باب کی طرف توجہ کی۔ باہم مناظرے بھی ہوئے

یہاں تک علوم شرعیہ کی تقسیم کا ذکر ہے

علوم حکمت | علوم حکمیہ کی حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی اولاد جب زمین پر پھیلی اور متفرق گروہ ہو کر جدا جدا مقامات کو اپنا وطن بنایا۔ ہر خطہ میں ایک جماعت آباد ہوئی۔ وہاں تجربہ

اور ان باتوں کی شناسائی کے اعتبار سے جن کا تعلق شہری اور خانگی انتظامات سے ہو اور ان کو بھی جن کا تعلق شائستگی نفس سے ہے نیز اُن نکات کو جن کا تعلق طب۔ ادویہ اور بیماریوں سے ہو اور ان کو بھی جو نجوم۔ کہانت۔ قیافہ اور حساب سے متعلق ہیں۔ نیز وہ نکات بھی جو جسمانی اور نفسی ریاضتوں کے سلسلے میں آتے ہیں۔

ان لوگوں میں جو صنعتیں بھی موجود تھیں، وہ اجتماعی طور پر پائی جاتی تھیں۔ اسی لئے اگلے اور پچھلے گروہوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کا ان فنون کی طرف میلان نہ ہو بلکہ جن افراد نے حکومت کی شکل اختیار کر لی اور وہاں ان علوم کے حاصل کرنے کا رواج بھی پڑ گیا۔ تو پھر ان علوم میں اُن کو اوروں سے زیادہ مہارت ہو جاتی تھی۔

فریدوں کے زمانے سے لے کر آنحضرت علیہ

جاتی تھی اور وہاں کے حکما تمام باتوں سے زیادہ

اندر رکھتے تھے۔

اس امر پر اتفاق ہے کہ اسکندر سے تقریباً تین سو سال پہلے یونان میں بڑے بڑے حمد اور تحصیل علم کی خاطر بڑے صابر اور اس کے دلدادہ تھے۔ ان علوم میں خوب خوب داد فکر دی۔ آخر علم طب کے ذریعے انھیں معدنی۔ نباتاتی اور حیوانی اشیاء۔ ان کے خواص اور ان کے افعال طبعی کا علم ہوا نیز اس علم نے ان کو اس طرف بھی متوجہ کیا کہ موالید ثلاثہ کے معجون مرکب جسم میں غذائیت اور نمو کے لحاظ سے طبیعت کیا کیا تصرفات کرتی ہے پھر انھوں نے فضائی اور سماوی اشیاء وغیرہ کی تفتیش کی۔ آخر انھوں نے ان تحقیقات سے چند نکتے اور حکایتیں حاصل کر لیں جنھیں سمجھدار لوگوں نے محفوظ کر لیا اور پھر رسالوں کی شکل دے دی۔ علم نجوم نے انھیں سیارات کی تحقیق کی طرف متوجہ کیا اور چونکہ بغیر حسابی قاعدوں کے جانے اس کا یاد کرنا مشکل تھا۔ لہذا ان قواعد کو ترتیب دیا گیا تاکہ تحصیل علم نجوم کے لئے وسیلہ بن سکیں سلسلہ تحقیق جاری رہا تاآنکہ ہیئت۔ ہندسہ اور حساب کا بھی فنون میں شمار ہونے لگا۔ مزید برآں ریاضت و عبادت نے جو انبیاء سابقین

ل ہوئی تھی ثمرات نفس کے معلوم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ تدریجاً اس ادراک نے نوک
معرفت تک پہنچایا۔ پھر ان حقائق کی لوگوں کو خبر دی نیز رسائل تصنیف کئے جن کا ذکر
و چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی دلچسپیاں بڑھ گئیں۔ بحث و مباحثہ شروع ہو گئے
ب کہ فن مناظرہ کے تمام حربوں کو استعمال کرنا پڑا۔
ارسطو جو کہ بہت ہی صائب الرائے متین سنجیدہ اور جنگ وجدل سے متنفر تھا۔
ں کا زمانہ آیا تو اس نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ مباحث حد و برہان کی تشریح کر دی
۔ نیز شعر وجدل اور برہان کا باہمی فرق بتلا دیا جائے۔ آخر اس نے قواعد کی وہ ترتیب
ہے عقل بلاچون وچرا تسلیم کرے۔ اس کا یہ طریق عمل خلیل نحوی سے ملتا جلتا تھا جس نے
کو ایجاد کیا تھا۔
ارسطو نے کیا یہ کہ مذکورہ تینوں علموں کو علم طبعی سے الگ کر دیا۔ اور اس میں کچھ اور
ر کے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دی۔
اس نے اشراقیوں کے کلام کو دیکھا جو مناقضہ۔ تعقید اور اضطراب سے مملو تھا۔ دیکھتے
صاف معلوم ہو جاتا تھا کہ حد و برہان کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ تو اس نے ایک بہت
مختصر بات کہہ ڈالی جس نے ترددات کا خاتمہ کر دیا۔ اگر اسکندر نہ ہوتا تو تصانیف کی
، نہ ہوتی اور نہ لوگوں ہی کو اس طرف توجہ کا شوق ہوتا۔
بطلیموس علم ہیئت و نجوم کا بڑا ماہر تھا ان علوم میں اس کی تصنیفات بہترین ہیں۔
دس نے اپنے زمانے کے ایک بادشاہ کے لئے اصول ہندسہ میں ایک کتاب لکھی۔
ب کا ماہر تھا اس نے اسی فن میں بہت کچھ لکھا۔ جالینوس نے اس کی تشریح کی اور
، حد و تک پہنچا دیا۔
دورِ جاہلیت اس حالت میں ختم ہوا کہ ان کے پاس یہ کتابیں اور رسائل تھے اور مصنفین
ت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ وہ ان کی تحصیل میں مشغول تھے۔ اور ان کے مباحث

میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔

موسیقی کے متعلق یہ خیال ہے کہ صناعات کے زمرے میں داخل ہے علوم میں نہیں۔ ہاں ایک جماعت نے جب دیکھا کہ مسائل کے منتشر ہونے کے باعث موسیقی کی تحصیل دشوار ہے تو انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک رسالے میں ان قواعد کو جمع کر دیا جائے۔ [illegible] اس فن میں کتابیں اور رسالے تصنیف کیے گئے۔

اس کے بعد حکما میں اس بات پر بحث

نغموں سے سرور حاصل ہوتا ہے اور بعضوں سے

متعلق گفتگو ہونے لگی۔ چونکہ اس قسم کی بحث کو

علوم حکمیہ میں داخل کر دیا جائے۔ جب اسلام کا دور آیا اور یونان سے [illegible] عربی میں منتقل کیا تو مسلمانوں نے اس کے انتشار و پراگندگی پر غور کیا جب ابوعلی کا زمانہ آیا تو اس نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اور بعض باتوں پر دونوں کا از خود اجتماع ہو گیا۔ لیکن بعض باتوں میں شارع علیہ السلام کی مصلحتوں پر آگاہی نہ ہوئی۔ نہ سلسلۂ کلام کے مقصد پر۔ آخر اپنے اپنے طریقے پر جو سمجھ میں آیا بیان کرنا شروع کر دیا۔ ابوعلی نے کتاب الشفا میں ان علوم کی ترتیب و تالیف بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی۔ نیز حکمت نظری کو چار پر تقسیم کیا۔

(۱) منطق۔ اس میں نو ابحاث رکھیں۔

کلیات خمس۔ مقولات عشر۔ قضایا۔ قیاس۔ مباحث حد و برہان۔ خطابت۔ جدل۔ شعر اور مغالطہ۔

(۲) طبیعات۔ اس میں آٹھ ابحاث رکھیں۔

سماع الطبعی۔ کون و فساد۔ کائنات جو معادن۔ نباتات۔ حیوانات اور نفس۔

(۳) ریاضیات۔ اس میں چار بحثیں۔

ہیئت۔ حساب۔ ہندسہ اور موسیقی۔

سے حاصل ہوئی تھی ثمرات نفس کے معلوم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ تدریجاً اس ادراک نے ترک دنیا اور معرفت تک پہنچایا۔ پھر ان حقائق کی لوگوں کو خبر دی نیز رسائل تصنیف کئے جن کا ذکر گذشتہ ہو چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی دلچسپیاں بڑھ گئیں۔ بحث و مباحثہ شروع ہو گئے یہاں تک کہ فن مناظرہ کے تمام حربوں کو استعمال کرنا پڑا۔

ارسطو جو کہ بہت ہی صائب الرائے، متین، سنجیدہ اور جنگ و جدل سے متنفر تھا۔ جب اس کا زمانہ آیا تو اس نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ مباحث حد و برہان کی تشریح کر دی جائے۔ نیز شر و جدل اور برہان کا باہمی فرق بتلا دیا جائے۔ آخر اس نے قواعد کی وہ ترتیب رکھی جسے عقل بلاچون وچرا تسلیم کرے۔ اس کا یہ طریق عمل خلیل نحوی سے ملتا جلتا تھا جس نے عروض کو ایجاد کیا تھا۔

ارسطو نے کیا یہ کہ مذکورہ تینوں علموں کو علم طبعی سے الگ کر دیا۔ اور اس میں کچھ اور اضافہ کر کے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دی۔

اس نے اشراقیوں کے کلام کو دیکھا جو مناقضہ، تعقید اور اضطراب سے مملو تھا۔ دیکھنے والے کو صاف معلوم ہو جاتا تھا کہ حد و برہان کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ تو اس نے ایک بہت کھلی اور مختصر بات کہہ ڈالی جس نے ترددات کا خاتمہ کر دیا۔ اگر اسکندر نہ ہوتا تو تصانیف کی یہ کثرت نہ ہوتی اور نہ لوگوں ہی کو اس طرف توجہ کا شوق ہوتا۔

بطلیموس علم ہیئت و نجوم کا بڑا ماہر تھا ان علوم میں اس کی تصنیفات بہترین ہیں۔
اقلیدس نے اپنے زمانے کے ایک بادشاہ کے لئے اصول ہندسہ میں ایک کتاب لکھی۔
بقراط طب کا ماہر تھا اس نے اسی فن میں بہت کچھ لکھا۔ جالینوس نے اس کی تشریح کی اور انتہائی حدود تک پہنچا دیا۔

دورِ جاہلیت اس حالت میں ختم ہوا کہ ان کے پاس یہ کتابیں اور رسائل تھے اور مصنفین کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ وہ ان کی تحصیل میں مشغول تھے۔ اور ان کے مباحث

میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔

موسیقی کے متعلق یہ خیال ہے کہ صناعات کے زمرے میں داخل ہے علوم میں نہیں۔ ہاں ایک جماعت نے جب دیکھا کہ مسائل کے منتشر ہونے کے باعث موسیقی کی تحصیل دشوار ہے تو انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک رسالے میں ان قواعد کو جمع کر دیا جائے لہٰذا اس فن میں کتابیں اور رسالے تصنیف کیے گئے۔

اس کے بعد حکما میں اس بات پر بحث
نغموں سے سرور حاصل ہوتا ہے اور بعضوں
متعلق گفتگو ہونے لگی۔ چونکہ اس قسم کی بحث کو
علوم حکمیہ میں داخل کر دیا جائے۔ جب اسلام کا دور آیا اور یمن سے فلسفہ یونان کو عربی میں منتقل کیا تو مسلمانوں نے اس کے انتشار و پراگندگی پر غور کیا جب ابو علی کا زمانہ آیا تو اس نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اور بعض باتوں پر دونوں کا از خود اجماع ہو گیا۔ لیکن بعض باتوں میں شارع علیہ السلام کی مصلحتوں پہ آگاہی نہ ہوئی۔ نہ سلسلۂ کلام کے مقصد پر۔ آخر اپنے اپنے طریقے پر جو سمجھ میں آیا بیان کرنا شروع کر دیا۔ ابو علی نے کتاب الشفا میں ان علوم کی ترتیب و تالیف بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی۔ نیز حکمت نظری کو چار پر تقسیم کیا۔

(۱) منطق۔ اس میں نو ابحاث رکھیں۔
کلیات خمس۔ مقولات عشر۔ قضایا۔ قیاس۔ مباحث حد و برہان۔ خطابت۔ جدل۔ شعر اور مغالطہ۔

(۲) طبیعات۔ اس میں آٹھ ابحاث رکھیں۔
سماع الطبیعی۔ کون و فساد۔ کائنات جو معادن۔ نباتات۔ حیوانات اور نفس۔

(۳) ریاضیات۔ اس میں چار بحثیں۔
ہیئت۔ حساب۔ ہندسہ اور موسیقی۔

(۴) الٰہیات۔ اس میں دو بحثیں۔

امور عامہ اور معرفت باری تعالیٰ و عقول۔

ختم کتاب پر اسرار شریعت کو بیان کیا جیسے جزا سزا۔ نبوت۔ عبادت۔ تدبیر منزل اور سیاست مدن۔

اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ابوعلی نے ذات باری۔ صفات اور کلام باری کے متعلق جو کچھ بحث کی ہے وہ بہت پھس پھسی ہے۔ اس لئے کہ محض ظن و تخمین سے کام لیا گیا ہے۔ طبعیات میں فلاسفہ کے کلام کا منشا عناصر و موالید میں اکثر حادثات کے اسباب کی تشریح ہوتی ہے۔ جن کا ظہور حدسی ہوتا ہے

علوم محاضریہ | ضرورتاً یا رسماً انسانوں کے لئے یا اس لئے کہ انسانوں کا ایک گروہ ان سے دلچسپی لیتا ہے۔ جو قواعد کلیہ۔ مفید صنعتیں اور دلچسپ حکایتیں مرتب کی گئی ہیں۔ ان کا نام علوم محاضریہ ہے۔ انھیں میں سے بعض میں سے بعض علوم ایسے بھی ہیں جن سے اشیاء کی پیشگی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ حوادثاتِ دنیا مثلاً فتح شکست۔ ارزانی و قحط وغیرہ کو ان کے آنے سے پہلے جاننے کے متمنی ہوتے ہیں۔ یہ علوم نجوم۔ کہانت۔ فال۔ خواب کی تعبیر۔ رمل اور جفر وغیرہ ہیں۔

کچھ ایسے علوم بھی ہیں جن سے مزاج میں اعتدال اور بیماریوں کا دفعیہ ہوتا ہے اور اور ان کی ضرورت بالکل عیاں ہے۔ مثلاً طب۔ تعویذ اور پالو جانوروں جیسے گھوڑا۔ اونٹ بکری۔ گائے۔ گدھا۔ ہاتھی اور کبوتروں کا علاج۔

انھیں میں نادر صنعتوں کا شمار ہے جیسے تیراندازی۔ خوش خطی۔ کیمیا۔ موسیقی۔ طباخی اور کیمیائی فنون حکمت بھی انھیں میں داخل ہیں۔

حکمت ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے عمدہ اخلاق۔ تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ قدیم حکما واقعی اور فرضی حکایتیں و خیالوں اور پرندوں اور درندوں کی زبانی

اسی غرض سے مرتب کرتے تھے۔ پھر ان کی کوشش ان حکایتوں سے عجیب عجیب نتیجے بہم پہنچاتی تھی۔

علوم محاضریہ میں . . . بادشاہوں کے ہونکے قصے عجیب وغریب حکایتیں۔ شہروں کے حالات۔ پہاڑوں اور درختوں کی کیفیات داخل ہیں۔

لغات کی معرفت یعنی ترکی، عربی، فارسی اور ہندی یا دوسری مختلف زبانوں کی پہچان یہ بھی علوم محاضریہ کا ایک جز ہے۔

قومی اشعار ان کا طریقہ تحریر۔

ان کی کتابوں کی روایت۔ اور ان کے

ان سب کا شمار علوم محاضریہ میں کیا گیا ہے۔

ان اوراق میں جن امور کے تذکرہ کا ہم نے ارادہ کیا تھا یہ ان کا خاتمہ ہے اول وآخر خدا ہی کے لئے تمام اوصاف لائق و زیبا ہیں۔

(فہرست ان علوم کی جن کو علمار عرب نے مرتب کیا یا ان میں اضافہ و تشریح کی۔)

علم لغت۔ علم مخارج۔ علم صرف۔ علم اشتقاق۔ علم الاعراب۔ علم تالیف۔ علم بدیع۔ علم عروض۔ علم قافیہ۔ علم خط۔ نقہ۔ تفسیر۔ سیر۔ رقائق (نصائح ومواعظ) تمیز صحیح۔ تقسیم حدیث فقہ و ترجمہ کے لحاظ سے۔ تقسیم حدیث صحابہ کے لحاظ سے۔ علم اسمار الرجال جرح و تعدیل۔ تخریج۔ کتب احادیث۔ تخریج احادیث بطرز صحاح۔ ضبط احادیث مشکلہ۔ جمع احادیث مشکلہ۔ اصول حدیث۔ شروح کتب۔ اصول فقہ۔ علم جدل۔ معرفۃ الخلاف۔ علم الترجیح۔ فتاوی۔ علم المذاہب۔ علم الکلام۔ علم اخلاق۔ تدبیر منزل۔ سیاست مدن۔ طب۔ معرفت ادویہ۔ نجوم کہانت۔ قیافہ۔ حساب۔ ہیئت۔ موسیقی۔ علم القرأت۔ علوم محاضریہ (ان کے علاوہ اور بہت سے علوم عقلیہ و نقلیہ جن کی ایجاد یا ترقی و تجدید میں عربوں کو دخل ہے)۔۴۴۔

حکیم مولوی سید سعید احمد صاحب اسعد ٹونکی مرحوم

حکیم صاحب سلف صالحین کی یادگار، اور آخری عہد اسلامی کے تمدن کے علم بردار تھے۔ خاندانی علم وفضل کے ساتھ ذاتی فضل وکمال سے آراستہ، مروجہ علوم وفنون عربی وفارسی کے علاوہ فن طب اور اردو فارسی شاعری کے مسلم استاد تھے۔

آپ کے والد ماجد مولوی حکیم سید احمد علی صاحب سیماب بن مولنا سید محمد علی صاحب واعظ رامپوری المتوفی ۱۲۸۵ھ خلیفہ حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے برادر خورد مولنا حکیم سید حیدر علی صاحب رامپوری کہ آپ کا خاندان سادات بخاری سے تھا۔

ولادت ۱۲۷۰ھ ٹونک میں ہوئی، اپنے والد بزرگوار و دیگر اہل فضل وکمال سے جو ان دنوں ٹونک میں تھے علم وفضل حاصل کیا، ۱۳۰۰ھ میں بھوپال گئے۔ وہاں بڑے بڑے فضلاء سے تحصیل علوم وفنون کی۔ مثلاً قاضی شیخ محمد صاحب مچھلی شہری، شیخ حسین عرب صاحب یمانی وغیرہ فن طب میں کمال پیدا کیا، نباضی وتشخیص میں فریدِ عصر تھے۔ ذہانت، قوت حافظہ، طباعی اور ذکاء میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ حواس کی ذکاوت وتیزی میں ضرب المثل تھے۔ علاج وطب میں وہ کمال تھا کہ دور دور کے لاعلاج مریض آتے۔ ایک مرتبہ ہاتھ رکھ کر پوری کیفیت بیان کر دیتے تھے، اکثر امراض میں سول سرجن ان کی رائے ومشورے سے کام کرتا تھا۔ جراحی کے مشکلات میں خصوصاً ان کا مشورہ قابل قدر خیال کیا جاتا تھا۔ بہت سے معرکے کے علاج ایسے کئے، اور مایوسوں کو ان کے ذریعے وہ شفا حاصل ہوئی جو زبان زد عوام وخاص ہے۔ برص ودیگر لاعلاج بیماریوں میں انگریزان کے پاس آتے یا باہر بلوا کر علاج کراتے اور اکثر کامیاب ہوتے تھے۔

۱۳۱۰ھ میں حج بیت اللہ کے لئے گئے اور ایک سال تک وہاں رہے جس میں اہل علم وفضل سے خوب صحبت رہی۔ شیخ احمد مغربی اور علامہ شیخ محمد سہارنپوری وغیرہ سے خاص اتحاد

والفت تھی، عرب کے قبائل سے بھی آمد و رفت اور تعلقات و روابط پیدا کئے، وہاں طب کی
وہ خواہش و قدر دیکھی کہ حد بیان سے باہر۔

اخلاق و عادات میں نہایت منکسر المزاج، سادہ اور رحم دل تھے۔ مخلوق خدا کی نفع رسانی
میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے، غریب و امیر سب کو ایک نظر سے دیکھتے بلکہ غربا کا زیادہ
خیال کرتے تھے، مریض کو دیکھ کر اگر قابل علاج ...
کرتے، بلکہ اپنے پاس سے کچھ خدمت کر دیتے
علاج سے دست بردار ہو جاتے اور اکیلے
کا یہ نہاں ہے۔ اسے فلاں نسخہ استعمال کر۔

ریاست سے جاگیر و تنخواہ تھی مگر دربار میں زیادہ آمد و رفت نہ رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت
میں سادگی کے ساتھ خودداری استغنا اور سچائی بہت تھی۔ مال و زر کی طمع مطلق نہ تھی، اس
لئے ایسے تمام مقامات سے جہاں دین کو دنیا پر قربان کر دیا جاتا ہے بہت پرہیز کرتے تھے۔ ہمیشہ
اہل علم و فضل سے محبت و مودت کا سلسلہ قائم تھا۔ مولانا سید عرفان صاحب مرحوم اور ان کے
بھائی مصطفیٰ میاں مرحوم نبیرگان سید احمد صاحب بریلوی سے خاص اخلاص تھا، اتباع سنت میں
خاص کوشش کرتے اور اہل توحید سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اکابر و فضلا کے حال ہر مجلس
میں اس طرح بیساختہ بیان کرتے تھے کہ گویا کوئی محفوظ چیز دہرائی جاتی ہے۔ ایسا خوش بیان قوی
الحافظہ بہت کم دیکھا گیا۔

سنہ ۱۳۴۲ھ سے ایک آنکھ میں پانی اتر آیا تھا، پھر دوسری میں بھی سنہ ۴۵ھ میں ایک آنکھ
بنوائی جو کچھ دنوں کے بعد خراب ہوگئی، دوسری آنکھ سنہ ۴۸ھ میں بنوائی مگر وہ تیار نہ تھی۔
اس کے بنوانے میں بے حد تکلیف ہوئی اور جو کچھ بصارت تھی وہ بھی جاتی رہی، اس سے سخت
صدمہ پہنچا اور زندگی سے دل تنگ ہوگیا، خصوصاً نماز کے اوقات کی معرفت نہ ہونے پر سخت
افسوس کیا کرتے تھے!

فارسی۔ طب وغیرہ میں بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں حکیم سید یحییٰ میاں خلف اکبر اور سید احمد میاں نواسہ طب و فارسی میں اور مولوی سید شرف الدین صاحب، مولوی عبدالرحمن صاحب فارسی میں۔ سید عیسیٰ بسمل منجھلے صاحبزادے شعر و شاعری میں خاص کر قابل ذکر ہیں۔ تاریخ نکالنے میں خاص مہارت رکھتے تھے، بہت لوگ اس فن میں بھی ان سے تلمذ رکھتے ہیں، حافظ عبیداللہ البصیر کو خاص کمال حاصل ہوا ہے۔ جناب حکیم صاحب کی پہلی اہلیہ سے دو یادگار ایک لڑکا ایک لڑکی باقی ہیں اور دوسری زوجہ سے پانچ اولاد تین لڑکے اور دو لڑکیاں زندہ و آباد ہیں۔ تالیف کی طرف بہت کم توجہ تھی بعض کتب تاریخ و سیر کا ترجمہ کیا ہے اصحاب بدر کے حالات میں ایک کتاب تیار کی تھی جو اب تک شائع نہ ہو سکی، فارسی، اردو کی نظموں کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے جن کی بابت کوشش ہو رہی ہے کہ یکجا جمع کر دی جائیں۔

وفات سے عرصہ قبل اطلاع دیتے تھے کہ اب میں پانچ چھ ماہ کا مہمان ہوں، اور ایسا ہی ہوا۔ گذشتہ سال ذوالقعدہ ۱۳۵۴ھ میں جب میں نے عبداللہ میاں کی والدہ کو بلانا چاہا تو آپ نے فرمایا "بیٹا میں چاہتا تھا تم یہاں رہو، تو مولوی میاں میری وفات کے وقت یہاں آجائیں گے، اور میری نماز جنازہ پڑھائیں گے، مگر اب تم جاتی ہو اللہ حافظ! انشاء اللہ حشر کے میدان میں ملیں گے۔ میں اب پانچ چھ ماہ کا مہمان ہوں" ایسا ہی ہوا۔ ۲۹ ربیع الآخر ۱۳۵۵ھ اتوار کے روز عصر کے وقت دار فانی سے دار باقی کی طرف رحلت کر گئے اور ام عبداللہ بیماری کی وجہ سے ٹونک نہ پہنچ سکیں، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

وفات سے قبل خود اپنی تاریخ اس طرح لکھ گئے گویا غیب سے اطلاع مل چکی تھی، اور اور اس کا پورا یقین ہو چکا تھا۔

تاریخ ہے سر سے میری رحلت کی بجا　　　بھوہا سے الف سے لکھ دیکھو تجیا (بلحاظ ترتیب)

ایک صوری دعائیہ بیا بغفراں　　　اک اور ہے۔ ربی با د رضواں بجا

علی حزیں کے قطعہ پر فارسی میں یہ قطعہ بھی لکھوایا ملاحظہ ہو۔

بود ایں جائے یارب قطعۂ از روضۂ رضواں — سعید خستہ ہشتاد و سالہ آرمید اینجا
بشوق قرب مولیٰ از تعلق وارہ می گشتم — حرم پا آستاں بارگاہ او رسید اینجا

قطعہ تاریخ وفات از جناب مولوی حکیم [illegible] صاحب سہا [illegible]

طبع سہا ز کثرت رنج و ملال و غم — [illegible]
تاریخ انتقال بگو گفتم سروش گفت

قطعہ تاریخ وفات از صاحبزادہ [illegible]

تھی جو تاریخ ولادت مصدر فیض و لی ۱۲۷۰ — اس سے [illegible] تھا بہ الہام
خاتم فیض: اس کا پایا عیسوی سال وفات ۱۹۳۱ — دفتر فیض و سخا کا [illegible] گیا عالم [illegible] نام
تھا ربیع الثانی اور تاریخ تھی انتیسویں ۲۹ — چھپ گیا زیر زمیں وہ علم کا ماہ تمام
یک ہزار و سہ صد و پنجاہ سن ہجری تھے او — روز یکشنبہ تھا وقت عصر جب آیا پیام

بیداری کا انعام

(۱)

بیچارہ بھائی اللہ کے نام پر!

یہ تھی وہ آواز جو فضا پر رات کی تاریکی مسلط ہوئی ہر" گلی قاسم جان مںکے ایک بلند مکان کی ڈیوڑھی پر محمود کے منہ سے پہلی مرتبہ نکلی، جب اس کی بھوک اور ضمیر میں زبردست جنگ ہو رہی تھی، بھوک کا تقاضہ تھا کہ جس طرح بھی میسر آئے" تنورِ شکم" کو پر کرد، غیرت کہتی تھی کہ دوسرے کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کے مقابلے میں مرجانا بہتر ہے۔ آخر پیٹ کی آگ کے شعلوں نے دامنِ غیرت کو داغدار کر دیا۔ اور محمود اندھیری رات کا سیاہ نقاب چہرے پر ڈال کر ایک شاندار مکان کے سامنے سے گذرا جس کے برآمدے میں چند خوش باش احباب اپنے لمحاتِ فرصت سے اطمینان کے ساتھ فائدہ اٹھا رہے تھے۔

درمیان میں خوبصورت بیضوی میز پڑی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز پر "سوڈا واٹر" کی چند بوتلیں اور بادۂ ناب سے بھرے ہوئے متعدد کانچ کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ قہقہے کی مسلسل صدائیں دروازوں کی چقوں کو چیر کر سڑک پر آ رہی تھیں اور بجلی کے قمقمے اپنی پرنور شعاعوں سے راستے کو روشن کر رہے تھے۔ محمود آہستہ آہستہ برآمدے کے سامنے آیا، اس نے یہ نظارہ دیکھا اور اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر سر سے پیر تک لرز گیا۔ . . . کاش نوجوانوں کا بے پرواگروہ جو آئندہ چل کر سیکڑوں نفوس کی بربادی کا باعث ہوگا۔ مجھے دیکھ کر عبرت حاصل کرتا اور مجتاالزہر کے یہ خوش رنگ پیالے انسان کو دنیا میں کسی کام کا نہیں رکھتے۔

اس نے چاہا کہ ان کو اپنی شکستہ حالی پر متوجہ کرے اس کے لبوں میں حرکت کے آثار

پیدا ہوئے۔ زبان نے جنبش کرنے کا ارادہ کیا لیکن الفاظ نے ساتھ نہ دیا اور اس کا وہ سوال جو حمیت کے خون کو کھولاتا ہوا لب تک آنا چاہتا تھا دل کا دل میں رہ گیا۔ وہ تیزی سے چلنے لگا اور عجلت کے ساتھ پچاس ساٹھ قدم چلنے کے بعد جرأت کرکے وہ ایک دروازے پر رکا اور چاہتا کہ سوال کرے لیکن خاندانی وجاہت، باپ دادا کی عزت و شہرت نے اس کے دامن کو جھٹکا دے کر کہا۔ محمود کیا محض ایک روٹی کے لئے اتنے سے چند سوالوں کے معاوضے

میں اپنی خاندانی نام و نمود کو فروخت کردے گا

حاجتمندی گناہ کو بھی ثواب کر دیتی ہے لیکن

کے تمام آلام کا بہترین علاج ہے۔ مگر زندگی

میں اس کو اپنے ہی ہاتھوں تباہ کر دوں۔ دوست

بھی گزر گیا جو خطرہ بار بار پیش آتا ہے انسان اس کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ اس سے کوئی اندیشہ محسوس نہیں کرتا۔ محمود کے سامنے دوم رتبہ غیرت و ضرورت کی کشمکش ہو چکی تھی ضرورت بڑھ رہی تھی اور غیرت اسی اعتبار سے مغلوب ہو کر کمزور ہو رہی تھی۔ جس طرح آگ کی معمولی سی چنگاری پر بہت سی لکڑیاں ڈال دی جاتی ہیں اور وہ ان کے وزن سے دب کر خود ہی بجھ جاتی ہے۔ اسی طرح ضرورت کے بوجھ سے محمود کی غیرت دب گئی تھی اب اس میں تاب نہ تھی کہ وہ ضرورت کے مقابلے میں صف آرا رہ سکے۔

محمود پھر ایک دروازے پر رکا اور ڈیوڑھی میں منہ ڈال کر پوری قوت سے آواز بلند کی

"بھیجنا بھائی اللہ کے نام پر!"

گھر میں سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں برتنوں کی جھنکار محمود کے کانوں میں پیام امید پہنچا رہی تھی مگر اس کی پہلی صدا بیکار ثابت ہوئی اس نے چاہا کہ اب اس دروازے کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائے، لیکن پھر بھی اسی ناگوار فرض کو انجام دینا تھا پھر یہیں کیوں نہ اس کی تکمیل کر لی جائے۔ اس نے پھر اپنے لہجے میں سائلانہ لوچ پیدا کرکے وہی "صدا سے طلب"

بلند کی چونکہ اس مرتبہ وہ نورا دلیر بھی ہوگیا تھا، غیرت کا نشہ پہلی آواز کے بعد کچھ کم ہو چکا تھا اس لئے اس مرتبہ اس کے حلق نے خوب کام دیا، اگرچہ آواز میں فن سوال کی پوری بہار تمیں مجتمع نہ تھیں ــــ وہ سوال کرنے کے بعد تھوڑی دیر تک منتظر رہا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس نے ہمت کرکے تیسری مرتبہ پوری قوت سے اسی سوال کو دہرایا مگر اس کا جواب پھر نہایت تلخ اور دل شکن تھا اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا "چلو ــــ آگے بڑھو کیوں کان کھاتے ہو!"

محمود کی غیرت و حمیت پر یہ ایسی کاری ضرب تھی کہ اگر امید اس کا ساتھ نہ دیتی تو وہ اس سے زیادہ بے غیرتی پر آمادہ نہ ہو سکتا۔ دروازے کی سیڑھیوں کو طے کرکے سڑک پر آیا اور اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ اب کیا کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ دنیا میں جہاں تنگ نظر اور کم ظرف لوگوں کی کثرت ہے وہاں ارباب خیر اور صاحبان ہمت کی بھی کمی نہیں، بدقسمتی سے مجھے پہلی مرتبہ نہایت ناپاک نفوس سے واسطہ پڑا کہ انھوں نے مجھے عام سائلوں کی طرح جھڑک دیا اور اُن کے بے درد قلوب میری درد بھری آواز سے متاثر نہ ہوئے جو بہت حد تک میری قلبی کشمکش اور دماغی کوفت کی آئینہ دار تھی لیکن بہت ممکن ہے کہ آئندہ اس کی تلافی ہو جائے۔ جب یہ حرکت کی ہے تو مقصد حاصل ہونے سے پہلے اس کو چھوڑ دینا دانشمندی نہیں، پھر بھوک بھی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی اور اب یہ عالم تھا کہ شدت گرسنگی سے پاؤں اٹھانا بھی مشکل تھا۔

جہاں تک اس کے پیروں کی قوت نے اجازت دی وہ چلتا رہا دس پندرہ منٹ گزر جانے پر وہ ایک موڑ پر کھڑا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ قریب کے دروازے میں کسی شخص کے داخل ہونے کی آہٹ ہوئی وہ اس دروازے کے پاس پہنچا اور اس نے پھر ایک مرتبہ وہی آواز بلند کی، تقریباً دو منٹ کے بعد ادھیڑ عمر کا ایک آدمی جس کے چہرے سے شرافت و نرم دلی نمایاں تھی ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں گرم گرم پلاؤ کی پلیٹ لئے ہوئے باہر آیا اس نے سر سے پیر تک محمود کو دیکھا اور ایک خاص شفقت کے ساتھ پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے

کھا، یہ لو اس کو یہیں بیٹھ کر کھا لو۔"

محمود کا سر چکرانے لگا۔ اس کا دماغ معطل ہو گیا۔ سارے بدن میں آگ سی جلتی ہوئی
معلوم ہونے لگی اور اسی حالت میں اس کا ہاتھ پہلی بار اس کھانے کو لینے کی غرض سے اٹھا جو
دو گھنٹے کی گداگری کے بعد حاصل ہوا تھا۔ اگرچہ اس کا ضمیر اب بھی اس بزدلی پر ملامت کر رہا تھا
مگر اس وقت اس نعمت غیر مترقبہ کو ٹھکرا دینا ویسا ہی تھا جیسے گلا کٹ جانے کے بعد جینے کی آرزو
کرنا اس واسطے چار و ناچار اس نے رکابی لے لی اور کھانا شروع کر دیا ۔۔۔ چار وقت کا فاقہ
اور اس پر مزیدار پلاؤ کے بڑے بڑے لقمے ۔۔۔ تو
ہو گئی۔ صاحب خانہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ
اس کے حواس پریشان ہو گئے۔

محمود کی گردن ڈھیلی ہو کر ایک طرف کو لٹک گئی
تو اس کے گر جانے میں کوئی شک نہیں۔

ارے کیا تم بیمار تھے! صاحب خانہ نے نبض پر ہاتھ رکھا، کمزوری چہرے ہی سے
ظاہر تھی۔ پھر بیہوشی میں نبض کا ساقط ہو جانا کوئی تعجب خیز امر نہ تھا، ذرا سی دیر میں محمود کے
چاروں طرف گھر کے آدمیوں کا ہجوم ہو گیا۔ کوئی منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا، کوئی چائے کی
پیالی لئے کھڑا تھا کسی کے ہاتھ میں پنکھا تھا کوئی شانہ جھنجھوڑ کر اسے ہوشیار کرنے کی کوشش
کر رہا تھا۔ سب کو یہی خیال تھا کہ اس طرح ان کے دروازے پر دم توڑ دینا قیامت سے کم نہیں۔
نہ معلوم کیا الزام لگایا جائے۔

محمود کے منہ سے نحیف سی آواز نکلی "پانی" ۔۔۔ فوراً پانی حلق میں ڈالا گیا۔ خدا خدا
کر کے محمود اٹھ کر بیٹھا، اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

صاحب خانہ کے سخت اصرار پر اس نے صرف اتنا کہا کہ میں چار وقت کا بھوکا ہوں اس
سے زیادہ اپنا کوئی حال ظاہر نہیں کیا۔ یہ معلوم ہو جانے پر کہ محمود کی غشی نتیجہ تھی سخت بھوک میں

دفعتہً قبل غذا کے معدے میں پہنچ جانے کا۔ اس کے واسطے چائے اور انڈوں کا انتظام کیا گیا۔

(۲)

میرٹھ کے مشہور رئیس اور ممتاز دولتمند "قاضی اشفاق حسین" کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کی پاک طینتی، ان کا بے ریا اخلاق، اور ان کی مخلصانہ قومی خدمات ایسی نہ تھیں کہ ہندوستان کا کوئی آدمی ان کے نام کے ساتھ لفظ "مولانا" کا اضافہ نہ کرتا ہو۔ وہ شہر کے سب سے بڑے تاجر اور سربرآوردہ بزرگ تھے۔ ان کا عالیشان محل شاہ پیر دروازے میں مرجع انام تھا۔ روزانہ شام کے وقت ان کے دروازے پر سائلوں کا ہجوم ہوتا اور قاضی اشفاق حسین اپنی نورانی داڑھی میں کنگھا کرتے ہوئے گھر سے برآمد ہوئے، ہر طرف سے دعاؤں کا شور پیدا ہوتا اور ہر ضرورتمند قاضی صاحب کی فیاضی سے فائز المرام ہو کر واپس جاتا۔

عام طور پر مشہور تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا نصف حصہ غربا پر تقسیم کر دیتے ہیں ممکن ہے کہ اس میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے سینے میں ایک ایسا درد مند دل تھا جو ابنائے جنس کی غربت و افلاس اور بیکسی و بیچارگی پر ہر وقت تڑپتا رہتا تھا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ نہایت مخیر، کریم النفس اور پاک خصلت آدمی تھے۔

قاضی اشفاق حسین کے بہت دن تک کوئی اولاد نہ ہوئی اور دولتمند ہو کر بھی وہ اگر کسی چیز کے لئے بے چین رہتے تھے تو صرف اولاد کے لئے ان کے احباب نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ عقد ثانی کر کے اپنے دامن آرزو کو گوہر مقصود سے پر کرلیں لیکن بیوی سے انھیں غیر معمولی محبت تھی وہ ہرگز یہ نہ چاہتے تھے کہ اپنی دہ سالہ رفیق زندگی کو صدمہ پہنچا کر اپنی تمنا حاصل کریں وہ اس قسم کے مشوروں پر باوجود بے حد خلیق اور متحمل مزاج ہونے کے چیں بہ جبیں ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ اولاد کی آرزو اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب دوسری شادی کی جائے تو وہ چہرہ پر غصے کے آثار نمایاں کر کے کہتے، یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ میں اپنا دل خوش کرنے کی غرض سے اس غریب کو ایک دائمی اذیت میں مبتلا کر دوں۔ جو میری ذات پر سب

سے زیادہ اعتماد رکھتی ہو اور پھر اس کی کیا ضمانت ہے کہ عقد ثانی کے بعد میں صاحب اولاد ہوجاؤنگا اگر اس وقت بھی قسمت نے ساتھ نہ دیا تو میرے لئے تو دنیا جہنم ہوجائے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب میں جملہ اوصاف انسانی بدرجہ کمال موجود تھے اور سب خوبیوں کے ساتھ قدرت نے انھیں مستقل مزاجی بھی غضب کی عطا فرائی تھی اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس کا متزلزل ہوجانا یقینی تھا لیکن یہ قاضی صاحب ہی کا دل گردہ تھا کہ انھوں نے اس طرف ذرا توجہ نہ کی اور موجودہ بیوی کے ساتھ اپنے پیمان وفا کو کبھی سست نہ ہونے دیا۔

دنیا میں صرف استقلال ایسی چیز ہے
اگر کوئی شخص حقیقی مسرتیں حاصل کرنا چاہتا ہے تو
کا اصول زندگی ہی یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں
زندگی میں ناکامی سے وہ ہمیشہ ناواقف رہے۔ چنانچہ اس
ساتھ دیا۔ اور شادی کے پورے چودہ سال بعد ان کی بیوی کے بطن سے ایک نہایت خوبصورت، اور تندرست بچہ پیدا ہوا جس کو "محمود حسن" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اگرچہ قاضی صاحب نے محمود کی تربیت میں نہایت بیدار مغزی اور احتیاط سے کام لیا اور اور اس میں شک نہیں کہ اگر ان کا سایہ محمود کے سر سے نہ اٹھتا تو وہ دنیا میں بہترین اوصاف کا انسان ہوتا لیکن خدا کو منظور نہ تھا کہ محمود کی زندگی "حیات پدر" کا جواب ہو اور اس طرح ایک بے نظیر چیز کی مثال اس کی قیمت کو کم کردے۔

محمود ابھی آٹھ سال ہی کا تھا کہ قاضی صاحب کا انتقال ہوگیا اولاد سب سے زیادہ جس عمر میں ماں باپ کے التفات کی محتاج ہوتی ہے حقیقتاً وہی عمر ہے اس عمر میں بچہ کے اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے اور اس کا سنگ بنیاد ماں باپ ہی کے ہاتھ سے رکھا جاتا ہے اگر بنیاد کو کافی مستحکم نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ عمارت پائدار نہ ہوگی جس طرح باغ کا سرسبز پودا جس کی جڑیں زمین میں اچھی طرح پیوست نہیں ہوئیں، اور جو اپنی غذا جذب کرنے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا، مالی

کی معمولی سی غفلت سے خشک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ہونہار بچہ کی اخلاقی حیثیت بالکل تباہ ہو جاتی ہے اگر اس کی ابتدائی تربیت پر کافی توجہ نہ کی جائے۔

قاضی صاحب کے مرتے ہی ان کے گھر کا رنگ بدل گیا۔ گھر میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کی مسند پر بیٹھتا اور ان کا صحیح جانشین ہوتا۔ اس لئے محمود کی ماں نے اپنے بھائی کے لڑکے "بشیر حسن" کو بلا کر اپنے یہاں رکھ لیا اور کاروبار کی نگرانی اس کے سپرد کر دی۔

بشیر ابھی نوجوان تھا اگرچہ اس کی تعلیم بہت اعلیٰ نہ تھی تاہم جس اہلیت کا آدمی اس کام کے واسطے موزوں ہو سکتا تھا وہ قریب قریب اس میں موجود تھی اس لئے آتے ہی تمام کاروبار تجارت پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اور نہایت دانشمندی سے جملہ امور کی نگرانی کرتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمدنی میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی بلکہ بحیثیت مجموعی بشیر کی موجودگی سے قاضی صاحب کی تجارت کو فروغ ہو گیا۔

قاضی صاحب زیادہ تر چمڑے کی تجارت کرتے تھے، چمڑے کی شناخت اور اس کی خرید فروخت میں بشیر کو پہلے سے کافی مہارت حاصل تھی چنانچہ میرٹھ ایسے شہر میں جہاں یہ کاروبار کسی فن کے نقطۂ نگاہ سے نہیں کیا جاتا۔ بشیر بہت زیادہ کامیاب ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ بشیر قاضی صاحب کی تجارتی حیثیت کے لحاظ سے ان کا بہترین جانشین تھا لیکن دوسرے اوصاف اس میں بالکل مفقود تھے۔

خصوصاً محمود کی تربیت سے وہ مجرمانہ تغافل روا رکھتا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بشیر نے شروع ہی سے محمود کو ایک زبردست حریف سمجھا اس لئے ابتدا ہی سے یہ انتظام کیا کہ اس کی دماغی قابلیتوں پر جہالت کا پردہ پڑ جائے تاکہ وہ جوان ہو کر بھی بشیر سے بے نیاز نہ ہو چنانچہ اس نے محمود کو لہو و لعب میں مشغول کر دیا۔ تھیٹر، سینما، رقص و سرود کی طرف اسے متوجہ کیا۔ یہ چیزیں محمود کے لئے بے انتہا جذب و کشش کا سامان رکھتی تھیں، اس کی نگاہوں میں یہ قوت نہ تھی کہ وہ ان کے تاریک پہلو تک پہنچ سکیں۔ وہ صرف ظاہری سطح کو دیکھتا تھا جو ایک زبردست قوت تسخیر کی حامل تھی۔

تھوڑے ہی دنوں میں محمود میرٹھ کی اوباش جماعت کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔ اس کی ماں نے بہت کوشش کی کہ محمود کی اصلاح ہو جائے۔ لیکن اس کی ہر کوشش بشیر کی تائید و

امداد کی محتاج تھی اور اس کا یہ عالم تھا کہ وہ دانستہ اس معاملہ خاص میں کوتاہی کرتا تھا اور محمود کی گم کردہ راہی کو اپنے لئے نشانِ منزل سمجھتا تھا۔ محمود کی ماں جب زیادہ پریشان ہوتی تو وہ کہہ دیتا کہ محمود قاضی صاحب کی تنہا نشانی ہے۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں اس پر سختی کروں اور تکلیف پہنچا کر اس کے اخلاق کو درست کروں۔ یہ وہ حربہ تھا جو خصوصی طور پر ایک عورت کے جذباتِ محبت کو برانگیختہ کرنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا تھا اور اس کی کامیابی یقینی تھی۔

تمام کاروبار پر بشیر حاوی تھا۔ محمود کو ...

تھی جو اس کے دلچسپ مشاغل کے لئے کافی ...

مول لیتا اس نے اس طرف کبھی توجہ ہی نہ ...

محمود کی عمر کے ساتھ ساتھ بشیر کی حر...

اس کے لئے مایوسی و نامرادی کا وہ پیام لا رہا ہے جو ایک دن اس کو وہ مسند نشینی اس سے مسند سے نیچے اتار دے گا۔ اگرچہ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ محمود کو اتنا ہوش کبھی نہ آئے گا کہ وہ اس کی عیارانہ چالوں سے آگاہ ہو۔ لیکن یہ بھی مقتضائے عقل و دانش کے خلاف تھا کہ بشیر محض اسی خیال کی بنا پر اپنے مستقبل سے غافل رہے۔

بشیر نے دوربینی کے لحاظ سے اپنا سرمایہ محفوظ کرنا شروع کیا۔ تمام نقد روپیہ اس کی تحویل میں رہتا تھا اور مہینے میں دو چار ہزار کی رقم الگ کر لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ بشیر کی طمع اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے اعتدال سے کام لینا بھی چھوڑ دیا اور وہ بڑی بڑی رقموں پر غاصبانہ نگاہیں ڈالنے لگا جس کا انجام یہ ہوا کہ سرمایہ کم ہونے لگا جس کے باعث تجارت میں بھی انحطاط کے آثار نمایاں ہوئے۔ رفتہ رفتہ بشیر کی تجارت بالکل گر گئی اور وہ اپنی ساکھ قائم نہ رکھ سکا بعض مطالبوں میں قاضی صاحب کے چند مکانات بھی قرق ہو گئے۔ آخر میں مجبوراً بشیر نے ایک دیوالیے کی حیثیت سے اپنا کاروبار بند کر دیا۔ اب وقت آگیا تھا کہ بشیر اپنا دامن بچا کر محمود سے جدا ہو جائے چنانچہ اس نے محمود کی ماں سے کہا کہ یہ کام اب میرے بس کا نہیں جب تک ہو سکا میں نے

آپ کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ اب میں قطعاً مجبور ہوں، روپیہ میرے پاس بالکل نہیں ہے، اور قرضخواہ ہر طرف سے مجھ پر زغہ کر رہے ہیں۔ دوکان کو بند ہوئے آج ایک ہفتہ ہو گیا۔ میں کسی صورت سے آپ کے یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ میری رائے میں آپ کے پاس جس قدر نقد سرمایہ ہو اس کو محفوظ کر لیجئے اور غیر منقولہ جائداد کو فروخت کر کے قرض ادا کرنے کی تدبیر کیجئے۔ اس بعد جو کچھ بچے اس کو اپنے مصارف اور گذر اوقات کی غرض سے اپنے قبضے میں رکھئے تاکہ محمود کو اس پر دست درازی کا موقعہ نہ ملے۔

محمود کی شادی ہو چکی تھی، مگر اس سے اس کی زندگی میں کوئی خوشگوار انقلاب نہ ہوا تھا۔ بلکہ ناپاک صحبتوں کے اثر سے وہ "بادۂ ناب" کے جرعۂ تلخ کو بھی سرمایۂ نشاط تصور کرنے لگا تھا۔ اس سلسلے میں اس کی فضول خرچیاں حد سے تجاوز ہو چکی تھیں، آتش سیال کی پرستش کے واسطے جس ماحول کی ضرورت ہے وہ محمود نے پیدا کر لیا تھا۔ اس کے گھر میں ہر وقت ایک ہنگامۂ رقص و سرود اور محشر نائے نوش بپا رہتا تھا۔ اس کی ماں نے بہت سعی کی کہ محمود کے سر سے یہ سودا نکل جائے اور وہ اس خطرناک وادی سے نکل کر منزل حیات کے جادۂ مستقیم پر گامزن ہو لیکن جس دماغ میں بیابان کا مفہوم "چمنستان عشرت" اور بربادی کا ترجمہ "نشاط زندگی" ہو اس پیکر جنون و جہالت کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔ اگرچہ وہ غریب اپنے مقصد اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن اپنی جان اس نے اس کے نذر کر دی۔

ماں کے مرنے پر گھر کے سب اختیارات محمود کو حاصل ہو گئے۔ اس کی بیوی "ربیعہ" میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ شوہر کی کجروی پر زبان اعتراض دراز کر سکے۔ اس کو اب نہ خلقت کی تلخ گفتاریوں کا اندیشہ تھا نہ ناصحانہ جھڑکیوں کا خوف۔ وہ گھر میں بھی آزاد تھا باہر بھی آزاد ربیعہ چونکہ بالکل تنہا رہ گئی تھی اس کی غمگسار ساس باقی نہ تھی کہ اپنی مشفقانہ باتوں سے اس کا غم غلط کرتی رہے اس لئے وہ محمود سے اجازت لے کر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی۔ جو پنجاب میں کسی جگہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ربیعہ کے جاتے ہی محمود اور زیادہ بے لگام ہو گیا اگرچہ

اس پر بظاہر ربیعہ کا کوئی اثر نہ تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں وہ بعض چیزوں کو خاص اس کی ملک سمجھتا تھا۔ اب ان سب پر وہ قابض ہو گیا۔ اس میں کچھ چیزیں ایسی تھیں جو اس کے مقصد میں خاص طور پر مفید ثابت ہوئیں، رفتہ رفتہ وہ وقت آیا کہ محمود نے باپ دادا کی ہر چیز کو قربانگاہ عیش پر بھینٹ چڑھا دیا۔ پہلے غیر منقولہ جائداد، پھر گھر کا قیمتی اسباب، اس کے بعد سکونتی مکان اور سب سے آخر میں محمود نے اپنی غیرت و حمیت ان تبا . . . یادوں کی نذر کی۔ قرض کی وہ معمولی معمولی رقمیں جو اس نے شراب کے خالی پیا . . .

کی غرض سے ساہوکاروں سے حاصل کی تھیں

پہنچ گئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ محمود گھر سے بے گھر

ربیعہ جس دن سے گئی تھی۔ محمود نے اس کو بہ . . .

تھی، مگر اس کے شبستان عیش میں ربیعہ کے واسطے کوئی گنجائش نہ تھی۔

جب محمود کی جائداد نیلام ہو گئی، اس کا سارا سامان فروخت ہو گیا تو اس کے حواس درست ہوئے اور آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن اب سوائے منہ چھپا کر فرار ہو جانے کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ممکن تھا کہ ربیعہ سے اس کو کچھ امداد مل جاتی، لیکن جس بیوی کو کبھی محبت کی نظر سے نہ دیکھا تھا ضرورت کے وقت اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا اُسے گوارا نہ تھا۔

عرصۂ حیات محمود پر تنگ تھا مگر موت کو اس کے وجود سے نفرت تھی، وہ ہفتوں تک دیوانہ وار جنگلوں میں پھرتا رہا۔ مگر یہاں بھی اس کی سوزش قلب کا کوئی علاج نہ تھا بالآخر مجبور ہو کر اس نے ترک وطن کا ارادہ کر لیا۔ اس نے دہلی کے راستے پر پیدل چلنا شروع کیا اور جس دن وہ دہلی کی آبادی میں داخل ہوا ہے وہ وقت کا بجو کا تھا۔

وہ صبح چار بجے دہلی پہنچ گیا تھا یہ وہ وقت تھا جب محمود دہلی کے دوران قیام میں پارسی تھیٹریکل کمپنی" میں رات بھر دل بہلانے کے بعد قیمتی موٹر میں سوار ہو کر امپیریل ہوٹل کی طرف روانہ ہوا کرتا تھا۔ جس شہر میں وہ پوری شان امارت کے ساتھ داخل ہونے کا عادی تھا اور جس کے اسٹیشن

مقصد ہوئیں بیسیوں، احباب اس کے خیر مقدم کی رسم ادا کرنے جمع ہوا کرتے تھے آج وہ پھٹے پرانے لباس میں نہایت بیکسی کے ساتھ اس میں داخل ہو رہا تھا اور کتوں کی خوفناک آوازیں اس کے استقبال میں بلند ہو رہی تھیں۔

وہ دن بھر شہر کے کم آباد محلوں میں پھرتا رہا شام کو بھوک سے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ پورے چار وقت سے اس کے پیٹ میں کوئی چیز غذائی قسم سے نہ پہنچی تھی اس کے ہاتھ پیروں کی رگیں کھنچ رہی تھیں، معدے سے شعلے بلند ہو رہے تھے جن کی حدت سے زبان بالکل سوکھ گئی تھی۔ انسان ہر تکلیف میں تھوڑا بہت صبر کر لیتا ہے مگر بھوک سے خدا پناہ میں رکھے جو زبردست سے زبردست آدمی کو نہایت ذلیل کارروائیوں پر آمادہ کر دیتی ہے۔

مزدوری سے محمود کو عار نہ تھا، کیونکہ اس مشغلے کو وہ اپنی آئندہ زندگی کا سہارا بنا چکا تھا لیکن اس کا وقت تھا نہ طاقت! مجبوراً صرف ایک وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے اس نے دنیا کے ذلیل ترین پیشے "گداگری" پر اعتماد کیا۔

(۳)

محمود نے صاحب خانہ کے کہنے سننے پر وہ رات وہیں بسر کی لیکن یہ طے کر لیا کہ بہت سویرے کسی کو اطلاع کئے بغیر ہی چلا جاؤں گا۔ اس کا میزبان نفسیات انسانی سے باخبر تھا۔ وہ محمود کی صورت دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ آدمی شریف مگر مصیبت زدہ معلوم ہوتا ہے اب اس کی باتیں سن کر یقین ہو گیا کہ اس کی غیرت اجازت نہیں دیتی کہ وہ دن کی روشنی میں اپنے آپ کو ایک معمولی گداگر کی صورت میں ظاہر کرے، چنانچہ اس نے محمود کو زیادہ مجبور نہ کیا۔

محمود صبح چار بجے کے قریب بیدار ہوا تو دیکھا کہ پلنگ کی برابر میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی ہے جس پر کشتی میں کھانا اور چائے رکھی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں میزبان کا شکریہ ادا کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ چلنے پر آمادہ ہوا لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنی جیب میں غیر معمولی وزن کا احساس کیا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ پچاس روپے کا غذ

کی ایک پڑیہ میں بندھے ہوئے جیب میں پڑے ہیں۔ اب اس کا ارادہ ہوا کہ اپنے مخیر میزبان کا شکریہ ادا کر کے یہ روپیہ اس کو واپس کر دے۔ مگر جس کاغذ میں روپیہ لپٹا ہوا تھا اس پر لکھا تھا۔

"امید ہے آپ یہ روپے قبول کر لیں گے اور اب تو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ
بھی نہیں کیونکہ اتفاقاً آج میں بھی بارہ بجے شب کو رنگون روانہ ہو رہا ہوں ،
اب میری روانگی کا وقت آگیا اور میں جا رہا ہوں، گھر پر ایک نوکر کے علاوہ
کوئی نہیں ہے یہی آپ کے ناشتے کا انتظام کرے۔"

ہی ہے جیسے کنوئیں میں ڈال دیا
نہیں بھیج سکتے، ایسی حالت میں
اگرچہ محمود نے صرف ایک وقت کی ...
نیت یہ تھی کہ وہ اس پیشے کا پھر کبھی نام نہ لے لیکن اب یہ روپیہ بھی بادلِ ناخواستہ اس کو لینا ہی پڑا۔

اس مکان سے نکلتے ہی اس نے اپنے ارادے میں بلندی محسوس کی اور قلب میں جوشِ عمل کا امنڈتا ہوا دریا اسے نظر آیا۔ وہ پہلے تو دن نکلنے کے انتظار میں ادھر اُدھر پھرتا رہا پھر بازار پہنچ کر اس نے چالیس روپئے کے جوتے خرید کئے اور وہاں سے سیدھا اسٹیشن گیا۔ جہاں دو گھنٹے قیام کر کے اس نے اپنے لئے ایک مقصدِ زندگی اور ایک شاہ راہِ عمل تجویز کی۔

چالیس روپیہ کا سرمایہ بظاہر کچھ بھی نہ تھا مگر قوی ارادہ اور ولولۂ عمل ایک ایسی چیز ہے جو ذرے کو پہاڑ بنا دینے کی زبردست طاقت رکھتی ہے، محمود نشۂ عمل سے سرشار تھا، ارادے کی شراب کا خمار اس کے دماغ میں قوت پیدا کر رہا تھا۔ اور وہ ان حالات میں کامیابی کے بہت قریب ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے طے کر لیا کہ میں یہاں سے بمبئی جاؤں گا اور وہاں پہنچ کر اپنی تجارت کو فروغ دوں گا۔ ہر چند سرمایہ میرے پاس نہیں لیکن جو ارادے بے سرو سامانی کے عالم میں قائم کئے جاتے ہیں وہ اکثر کامیاب ہوئے ہیں، میں کہ برگ و نوا سے فائدہ نہ اٹھا سکا یقیناً بے نوائی

اقتصادی بے سروسامانی مجھے راس آئے گی۔

بمبئی میں ایک ہفتے کے اندر ہی اس کے سب جوتے فروخت ہو گئے جس کے بعد اس کو نوے روپئے حاصل ہوئے دہلی میں جس دوکان سے محمود نے جوتے خرید کئے تھے اس سے یہ قرارداد ہو گئی تھی کہ آئندہ اگر ضرورت ہوئی تو اسی نرخ پر وہ جس جگہ سے چاہے گا مال طلب کر سکے گا چنانچہ اس نے یہ روپیہ اس دوکان کو بھیج کر استدعا کی کہ مال فوراً بھیج دیا جائے۔ اب اس نے بمبئی کی ایک دوکان پر ۸ ر یومیہ پر مزدوری شروع کر دی۔ بارہ دن کے بعد جب پارسل وصول ہوا تو وہ مزدوری سے چھ روپئے پیدا کر چکا تھا جس میں سے چار روپئے نقد اس کی جیب میں موجود تھے۔ اس نے مزدوری برابر جاری رکھی، صرف شام کو تین چار گھنٹے کے لئے وہ کسی اچھی جگہ اپنی دوکان لے کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ اتنے وقت میں جو کچھ فروخت ہوتا تھا اس کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھتا تھا اور مزدوری کے سلسلے میں اپنے کھانے پینے کے مصارف پورے کرتا تھا۔

چونکہ بمبئی میں دہلی کے جوتوں کی یہ پہلی دوکان تھی لہذا کوئی وجہ نہ تھی کہ محمود کا یہ کاروبار اتنے بڑے شہر میں فروغ نہ پاتا۔ ایک سال کے ہیر پھیر میں محمود نے ہزاروں روپئے پیدا کر لئے اس نے شہر کے ایک بڑے بازار میں ایک شاندار دوکان کھول دی، اور اب کثرت سے دہلی کے جوتے اس کے یہاں موجود رہتے ہیں جن کو وہ ہندوستان کے باہر بھی مصر، سوڈان، افریقہ وغیرہ بھیجتا رہتا ہے، اس نے اسی کے ساتھ کپڑے کی تجارت بھی شروع کر دی ہے جس میں اس کو کافی منافع ہوتا ہے۔

اگرچہ محمود بظاہر بہت مطمئن ہے اور اس کی حیثیت اب اس قدر مضبوط ہو گئی ہے کہ اس کو اس طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ ہر وقت کسی خیال میں محو رہتا ہے وہ اقتصادی جنگ میں جتنا کامیاب ہو رہا ہے دماغی کشمکش میں اتنا ہی مغلوب ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ربیعہ کی مفارقت کو اپنے لئے نہایت تکلیف دہ خیال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے میزبان کا قرض ادا کرنے کی اُسے سب سے زیادہ فکر ہے۔

حقیقتاً ان ہی وجوہ سے وہ ہر وقت پریشان اور مضطرب رہتا ہے بظاہر اس کو جس قدر اطمینان ہے اتنا ہی وہ دل میں بے چین ہے۔

(۴)

محمود کے لئے ربیعہ کا بلا لینا کچھ دشوار نہ تھا، وہ اگر معمولی طور پر بھی اُسے یاد کرتا تو ربیعہ ایسی عورت نہ تھی کہ محمود کی بدسلوکی کا انتقام لیتی، وہ جانتی تھی کہ اگر محمود کی زندگی کے چمن سے جدا ہو گئی تھی تو "عروس بہار" بن کر واپس بھی آسکتی تھی

ہر چند پانی کی گستاخ موجیں کنول کو

یہ صحیح نہیں کہ وہ موجوں کے ان تھپیڑوں سے

میں کھلتا ہے اور وہیں مرجھا کر اپنی شگفتگی سے خوش ہے

ربیعہ بھی محمود ہی کو اپنی کشتی حیات کا ناخدا سمجھتی تھی اور محمود کی بے التفاتی کو اپنی بد بختی سے تعبیر کرتی تھی، لیکن محمود کے لئے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ وہ ربیعہ سے بے انتہا شرمندہ تھا۔ اس لئے اس کے بلانے کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی، جس زمانے میں محمود میرٹھ میں مقیم تھا اور اس کے پاس کافی سرمایہ تھا اس کو اطلاع دی گئی تھی کہ ربیعہ کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا ہے آکر دیکھ جاؤ۔ مگر اس نے ادھر کوئی توجہ نہ کی تھی، اس کے بعد بیماری کے حیلے سے بھی اُسے بلایا گیا مگر محمود نہ گیا۔

ان حالات میں اُسے ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی اُس بیوی کو جس کا قلب اس کی بے اعتنائی سے مجروح ہے دعوت التفات دے۔ مگر یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہ بیوی اور بچے کو بھول جائے۔

اس نے ایک دن ربیعہ کو اپنے تمام حالات قلمبند کر کے بھیج دئے یہ بھی لکھ دیا کہ میں نے محض شرم کی وجہ سے تمہیں نہیں بلایا اگر تمہیں باوجود میری بداخلاقی کے مجھ پر رحم آسکتا ہو تو پچھلی باتوں کو ایک بدقسمت انسان کی بکواس اور بیمار آدمی کا ہذیان سمجھ کر بھلا دو۔ اور خدا کے لئے میرے نور عین کو لے کر چلی آؤ۔ میرے کاشانہ حیات کا دروازہ تمہارے لئے ہر وقت کھلا ہوا ہے اور صرف تمہاری میرے گھر میں کمی ہے۔ خط لکھنے کے دسویں روز محمود کو تار سے اطلاع دی گئی کہ ربیعہ بمبئی روانہ ہو چکی ہے۔ اسٹیشن پر

سواری کا انتظام کر دو۔

محمود وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا، پنجاب میل کے بمبئی اسٹیشن پر رکتے ہی ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کھڑکی سے سر نکال کر زور سے کہا "مسٹر محمود"۔ اس آواز کی صدائے بازگشت ابھی فضا میں گونج رہی تھی کہ محمود دوڑ کر زنانے ڈبے کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے ربیعہ کے ساتھ آنے والے آدمی کو غور سے دیکھ کر معلوم کیا کہ یہ اس کا وہ مخیر میزبان ہے جس کے دروازے پر اس نے اپنا طویل روزہ افطار کیا تھا۔

یہ بھی ایک اتفاقی بات تھی کہ عارف نے معمولی توقف کے بعد محمود کو پہچان لیا۔ ربیعہ نے محمود کو دیکھتے ہی عارف کو اشارے سے بتایا کہ یہی محمود ہیں تو عارف پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی، ان کے حافظے میں محمود کی دو سال قبل کی ہیئت اس طرح محفوظ تھی جیسے کوئی ہوشیار مصور آئینے پر تصویر بنا دیتا ہے ممکن تھا کہ عارف اس کو اپنے ذہن و دماغ کا ایک مغالطہ سمجھے لیکن جب محمود نے بھی ان کو متعارفانہ نگاہوں سے دیکھ کر ان کا خیر مقدم کیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے خیال کو غلط سمجھے۔

عارف محمود کے کاروبار کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس قدر جلد ترقی کرنے پر انہوں نے بہت تحسین کی جس کا محمود نے ادب کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور پھر پچاس روپیہ کا نوٹ پیش کر کے عارف سے کہا کہ اب اپنا یہ عطیہ واپس کر لیجئے۔

عارف نے کہا میں اس معاملے میں ربیعہ کی اجازت کا پابند ہوں کیونکہ میں رقم سے یہ روپیہ آپ کو دیا گیا تھا اس میں میرے علاوہ ربیعہ اور ان کے بھائی بھی شریک تھے۔ ہم تینوں کے مشترک سرمایہ سے تجارت ہوتی تھی اور جس روز آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے۔ اسی دن مجھے بھی "نمک" کی تجارت میں پندرہ ہزار کا نفع ہوا تھا۔ اسی منافعے سے میں نے اپنی ذمہ داری پر پچاس روپئے تم کو دیئے تھے لیکن اب یہ روپیہ خیرات کی مد میں درج ہو چکا ہے۔ میں اس کو کسی طرح اپنے اختیار سے واپس نہیں لے سکتا۔ اور نہ ایک سائل کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دو سال کے بعد بھی

۔۔۔یہ اُسے واپس کرے۔

جب ربیعہ کے سامنے یہ قصہ بیان کیا گیا تو محمود نے اس کی پوری تفصیل بھی اُسے سنادی جس کو سن کر ربیعہ بہت روئی، آخر میں یہ روپیہ غربا کو تقسیم کر دیا گیا۔ اور اس طرح محمود اپنے سر سے ایک ۔۔۔ ہلکا کرنے میں کامیاب ہوا۔

ربیعہ کے بمبئی آنے کے بعد محمود نے ایک اخبار میں پڑھا۔ "جو شخص بشیر حسن ساکن ۔۔۔ کے
ورثا کا پتہ بتائے گا ان کو پانچسو روپے انعام دیا جائے گا"
اس لئے محمود نے فوراً بشیر کے ساتھ اپنی قرابت کی ا۔۔۔
نیچے درج تھا وہ حیران تھا کہ بشیر کے ورثا اور اعزہ ۔۔۔
بعد جواب آیا کہ بشیر حسن نے ایک معقول جائداد اپنی اولاد ۔۔۔
خاندان وبائے طاعون میں تباہ ہو گیا اس لئے جستجو کی جارہی ہے کہ اس خاندان کا کوئی فرد زندہ موجود ہو تو وقف کی آمدنی اس کے نام منتقل کی جائے ورنہ وقف عامہ میں شامل کر دی جائے۔ دور کے دو عزیزوں کے نام پہلے دریافت ہو چکے ہیں لیکن آپ بہت قریب کے عزیز ہیں لہٰذا آپ کو علاوہ پانچسو روپیہ ماہوار کے تین سو روپیہ ماہانہ ملا کریں گے، دو سو روپیے دوسرے اعزہ کو دیئے جائیں گے، بشرطیکہ انھوں نے اپنا حق قرابت ثابت کر دیا۔

چونکہ آخر میں بعض کارروائیوں سے اور اپنے خیر خواہوں کے کہنے سننے سے محمود پر بشیر کی عیاریاں منکشف ہو چکی تھیں اس لئے اس روپئے کو اس نے بشیر کا عطیہ خیال نہ کیا بلکہ ایک طویل غفلت کے بعد اپنی "بیداری کا انعام" سمجھ کر قبول کر لیا۔

غزلیات

از حضرت جگرؔ مرادآبادی

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا

ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

دل نے اک نالہ کیا آج اس طرح دیوانہ وار
بال بکھرائے کوئی مستانہ وار آ ہی گیا

ہاں سزا دے، اے خدائے عشق اے توفیقِ غم
پھر زبانِ بے ادب پر ذکرِ یار آ ہی گیا

جب نگاہیں اٹھ گئیں، اللہ ری معراجِ شوق
دیکھتا کیا ہوں، وہ جانِ انتظار آ ہی گیا

ہائے کافر دل کی۔ یہ کافر جنوں انگیزیاں
تم کو پیار آئے نہ آئے مجھ کو پیار آ ہی گیا

اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں
درحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

درد نے کروٹ ہی بدلی تھی کہ دل کی آڑ سے
دفعتاً پردہ اٹھا اور پردہ دار آ ہی گیا

جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

کس نظر سے آج وہ دیکھا کیے
دل مرا ڈوبا کیا اچھلا کیے

حسن سے بھی دل کو بے پروا کیا
کیا کیا اے عشق تو نے کیا کیا

تو نے سو سو رنگ سے پردا کیا
دیکھنے والا تجھے دیکھا کیے

وہ بھی نکلی اک شعاعِ برقِ حسن
میں جسے اپنی نظر سمجھا کیے

لذتِ ناکامیابی۔ الاماں
تو نے ہر امروز کو فردا کیا

اب نظر کو بھی نہیں دم بھر قرار
اس نے بھی اندازِ دل پیدا کیا

خونِ دل۔ خونِ تمنا۔ خونِ شوق
آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا

اُن کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی
جس طرف دیکھا کیا دیکھا کیے

مجھ سے قائم ہیں جنوں کی عظمتیں
میں نے صحرا کو جگرؔ صحرا کیا

تنقید و تبصرہ

کتب:

تفصیل البیان فی مقاصد القرآن - مانی الاسلام - نقش و نگار - کامیاب مطالعہ

تفصیل البیان فی مقاصد القرآن | مؤلفہ مولوی سید ممتاز علی صاحب

مجلد، لکھائی چھپائی اعلیٰ درجے کی۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ: دارالاشاعت پنجاب لاہور

اس کتاب کے اب تک چار حصے بغرض تبصرہ ہمارے پاس آئے ہیں جن میں سے دو زیر طبع ہیں اور دو زیر تالیف۔

مؤلف نے اس کتاب میں قرآن کریم کی آیات کو بہ ترتیب موضوع و عنوان فراہم کیا ہے۔ اس طرح پر کہ قرآن کو اول سے پڑھنا شروع کیا۔ ہر ہر آیت جس جس موضوع کے تحت میں آسکتی ہے یا جس جس موضوع کے تحت میں آنی مناسب ہے اس اس کے تحت میں لکھی گئی۔ جو اُن موضوعوں کے تحت میں نہیں آسکی اس کے لئے ایک نیا موضوع یا عنوان قائم کیا گیا اور اس کے ذیل میں لکھی گئی۔ یہ انتخاب قرآن مجید کی ہر آیت کے متعلق کیا گیا۔ یہاں تک کہ جملہ آیات مضمون وار مرتب ہوگئیں۔ اس مجموعے کی ضخامت قرآن مجید سے زیادہ ہوگئی اور ہونی بھی چاہیئے تھی کیونکہ ہر آیت کم سے کم ایک بار تو ضرور کسی موضوع کے تحت میں آئی اور بہت سی آیتیں جن میں مختلف پہلو نکلتے ہیں مختلف عنوانوں کے تحت میں دو دو یا تین تین بار آئیں۔

یہ چاروں حصے ہم نے مطالعہ کئے۔ اس سے قبل مولوی عبیداللہ صاحب کی اقتباس الانوار اور مولینا وحید الزمان کی تبویب القرآن بھی ہماری نظر سے گزر چکی ہیں لیکن ان کے مقابلے میں یہ کتاب بہت زیادہ مفید اور کارآمد اور اپنے مقصد کو پورا کرنے والی ہے۔

درحقیقت ایک عرصے سے طالبان قرآن اس ضرورت کو نہایت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں کہ آیات قرآنی بترتیب مضامین مرتب کی جائیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی یا اردو میں حقائق قرآنی سمجھانے سے قاطبۃً قاصر ہیں کیونکہ وہ ایک ایک آیت

کی تشریح کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور بہت کم ان حقائق سے بحث کرتی ہیں جن کا وہ آیت ایک حصہ ہوتی ہو۔ صورت یہ ہو کہ قرآن میں ایک حقیقت کی تعلیم ایک آیت میں شروع ہوتی ہے دوسری جگہ کسی سورۃ میں اس پر کچھ اضافہ ہوتا ہو۔ پھر تیسرے مقام پر کوئی استثنا یا قید یا شرط بڑھائی جاتی ہو پھر کہیں تکمیل یا تتمہ ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مسئلہ قرآن کے مختلف مقامات میں پھیلا ہوتا ہو۔ اس کی پوری حقیقت سمجھنے کے لئے ان جملہ آیات کو ایک جگہ فراہم کرنا ضروری ہو تاکہ مکمل حقیقت ذہن میں آسکے۔ اس لئے علوم قرآن تفاسیر میں نہیں ہیں بلکہ خود قرآن میں ہیں اور آیات کو آیات کے ساتھ ملانے سے وہ سمجھ میں آتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اسی ضرورت سے قرآنی آیات کی تبویب شروع کی جن میں سے اب تک سب سے بڑی اور بکار آمد کوشش یہ کتاب ہو جو زیر تنقید ہے۔ اس کا پہلا حصہ کتاب العقائد ہے جس میں اللہ کی ذات وصفات اور اس کے افعال کے متعلق آیات ہیں۔ دوسرا حصہ کتاب الاحکام ہو جس میں فقہی احکام کی آیات جمع کی گئی ہیں۔

تیسرا حصہ کتاب الرسالۃ ہو جس میں قرآن اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے متعلق جملہ آیات فراہم کی گئی ہیں۔ چوتھے حصے میں جس کا نام کتاب المعاد ہو قیامت اور اس کے متعلقات کی آیات ہیں۔

کتاب میں پہلے ہر موضوع بطور عنوان کے اوپر لکھا گیا ہو۔ پھر اس کے تحت میں متعدد ضمنی سرخیاں حاشیے میں قائم کی گئی ہیں۔ پھر اس کے ذیل میں آیات نقل کی گئی ہیں جن کا شمار اوپر اور سورۃ کا شمار نیچے دیا گیا ہو۔ اس کا حوالہ دیکھنے کے لئے وہ قرآن درکار ہو جس میں ہر آیت کا شمار لکھا ہوا ہو۔

یہاں ضمناً مجھے یہ عرض کرنا بھی ضروری ہو کہ ارباب مطابع جو قرآن چھاپتے ہیں ان کو چاہئے کہ آیات کے اندر ان کے شمار بھی ضرور لکھا دیا کریں۔ اس میں ان کے لئے کوئی دقت نہیں ہو اور بڑی آسانی سے وہ اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں کیونکہ صرف ہندسہ ہی لکھنا تو ہے۔

مؤلف کی محنت جانکاہی اور ان کے خلوص کی قدر کرتے ہوئے میں اس کتاب کے نقائص اور خامیوں کی طرف بھی ایک نظر ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ کتاب ابھی زیر ترتیب ہو اور مؤلف نے لکھا بھی ہو کہ احباب جو مشورہ دیں گے ان پر میں کاربند ہوں گا۔ اس لئے ممکن ہو کہ میرے مشورے کچھ مفید ثابت ہو سکیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہو کہ مؤلف نے عنوانات کی ترتیب کسی علمی اصول پر نہیں رکھی۔ پہلے حصے کا نام انھوں نے کتاب العقائد رکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ اس میں جملہ عقائد کے متعلق آیات

ہوں گی مگر صرف اللہ کی وجود کے اثبات اور اس کے صفات ہی پر یہ حصہ ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا حصہ احکام فقہیہ کے متعلق شروع ہو جاتا ہے۔ پھر تیسرا حصہ کتاب الرسالۃ ہے یعنی رسول اور کتاب جو عقائد میں سے ہیں احکام کے بعد آتے ہیں علیٰ ہذا چوتھا حصہ معاد بھی عقائد ہی کا حصہ ہے ملائکہ کا کوئی عنوان نہیں قائم کیا گیا ہے۔

پہلے حصے میں ایک باب آخر میں قضاء و قدر کے متعلق ہے اور یہی [illegible] احکام یعنی دوسرے حصے میں دہرایا گیا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی
ذات الٰہی کے متعلق کوئی عنوان نہیں تھا
کتب سے زیادہ تعلیمات موجود ہیں۔ علم جو صفت ا[illegible]
ذیلی سرخیوں میں لکھا گیا ہے اور علم غیب جو علم [illegible] متعلق [illegible]
میں آیات کے استیعاب کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے حصے [illegible]
"مشرکوں کے اعمال اکارت ہیں" اور ارتداد کے تحت میں ہے "مرتدوں کے اعمال رائگاں ہیں" لیکن کفر کے تحت میں اس سرخی کو چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ آیات موجود ہیں۔ سورۂ ابراہیم میں ہے الذین کفروا اعمالہم کرماد الآیہ سورۂ نور میں ہے الذین کفروا اعمالہم کسراب الآیہ معلوم نہیں یہ آیات کس ذیل میں لکھی گئی ہیں۔

تیسرے حصے میں کتب سماوی میں سے قرآن۔ تورات اور انجیل کے ذکر کے ساتھ زبور اور صحف ابراہیم وغیرہ کا بھی ذکر لازم تھا۔

شق القمر والی آیت پیش گوئیوں میں بھی درج ہے اور علامات قیامت میں بھی۔ ایسی صورت میں ایک ہی معنی کا تعین لازمی تھا۔ کوئی آیت قرآن کی دو مختلف معنوں میں لینا صحیح نہیں۔ یہی معاملہ الذین آتیناہم الکتاب یعرفونہ الآیہ کے متعلق کیا گیا ہے حصہ دوم صفحہ ۱۳۱ میں یہی آیت کعبے کے بارے میں ہے اور حصہ سوم صفحہ ۲۰ میں یہی آیت رسول کے متعلق ہے۔ حالانکہ اس کا مفہوم ایک ہی ہو سکتا ہے علاوہ بریں اسی مضمون کی دوسری آیت جو سورہ انعام میں ہے یعنی الذین آتیناہم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءہم الذین خسروا انفسہم فہم لا یومنون۔ یہ نہ کعبے کے متعلق ہے نہ رسول کے ذیل میں ہے نہ قرآن کے۔

سورۂ ص کی آیت "کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب" "قرآن مبارک کتاب ہے" کی سرخی میں درج کی گئی ہے حالانکہ اس کو مقاصد قرآن کے تحت میں بھی درج کرنا لازم تھا۔

رسول اللہ کی شان میں سورہ والضحیٰ کو نقل کرنا اور اس میں آیت و وجدک ضالاً فہدیٰ کو صنف کردینا نہایت بیجا ہے کیونکہ اس میں اللہ نے ایک حقیقت بیان کی ہے جو کسی دوسری آیت سے نہیں مل سکتی۔

چوتھا حصہ کتاب المعاد ہے۔ اس سے پہلے عالم برزخ ہونا چاہئے تھا جس کے متعلق قرآن میں تعلیمات موجود ہیں۔ معاد میں نفخ صور بار اول اور نفخ صور بار دوم کے الگ الگ عنوانات قائم کئے ہیں۔ لیکن پہلے کی آیات دوسرے میں اور دوسرے کی آیات پہلے میں خلط ملط کر دی ہیں۔ نفخ صور بار اول میں آیت ۶۹ یعنی واشرقت الارض بنور ربہا درج کی ہے حالانکہ خود قرآن میں اس آیت کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے کہ یہ نفخ صور دوم کے تحت میں ہے۔ اسی طرح صفحہ ۲۶ کی ساتوں آیتیں نیز آیت ۶۹ جو نفخ دوم میں درج ہوئی ہیں نفخ اول کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ الساعہ اور القیامہ دونوں کی آیتوں میں لوگوں نے بہت غلطیاں کی ہیں۔ خاصکر اس وجہ سے بھی کہ الساعہ کہیں کہیں القیامہ کے معنی میں بھی آگیا ہے جس کو وہ تمیز نہیں کرسکے۔ اس لئے اس میں نہایت غائر نظر ڈال کر امتیاز کرنا چاہئے تھا۔

یہ نقائص اس لئے میں نے دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ آئندہ حصوں نیز آئندہ اشاعت میں ان کی اصلاح کی جائے تاکہ یہ کتاب زیادہ مفید ہوسکے۔ ورنہ اس کتاب کی خوبی اور مؤلف کی محنت کو میں نہایت قابل قدر سمجھتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اس خدمت قرآن کے صلہ میں اللہ ان کو دین اور دنیا دونوں میں کامیاب کرے گا۔

معانی الاسلام | مصنفہ مولانا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر دینیات و ادبیات اسلامیہ کالج لاہور۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حصہ اول ضخامت ۱۱۲ صفحے قیمت ۸ حصہ دوم ضخامت ۴۸۴ صفحے قیمت ۲ لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ غالباً مصنف سے مل سکے گی۔

مولانا روحی صاحب نے اس کتاب میں مذہب کے جملہ جہات عقائد و اعمال پر بسط و تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور نہایت شستہ عبارت میں فلسفیانہ طریق پر مذہب جمہور یعنی اہل سنت کی حمایت کی ہے بلکہ حمایت کا حق ادا کر دیا ہے۔ چونکہ ایک مدت سے وہ عقائد و دینیات اسلامی کے معلم رہے ہیں اس سے ان کی بحثیں نہایت غور و خوض اور کافی عرصے کے مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے اپنے پیش نظر ان جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو رکھا ہے جو مذہب سے ناواقفی کی وجہ سے اس کی تعلیمات پر اعتراض یا اس سے اعراض کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عقائد و مسائل کے اثبات میں فلسفیانہ استدلال کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جابجا اسلامی مسائل میں انھوں نے سرسید کی غلطیاں دکھائی ہیں اور بالخصوص

"ہما اعتقاد نیا پچوہ" کو جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

اس سے پہلے اسی قسم کی ایک کتاب مولوی عبد القیوم صاحب وکیل جالندھر نے "دین کامل" کے نام سے لکھی ہے جس کے اوپر جامعہ کے صفحات میں تنقید ہو چکی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ طریقہ دین حق کو سمجھانے کا نظری ہے جو اس کو فلسفیانہ بحثوں میں الجھا کر بہت کچھ شکوک پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ علماء سلف نے اس استدلالی طریق کو عقیم اور بے نتیجہ اسی [illegible] دیا ہے کہ اس [illegible] بیان نہیں کیا جا سکتا ہے نہ اذعان اور یقین پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً [illegible] خود ہی اپنے ثبوت میں مولانا [illegible] کے پچاس صفحوں [illegible] کہا جا سکتا ہے۔

مولانا نے اس کتاب کے سرورق پر یہ [illegible]

خیال ہوا تھا کہ اپنی اس کتاب میں وہ غالباً قرآن کی تعلیمات بیان [illegible] کہ عوام مسلمانوں کے عقائد فلسفیانہ لباس میں جلوہ گر کئے گئے ہیں۔ جہاں فلسفہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے وہاں بزرگوں، صوفیوں اور بالخصوص شعراء کے اقوال سے اس کی تلافی کی جاتی ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کا حریف مخاطب ان لوگوں کو حجت تسلیم کرے۔

سوال قبر روح اور بدن ہر دو سے پھر سماع میت وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن پر علماء اور بزرگوں کے اقوال سے مولانا نے شہادتیں پیش کی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ سماع میت پر حضرت عائشہ ام المومنینؓ کے استدلال قرآنی کی انھوں نے تردید کی ہے کہ آیت میں اسماع کی نفی ہے نہ کہ سماع کی۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتے تو قرآن میں بہت سی آیتیں سماع کی نفی پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً

والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیر ان تدعوہم لا یسمعوا دعائکم الآیہ — جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے۔

اہل شرک اللہ کے ماسوا جن لوگوں کو پکارتے تھے ان میں مردہ بزرگ اولیا بلکہ انبیاء وغیرہ سبھی ہیں۔ ان کی نسبت تصریح ہے کہ وہ نہیں سنتے۔ ایسی صورت میں اگر قرآن اور حدیث میں تعارض ہے تو محفوظ طریقہ یہ ہے کہ حدیث میں تاویل کی جائے نہ کہ قرآن میں۔

اسی طرح ایصال ثواب کے مسئلے میں بھی انھوں نے قرآن کے خلاف فیصلہ کیا ہے جو یہ تصریح کر رہا ہے کہ "لیس للانسان الا ما سعیٰ" اور "ہل تجزون الا ما کنتم تعملون"۔

مہدی کی آمد کا عقیدہ جس کا اشارہ بھی قرآن میں نہیں ہے اور جو حدیثیں اس کے متعلق ہیں وہ

بہ تحقیق اہل سنت معمول ہیں انکے نزدیک دینی ہے اور تعجب یہ ہے کہ اس کے نسب اور نام تک کو اہل سنت سے تسلیم کرانے پر مصر ہیں۔

تصوف کے ثبوت میں بھی جس کے نام تک سے قرآن یا حدیث آشنا نہیں ہیں انھوں نے تین جز صرف کئے ہیں اور اس کو اسلامی تعلیمات کی حقیقت قرار دیا ہے۔ مکاشفہ کے اثبات میں سر سید پر لعن طعن کر کے بزرگوں کے اقوال سے سندیں پیش کی ہیں۔ مگر کشف تو ہر ایک ماہر فن کو اپنے فن کے متعلق ہوتا ہے۔ اس کو دین کے ساتھ کیا خصوصیت ہے۔

ان کے نزدیک ہر مسلمان کو شیخ کی بھی ضرورت ہے حالانکہ قرآن اس کو نہایت خطرناک بتاتا ہے۔ "وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ" (دنیا کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تو ان کی اطاعت کرے تو وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے) دوسری آیت میں بتصریح اس کی ممانعت ہے "اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء" (اسی کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تمھارے اوپر نازل کیا گیا اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو) حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے ہوتے ہوئے شیخ کی تلاش کرنا بعینہ ایسا ہی ہے جیسے آفتاب کے ہوتے ہوئے چراغ ڈھونڈھنا۔ رسول پاک نے جو بیعت لی تھی وہ امامت کی حیثیت سے تھی چنانچہ ان کے بعد صحابہ کرام میں سے صرف وہی لوگ بیعت لیتے تھے جو خلافت یا امارت کا منصب رکھتے تھے۔ دیگر صحابہ سے بیعت لینا مطلقاً ثابت نہیں ہے۔ پیری اور مریدی کی بیعت مسلمانوں میں اس وقت شروع ہوئی ہے جب تاتار کے غلبہ کے بعد ان کی دینی صلاحیت فوت ہو گئی اور ارشاد و ہدایت کا منصب دنیا کمانے کا ذریعہ بن گیا۔

غرض یہ ہے کہ جو عقائد جو اعمال اور جو رسوم مسلمانوں میں مذہب کے نام سے پھیلے ہوئے ہیں مولانا روحی نے اپنے فلسفے سے انھیں کی حمایت کی کوشش کی ہے۔ اور مخالفین کو نہایت سخت بلکہ بعض مقامات پر کرخت لہجے میں مخاطب فرمایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے پانچ ہی اجزاء ایمان قرار دئے ہیں۔ اللہ۔ رسول۔ ملائکہ۔ کتاب اور یوم آخر ان کے سوا کوئی چھٹا عقیدہ قرآن میں نہیں۔ مسلمانوں نے ان کے اوپر سیکڑوں عقائد اضافہ کرلئے لیکن نتیجہ سوائے ہلاکت اور غضب الٰہی کے اور کچھ نہ ہوا۔ کیونکہ یہ سب الگ الگ فرقوں کے خیالات تھے جن سے امت کی وحدت فنا ہو گئی۔ تعجب ہے اگر مولانا روحی جیسا شخص بھی اسی سے عبرت نہ لے اور اسی لکیر کا فقیر بنا رہے جو ترکستان کو جاتی ہے۔

(ا۔س۔ج)

نقش و نگار | جناب جلیل احمد صاحب جلیل قدوائی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ حجم ۹۴ صفحہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی اوسط درجے کی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس۔ قیمت ۸؎۔ مصنف سے کاشانہ اناؤ کے پتے سے مل سکتی ہے۔

اردو داں پبلک جلیل قدوائی صاحب سے فسانہ نگار کی حیثیت سے واقف ہے۔ ان کی چند متفرق نظمیں بھی اردو کے ممتاز رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان کی نظموں کا مجموعہ اب تک نہیں چھپا تھا اس لئے ان کے شاعرانہ جوہر لوگوں پر اچھی طرح نہیں کھلے تھے۔ اس مجموعے کو پڑھ کر اہل ذوق کو بڑی خوشی ہوگی کہ نئی نسل میں ایک ایسا شاعر موجود ہے جس کی زبان میں [illegible] ان کی [illegible] اور خیالات میں وہ درد اور اثر ہے جو غزل کی جان [illegible]

کتاب کے ساتھ حضرت احسن مارہروی کا [illegible] کالج علی گڑھ کا مقدمہ بھی ہے جس میں جلیل صاحب [illegible] پڑھ کر اس کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

ہم نمونے کے طور پر چند اشعار درج کرتے ہیں جنہیں انتخاب نے چھانٹا ہے۔

باغ میں چاندنی چھٹکتی ہے — آنکھ بے اختیار روتی ہے
بے قراری ہمارے دل کی حیف — نام عشاق کا ڈبوتی ہے

فکر پوشیدگی راز میں ہیں دیوانے — سی رہا ہے کوئی دامن تو گریباں کوئی

خوشی کے چند دن تھے جو خوشی میں کٹ گئے لیکن — حیات غم حیات جاوداں معلوم ہوتی ہے
بھرے آتے ہیں آنسو سن کے حال گریۂ بلبل — ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

مٹ چلے ہیں دل سے کچھ کچھ داغ ہائے آرزو — پھر چمک اٹھیں نہ اس ظالم کو ہنستا دیکھ کر

جلوہ دکھلاتی ہے اپنا زیر دامان سحاب — نوعروس برق یعنی دختر ابر بہار
آج ہوتی ہے دل میں ایک خلش — آج کھلتا ہے راز راحت کا

کیسا ویرانہ، کیسی آبادی؟ | اقتضا اور کچھ ہے وحشت کا
عمر ساری ملال میں گزری | اللہ اللہ فریب راحت کا
تسکین ہے وجہ راحت دل | تسکین کا اعتبار کب تک
دل مرحوم کی اٹھان کی شان | ہائے اس ہونہار کی باتیں
ڈرایا اس قدر طوفان بحر زندگانی نے | کہ ہم ساحل کو بھی موج لب ساحل سمجھتے ہیں
مایوسیوں نے یہم دل سرد کر دیا ہے | اب آرزو کے بدلے اک داغ آرزو ہے
منزل کا ہوش کچھ ہے نہ ہے راہ کی خبر | لے جائے کس طرف دل دیوانہ دیکھئے

ایک نظم "برکھارت" کے چند اشعار۔

باغ میں پریاں جھول رہی ہیں | حسن پہ اپنے پھول رہی ہیں
دھانی ساڑھی اونچا دامن | ترچھی نظریں تیکھی چتون
نین رسیلے چھب متوالی | ہنسی انوکھی بات نرالی
سر سے وہ آنچل کا ڈھل جانا | شرما کر وہ سر کو جھکانا

کامیاب مطالعہ | از سید تجمل حسین صاحب ایم اے، بی ٹی لکچرر ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔ حجم ۱۲۱ صفحے
قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ میراماں منزل، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ یا مکتبہ جامعہ ملیہ۔ قرولباغ۔ دہلی۔

اس رسالے میں مصنف نے جو اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور ٹریننگ کالج کے لکچرر کی حیثیت سے طالب علموں اور معلموں دونوں کی تعلیم کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ مطالعہ کے نفسیاتی اصولوں کو بہت سلیس شگفتہ عام فہم زبان اور دلنشیں انداز میں سمجھایا ہے اور ایسے گر بتائے ہیں جن سے کام لے کر طالب علم کم سے کم محنت کا زیادہ سے زیادہ نتیجہ حاصل کر سکتا ہے۔ ہندوستانی طالب علم عموماً مطالعہ میں بہت بے تکے طریقے سے محنت کرتے ہیں۔ سارا بار حافظے پر ڈال دیتے ہیں اور وہ بھی اس طرح سے کہ نفسی قوانین کی صریحی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ حافظے کا ٹٹو اناڑی سوار کے ہاتھ سے لگام کے جھٹکے اور چابک کھاتے کھاتے اتنا اڑیل ہو جاتا ہے کہ کسی طرح نہیں چلتا۔ اس کتاب کے مطالعے سے طالب علموں کو اس مرکب پر پورا قابو حاصل ہو سکتا ہے اور وہ ایک اشارے سے جدھر چاہیں موڑ سکتے ہیں۔ ہم ذیل میں اس کی فہرست درج کرتے ہیں جس سے کتاب کے مضامین کا پورا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) طالب علم کی جسمانی صحت (۲) مطالعے کے لئے جگہ اور وقت کا تعین (۳) مطالعے کی مختلف قسمیں۔
(۴) مطالعے کو کامیاب بنانے کے طریقے (۵) حافظہ اور اس کی ترتیب (۶) حفظ کرنے کے صحیح طریقے (۷) امتحان اور اس کی تیاری۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

جرمنی کا قرضہ | (ڈاکٹر برونگ وزیراعظم جرمنی کا جو اعلان حال میں جرمنی کے قرضے کے متعلق شائع کیا ہے اس سے دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری درخواست پر ڈاکٹر [illegible] جرمنی کے مشہور [illegible] داشنٹ گارڈ" کی ہندوستانی شاخ کے جنرل [illegible]

جرمنی کے ذمے بیرونی قرضے دو قسم کے ہیں

(الف) سیاسی قرضے (تاوان جنگ)

(ب) تجارتی قرضے (بیرونی بنکوں سے)

سیاسی قرضوں کا تصفیہ پہلی بار ۱۹۲۴ء میں ڈاز (Dawes) یعنی سنے کیا۔ پھر ۱۹۲۹ء میں ایک اور تصفیہ ہوا جو "تجویز ینگ" (Young Plan.) کے نام سے مشہور ہے۔

تاوان جنگ کا مطالبہ اس بے بنیاد دعوے پر مبنی تھا کہ لڑائی جرمنی نے شروع کی اور اس میں سراسر اسی کا قصور تھا۔ صلحنامہ ورسائی (Treaty of Versailles.) کے بعد سے اب تک متعدد فرانسیسی اور انگریز سیاست داں اس دعوے کی تردید کر چکے ہیں۔ مگر فرانس ہنوز ان مطالبات پر مصر ہے۔

"تجویز ینگ" کی رو سے جرمنی سنہ ۱۹۶۶ء تک تقریباً دس کروڑ پاؤنڈ (ڈیڑھ کرور روپیہ) سالانہ دینے کا پابند کر دیا گیا۔

۱۹۲۲ء میں دنیا کے ماہرین تجارت پر یہ بات روشن ہو گئی کہ جرمنی کے لئے اس خطیر رقم کے ادا کرنے کی سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ اسے سالانہ قسط تاوان کے مساوی رقم کا مال باہر بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ بجائے اس کے ہوا یہ کہ یورپ، امریکا اور ایشیا کے ملکوں نے بھاری محصول لگا کر جرمن مال کی درآمد کو روک دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب جرمنی غیر ملکی بازاروں میں اتنا مال نہیں بھیج سکتا، جتنا فرانس، انگلستان، امریکا کے سیاسی مطالبات ادا کرنے کے لئے بھیجنا ضروری ہے۔ مجبوراً اسے یہ رقم غیر ملکوں سے اور زیادہ تر خود انگلستان اور امریکا سے قرض لینا پڑی۔

اس طرح ایک چکر سا بن گیا جس میں سے نکلنے کی کوئی جگہ نہیں۔ جرمن حکومت نے اپنے ملک کے لوگوں پر خصوصاً صنعت و حرفت اور تجارت پر بھاری ٹیکس لگائے۔ صنعتی کارخانے اور تاجر باہر کے

[illegible] مال بھی نہیں سکتے تھے کہ حکومت کو محصول ادا کریں۔ اس لئے انھوں نے انگلستان اور امریکا کے بینکوں سے اپنی ملکیت اراضی کی ضمانت پر اور جرمن قوم کی محنت اور جفاکشی کی ساکھ پر بے بہ بے قرض لینا شروع کر دیا۔

عموماً غیر سرکاری قرضے انگلستان اور امریکا سے لئے گئے۔ یہ قرض کی رقم ٹیکس کی صورت میں جرمن حکومت کو ادا کی جاتی تھی اور وہاں سے تاوان کی صورت میں پھر غیر ملکوں میں چلی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۱ء میں منقطع ہو گیا کیونکہ اب دنیا کی عام اقتصادی مشکلات کی وجہ سے بین الاقوامی قرضوں کا ملنا ناممکن تھا۔ جولائی ۱۹۲۹ء سے اب تک بین الاقوامی ماہرین کے کم سے کم تین کمیشن مقرر کئے جا چکے ہیں جنھوں نے اس مسئلے پر اچھی طرح غور کر کے یہ فیصلہ کیا اور مختلف حکومتوں کو اس سے آگاہ کر دیا کہ جرمنی یا تو اپنا سیاسی قرض ادا کر سکتا ہے یا تجارتی قرضہ۔ دونوں قرضے ساتھ ساتھ نہیں دے سکتا۔

سب سے زیادہ سیاسی پیچیدگیاں سیاسی قرضے میں پڑتی ہیں کیونکہ تاوان جنگ میں سے ۵۲ فیصدی فرانس کو دیا جاتا ہے۔ مگر تجارتی قرضہ قریب قریب سو فیصدی ایسا ہے جو جرمنی کے تاجروں اور کارخانہ والوں نے انگلستان اور امریکا کے بینکوں سے لیا ہے۔ چنانچہ صرف انگلستان کے بینکوں کا (غیر سرکاری) قرضہ بیس کروڑ پاؤنڈ (تین ارب روپیہ) تک پہنچ گیا ہے۔

غرض اب صورت حال یہ ہے۔ اگر جرمنی سیاسی قرضہ (تاوان جنگ) ادا نہ کرے تو حکومت فرانس کا بجٹ خطرے میں پڑ جائے گا لیکن فرانس کے لئے ان مشکلات کا برداشت کرنا ممکن ہے۔ وہ آج کل دنیا کا سب سے دولتمند ملک ہے لیکن اگر جرمنی اپنا تجارتی قرضہ نہ دے تو انگلستان اور امریکا کے بینک بیٹھ جائیں گے یعنی ان دونوں ملکوں کا پورا مالیاتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

جیسا ڈاکٹر بروننگ نے اپنے اعلان میں کہا جرمنی سیاسی قرضے کے ادا کرنے سے بالکل معذور ہے مگر وہ تجارتی قرضہ ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔ جرمنی کے اس رویئے سے انگلستان اور امریکا کی تجارت محفوظ رہ سکتی ہے گو اس میں فرانس کا نقصان ہے۔ اسی لئے انگلستان اور امریکا مل کر فرانس کی مخالفت کر رہے ہیں اور فرانس کی ہمت نہیں کہ جرمنی سے جنگ کا اعلان کرے کیونکہ یہ گویا انگلستان اور امریکا سے یعنی تقریباً کل مہذب دنیا سے کھلم کھلا دشمنی مول لینا ہے۔

اس صورت حال میں جو زبردست خطرہ پنہاں ہے اس کا تجربہ فرانس کو ابھی سے ہونے لگا ہے۔ چنانچہ آج ہی خبر آئی ہے کہ فرانس کی حکومت کو ایک ایسی متحدہ قومی مجلس وزارت ترتیب دینے میں کامیابی نہیں ہوئی جو روز افزوں

مشکلات کا مقابلہ کرسکے خصوصاً اوان جنگ کی اس کانفرنس میں جو لوزآن میں ہونے والی ہو حصے لینے اس نے اس نے استعفے دیا۔

ان امور سے صاف ظاہر ہو کہ اگر اب یورپ میں کوئی جنگ ہوئی تو انگلستان جرمنی کے خلاف نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوگا۔

ہندوستان

صوبہ متحدہ میں عدم ادائیگی لگان کی تحریک کچھ عرصہ ہوا صوبہ متحدہ کے بعض اضلاع میں کانگریس کی طرف سے عدم ادائیگی لگان کی تحریک اٹھائی گئی ہو جس سے ہندوستان کے

ہوگیا ہو۔ صوبہ متحدہ مثل دوسرے صوبوں کے نہیں

بلکہ یہاں پر دونو کے درمیان زمینداروں کا ایک طبقہ

کا یہ طبقہ انگریزی حکومت کا پیدا کردہ ہو یہاں

مسئلہ ہو جس سے سردست بحث نہیں۔ اصل واقعہ یہ ہو کہ اس صوبے

ہیں: (۱) کاشتکار (۲) زمیندار اور (۳) حکومت۔ ان ہر سہ عناصر کے باہمی اشتراک عمل اور توازن پر اس صوبے کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ ان عناصر کو باہم ایک دوسرے کی نسبت سے جو درجہ حاصل ہونا چاہئے وہ اس وقت نہیں ہو لیکن اس باہمی امتزاج کی کشمکش میں کسی عنصر کو سرے سے خارج کردینے کی کوشش کرنا اس صوبے کی زندگی کو شدید نقصان پہنچائے بغیر ممکن نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ گذشتہ کچھ عرصے سے دنیا کا عام معاشی نظام بہت کچھ بگڑا ہوا ہو اور ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی نے ہندوستان کی عام تجارتی حالات اور اس کی وجہ سے اجناس کی ارزانی نرخ نے صوبۂ متحدہ کی اقتصادی حالت کو اور بھی خراب کردیا ہو۔ بیرون ہند اور ہندوستان کی عام کساد بازاری کی وجہ سے گذشتہ فصل ربیع کی پیداوار کاشتکاروں کے ہاں جوں کی توں پڑی رہ گئی اور ان کے فروخت نہ ہوسکنے کی وجہ سے روپیہ ان کے لئے عنقا ہوگیا ایسی صورت میں جب ادائیگی لگان کا وقت آیا تو کاشتکار بجائے نقدی ادا کرنے کے اجناس کے سوا کچھ نہ پیش کرسکے۔ لیکن غلے کے دانے سکے تو بن نہیں سکتے تھے، تھوڑی بہت جو کچھ بھی اجناس نقدی کی صورت میں تبدیل کی جاسکیں وہ ارزانی نرخ کے باعث بہت کم قیمت ثابت ہوئیں اور اس لئے تخفیف اور عدم ادائیگی لگان کا سوال پیدا ہوا۔

صوبہ متحدہ میں مخصوص اس نوعیت کا سوال پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہ ایک تمام تر زراعتی صوبہ ہے یہاں کی آبادی کا ۹۰ فیصدی حصہ ایسا ہے جو تمام تر زراعت و کاشتکاری زندگی بسر کرتا ہے اور ۱۰ فیصدی ایسا ہے جو جزوی طور پر گزران کرتا ہے۔ اس صوبے کی زراعت سے متعلق کل آبادی تین طبقوں پر مشتمل ہے۔ (۱) زمیندار جن کی تعداد کوئی بارہ لاکھ ہے اور جن میں بیشتر ایسے ہیں جو خود بھی کاشتکاری کرتے ہیں۔ (۲) کاشتکار جن کی تعداد ۵۵ لاکھ ہے، جو بذات خود کاشتکاری کرتے ہیں اور اپنی پیداوار کا ایک حصہ (خواہ بصورت جنس یا بصورت نقد) زمیندار کو بطور لگان دیتے ہیں (۳) مزدور جن کی تعداد ۱۰ لاکھ ہے جو صرف اجرت پر کھیتوں میں کام کرتے ہیں اور اپنی کوئی ملک یا حق کاشت نہیں رکھتے۔

صوبے کی یہ زراعتی مشکلات کچھ آج نئی نہیں بلکہ ایک زمانے سے چلی آتی ہیں۔ سماوی دشواریوں کے علاوہ کہ جن کا کلی انسداد مالکان اراضی آج تک نہیں کر سکے، ایک بہت بڑا مسئلہ اس صوبے کی اضافہ آبادی کا ہے۔ زیادہ سے زیادہ قدیم اعداد جو یہاں کی آبادی کے ملتے ہیں وہ اکبر بادشاہ کے زمانے کے ہیں اور اس وقت اس صوبے کی آبادی ۲ کروڑ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ پھر انگریزی عہد کی ابتدا یعنی ۱۸۰۱ء میں یہی تعداد بڑھ کر ۳ ½ کروڑ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اب ۱۹۳۱ء کی تازہ مردم شماری سے یہ تعداد ۴ کروڑ ۹۵ لاکھ ہو جاتی ہے، گویا ہر دسویں سال یہاں کی آبادی میں ۶ر۰ فیصدی کا اضافہ ہوتا رہا ہے، گو اس کے ساتھ ساتھ یہاں کی مزروعہ زمین کا رقبہ بھی بڑھتا رہا ہے، لیکن وہ آج تک کبھی ۴۰ فیصدی سے آگے نہیں بڑھا۔

یہ کمی حکومت کی طرف سے ذرائع آبپاشی میں توسیع اور طریقۂ کاشت کی ترقی سے پوری کی جاتی رہی ہے اور کچھ عرصے سے حکومت کے تمام میلانات مزارعین اور کاشتکاروں کی حمایت اور تائید میں رہے ہیں۔ اب تک زمینداروں کو اپنے کاشتکاروں کو بے دخل کرنے کا جو حق حاصل تھا ان کے اس حق میں بہت کمی کر دی گئی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ۷۱ فیصدی کاشتکار موروثی کاشتکار ہیں، یعنی وہ اپنا حق کاشت اپنے بعد اپنی اولاد کو منتقل کر سکتے ہیں۔ ۲۹ فیصدی ایسے ہیں جنھیں حین حیات حق حاصل ہے یعنی زمیندار ان کی زندگی میں انھیں اس زمین کا حق کاشت سے محروم نہیں کر سکتا جس پر وہ کاشت کرتے چلے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت کم تعداد ایسی رہ جاتی ہے جنھیں بضرورت بے دخل کیا جا سکتا ہے۔ رسد و بیگار کا ایک نہایت تکلیف دہ حق جو ایک عرصے سے چلا آتا تھا وہ بھی بجز کسی خاص علاقوں کے عام طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اور کوئی زمیندار اپنے اسامیوں سے بلا اجرت خدمت یا بلا قیمت غلہ نہیں لے سکتا

[illegible] سال میں ایک بڑی چیز جو مزارعین کے حقوق کو محفوظ کرنے اور زمینداروں کی دست درازیوں کو روکنے [illegible] کی گئی ہے، وہ قانون لگان آراضیات صوبہ آگرہ ہے۔ جو ۱۹۲۶ء میں زمینداروں کے متفقہ مخالفت [illegible] باوجود سوراجی اور سرکاری ممبران کے اتفاق آرا سے پاس ہوا تھا۔

یہ تمام تحفظات اور مراعات ہیں جو گزشتہ کچھ عرصے سے مزارعین اور کاشتکاروں کے ساتھ ہوتی رہی ہیں اور جن سے اس صوبے کے اندر اس طبقے کی حالت اگر بہت اچھی نہیں تو کچھ بہت بری بھی نہیں رہی ہے، لیکن گزشتہ سال کے اندر نرخ اجناس میں ۳۰ سے [illegible] ۵۰ [illegible] کی [illegible] نے [illegible] حالت پیدا کر دی ہے جس سے کاشتکار پورا لگان ا[illegible] متحدہ نے اس کے لئے یہ کیا کہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے کل مطا[illegible] ایک کرور ۱۰ لاکھ کی کمی کر دی یعنی تقریباً ۱۶ فیصدی ۳۰ سال قبل کے مطالبے سے ۴۰ لاکھ یا ۷ فیصدی کم ہو [illegible] ۴ کرور ۱۲ لاکھ کی کمی ہو گئی ہے۔ یعنی گویا کل مطالبات لگان پر ۴ ر ۱۲ فیصدی رعایت ہو گئی ہے۔

یہ رعایتیں حکومت کی طرف سے خواہ کتنی ہی فیاضی کے ساتھ کی گئی ہوں کاشتکاروں کی مالی دشواریوں کو رفع کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ زمینداروں کی خصوصاً چھوٹے زمینداروں کی حالت بھی قابل رحم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کانگریس کی عدم ادائگی لگان کی تحریک کا شکار سب سے پہلے اور سب سے زیادہ یہی ہوں گے۔ کاش کانگریس کے کارکنوں میں اور ان لوگوں میں کوئی مفاہمت ایسی ہو سکتی جس سے کاشتکاروں کی مشکلات واقعی رفع ہو جائیں۔ مشکل یہ ہے کہ اقتصادی مسئلوں کے ساتھ سیاسی مصلحتیں ایسی [illegible] گئی ہیں کہ جو گرہیں آسانی سے سلجھ سکتی تھیں وہ اور پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔

عالم اسلامی

موتمر اسلام

گذشتہ مہینے کا سب سے اہم واقعہ موتمر اسلام کا وہ عظیم الشان اجلاس ہے جو قدس الشریف میں منعقد ہوا اور جس کو سیاسیات حاضرہ میں بلاشبہ ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سے پہلے بھی مصر و حجاز میں موتمر کے دو اجلاس منعقد ہو چکے ہیں لیکن ان کا تعلق زیادہ تر ہنگامی واقعات سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلامی کے

باہمی ربط وضبط کے لئے ان سے کوئی خاص نتائج مرتب نہیں ہوئے۔ برعکس اس کے، جلاس قدس کے انعقاد میں ایک نہایت اہم اور ضروری مقصد پیش نظر تھا اور وہ یہ کہ مسلمانان عالم کہیں وقتی اور مقامی مصروفیتوں کے خیال میں اپنے ملی اور تمدنی مصالح کو فراموش نہ کردیں۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت عجیب ہے اول تو ان کو اسلام سے بطور ایک تمدن یا نظام اجتماع کوئی ربط یا تعلق باقی نہیں رہا۔ مذہب کی حیثیت ان کے نزدیک کم وبیش ایک مجموعہ عقائد یا شکل عبادات کی سی ہوگئی ہے اور اس میں وہ قوت موجود نہیں رہی جو ان کے انفرادی نشوونما یا جماعتی زندگی کے قیام کا باعث ہو۔ ثانیاً ان کی وطنی اور مقامی ضروریات دن بدن ان کی توجہ کو اپنی طرف جذب کررہی ہیں اور ثالثاً ان کی حالت اس قدر پست ہوگئی ہے کہ وہ دنیا کے سیاسی اور معاشی حالات کی تعبیر اپنے دین مقدس کی روشنی میں نہیں کرسکتے۔ اگر کوئی شخص مذہب کا نام لیتا ہے تو وہ گھبرا اٹھتے ہیں اور ان کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہوجاتی ہے کہ شاید اس کا مطلب ان کے سیاسی اور ملکی مصالح کی نفی ہے حالانکہ سیاست اور خدمتِ ملک و وطن میں ان کا رویہ مذہب اور تمدن کی طرف سے کچھ ایسی بے اعتنائی پیدا کردیتا ہے جس سے بجا طور پر تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس حماقت آمیز کشمکش میں گرفتار ہیں کہ آیا ان کی اجتماعی حالت اسلام کی بدولت سدھرے گی یا اول ان کی اجتماعی حالت ٹھیک ہوجائے گی اور پھر اسلام کو ترقی اور سربلندی نصیب ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقاصد الگ الگ نہیں ہیں جیسا کہ غلطی سے بعض لوگ سمجھ لیتے ہیں بلکہ وہ ایک ہی مقصد کے دو مختلف اجزا ہیں جن کی تکمیل اور نشوونما ساتھ ساتھ ہوتی ہے ہم کسی ایسی ترقی کو صحیح معنوں میں دینی ترقی سے تعبیر نہیں کرسکتے جو اس کے پیروؤں کے انفرادی اور اجتماعی نشوونما کے لئے فلاح و کامرانی کا پیام نہ لائے نہ یہ ممکن ہے کہ اول ایک قوم اسلام کا اصول حیات ترک کردے اور پھر کسی دوسرے طریق سے آزادی اور ترقی کی طرف قدم بڑھا کر اس کی خدمت کا دعویٰ کرے۔ اسلام اور مسلمانوں کی دنیوی کامیابی میں ایک ایسا ربط قائم ہے کہ ایک کے ترک سے قدرتاً دوسرے کا ترک لازم آئے گا۔ لہٰذا ارباب موتمر کی یہ کوشش کہ مسلمانان عالم کے لئے عقائد و مسلمات یا وطنی اور ملکی ضروریات سے الگ کچھ ایسے ذرائع و وسائل تلاش کئے جائیں جن سے ان کے قوائے ملی میں ادھر تو ایک تازہ حرکت پیدا ہو سراسر مستحق ستائش و مبارکباد ہے۔ یہ کہنا کہ دنیائے اسلام کے موجودہ حالات اس نئی تحریک کے لئے کہاں تک امید افزا ہیں۔ ایک طرح کا مغالطہ ہے اس لئے کہ اگر ہماری موجودہ فضا اس قسم کی تحریکوں کے لئے کچھ بہت زیادہ مساعد نہیں لہٰذا نظر بحالات اس کی کامیابی کے آثار کم ہیں تو یہ بھی ممکن نہیں کہ بجز اس قسم کی کسی تحریک کے ہم اپنے حالات میں کوئی خوشگوار

[illegible] پیدا کر سکیں۔ جہاں تک ارباب موتمر کو فراست ایمانی حاصل ہے اور وہ تعلیمات اسلامی پر بصیرت کی نظر رکھتے ہیں اسی قدر مسلمانان عالم کی ضروریات کے متعلق ان کا اندازہ صائب اور ٹھیک ہوگا۔ اور جہاں تک اخلاص وہمت کے ساتھ وہ ان کے اتمام میں سرگرم عمل رہیں گے اسی قدر ان کی کامیابی یقینی ہے۔ ہماری رائے میں بطور ایک تمہیدی اور افتتاحی اجلاس کے موتمر کا انعقاد نہایت کامیاب رہا اور اگرچہ ابتدا ہی میں اس سے کوئی بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرلینا دانشمندی سے بعید ہے لیکن موتمر کے مختلف جلسے اور اس کی کارروائیاں ہمت افزا ضرور ہیں۔

البتہ یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ موتمر کا یہ اجلاس جس قدر اہم تھا اتنا ہی اس کے متعلق غلط بیانی بلکہ رازو اخفاء سے کام لیا گیا۔ ایک تو مسلمانوں کی ذاتی ... بدگمانی کی مصیبت ہی کیا کم تھی اس پر طرہ یہ ہوا کہ خبر رسانی ... صیہونیت کے طرفدار، جہاں تک ممکن تھا اپنے اصول تو ... جس سے موتمر کے متعلق کوئی صحیح خیال قائم کرنا دشوار تھا۔ ... بھی نہیں اور جھپیں تو غلط۔ البتہ شرکائے موتمر کے باہمی اختلافات کو خصوصیت سے ساتھ شہرت دی گئی اور وہ ناگوار واقعہ جو ایک مصری مندوب کی بدولت ابتدائے موتمر میں پیش آیا اس کے متعلق خوب خوب رنگ آمیزی سے کام لیا گیا گویا موتمر کی ساری کامیابی اور ناکامی کا دارومدار اسی ایک مندوب کے طرز عمل سے وابستہ تھا۔ اجلاس موتمر سے پہلے بھی مغرب کی خبر رساں ایجنسیاں اس مبارک تحریک کے بارے میں حتی الوسع مبالغہ آمیز بیانات اور گمراہ کن اطلاعات شائع کرتی رہیں۔ اول خلافت کا مسئلہ چھیڑا گیا۔ پھر یہ فتنہ اٹھایا گیا کہ مفتی فلسطین جامعہ ازہر کے حریف بننا چاہتے ہیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد یہ اطلاع موصول ہوئی کہ مسلمانان عالم نے موتمر کی دعوت پر کسی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا، نہ کوئی اسلامی ریاست اس کی کارروائیوں میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مثلاً جب اجلاس موتمر سے کچھ مدت پہلے مفتی سید امین الحسینی قاہرہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں انہوں نے اکابر مصر سے موتمر کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے تو اس پر جریدۂ اسٹیٹسمین کے نامہ نگار مصر نے جس انداز میں تنقید فرمائی وہ یہ تھا:-

"... قاہرہ میں عام خیال یہ ہے کہ فلسطین کی مجوزہ اسلامی یونیورسٹی ازہر کے مقابلے پر قائم کی جا رہی ہے ... مفتی فلسطین کہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی کا مقصد صرف اس صیہونی جامعہ کے اثرات کو زائل کرنا ہے جو قدس میں موجود ہے ... انہوں نے یہ

بھی کہا ہے کہ موتمر سے مقصود مسلمانان فلسطین کی حالت کو مستحکم اور قومی بنانا ہے تاکہ وہ صیہونیوں کو اپنی اس خواہش میں کہ اماکن مقدسہ ان کے تصرف میں آجائیں کامیاب نہ ہونے دیں۔ الحاج امین اس معاملے میں صریحاً غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں ... اماکن مقدسہ کا مسئلہ محض ان کے ذہن کی پیداوار ہے ... اس لئے کہ اس کا تعلق صرف دیوار گریہ سے ہے جس کے بارے میں "مہذب دنیا" (دواوین ہمارے ہیں) جمعیت اقوام کی خاص مجلس کا فیصلہ قبول کر چکی ہے ... مسلمانان مصر پر سید امین الحسینی کی اس کوشش کا جو جذباتی پر مبنی ہے کوئی اثر نہیں پڑا ... یہاں ہر شخص کو یہ بدگمانی ہے کہ مفتی فلسطین قدس کو خلافت کا مرکز بنانا چاہتے ہیں حالانکہ مصریوں کو ... خود اس کی خواہش ہے۔"

گویا ایک ہی وقت میں موتمر کے متعلق وہ تمام فتنے چھیڑ دئے گئے جن سے اس کے مقاصد کو نقصان پہنچنے کی توقع تھی۔ مسلمانان عالم کی باہمی رنجشوں اور ان کے رہنماؤں کے ذاتی اختلافات کا مسئلہ تو اب بہت پرانا ہو چکا ہے۔ اس کی بجا یا بے جا شہرت کے ساتھ ہی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ ایک طرف خلافت اور ازہر کے نام سے امم اسلامیہ میں باہم رقابت کا جذبہ پیدا کیا جائے اور دوسری طرف مغربی ائمہ سیاست موتمر کے وجود کو اپنے اغراض و مقاصد کی راہ میں ایک زبردست خطرہ تصور کریں چنانچہ جہاں موتمر کے بظاہر ناکام جلسوں کی تصویریں نہایت مسرت اور اطمینان کے ساتھ کھینچی گئیں وہاں دبی زبان میں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑا۔

"... یہ خیال کرنا نادانی ہوگی کہ موتمر بالکل ناکام رہی ... جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا۔ یہ حقیقت آشکارا ہوتی جائے گی کہ یہ موتمر امم اسلامیہ کے اس عزم کی تمہید ہے کہ وہ اپنے نظم و ضبط کی طرف متوجہ ہوں۔ جونہی یہ تحریک زیادہ سمجھدار لوگوں کے ہاتھوں میں آئی (جیسا کہ یقینی ہے) اس سے مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کی سیاست متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گی یہ خیال ہے جو بہت سے مغربی اہل الرائے حضرات نے ظاہر کیا ہے اور ...."

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت جب ممالک اسلامی ایک دوسرے کی حالت سے قطعاً بے خبر ہیں۔ جب ہمارے اجزائے ملی میں ایک طوفان انتشار رونما ہے۔ نہ مذہب سیاست کا حامل رہا ہے نہ سیاست

جہاں تک یہ واجب ہے سامنے کا وجود ہی نہیں اور اگر ہے تو ارباب حل وعقد اس کی ترجمانی نہیں کرتے
چند مسلمانوں کا عربیت وعجمیت اور عقائد ومسائل کے اختلافات سے قطع نظر کرتے ہوئے اس پاک
اور مقدس سرزمین میں جمع ہو کر جسے انبیاء علیہم السلام کا مولد ومسکن ہونے کا شرف حاصل ہے اسلام کے
مصالح تمدن پر غور کرنا اور بغیر کسی سرمائے یا ذرائع نشر واشاعت کے اس امر پر آمادہ ہو جانا کہ وہ ان
کے حفظ وحمایت کے لئے عملاً جد وجہد کریں، ایک ایسا مبارک اور حوصلہ افزا اقدام ہے جس کا خیر مقدم ہر
مسلمان کو دلی مسرت کے ساتھ کرنا چاہئے۔ اب تک موتمر نے جن مسائل پر غور کیا ہے اور اس نے
جو فیصلے صادر کئے ہیں وہ بتقاضائے وقت وحالات نہایت مناسب ہیں مثلاً اس کی یہ قرارداد کہ فلسطین
میں ایک زرعی بینک قائم کیا جائے، یہود کے سامان تجارت کا مقاطعہ کر دیا جائے اور مسلمانوں کو
صیہونیت کے خطرے سے مطلع کیا جائے فلسطین میں ...
فلسطین کی سیاسی اور اقتصادی ترقی کے لئے بھی مفید
اقصیٰ کا قیام اور مصر میں ایک جامع عربی لغت کی تی...
کی نشاۃ ثانیہ میں ان کی اہمیت کو نظر انداز کرنا ناممکن
اسلام اپنی انجمنیں قائم کریں بلاد اسلامیہ کے باہمی ربط وضبط اور ان میں ...
احساس پیدا کرنے میں بڑے بڑے موثر ذرائع عمل کا موجب بن سکتی ہے۔ اسی طرح اماکن مقدسہ اسلام
اور براق شریف کے تحفظ کا عہد، الحاد ولا مذہبیت کے خلاف تعلیمات اسلامی کے نشر واشاعت کا عزم اور
حجاز ریلوے کو واپس لینے کا تہیہ کہ وہ ایک عظیم الشان اسلامی وقف ہے۔ نہایت ہی مبارک اور مفید
ارادے ہیں جن کے حصول واتمام پر ممالک اسلامی کے لئے بلا شبہ نہایت اہم اور دوررس نتائج مرتب
ہوں گے۔

البتہ یہ امر کہ موتمر کو ان مقاصد میں کہاں تک کامیابی ہو سکتی ہے بہت کچھ وقت طلب ہے اور
اس کے متعلق ابھی سے کوئی خیال ظاہر کرنا قبل از وقت ہوگا لیکن اگر موتمر کے شرکا اور ان کی سرگرمیوں
سے مستقبل کے متعلق کوئی توقع قائم کرنا ممکن ہے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اجلاس نہایت
کامیاب رہا اور یقین ہے کہ تبدیلی حالات کے ساتھ اس کی کامیابی کی رفتار بھی برابر بڑھتی رہے گی
اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ موتمر میں تقریباً وہ سب بزرگ موجود تھے جو اپنی خدمات اسلامی اور اخلاص و
ایثار کے لئے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان حضرات نے موتمر کی تمام کارروائیوں میں نہایت گرمجوشی سے
حصہ لیا۔ اس کی مختلف مجلسوں میں باہم مل کر کام کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی صحبتوں اور مشوروں میں

ٹھیک بیٹھے ہیں اور جہاں تک ممکن تھا آپس میں تبادلۂ خیالات بھی کیا۔ ممکن ہے کہ ان ملاقاتوں کا فوری طور سے کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو۔ اس امر کا تو جناب راقم کو بھی اعتراف ہے کہ سید امین الحسینی کی مخالف جماعت کو مؤتمر سے تعاون سے کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ مؤتمر کی تمام کارروائیوں سے ایک زبردست روحِ اخوت اور ولولۂ عمل کا اظہار ہوتا ہے اعضاء ارباب مؤتمر نے اپنے قول و فعل سے اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی ضروریات کے ساتھ اسلام کے بلند و برتر مقاصد سے ناواقف نہیں۔ اس کے لیے صرف اس مسرت آمیز واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ کہ ملتِ اسلامیہ کی وحدت اور اسلام کی بے تعصب اور تفرق و انتشار سے بالاتر روح کے تقاضے پر ایک شیعی رہنما یعنی سید محمد حسین الکاشف الغطاء نے جامع اقصیٰ میں امامت فرمائی اور تمام حضار مؤتمر نے ان کے پیچھے فریضۂ نماز ادا کیا۔ ہماری رائے میں مؤتمر کا انعقاد نہایت مناسب موقعہ پر عمل میں آیا ہے اور اس کا وجود جس سرزمین سے وابستہ ہے اس کے رہنے والے ان تمام خصائص عمل اور ملکاتِ ذہنی کے مالک ہیں جو عزت و کامرانی کی شرط ہیں اور جن کے ہوتے ہوئے کوئی سعی و کوشش ناکام نہیں رہ سکتی۔ ممکن ہے ہم اپنی فرسودہ سیاست یا بے روح زندگی کی بدولت مؤتمر کے مستقبل سے ناامید ہوں لیکن ہمیں اپنی بے بصری اور کور ذوقی سے بڑھ کر ان بلند ہمت اور اولوالعزم لوگوں کے قوائے عملی و فکری پر اعتماد رکھنا چاہیے جن کو قدرت نے ایک حساس دل اور بے چین طبیعت عطا کی ہے اور جن کی حمیتِ دینی اور ذوقِ جہاد و حریت ایک عالم میں مسلم ہے۔ بفضلہ تعالیٰ مؤتمر میں وہ پختہ کار اور زیرک اہلِ سیاست بھی شامل ہیں جن کا فہم و تدبر اور حزم و احتیاط اعتراض سے بالاتر ہے اور اس میں وہ بالغ نظر اور نکتہ بین اربابِ بصیرت بھی شریک ہیں جن کو زندگی اور اس کے حقائق پر غیر معمولی دسترس اور عبور حاصل ہے۔ یقین ہے کہ عالمِ اسلامی کے ہر حصے میں اس تحریک کا دلی جوش اور سرگرمی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ البتہ اس کی کامیابی کا راز صرف اس اسلوبِ ذہنی پر منحصر ہے جس کی طرف مؤتمر کے خاتمے پر علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا۔ جب مندوبین کو الوداع کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہ ان سے بڑھ کر حقائق کی ترجمانی کا دعویٰ اور کسے ہو سکتا ہے فرمایا: "... اسلام کو اس وقت دو خطرے درپیش ہیں ایک الحاد و مادیت اور دوسرا وطنیت و قومیت کا، مجھے یقین ہے کہ اسلام کی پاک اور مقدس روح ان دونوں خطرات کو شکست دے سکتی ہے۔۔ مجھے اسلام کے دشمنوں سے اتنا اندیشہ نہیں جتنا خود مسلمانوں سے۔۔ حضرت سرورِ کائنات صلعم کی ایک حدیث ہے انا حظکم من الانبیا وانتم حظی من الامم۔ میں جب کبھی اس کا خیال کرتا ہوں تو میری گردن شرم و ندامت سے جھک جاتی ہے۔ کیا آج ہم مسلمان اس قابل ہیں کہ جنابِ رسالتمآب صلعم ہم پر فخر کریں؟ البتہ جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر سکیں گے جو رسول اللہ صلعم نے ہمیں عنایت فرمایا تھا تو ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ حضور ہم پر فخر کریں۔۔۔"

شذرات

اردو اکادمی کا پہلا لکچر جس کا اعلان ہم پچھلے پرچے میں کر چکے ہیں، ۶ر جنوری کو ہوا۔ علاوہ جناب صدر کے باہر کے ارکان میں سے جناب خواجہ غلام السیدین صاحب جناب تجمل حسین صاحب، جناب یوسف الزمان صاحب اور جناب محمد یحییٰ صاحب تنہا تشریف لائے تھے۔ مقامی ارکان اکادمی اور دہلی کے دوسرے علم دوست حضرات بھی موجود تھے خصوصاً کالجوں کے طلبہ بہت کافی تعداد میں شریک تھے۔ جلسے کا افتتاح خواجہ غلام السیدین صاحب صدر جلسہ کی تقریر سے ہوا۔ موصوف نے حاضرین کو لکچروں کے اس سلسلے کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی جو اکادمی نے شروع کیا ہے اور اکادمی کی علمی خدمات کے متعلق بہت [illegible] اس کے بعد سید وہاج الدین صاحب کا تعارف کرایا۔ سید صاحب علی گڑھ کے [illegible]

بی اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور اسی سال سرکا[illegible]

ٹریننگ کے لئے ڈھاکہ بھیجے گئے اور اول نمبر پر کامیاب [illegible]

کالج میں معاشیات اور نفسیات کے پروفیسر ہیں۔ آپ کی ادبی [illegible]

متعدد گراں قدر ترجمے شائع کر چکا ہے۔ گذشتہ سال ہندستانی اکیڈمی نے آپ کی ایک تالیف "نفسیات [illegible]" پر انعام دیا ہے۔ آپ کے اسلوب بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ دقیق علمی مضامین کو ایسے دلپذیر اور دلنشین انداز میں پیش کرتے ہیں گویا پتھر کو پانی کر دیتے ہیں۔

جناب صدر کی تقریر کے بعد سید وہاج الدین صاحب نے اپنا فاضلانہ مقالہ "نفسیات مذہب" پڑھا جس کا خلاصہ آئندہ مہینے رسالہ جامعہ میں شائع ہوگا اور پورا لکچر رسالے کی شکل میں تین چار مہینے کے اندر چھپ جائے گا۔

آخر میں جناب صدر نے فاضل مقرر کا شکریہ ادا کیا اور لکچر کے موضوع کے متعلق حاضرین کو اپنے خیالات سے مستفید فرمایا۔ جلسہ جناب شیخ الجامعہ کی تقریر پر ختم ہوا جس میں موصوف نے اکادمی کی طرف سے جناب صدر اور فاضل مقرر کی خدمت میں تحفۂ سپاس و امتنان پیش کیا۔

اکادمی کا دوسرا لکچر ۱۴ر فروری یوم یکشنبہ کو منعقد ہوگا۔ وقت کا تعین ابھی نہیں ہوا ہے۔ حضرات اراکین کو دعوت ناموں کے ذریعے سے اطلاع دے دی جائے گی۔ جناب قاضی عبدالغفار صاحب سابق مدیر جمہور، جمال الدین افغانی کی سیرت پر تقریر فرمائیں گے جس کے متعلق موصوف مدت سے تحقیق و

[illegible] میں جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب استاد تاریخ مسلم یونیورسٹی نے جلسے کی صدارت [illegible] فرمایا ہے۔

ہم اس نمبر میں جناب نواب نصیر حسین صاحب خیالؔ کا ایک مضمون "ہماری شاعری" [illegible] سے شائع کر رہے ہیں۔ یہ ایک خطبہ ہے جو جناب موصوف نے مسلم یونیورسٹی سٹے یونین کے لئے مرتب فرمایا [illegible] ہم نواب صاحب کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے یہ مضمون رسالہ جامعہ میں اشاعت کے لئے عنایت کر دیا۔ نواب صاحب کے کیف بیان سے خمخانہ ادب کے پرانے میخواروں نے تو ایسے ایسے لطف اٹھائے ہیں کہ اب تک مزے لے رہے ہیں لیکن نئے پینے والے اس لذت سے محروم ہیں کیونکہ ایک عرصے سے موصوف نے بزم خیال کے میکدہ بے خروش کو چھوڑ کر عرصہ عمل کو جولان گاہ بنا لیا ہے۔ شکر ہے کہ خیالی خم کی مہر ٹوٹی اور بادۂ کہن میں پھر جوش آیا۔ اسی ایک مضمون سے ناظرین جامعہ کو حضرت خیال کے طرز تخیل اور طرز ادا کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس میں آپ نے شاعری کو اس رنگ میں دکھایا ہے جس میں آج کل کے وجدانی حکیم فلسفے کو دکھاتے ہیں یعنی اس پر اسرار قوت کے ذریعے سے جسے وجدان کہتے ہیں، بغیر عقل و ادراک کی مدد کے حقیقت اور سرچشمۂ حقیقت میں ڈوب جانا یا یوں کہئے کہ اپنی روح کو روح کائنات سے ہم آہنگ کر کے کائنات کی ہم آہنگی، تناسب، ترصیع یعنی حسن کا جلوہ دیکھنا اور دکھانا۔ اس چیز کو پیش نظر رکھ کر حضرت خیال نے تاریخ کے چند مناظر دکھائے ہیں جن میں عام تمدنی کا ایک دھندلا سا خاکہ کھینچ کر اس میں ہر دور کی شاعری کا نقش ابھارا ہے۔ ہماری رائے میں ناظرین حضرت خیال کے اسلوب بیان کی حلاوت اور کیف سے سرور حاصل کرنے کے بعد بھی تشنہ لب رہ جائیں گے اور موصوف سے فرمائش کریں گے کہ جس گردہ تصویر کی نقوش نے طرح ڈالی ہے اس میں رنگ بھر کر اسے مکمل کر دیں۔

ہم نے افسانہ نویسی کے جس انعامی مقابلے کا اعلان کیا تھا اس کے لئے آخری نمبر تک متعدد افسانے موصول ہوئے جو کمیٹی کے سامنے پیش کئے گئے۔ افسوس ہے کہ کمیٹی کے نزدیک کوئی افسانہ اس معیار پر پورا نہیں اترا جو انعام کے لئے مقرر کیا گیا تھا اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ ان میں سے دو تین افسانے رسالے میں شائع کرنے کے لئے منتخب کر لئے جائیں اور انعام کی رقم ان کے لکھنے والوں میں تقسیم کر دی جائے۔ یہ افسانے آئندہ چند مہینے کے اندر شائع ہوں گے اور اشاعت کے بعد مجوزہ معاوضہ مصنف کی خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی۔ اے آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ سے شائع کیا)

نفسیات مذہب

یہ اس خطبہ کا خلاصہ ہے جو سید وہاج الدین صاحب بی اے، بی ٹی پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد نے اردو اکادمی کے جلسے میں، ۸ر جنوری ۱۹۲۳ء کو پڑھا تھا۔ امید ہے کہ پورا خطبہ دو تین مہینے کے اندر رسالے کی شکل میں چھپ کر اور ارکان اکادمی کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔

(مدیر)

مذہبیت یا حاسہ مذہبی، فطرت انسانی کے سربستہ اسرار میں سے ہے جن کی تحلیل دشوار ہے۔ اس کی نزاکت اور لطافت، علمی موشگافیوں کی تحمل نہیں ہو سکتی۔ یا یہ کہیے کہ خشک علمیت اس کی عقدہ کشائی کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رکھتی، اور مذہب کے علمی مفتش کو قدم قدم پر یہ طعنہ سننا پڑتا ہے کہ

از بے خبری اے بے خبراں معذورند ذوقیست دریں بادہ کہ مستاں دانند

مذہب کو ٹٹولنا صرف انجان جگہوں میں قدم رکھنا ہی نہیں ہے۔ بلکہ انسان کے متاع دل اور روحانی سرمایہ پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ بقول میر

یہ کارگاہ ساری، دوکان شیشہ گر ہے

کچھ مذہب ہی پر موقوف نہیں نفس انسانی کی تمام تاثرات، تمام جذبات، تمام وجدانات اسی نوع کے شخصی اور سربستہ راز ہوتے ہیں۔ ان کی پوری پوری حقیقت اور معنویت سے اگر کوئی واقف ہوتا ہے تو صرف وہ نفس جو انہیں آغوش میں پال رہا ہو۔ دوسرا انھیں سمجھ ہی نہیں سکتا غریب فلسفی اور نفسیات داں اپنا ہی کھاتے ہوئے دور کا دور ہی کھڑا رہتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ان تاثرات کی توجیہ کر دے گا۔ ان کی تقسیم در تقسیم کر ڈالے گا۔ کوئی موٹی سی اصطلاح بتا دیگا۔ اور بس۔ اس سے زیادہ کا وہ اہل نہیں۔ محض دقت نظر اور نظری علمیت اس کے کام نہیں

[illegible]ی جب تک کہ وہ ویسا ہی جیتا جاگتا، فروزاں، رخشندہ وجہندہ شعلہ احساس اپنے دل میں نہ پیدا کرلے۔
[illegible]ضوع پر بحث کرنے سے پہلے اقبال کی زبان میں میری دعا صرف یہ ہے کہ :

یارب! درون سینہ دل باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم، آں نظر بدہ

[illegible]ب کی تعریف | تاثرات اور وجدانات کی تعریف [illegible] دشوار [illegible] کیفی
اور ذوقی ہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ ان کے مظاہر [illegible]
ہیں، لیکن ان کی کوئی جامع و مانع تعریف کرنا اگر [illegible]
اتم حاسہ مذہبیت کی تعریف کا ہے۔ خود ءالمان
اور رمز آشنایان معرفت

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نیست

کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں، تو نفسیات داں ایک تعریف پر کیونکر قائم اور متفق ہو سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔
مذہبیت کے لازمی عناصر تین ہیں، عمل، ایمان اور مذہبی تاثرات لیکن ان تینوں کی ہم آہنگی ضروری ہے، محض عقیدہ بغیر عمل صالح کے، مذہب کے مفہوم سے اتنا ہی مستبعد ہے، جتنا کہ محض اخلاقی عمل بغیر ایقان اور ایمان کے۔ پس ان مختلف اجزا کا ہونا ضروری ہے۔ چونکہ ہماری بحث کسی خاص عرفی مذہب سے نہیں بلکہ ان کی قدر مشترک یعنی حاسہ مذہبیت سے ہے، اس لئے ہم اس کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ "انسان کے وہ تمام افعال تاثرات اور تجربات جو اس عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں کہ ایک ہستی بزرگ و برتر موجود ہے جو حقیقت کا سرچشمہ اور نجات کا مدار ہے" یہ تعریف ہمارے موضوع کے لئے بہت موزوں ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، ہمارا تعلق خاص خاص مذاہب اور ان کے مخصوص ارکان و عبادات و دیگر ادارات سے نہیں، بلکہ عبد اور معبود کے تعلق سے ہے یعنی اس حاسہ روحانی سے جو ہر شخص میں موجود رہتا ہے، خواہ وہ اعمال و عبادات مذہبی کی شکل میں ظاہر ہو یا نہ ہو، عالم لاہوت کے متعلق ہو، یا ناسوت کے، شریعت ہو یا طریقت، منصور کا نعرۂ "اناالحق" ہو

یا اس گڈریے کا عقیدۂ تجسیم و تشبیہ جس کا قصہ مولانائے روم نے لکھا ہے۔

ان دیکھی حقیقت پر ایمان عشق مجازی کی طرح، عشق حقیقی، جسے ہم نے حاسۂ مذہبی کہا ہے، کوئی ایک جذبہ نہیں، بلکہ وجدان ہے اور مختلف جذبات سے مرکب ہے۔ وجدان اور جذبے میں یہ فرق ہے کہ وجدان کوئی خاص جذبہ نہیں بلکہ ایک مجموعی ذہنی کیفیت یا رجحان نفس کا نام ہے جس کے ماتحت مختلف اوقات میں مختلف جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔

اگر سوال کیا جائے کہ مذہبیت کی امتیازی خصوصیت کیا ہے تو عام لفظوں میں اس کا جواب یہ ملے گا کہ مذہبیت کی بنیاد یہ عقیدہ یا ایمان ہے کہ ہمارے اس عالم مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظام کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام موجود ہے، جس کے منشاء کے ساتھ خود کو مطابق کرنا انسان کا خاص فرض ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خود اس

"دیکھے بھالے بن سوجھے جانے پہچانے، بن بوجھے"

وجود کا احساس انسان کے نفس میں کیونکر ہوتا ہے۔ جب ہم ایمانی کیفیت کے اثر پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ماتحت وجود باری تعالیٰ کا احساس (تصور نہیں، بلکہ احساس) ایک حقیقت محسوس کی طرح انسان کے ساتھ رہتا ہے، بقول امام غزالیؒ کے

"طریقۂ تصوف پر کاربند رہنے سے ایک ایسی وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی حیثیت ایک صریحی ادراک کی سی ہوتی ہے، جیسے کہ انسان خود اپنے ہاتھ سے کسی چیز کو ٹٹول رہا ہو"

اقتضائے ایمانی سے ان دیکھی حقیقت، دیکھی بھالی، سمجھی بوجھی حقیقتوں سے زیادہ حقیقی بن جاتی ہے اور جس طرح ایک مقناطیس کی جنبش سے گرد و پیش کی آہنی اشیاء مقناطیسیت سے بھر جاتی ہیں، اسی طرح سے ایمانی مقناطیسیت انسانی شعور کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتی ہے اور اس کے حواس پر غالب آجاتی ہے، کائنات کا ہر ذرہ تجلی زار نظر آتا ہے۔ صفات الٰہی، رحیمی و کریمی، جباریت و قہاریت عدل و احسان محض تصورات نہیں بلکہ محسوسات بن کر دنیا میں ہر طرف محیط نظر آتے ہیں۔

ایمان باللہ کے اجزائے نفسی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود یہ ایمانی کیفیت جس سے ان دیکھی حقیقت موجود بن جاتی ہے، کیا چیز ہے؟ عقیدہ یا ایمان کے پانچ نفسی محرکات ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں یعنی (۱) سب سے پہلے روایت بچپن کی تعلیم اور ماحول کا اثر جسے ہم اثر پذیری یا انفعالیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ (۲) دوسرے فطرت کے حسن وجمال کا تصور اور کائنات کے توازن اور ہم آہنگی کو دیکھ کر مبدء فیاض کا یقین۔ اسے ہم فطری عنصر کہہ سکتے ہیں (۳) تیسرے اخلاقی کشمکش کا احساس اور اس سے ایک اعلیٰ اخلاقی مقنن ...

داخلی تاثری عنصر، مثلاً انسان میں مذہبی جذبات

صوفیانہ کیفیت نفسی اسی عنصر میں آتی ہے (۵)

نظام کائنات کی باقاعدگی اور ترتیب سے یہ عقیدہ پیدا ...

صاحب مشیت ہستی ضرور ہے۔ ہم اس ترتیب سے فرداً فرداً ان عناصر خمسہ سے بحث کریں گے۔

(۱) روایتی عنصر یا اثر پذیری۔

انسانی سیرت کی تشکیل میں تفکر اور استدلال کا دخل اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی عادتوں، اس کے اخلاق اور اس کے معتقدات کو سانچے میں ڈھلنے والے زیادہ تر ماحول تعلیم اور تربیت کے اثرات ہوا کرتے ہیں۔

ہمارے مذہبی عقائد میں بھی بہت زیادہ دخل بچپن کے ماحول اور تعلیم و تربیت کا ہوتا ہے کوئی بچہ ذات باری تعالیٰ کا ایمان عقلی ثبوت سے نہیں بلکہ ماں کی گود میں، یا خاندان والوں کے افعال واقوال کی وجہ سے حاصل کرتا ہے اور اس طرح جو بنیادیں قائم ہوتی ہیں وہ اٹل ہوتی ہیں۔ دوسروں کے علاوہ، انسان خود اپنے نفس پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ دعا اور عبادت کا اثر اسی قسم کا خود آفریدہ اثر ہوتا ہے۔ انسان جب صدق دل سے دعا مانگتا ہے تو اپنے قلب میں طمانیت اور سکون کا اثر پاتا ہے۔ عبادت میں خضوع وخشوع سے نفس میں انکساری اور فروتنی پیدا ہوتی ہے۔ مرشد کے سامنے حاضر ہو کر مشکلیں بیان کرنے سے نفس کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ ارشاد وہدایت سے نفس کو رہبری ملتی

ہے منتشر ذہن میں یک سوئی پیدا ہوتی ہے۔ ہر مذہب کی عبادت کا فلسفہ زیادہ تر اثر پذیری ہی کے ضمن میں آتا ہے۔ عبادت کے ارکان و قواعد ایسے ہوتے ہیں جن سے نفس کی اثر پذیری بڑھ جاتی ہے۔ جسمانی طہارت و پاکیزگی کا انعکاسی اثر ذہن پر پڑتا ہے۔ عبادت گاہوں کی خاموش فضا احترام کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ حضورِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ عبادت کے الفاظ سے تسکین ہوتی ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

نہ صرف عقیدہ یا ایمان، بلکہ ہر قسم کے معتقدات اور ہر قسم کی تعلیم بھی اسی انفعالیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک عالم کے علمی معتقدات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں بھی یہی عنصر موجود ملے گا۔ نفسیاتِ جدید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آج اس نے یہ حقیقت ثابت کر دی ہے کہ انسانی زندگی تعقل اور استدلال کی اتنی ماتحت نہیں ہے جتنی جذبات و وجدانات کی۔ نظامِ نفسی ارسطو اور مل کے منطقی قوانین کا اتنا پابند نہیں ہے جتنا والہانہ جذبات و وجدانات کا۔ انسانی زندگی میں جو کچھ خوشگواری پائی جاتی ہے، ہمارا مذہب، ہمارا ادب، ہمارے فنونِ لطیفہ سب کا سرچشمہ یہی غیر فکری عناصر ہیں اور یہ انسان کے لئے باعثِ ننگ نہیں ہیں۔

(۲) فطری عنصر

مناظرِ فطرت اور حسنِ قدرت کا دخل عقیدہ یا ایمانی کیفیت پیدا کرنے میں ہمیشہ رہا ہے۔ اس وقت بھی جب کہ انسان وحشی اور غیر متمدن تھا، اس کے پاس مذہبی سہارا نہ تھا اور نہ روحانی سرمایہ، وہ فطرت کے جمال میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھتا تھا، پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی پکار پکار کر اسے ایک وجود کی طرف متوجہ کرتی تھی، سورج کی خنکیں کرنوں میں چاند کی ٹھنڈک میں صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں اسے آیاتِ الٰہی نظر آتی تھیں اور وہ اپنے عقیدے کا اظہار ان کی پرستش سے کرتا تھا۔ آج اگرچہ ان محدود اور مخصوص معنوں میں مظاہر پرستی دنیا میں نہیں پائی جاتی، لیکن فطرت کے حسین مناظر اب بھی دیکھنے والوں سے احترام اور عقیدت کا خراج وصول کرتے ہیں۔ سخت سے سخت دل پگھل جاتے ہیں اور بے حس لوگ بھی "فتبارک اللہ احسن الخالقین" پکار اٹھتے ہیں۔

اس ایمان آفریں احساس فطرت میں ہمیں تین قسم کے نفسی تجربات نظر آتے ہیں، احساس رحمت الٰہی، احساس توازن کائنات اور احساس حسن وجمال، یہ تینوں اجزا انسان کے دل میں ایمانی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کیفیت کو صوفیانہ کیفیت نفسی بھی کہتے ہیں۔

(۳)۔ اخلاقی عنصر

انسان کو عالم صغیر کہا گیا ہے اور عالم کبیر کی طرح [illegible]
ہے۔ ایک طرف تو انسان کے طبعی تقاضا [illegible] خوا[illegible]
ہیں اور تسکین چاہتے ہیں، دوسری طرف عالم [illegible]
تقاضاؤں کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ اس سے متصادم [illegible]
کا اخلاقی قانون، اور جب کوئی انسان، اپنے نفس میں متضاد [illegible]
ہے، کچھ رجحانات ایسے پاتا ہے جو اسے اتباع قانون کی طرف مائل کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اسے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی پر آمادہ کرتے اور ابھارتے ہیں تو وہ بر خود قیاسی کے تقاضے سے مجبور ہو کر، جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، تائیدی رجحانات کو "خیر" اور تردیدی خواہشات کو "شر" سمجھتا ہے اور انھیں دو علٰحدہ علٰحدہ قوتوں سے منسوب کرتا ہے، یعنی رحمانی خیالات اور شیطانی خیالات دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انسان اس تصادم کے احساس ہی سے فطری طور پر یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس اخلاقی دار و گیر میں انسان کو راہ ہدایت پر قائم رکھنے اور شر سے بچانے کے لئے ایک اعلیٰ عقل کا وجود ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی جماعت کا اخلاقی قانون اور عدالت کے تادیبی قوانین ایک حد تک انسانی کردار کی نگرانی کرتے ہیں لیکن صرف انھیں کا اثر انسان کو خیر پر قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ان قوانین سے زیادہ سے زیادہ وہ اخلاق پیدا ہو سکتا ہے جسے انگریزی میں "Daylight Morality" "اجالے کا اخلاق" کہتے ہیں، یعنی اگر کوئی دیکھتا نہ ہو، اگر اخلاقی ذہن ہونے کا اندیشہ نہ ہو، قانونی شکنجے سے بچنے کا موقع ہو تو پھر انسان بدی کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی سلیم الطبع شخص اس اخلاق کو اچھا نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے وہ تقاضائے فطرت سے اس عقیدے پر مجبور ہوتا ہے کہ

صحیح معنوں میں ضبط اخلاق صرف ایمان باللہ ہی سے ہو سکتا ہے یعنی ایک سمیع و بصیر، علیم و خبیر ہستی پر ایمان لانے سے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور جس کی طرف ہر انسان کو آخر میں جانا ہے۔ بعض طبائع اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کے تمام افعال کا سرچشمہ محبت الہی ہوتی ہے، اور بعض طبائع میں حاسہ مذہبی کی محرک خشیت الہی ہوتی ہے۔ کسی کو شان رحیمی و کریمی کے تصور میں ایمانیت کا لطف آتا ہے تو کسی کو جباریت اور قہاریت کے تصور میں۔ کسی کی مذہبیت میں تولا، غالب ہوتا ہے تو کسی کے یہاں تورع۔ کوئی پابندی شریعت سے تسکین قلبی حاصل کرتا ہے تو کسی کو جادۂ طریقت میں اپنا مطلوب مل جاتا ہے غرض تفقہ، شریعت اور تورع میں اخلاقی عنصر نمایاں ہوتا ہے یعنی ذات باری تعالی کو ایک اعلی مقنن سمجھنا عقوبت الہی کے خوف کو ہر وقت سامنے رکھنا امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تصوف، طریقت اور تولا میں تاثری عنصر غالب ہوتا ہے، یعنی محبت الہی اور عشق حقیقی کے جذبات قلب پر وارد کرنا، ایمانیت کا جزو دونوں میں ہے۔ فرق صرف طریقے میں ہے

(۴) داخلی تاثری عنصر۔

مذکورہ بالا بحث ہیں خود بخود مذہبیت کے داخلی تاثری عنصر کی بحث کی طرف لے جاتی ہے۔ نفسیات میں تاثرات کی اصطلاح، جذبات، وجدانات اور حسی حیثیات کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اگرچہ فلسفہ مذہب، یا الہیات کے نام سے، مذہب میں عقلی عنصر داخل کرنے کی کوشش ہمیشہ کی گئی ہے اور جب تک انسان، انسان ہے اور اپنے یقین اور عقیدے کے لئے دلیلیں ڈھونڈتا رہے گا، اس وقت تک یہ کوشش بھی جاری رہے گی، لیکن مذہبیت کو علیت اور فلسفے کی خراد پر چڑھانے کی اس کوشش کے باوجود، نفسیات مذہب کا مطالعہ انسان کو جس نتیجے پر پہنچاتا ہے وہ یہی ہے کہ حاسۂ مذہبیت، ہمیشہ ہر شخص کی جذبی اور تاثری حیات شاعرہ کا ایک راز ہے، اور سراسر ایک انفرادی اور شخصی چیز ہے، مذہبیت کی جڑیں اگر کہیں ملیں گی تو صرف تاثرات کی گہرائیوں میں فلسفہ اور الہیات کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وہی ہے، جو ایک متن کے کسی غیر زبان میں ترجمہ کی ہوتی ہے۔
غرض مذہب کا اساس "سوز و گداز" ہے اور چونکہ اسی کو اصطلاح میں تصوف کہتے

ہیں، اس لئے اس حصے میں ہماری بحث خاص طور پر تصوف ہی سے ہوگی۔

اگر ہم اپنے دل سے یہ سوال کریں کہ انسانی زندگی کی خاص الخاص غرض اس کی سب سے بڑی قوت محرکہ کیا ہے، تو جواب ملے گا کہ خوشی کی تلاش، خوشی کس طرح حاصل کیا جائے، کہاں ڈھونڈھی جائے، کس طرح قائم رکھی جائے۔ یہی خواہش از آدم تا ایں دم، بنی نوع انسان کے تمام افعال کی اصلی محرک رہی ہے جس حد تک کہ خدا سے لو لگانا، اور اس کی رضا جوئی، انسان کے غمگین دل کو، جو عقلی جستجو اور کاوش فکری کا زخم خوردہ رہا ہے، مسرت سے مالا مال کر سکتی ہے، اس حد تک وہ [illegible]

پیدا کرنے میں موثر ہوتی ہے۔

اسی طرح جذبہ مسرت کا عکس یعنی غم کا تاثر بھی انسان [illegible]

رکھتا ہے۔ دنیا گزشتنی وگزاشتنی ہے مایا جال ہے۔ یہاں [illegible]

کے دم توڑنے کا نظارہ ہے، دارو گیر ہے۔ رستخیز ہے۔ [illegible]

سرچشمہ کی طرف لے جاتا ہے، وہ نجات کی تلاش کرتا، اور خدا کو پا لیتا ہے اگرچہ بادی النظر میں یہ دونو پہلو، مسرت اور غم، رجائیت اور قنوطیت ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں لیکن حاسہ مذہبیت کے بیدار کرنے میں دونوں یکساں طور پر موثر ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں ہمیں یہ دونوں جزا سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان دو اساسی تاثرات کا جو اثر مذہبیت پر پڑتا ہے۔ اس کی اس مختصر بحث کے بعد اب ہم ان تاثرات سے بحث کرتے ہیں جو تصوف کی کیفیت نفسی میں پائے جاتے ہیں۔

تصوف | اصطلاح تصوف کی تعریف کی کوشش میں نہیں کروں گا۔ اس سے میری مراد نفس کی وہ ناز کی کیفیت ہے جب عبد اور معبود کے درمیان وجدانی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے، اب خواہ اس کیفیت میں رقت و سوز و گداز کا پہلو نمایاں ہو، یا مسرت آمیز وجد و حال کا۔ اس صوفیانہ کیفیت نفسی کی بہترین مثال اگر کچھ ہو سکتی ہے تو وہ عشق کی کیفیت ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ عشق مجازی کا معروض مادی اور محسوس ہوتا ہے اور عشق حقیقی کا معروض ایک تصور ہوتا ہے جس میں محسوسات کی کیفیت پائی

صحیح معنوں میں ضبط اخلاق صرف ایمان باللہ ہی سے ہو سکتا ہے، یعنی ایک سمیع و بصیر، علیم و خبیر ہستی پر ایمان لانے سے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور جس کی طرف ہر انسان کو آخر میں جانا ہے۔ بعض طبائع اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کے تمام افعال کا سرچشمہ محبت الٰہی ہوتی ہے، اور بعض طبائع میں جاسہ مذہبی کی محرک خشیت الٰہی ہوتی ہے۔ کسی کو شان رحیمی و کریمی کے تصور میں ایمانیت کا لطف آتا ہے تو کسی کو جباریت اور قہاریت کے تصور میں۔ کسی کی مذہبیت میں تولا، غالب ہوتا ہے تو کسی کے یہاں ورع۔ کوئی پابندی شریعت سے تسکین قلبی حاصل کرتا ہے تو کسی کو جادہ طریقت میں اپنا مطلوب مل جاتا ہے غرض تفقہ، شریعت اور تورع میں اخلاقی عنصر نمایاں ہوتا ہے، یعنی ذات باری تعالیٰ کو ایک اعلیٰ مقنن سمجھنا عقوبت الٰہی کے خوف کو ہر وقت سامنے رکھنا امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تصوف، طریقت اور تولا میں تاثری عنصر غالب ہوتا ہے، یعنی محبت الٰہی اور عشق حقیقی کے جذبات قلب پر وارد کرنا، ایمانیت کا جزو دونوں میں ہے۔ فرق صرف طریقے میں ہے

(۴) داخلی تاثری عنصر۔

مذکورہ بالا بحث ہمیں خود بخود مذہبیت کے داخلی تاثری عنصر کی بحث کی طرف لے جاتی ہے۔ نفسیات میں تاثرات کی اصطلاح، جذبات، وجدانات اور حسی جبلیات کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اگرچہ فلسفہ مذہب، یا الٰہیات کے نام سے، مذہب میں عقلی عنصر داخل کرنے کی کوشش ہمیشہ کی گئی ہے اور جب تک انسان، انسان ہے اور اپنے یقین اور عقیدے کے لئے دلیلیں ڈھونڈتا رہے گا، اس وقت تک یہ کوشش بھی جاری رہے گی، لیکن مذہبیت کو علیت اور فلسفے کی خراد پر چڑھانے کی اس کوشش کے باوجود، نفسیات مذہب کا مطالعہ انسان کو جس نتیجے پر پہنچاتا ہے وہ یہی ہے کہ ماشہ مذہبیت، ہمیشہ ہر شخص کی جذبی اور تاثری حیات شاعرہ کا ایک راز ہے، اور سراسر ایک انفرادی اور شخصی چیز ہے، مذہبیت کی جڑیں اگر کہیں ملیں گی تو صرف تاثرات کی گہرائیوں میں فلسفہ اور الٰہیات کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وہی ہے، جو ایک متن کے کسی غیر زبان میں ترجمہ کی ہوتی ہے۔

غرض مذہب کا اساس "سوز و گداز" ہے اور چونکہ اسی کو اصطلاح میں تصوف کہتے

ہیں، اس لئے اس حصے میں ہماری بحث خاص طور پر تصوف ہی سے ہوگی۔

اگر ہم اپنے دل سے یہ سوال کریں کہ انسانی زندگی کی خاص الخاص غرض اس کی سب سے بڑی قوت محرکہ کیا ہے، تو جواب ملے گا کہ خوشی کی تلاش، خوشی کس طرح حاصل کیا جائے، کہاں ڈھونڈھی جائے، کس طرح قائم رکھی جائے۔ یہی خواہش از آدم تا ایں دم بنی نوع انسان کے تمام افعال کی اصلی محرک رہی ہے جس حد تک کہ خدا سے لو لگانا، اور اس کی رضا جوئی [illegible] انسان کے غمگین دل کو جو عقلی جستجو اور کاوش فکری کا زخم خوردہ رہا ہے، مسرت سے [illegible]

پیدا کرنے میں موثر ہوتی ہے۔

اسی طرح جذبہ مسرت کا عکس یعنی غم کا تاثر [illegible]

رکھتا ہے۔ دنیا گزشتنی وگزاشتنی ہے یا یا جال ہے [illegible]

کے دم توڑنے کا نظارہ ہے، وارد گیر ہے۔ رستخیز ہے۔ یہ خیال بھی انسان [illegible] اور باری مسرت سے سرچشمہ کی طرف لے جاتا ہے، وہ نجات کی تلاش کرتا، اور خدا کو پا لیتا ہے اگرچہ بادی النظر میں یہ دونوں پہلو، مسرت اور غم، رجائیت اور قنوطیت ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں۔ لیکن حاسہ مذہبیت کے بیدار کرنے میں دونوں یکساں طور پر موثر ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں ہمیں یہ دونوں اجزا سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان دو اساسی تاثرات کا جو اثر مذہبیت پر پڑتا ہے۔ اس کی اس مختصر بحث کے بعد اب ہم ان تاثرات سے بحث کرتے ہیں جو تصوف کی کیفیت نفسی میں پائے جاتے ہیں۔

تصوف | اصطلاح تصوف کی تعریف کی کوشش میں نہیں کروں گا۔ اس سے میری مراد نفس کی وہ تاثری کیفیت ہے جب عبد اور معبود کے درمیان وجدانی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے، اب خواہ اس کیفیت میں رقت و سوز و گداز کا پہلو نمایاں ہو، یا مسرت آمیز وجد و حال کا۔ اس صوفیانہ کیفیت نفسی کی بہترین مثال اگر کچھ ہو سکتی ہے تو وہ عشق کی کیفیت ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ عشق مجازی کا معروض مادی اور محسوس ہوتا ہے اور عشق حقیقی کا معروض ایک تصور ہوتا ہے جس میں محسوسات کی کیفیت پائی

جاتی ہے۔ اگر صوفیانہ واردات قلب کی نفسیاتی تشریح کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان میں حسب ذیل چار خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ صوفیانہ کیفیت نفسی کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ناقابل اظہار اور ناقابل بیان ہوتی ہیں۔ وہ

دل من داند و من دانم و داند دل من

کا مصداق ہوتی ہیں۔ انسان اگر اسی نفسی حالت کو بیان کرنا چاہے تو صرف مثالوں سے اپنا مطلب سمجھا جا سکتا ہے، بقول غالب

بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر

جس طرح سے موسیقی سے کوئی کن رس ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے، یا عشق کی کیفیت کو کوئی عاشق ہی سمجھ سکتا ہے، اسی طرح صوفیانہ کیفیات نفسی کے سمجھنے کے لئے ضروری ہو کہ اسی قسم کے واردات قلب پر طاری ہوئے ہوں۔

۲۔ دوسری خصوصیت صوفیانہ کیفیت نفسی کی یہ ہوتی ہے کہ ان میں کسی قدر وقوفی یا ادراکی صفت بھی پائی جاتی ہے یعنی ایک خاص قسم کی بصیرت افروزی و دیدۂ دل وا ہوجاتا ہے، اور کئی نہاں راز کے محرم ہوجاتے ہیں۔ ان حالتوں میں غایت درجہ کی تجلیت اور معنویت ہوتی ہے جس کا اثر اس کیفیت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ انسان اپنی زندگی کے ان بصیرت افروز لمحات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ کوئی عقلی دلیل یا منطقی بحث ان پر حقیقت لمحات زندگی کی معنوی قدر و قیمت کو کم نہیں کر سکتی۔

۳۔ تیسری خصوصیت، صوفیانہ کیفیت نفسی کی یہ ہو کہ وہ عارضی اور خواب آسا ہوتی ہیں۔ وہ بجلی کی طرح کوندکے غائب ہوجاتی ہیں اور انسان ہمہ لب تشنۂ تقریر ہی رہجاتا ہے۔

۴۔ سب سے آخری خصوصیت ان کی اضطراریت اور انفعالیت ہو۔ اگرچہ خارجی ذرائع سے انسان اپنے نفس کو ان کیفیات کے نزول کے لئے تیار کر سکتا ہو، مثلاً بعض جسمانی ریاضتوں یا

گھنوں سے، یا موسیقی اور بخور کی مدد سے، یا دھیان اور سمادھی کے ذریعے سے لیکن جب ایک مرتبہ یہ حالت طاری ہوجاتی ہے تو اس وقت نفس کی کیفیت سراسر انفعالیت کی ہوتی ہے۔

رشتہ در گردنم، افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

وہ ایک باطنی قوت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوتا ہے، خیالات پر بھی اسی قوت کی حکمرانی ہوتی ہے، قوت ارادی سلب ہوجاتی ہے۔ اکثر تو شدت تاثر کی وجہ سے بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ چونکہ اکثر دماغی امراض میں بعینہ وہی مظاہر نظر آتے ہیں جو صوفیانہ کیفیات نفسی میں مثلاً النہاس کی حالت میں آدمی نئی نئی شکلیں دیکھتا ہے، اور نئی نئی آوازیں سنتا ہے صرع کی ... [illegible]

احساسات ہوتے ہیں، ہسٹریا کی حالت میں رقت قلب [illegible]

کی صورت میں اعضاء جسمانی معطل ہوجاتے ہیں، اس لئے [illegible]

کوئی بات نہیں ہے کہ وہ صوفیانہ کیفیات نفسی کو بھی خاص [illegible]

وہ سمجھتے ہیں کہ گویا ایسا کرنے سے ان کیفیات نفسی کی ساری معنویت [illegible]

جیمس نے جو باتفاق رائے امریکہ کے اس صدی کے سب سے زیادہ مستند اور متبحر عالم نفسیات ہیں، اپنی کتاب . Varieties of Religious Experience (تجربات مذہبی کی گوناگونی) میں جس سے میں نے بھی بہت کچھ استفادہ کیا ہے، اس طرز خیال کا نام "طبی مادیت" رکھا ہے، اور اعتراضات پر گہری نظر ڈالی ہے، میں انھیں کے الفاظ آپ کے سامنے بیان کئے دیتا ہوں اور چونکہ یہ کسی "صوفی" کے لفظ نہیں، بلکہ ایک مشہور روزگار فلسفی اور ماہر علم النفس کے الفاظ ہیں، اس لئے امید ہے کہ ہمارے معترضین ان پر غور کریں گے، وہ لکھتے ہیں:-

"طبی مادیت سینٹ پال کی مذہبیت کا خاتمہ یہ کہہ کے کر دیتی ہے کہ دمشق کی سڑک پر جو مکاشفہ کی حالت ان پر طاری ہوئی تھی وہ "تعفن موخری" کے ناسور کی وجہ سے تھی اور وہ صرع کے مریض تھے، سینٹ ٹریسا (St. Teresa) کے تقدس کا چراغ یہ کہہ کر گل کر دیتی ہے کہ وہ ہسٹریا کی مریضہ تھیں، سینٹ فرانسس کو یہ کہہ کر ختم

کردیتی ہے کہ اسفل کی طرف راجع ہونے کا میلان ان میں موروثی تھا۔ جارج فاکس (George Fox) کو اپنے زمانے کی جھوٹی بناوٹ در تلبیسات کی طرف جو نفرت تھی اور روحانی صداقت کے لئے اس میں جو بے چینی پیدا ہو گئی تھی اسے اختلال اعصاب بتاتی ہے۔ کارلائل کے اقوال میں قنوطیت اور مایوسی کے جو شعر پائے جاتے ہیں ان کی وجہ امعا کا اختلال قرار دیتی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس قسم کے تمام نفسی ہیجانات، جسم کی مرض پذیری کے نتائج ہیں اور بعض غدود کے غیر طبعی فعل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعد طبی مادیت بڑے فخر و مباہات کے ساتھ کہتی ہے کہ دیکھا میں نے ان تمام بڑی بڑی برگزیدہ ہستیوں کی قلعی کھول کے رکھدی نا!"

اس کے بعد پروفیسر ولیم جیمس فرماتے ہیں:۔

"اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ واردات ذہنی کے اس طرح محض واقعاتی بیان سے ان کی روحانی معنویت پر کسی قسم کا بھی اثر پڑتا ہے؟ ویسے تو ہمارے ذہن کی کوئی حالت ارفع ہو یا اعلیٰ، صحیح الدماغی کی وجہ سے ہو یا عصبی امراض کی وجہ سے، انبساطی ہو یا حزنیہ ایسی نہیں ہے کہ کوئی نہ کوئی جسمی تغیر اس کی وجہ نہ ہوا ہو۔ علمی نظریئے بھی ان جسمی تغیرات کا اسی طرح نتیجہ ہوتے ہیں جس طرح کہ مذہبی تاثرات، اور اگر واقعات کا پوری پوری طرح علم ہو جائے تو شاید ہم کو کثر دہریے کے دہریت آمیز خیالات میں بھی جگر کے فعل کی خرابی اسی طرح نظر آئے جس طرح کہ آج (طبی مادیت کو) اس میتھوڈسٹ میں نظر آتی ہے جو اپنی روحانی نجات کے لئے بے چین ہے!"

آخر میں وہ اپنی قطعی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

"الغرض نفس کے کسی مذہبی تاثر کی جسمی وجہ بیان کر کے یہ دعویٰ کرنا کہ اس طرح اس کی اعلیٰ روحانی قدر و قیمت میں فرق آگیا ہے۔ سراسر ایک بے تکی اور غیر منطقی بات ہے۔ اگر یہی صحیح ہوتا تو پھر تو ہمارے کسی خیال اور کسی تاثر میں حتّٰی کہ کسی علمی نظریئے میں بھی

کسی قسم کی حقیقت باقی نہ رہتی، اس لئے کہ ان سب پر یکساں طور پر انسان کے جسم کی حالت کا اثر پڑتا ہے . . . . پس ہمیں چاہئے کہ اس کل معاملے پر دیانت کے ساتھ غور کریں۔ جب ہم کسی نفسی کیفیت کو دوسری نفسی کیفیتوں پر ترجیح دیتے ہیں تو کیا ہم وجہ سے کہ ہمیں اس کے جسمی مقدمات معلوم ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ ہماری اس ترجیح کے صرف دو وجوہ ہوتے ہیں اولاً تو یہ کہ ہمیں ان نفسی کیفیات سے فوری مسرت ہوتی ہے یا پھر کہ ہم سمجھتے ہیں کہ انجام کار ان کے نتائج ہماری زندگی کے لئے با[illegible]

ہوں گے . . . . الخ

نفسی کیفیات کا ہماری رایوں کے مطابق ہ[illegible]

یہی وہ معیار ہیں جن سے کسی خیال یا اثر کی [illegible]

صوفیانہ حالت کی بسیط ترین مثال تو وہ کیفیت ہے جو [illegible]

ہے. وہ شعر ہم پہلے بھی سن چکے ہیں لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ دل میں تازہ و موثر نفس کے تاروں کو ایک خاص انداز سے چھیڑ دیتا ہے۔ اس شعر کی معنویت جیسی اس حالت میں ہم پر منکشف ہوتی ہے، پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک نیا ہی جہان معنی ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح سے بعض مناظر قدرت، خوشبوئیں، روشنی اور اندھیرے کا سنجوگ، سطح سمندر پر دھوپ چھاؤں کا نظارہ، پھولوں کا کھلنا، یہ سب باتیں بھی نفس انسانی کے کل پرزوں میں کوک بھر سکتی ہے۔

اس کے بعد دوسری منزل یہ ہو سکتی ہے کہ ہم پر بعض اوقات دفعتاً اور بغیر ہمارے علم اور ارادے کے ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہم ایک نئے مکان میں داخل ہوتے ہیں یا ایک اجنبی شخص سے ملتے ہیں، یا ایک بالکل ہی نئی بات سنتے ہیں، لیکن ذہن میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ جیسے ہم اس مکان یا شخص کو پہلے کہیں ضرور دیکھ چکے ہیں یا اس بات کو پہلے کہیں ضرور سن چکے ہیں۔ آپ میں سے اکثر حضرات اس کیفیت نفسی کا تجربہ کر چکے ہوں گے۔ اس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا، بس یوں سمجھے کہ

انچہ می بینم ، بہ بیداری است یارب یا بخواب

کی سی حالت ہوتی ہو، جس میں ذرا دیر کے لئے ہی سہی لیکن ہمارا ادراک غیر معمولی طور پر وسیع ہوجاتا ہے۔ چارلس کنگس لے اپنے متعلق لکھتا ہے :-

"جب میں میدانوں میں ٹہلنے کے لئے نکلتا ہوں تو اکثر یہ باطنی تاثر میرے نفس پر غالب ہوتا ہے کہ ہر چیز جو مجھے نظر آرہی، کچھ نہ کچھ معنی ضرور رکھتی، بشرطیکہ میں اسے سمجھ سکوں اور بعض اوقات یہ احساس کہ میرے گرد و پیش حقائق و معارف ہیں، جنھیں میں سمجھ نہیں سکتا، اکثر مجھ پر ایک ناقابل اظہار ہیبت طاری کر دیتا ہے۔ کیا تم نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ تمھاری اصلی روح تمھارے نفس کی آنکھوں سے بجز صرف چند مقدس لمحات کے پوشیدہ رہتی ہے"

اس کے بعد خالص تصوف مذہبی کی منزل آتی ہے۔ ہر مذہب میں ہمیں صوفیانہ خیالات نظر آتے ہیں، اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ان میں عجیب و غریب یک رنگی نظر آتی ہے۔ سینٹ ٹیرلیسا کے واردات قلبی پڑھئے جو ان کی کتاب The Interior Castle. میں بیان کئے گئے ہیں اور پھر ان کا موازنہ و مقابلہ مسلمان صوفیہ اور ہندو یوگیوں کے تجربات سے کیجئے تو ایک ایسی یکسانی اور مشابہت نظر آتی ہے کہ انسان اس اعتراف پر مجبور ہوتا ہے کہ ان لمحات زندگی میں واقعی ایک عجیب و غریب روحانی معنویت پائی جاتی ہے۔

اسلام میں تصوف کے مختلف مدارج کے متعلق آپ حضرات کے سامنے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں صرف حضرت امام غزالیؒ کی خود نوشتہ سوانح عمری سے ان کے ان ذاتی تجربات کو آپ کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں جو صوفیانہ کیفیتِ نفسی پیدا کرنے کی کوشش میں انھیں ہوئے۔ چونکہ مسلمان صوفیہ میں اس قسم کی خود نوشت سوانح عمریاں بہت کم پائی جاتی ہیں، اس لئے امام غزالیؒ کے واردات قلب کی تشریح خود ان کی زبان سے سننا خالی از منفعت نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں :-

"تصوف کی غایت یہ ہے کہ دل ماسوا اللہ سے ہٹ کر صرف باری تعالیٰ کے تصور
میں محو ہو جائے۔ چونکہ میرے لئے نظریہ عمل سے زیادہ آسان تھا اس لئے میں
نے شروع میں تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اور جو کچھ کتابوں کے پڑھنے یا سننے
سے حاصل ہو سکتا تھا، وہ سب حاصل کیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ طریق تصوف کا خاص
جزو ایسا ہے کہ اس کی حقیقت کسی مطالعے سے نہیں [illegible]
ماہیت [illegible] آشکارا ہو سکتی ہے۔ مثلاً غور کرو۔ [illegible]
اور ان کے اسباب و نقائص سے واقف ہونا
اور صرف یہ علم رکھنا کہ نشے کے اسباب کیا ہیں۔ [illegible]
نشہ پیدا کرتے ہیں اور فی الواقع حالت نشہ میں ہونے میں کیا [illegible] انسان کا فرق
ہے۔ وہ انسان جو نشے میں ہوتا ہے وہ نہ تو نشے کی تعریف جانتا ہے اور نہ اسے اس
سے سروکار ہے کہ نشے کو علمی بحثوں سے کیا تعلق ہے۔ لیکن طبیب اگرچہ نشے میں
نہیں ہوتا مگر اس کی ماہیت اور علامات سے واقف ہوتا ہے۔ بعینہ یہی فرق
ترک لذات کی ماہیت سے واقف ہونے اور خود تارک لذات ہونے میں ہے
غرضکہ جہاں تک کہ الفاظ سے تصوف کی ماہیت معلوم ہو سکتی تھی، وہ میں نے حاصل
کرلی لیکن جو کچھ باقی تھا وہ ایسا تھا جو کسی مطالعہ یا قال سے حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ صرف
خود کو وقف حال کرنے اور تقوے کی زندگی بسر کرنے سے اس کی حقیقت کھل سکتی تھی"

سطور بالا سے آپ حضرات کو یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ نفسیات میں تصوف کی اصطلاح کسی
خاص محدود معنی میں نہیں، بلکہ وسیع ترین معنوں میں استعمال ہوتی ہے، مذہبی اور غیر مذہبی
ہر قسم کی صوفیانہ کیفیات نفسی اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ یعنی ایسی تمام کیفیات نفسی جو اپنی بصیرت
افروزی، انفعالیت، ناقابل بیان ہونے کی خصوصیت اور عارضیت کی وجہ سے دوسری کیفیتوں
سے متمائز ہوں۔ یہ حالت کسی خاص طبقے یا ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہندویت ہو، یا اسلام

بودھ مت ہو یا عیسائیت ہر مذہب کے صوفیانہ تاثرات میں ہمیں ایک سی کیفیت نظر آتی ہے، جو ایک اس وجہ سے ہے کہ اس کی قدر مشترک یعنی ایمان باللہ وہی ایک ہے۔

(۵) عنصر عقلی

اب ہم ایمانیت کے عناصر خمسہ میں سے پانچویں عنصر یعنی عنصر عقلی سے بحث کرتے ہیں، اگرچہ مذہبیت سراسر ایک کیفی اور تاثری چیز ہے، تاہم عنصر عقلی کا دخل بھی اس میں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ اور اگر ایمان آفرینی میں نہیں تو کم از کم ایمانی کیفیت کی توجیہ میں عقل و استدلال سے ضرور کام لیا جاتا ہے عقلی استدلال کی بھی اکثر صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے انسان وجود باری تعالیٰ کا ثبوت پاتا ہے، یا اگر ثبوت نہیں پاتا تو لا ادری کہہ کر چپ ہو جاتا ہے جو خود اثبات واجب الوجود کی ایک سلبی شکل ہی ہے بقول حالی۔

سمجھا ہے پرے تجھ کو ادراک کی سرحد سے　　جس قوم نے رکھا ہے، انکار روا تیرا

سب سے پہلی دلیل جو وجود مطلق کی پیش کی جاتی ہے وہ ایک استخراجی قیاس منطقی ہے فلاسفہ میں سے ڈیکارٹ (Descartes) اور لائب نٹز (Leibnitz) نے اس قیاس سے اثبات واجب الوجود کے متعلق استنباط کیا ہے۔ ڈیکارٹ کی دلیل مختصراً یہ ہے۔

تصور الٰہی ایک مکمل ہستی کا تصور ہے۔

وجود ایک کمال ہے اور عدم وجود ایک نقص -

ایک کامل ہستی میں صفت وجود کا ہونا ضروری ہے۔

پس خدا موجود ہے۔

دوسری عقلی دلیلیں تجربات انسانی سے ماخوذ ہیں، مثلاً علت و معلول کے سلسلے سے وجود باری تعالےٰ کا ثابت ہونا، دنیا میں کوئی معلول بغیر علت کے نہیں ہو سکتا اور ہر علت کے لئے بھی کوئی نہ کوئی سابقہ علت ضرور ہونی چاہئے، اور اس طرح یہ سلسلہ علت اول یعنی خدا پر جا کر ٹھہرتا ہے۔ ایک اور دلیل یہ ہے کہ اشیاء عالم کی ہیئت ترکیبی ایک خالق کے وجود کا پتہ دیتی ہے، مثلاً ذی الحیات کی ہیئت

ترکیبی میں ہمیں بہت سی باتیں ایسی ملتی ہیں جن کی توجیہ محض طبعی قوانین سے نہیں ہوسکتی، مثلاً ان کی زندگی اور ان کی جبلتیں، ان کے وجود کا منشا نظام کائنات میں صرف اپنے بقائے ذات کے علاوہ اور کچھ ضرور ہے تمام اشیا میں ایک واحد نظام کا فرما نظر آتا ہے۔ اثرت کے لباس میں وحدت جلوہ گر ہے، غرضکہ ان مختلف صورتوں سے یہ ثابت [illegible]

سب سے آخر میں اثبات واجب الوجود کی [illegible]
کے ضمن میں کی جا چکی ہے، یعنی اخلاقی اقتضا[illegible]
رہنے کے لئے خدا کے وجود کو ضروری سمجھنا

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان دلائل کے بیان کرنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ منطقیا حیثیت سے بھی یہ دلیلیں قابل قبول ہیں یا نہیں، میرے اس مقالے کے موجودہ حصے میں وہ ایک خاص نفسیاتی مسئلہ ہے، یعنی یہ کہ ایمانیت پر استدلال اور عقلیت کا اثر کیا ہوتا ہے؟ مجھے امید ہے کہ سابقہ بحثوں سے میرے سامعین یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ انسان کے عقیدے پر زیادہ تر اثر ہمارے تاثرات وجذبات کا پڑتا ہے اور بہت کم عقل واستدلال کا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عقل کا حصہ بالکل ہوتا ہی نہیں ہے۔ معتقدات کی بنیاد خواہ تاثرات ہوں یا جذبات، لیکن ان کی جرح وقدح نقد ونظر میں زیادہ تر عنصر عقلی ہی کا دخل ہے، بے ربط عقائد وخیالات کو کوئی ذہن قبول نہیں کر سکتا ایسے عقائد جو ہمارے مجموعی علم سے میل نہ کھائیں، درجہ قبولیت حاصل نہیں کر سکتے۔ عقلیت کے معیاروں کے خاص خاص صورتوں میں مفید ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے، ہمارا سارا فلسفہ اور ہمارے تمام علوم صحیحہ عقلیت کے معیاروں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن۔

ہر سخن موقع وہر نکتہ مکانے دارد

کیا فرض ہے کہ انسانی زندگی کی سی ایک پیچیدہ اور مختلف الحیثیات چیز بھی انھیں معیاروں سے جانچی جائے۔ اگر مجموعی حیثیت سے انسان کی حیات نفسی پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ عقلیت اور منطقیت صرف اس کے ایک جزو کی تشفی کر سکتی ہے اور بس، یعنی صرف قوائے استدلالیہ کی، ان

قوتوں کی جو بے زبان ہیں، دلیل بازی خوب کرلیتی ہیں، منطق بگھار لیتی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ نفس کی دوسری خاموش لیکن طوفانی کیفیتیں بھی ہوتی ہیں، یعنی آپ کی پوری غیر شعوری زندگی، آپ کے رجحانات، معتقدات، الہامات فطری، تاثرات اور وجدانات ان سب کے متعلق عقلیت کسی قسم کا دعا نہیں کرسکتی۔ اس کے مقدمات صغریٰ وکبریٰ، جب تک کہ پہلے ان بے زبان قوتوں سے سند قبولیت نہ پالیں تسلیم ہی نہیں کئے جاسکتے۔

حضرات۔ یاد رکھئے کہ جس طرح عقلیت عقیدے کی بنیاد کو متزلزل نہیں کرسکتی، اسی طرح سے محض عقلی دلیل اور منطق سے عقیدے قائم بھی نہیں ہوتے۔ اثبات واجب الوجود کے متعلق منطقی دلیلوں سے کسی کو اس کا یقین نہیں پیدا ہوسکتا۔ نری منطقی بحثیں ایمانی کیفیت نہیں پیدا کرسکتیں۔

ہندوستان میں جب سے انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس کا رواج ہوا، ایک تعلیم یافتہ طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے، جسے اس وقت تک چین ہی نہیں آتا جب تک کہ وہ صحف سماوی سے نیوٹن کا کلیہ کشش ثقل اور ڈارون کا نظریہ ارتقا ثابت نہ کرلے، حاسۂ مذہبی اور ایمانیت کو ان کوششوں پر ہنسی آتی ہے، اس کے تاثرات اور وجدانات ہی اس کے لئے کافی شہادتیں ہیں۔ وہ ان مخلص لیکن گم کردہ راہ عقل ودانش کے پتلوں سے اکبر کی زبان میں کہتی ہے۔

شعر میں کہتا ہوں، ہے تم کرو

سائنس کو صرف کلیات اور تعمیمات سے مطلب ہے، وہ ابر رحمت کو عمل حرارت و تقطیر کہتی ہے، اسے اس سے کیا بحث کہ غریب کسان اسے کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس کا نقطۂ نگاہ سراسر غیر شخصی ہے سائنس کا خدا صرف عمومی قوانین کا خدا ہے، بقول جیمس کے، وہ تھوک فروشی کرتا ہے، خوردہ فروشی نہیں کرتا غرض دنیائے مذہب میں سائنس ہو یا عقلیت، دونوں کے "پاؤں" "پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود" کے مصداق ہیں، حاسۂ مذہبی ایک شخصی راز ہے، اور زیادہ تر ہر شخص کے جذبات اور تاثرات پر منحصر ہے، اور یہ دل کی انجان گہرائیوں میں پرورش پاتے ہیں، اور انسان

کے گل ہائے رنگا رنگ چڑھاتے ہیں
نفس انسانی کا مطالعہ ہمیں جس نتیجے پر پہنچاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نفس کی کچھ باطنی مشکلات ہوتی
ہیں اور وہ ان کا حل تلاش کرتا ہے، حاسہ مذہبی، یا ایمانیت ہی ایک ایسا جامع الحیثیات حل ہے
جو روح کے اکثر امراض کے لئے نسخۂ شفا کا حکم رکھتا ہے، انسان اپنی ترکیب نفسی کے اعتبار سے بلکہ
اپنی باطنی ضروریات کے تقاضے سے اس حل پر پہنچنے پر مجبور ہیں۔ چاہے نام مختلف ہوں ارکان
وعبادات میں فرق ہو، نظریئے الگ الگ ہوں لیکن ہر مذہب کی قدر مشترک یہی حاسہ مذہبی ہے
یہ جس کسی میں اور جہاں کہیں پایا جائے، کم از کم اتنا ہی قابل قدر ہے
اس حقیقت کو سمجھ لیں، تو ہم میں دوسروں کے مذہبی عقائد
کہ خواہ ہم ان کے ہم خیال نہ ہوں لیکن ہمارے دل میں ان
ہو جائے اور ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ
یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط
قاضی عبدالغفار صاحب کے نام

برادرم السلام علیکم۔ خدا تمہیں تندرست رکھے اور خوش اور اسی طرح صداقت و صبر پر قائم۔ اگست میں چند دن کے لئے ایک دور سنسری پر لطف گر وقت و مقابلہ طلب آگیا تھا۔ اسی زمانہ میں تم کو بھی شکایت کا موقعہ ملا تھا۔ میں نے اس کے بعد ہی تم کو ایک مفصل و مشرح خط یہاں کے حالات کا لکھا تھا جس میں ان سنسر صاحب کے عہد نظامی کے حالات بھی شامل تھے۔ مگر پھر اس خیال سے پھاڑ ڈالا کہ نئے سنسر صاحب کا طرز عمل بالکل مختلف تھا اور جب حالات ماضیہ بدل گئے تھے تو پھر ان کا تذکرہ بھی عبث تھا۔ اس کے بعد تم کو خط لکھنا تھا مگر بھائی مجھے اس شفاخانہ امن کی "مس فلارنس نائیٹنگل" بننا پڑا۔ بیگم صاحب پہلے علیل ہوئیں پھر گلتا رکو انٹرک ہوا۔ پھر جس دن وہ اچھے ہوئے اسی دن بیگم صاحبہ پھر علیل ہوئیں اور سخت تھیں۔ خدا خدا کر کے ان کو شفا ہوئی تو معظم کے ہمراہ ان کے دونوں بھائی آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیچارہ مسعود اپنے ساتھ انٹرک لایا۔ اس عمر میں یہ مرض نہایت خطرناک ہوتا ہے اور سوائے نرسنگ کے کچھ علاج ہی نہیں۔ چنانچہ اپنا سارا تجربہ تیمارداری کا کام میں لانا پڑا۔ شوکت صاحب بھی حرارہ لائے۔ پیر میں پھڑیا نکلی۔ جوش میں آگئے۔ ہم نے لاکھ کہا کہ ہمارا مرہم لگاؤ۔ اچھے ہو جاؤ گے مگر نہ مانا۔ جنگجویانہ جذبات تراوش کئے بغیر نہ رہے اسسٹنٹ سرجن سے چیرا لگوایا۔ اس میں لیکن کچھ مادہ فاسد داخل ہو گیا۔ (Erithema ؟) میں مبتلا

---

(۱) میعادی بخار

ہو گئے۔ آج مادہ شخنے کے پاس ہو تو کل ران پر اور پرسوں گھٹنے میں یا پنڈلی میں۔ ڈاکٹر نے دس بارہ مسہل دیئے تب جاکر بخار اور ([illegible]) سے نجات پائی۔ سو وہ بھی بفضلہ تعالیٰ اچھا ہو گیا۔ مگر بیچارے علم کی درگا پوجا تباہ ہو گئی۔ چنانچہ یہ کیا گیا ہے کہ میری بیوی بچے جو سال بھر سے یہاں پڑے سڑ رہے تھے اور پے در پے علالتوں کے باعث تبدیل آب وہوا کے مستحق تھے۔ رام پور جانے والے تھے۔ انہیں میں نے بانکی پور بھیج دیا ہے ... تک انشاء اللہ وہاں رہکر گھر چلے جائیں گے۔ جب تک ... جاری تھا ایک روپیہ آمدنی موجود تھا۔ سنسر صاحب کی عنایت نے اسے بھی ...

مکان کا کرایہ اب تک دینا پڑتا ہے۔ اب صرف (...)
(۱)
یہی ذریعہ معاش رہگیا ہے اس لئے کہ جائداد

اور میں ہاتھ نہیں لگاتے تھے اور اس کی آمدنی محض ان اعزا ... کی کوئی دوسری آمدنی نہ تھی۔ ہاں ہمدرد کا کامریڈ کی بدولت تیس ہزار کی جائداد پہلے رہن رکھدی تھی۔ اب نظربندی کے زمانہ میں شوکت فیکٹری کے سود کی بدولت یہ ہو رہا ہے کہ ساٹھ ہزار کی جائداد فروخت کر رہے ہیں تاکہ سب قرض ادا ہو جائے۔ یہ جائداد جیسا کہ تم جانتے ہو۔ دادا صاحب مرحوم کو ملی تھی۔ غدر میں گورنمنٹ کو صوبجات متحدہ میں انہوں اور ان کے آقانے نادار نے بچا دیا تھا۔ شکر ہے کہ جو صلہ اس وقت ملا تھا وہ آج پوتوں کی طرف سے اسی گورنمنٹ پر تصدق کیا جا رہا ہے۔ ہَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ شرمندگی احسان دور ہو جائے گی۔ یہ بار منت گراں تھا۔ خدا نے خوب سبکدوش کیا۔ گورنمنٹ کو اطلاع دیدی ہے کہ اب کوئی ذریعہ معاش نہیں ہو۔ الاونس جب صرف اپنے اخراجات کے لئے مقرر ہوئی تھی ناکافی تھی۔ مگر خدا کا دیا بہت کچھ تھا اس لئے علاوہ اصول کی بحث کے کہ نظربندوں کو الاونس ملے یا نہ ملے کچھ نہ کہا گیا۔ سال بھر سے یہ اندھیر کہ بیوی بچوں کے

---

(۱) روزینہ جو بہ حالت نظربندی مولانا کو ملتا تھا۔

بھی اسی میں سے نکالا جاتا ہے۔ تمہارا تو ذکر کیا ہے۔ خود گورنمنٹ کے عہدہ دار اس کو آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ شوکت (جنہیں علاوہ رامپور کے گاؤں کے ٹھیکہ کے جس میں سے چار سو ماہوار ملتا تھا گورنمنٹ خود چھ سو کے قریب ماہانہ دیتی تھی) اور میرے لئے مع متعلقین کے یہ ڈہائی ڈہائی سو کہاں تک کافی ہو سکتے ہیں۔ امید ہے کہ جس رزاق نے رزق میں پہلے فراخی عطا فرمائی تھی وہی آج بھی عطا فرمائے گا۔ اور الاؤنس میں اضافہ ہوجائے گا۔ اور سفر خرچ گورنمنٹ ادا کرے گی۔ نیز (۱) Separation allowance کے تحت مشکل ہوگی۔ مگر ہم آخر پیدا ہی کس لئے کئے گئے ہیں جانتے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں بلکہ کروروں ہمارے بھائی ہیں جنہیں ہماری اسیری کی روزی اور رزق قارون کا خزانہ معلوم ہوتا ہی اگر وہ زندہ رہ سکتے ہیں اور خدا کا شکر بجالاتے ہیں تو ہم یہ کیوں نہیں کرسکتے۔

جب سے یہ معلوم ہوا ہی کہ خود لارڈ چانسلر سابق قانون تحفظ ہند کو گورنمنٹ اور کونسل واضع آئین و قوانین کے اختیارات قانون سازی کے باہر سمجھتے ہیں۔ اور انڈیا آفس کو خود اس کا اعتراف ہی خیال ہوا ہے کہ اس کے متعلق کچھ کارروائی کروں چنانچہ مظہر کو بلالیہے۔ ڈپٹی کمشنر نے احتیاطاً گورنمنٹ سے بھی استصواب کرلیا ہی۔ اور گورنمنٹ نے انہیں اطلاع دیدی ہی کہ مظہر شوق سے آسکتے ہیں۔ نہ معلوم بیچارہ کو فرصت بھی مل سکے گی یا نہیں۔ اگر محرم میں آگئے تو اچھا ہوگا۔ ارکو بال بچے بانکی پور گئے۔ آج شب کو والدہ آرہی ہیں۔ ارہی کو حیات آگیا۔ اس لئے دل نہیں گھبرایا اور یہاں تو عقیدہ ہے کہ

انساں بجائے خود بھی ہو اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اب زیادہ نہیں لکھتا۔ اب سلسلہ پھر جاری ہوگیا ہے اس لئے متوقع رہو کہ مزیدار خطوط پھر آیا کریں گے۔ کہو (۲) Times تو شاید اب نہ آتا ہو۔ کیا (۳) Near East

---

(۱) گھر سے علیحدگی کا الاؤنس (۲) اخبار لندن ٹائمز (۳) اخبار نیئر ایسٹ۔

بھی بند ہوگیا۔ اخبار اور رسالے جو ضرورت سے زائد ہوں بھیجدیا کرو۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ خوب کام کر رہے۔ واللہ بسا اوقات رشک آتا ہے۔ اگر اپنی ترقی نہ سمجھو تو کہوں کہ اردو کے محمد علی ہو۔ یہ مخمصے ختم ہوں گے تو نہ معلوم اخبار کی پھر ضرورت بھی رہے یا نہیں لیکن اگر سب کچھ نکالنے کے بعد پھر بھی اخبار نکالنا پڑا تو ہمدرد ہوگا ورنہ میں تو پنشن لے لوں گا اور صرف زبان کے چٹخارے لیا کروں گا۔ حیا تو سلام کہتا ہے۔ شوکت جہاں فرماتے ہیں کہ میرے سر پر قرارۃ العین کا بھوت سوار ہے۔ خدا کرے اس کا کلام بھیج دو۔ صداقت کے چند مداح یہاں کا اظہار کرتے ہیں۔ میاں حسرت کی غزل کیا خوب ہے (۱) کے چند اشعار مع مقطع کے لاجواب ہیں۔ شوکت د "بھائیو سلام علیکم" کو ایک کارڈ لکھیں بجواب ان کی کھلی چٹھی کے کہ میری رائے ہے کہ بہتر تو یہ ہو کہ آپ سرے سے کلکتہ جائیں ہی نہیں۔ اور اگر "علمی بحث" کا اس قدر شوق ہے تو یہاں چلے آیئے۔ ہم دونوں بھائی کافی مسالہ فراہم کردیں گے۔ اچھا رخصت تمہارا

محمد علی

---

(۱) مذاق۔

ایران جدید

ہندوستان کی افسوسناک فرقہ وارانہ کشمکش نے وہ تسکین حاصل کرنے کیلئے جس کی میرے قلب کو ضرورت تھی مجھے اس موسم گرما میں ایک ہمسایہ قوم کے آغوش میں پہونچا دیا مجھ وہاں پہونچکر مایوس نہیں ہونا پڑا۔ ایرانی اپنے ملکی مراحل کو طے کرنے میں ایسی ہوشمندی اور وسعت نظر سے کام لے رہی ہیں جو ہم سب کے لئے ایک اچھی خاصی مثال بن سکتی ہے۔ مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات جن کی وجہ سے ہندوستان میں آپس کے مناقشات روز بروز بڑھتے جاتے ہیں ان کا ایران میں نام بھی نہیں وہاں تمام فرقے بہ حیثیت ایرانی باشندوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کو استوار کرتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ایرانی قانون ازدواج ہے جو کہ گذشتہ ستمبر میں پاس کیا گیا ہے، یہ قانون تمام ایرانیوں کے لئے ہے جس میں مسلمان، پارسی، عیسائی اور یہودی سب شامل ہیں اور تمام ملک نے اس کو دل سے قبول کرلیا ہے۔ نابالغوں کے لئے جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو جسمانی لحاظ سے شادی کے قابل نہیں شادی کرنا قانوناً جرم قرار دیدیا گیا ہے، علاوہ ان نابالغوں کے جن کی شادی ہو، تمام وہ اشخاص جو اس قسم کی شادیوں کے ذمہ وار ٹھہریں، سزائے قید کے مستوجب قرار پاتے ہیں جس کی میعاد ۳ سال تک رکھی گئی ہے۔ نکاح اور طلاق کی رجسٹری کرانا ضروری ہے اور اس کی فروگذاشت کے جرم میں شوہر کو چھ ماہ کی سزائے قید ہو سکتی ہے۔ شادی کے وقت شوہر اور زوجہ کو حق حاصل ہوتا ہے کہ نکاح نامہ میں ایسے شرائط تحریر کرائیں جن کے مطابق فریقین کے آیندہ تعلقات کا فیصلہ ہوا کرے گا۔ جانبین کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملت اور شریعت کے قدیم روایات پر قائم رہیں۔ یا کوئی جدید طریقہ اختیار کرلیں۔ بجز اس صورت کے کہ نکاحنامہ کے شرائط خود ازدواجی تعلقات کے منافی

صرف ان شرائط کا نفاذ سرکاری عدالتوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے جن میں علمار کے طبقہ کو
کوئی دخل نہیں ہے، نکاح کے رسم ورواج کا تعلق جہاں تک قانون سے ہے اس کو طبقہ علمار کے
ہاتھ سے قریب قریب بالکل نکال لیا ہے۔ اور یہ تعلیمیافتہ ایرانیوں کی عین خواہش ہے کہ ایسا ہی ہونا
چاہیے۔ لارڈ کرزن جیسے سیاحوں کی رائے ہے کہ ایرانی فریبی اور ناقابل اعتماد ہوتے ہیں لیکن یہ
ان کے ساتھ صریحاً ناانصافی ہے۔ ایرانی لوگوں کی تعریف کرنے میں الفاظ کا طومار باندھ دیتے
ہیں لیکن یہ محض ان کی خوش خلقی کا ایک راز ہے۔ ورنہ ان الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ آپ
کو مشکل سے کوئی قوم ملے گی جس کے ہر طبقہ کے لوگوں میں یکساں ط...
اخلاق اور مروت اس قدر پائی جاتی ہو جتنی کہ ایرانیو...
کہیں گالی گلوج بیہودہ الفاظ سننے میں نہیں آتے، اگر ا...
معاشرتی زندگی سے مقابلہ کریں تو دو باتوں میں نمایاں فرق پائیے۔
کا فرق ہے، نہ مختلف طبقوں میں نیچ اونچ۔ نہ بڑے بڑے امرار کا کوئی طبقہ ہے جو دولت سے سرشار
ہو، نہ فاقہ مستوں کا کوئی طبقہ ہے جو بالکل تباہ حال ہو۔ اس لحاظ سے ایرانیوں میں جتنی یک رنگی ہے
اتنی مشرق کے کسی دوسری قوم بلکہ شاید دنیا کی کسی قوم میں نہ ہوگی۔ مسلمانوں کے ورود
سے قبل ایران میں ذات پات کی خفیف سی جھلک پائی جاتی تھی۔ لیکن سامیوں کی فتوحات نے
اس کی بھی پوری طرح بیخ کنی کر دی، اس کے بعد پھر کبھی ذات پات کا رواج نہ ہو سکا۔ اب
وہاں کے تعلیمیافتہ طبقہ اور عوام الناس کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں۔ تمام ایرانی اپنے ملک کے
ہر باشندہ کو اپنا ہم مرتبہ سمجھتے ہیں اور مساوات کا برتاؤ رکھتے ہیں۔ اسی قسم کی سوسائٹی میں تعلیم یافتہ
طبقہ کے خیالات نہایت سرعت کے ساتھ عوام الناس تک پہنچ کر ان میں خود بخود اثر کر جاتے
ہیں اس کے علاوہ بخلاف ہماری قوم کے ایرانی جدید روشنی اور خیالات کو قبول کرنے اور اختیار
کرنے پر بالطبع بہت زیادہ مائل ہیں کسی نئے خیال کے وہ اتنے ہی گرویدہ ہوتے ہیں جتنے ہم اس کے متنفر
ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ایران مسلسل تغیرات سے پر ہے جس کی کوئی مثال ہمارے ملک

کی [illegible] میں مشکل ہے۔ قرون وسطیٰ کا ابتدائی زمانہ تصوف کی نشو ونما میں گذرا اور اس کے بعد صفوی
[illegible]ان کی شہنشاہیت کا دور دورہ رہا بالآخر دونوں کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اور اب ان کا کوئی نام
[illegible] باقی ہے تو صرف تاریخ وادب کی کتابوں میں۔ ورنہ آج کل تو قوم پرستی یا ملت پرستی کا زور
ہے [illegible]ء۔ ۲۰-۲۱ فروری کی درمیانی شب میں آدھی رات گذر چکی تھی کہ رضا خاں پہلوی نے (جو
کہ اب اعلیحضرت پہلوی اول کے نام سے مشہور ہیں) طہران پر تسلط حاصل کر لیا۔ ایران کے اکثر
مورخین تاریخ جدید کا آغاز اسی دن سے کرتے ہیں۔ اس صورت حال کا جس کو ایرانی انقلاب کے نام
سے یاد کرتے ہیں ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ایک مستقل دولت ملیہ کی تاسیس و تشکیل کی گئی۔ اور دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ان
کی طرز زندگی اور خیالات میں ایک نیا نقطہ نظر نمایاں طور پر پیدا ہوگیا جسے ہم اصطلاحاً مغربیت کہہ
سکتے ہیں۔ سلطنت پہلوی کی گذشتہ گیارہ سال کی حکومت میں تقریباً وہ تمام باتیں جن کا تعلق قرون
وسطےٰ سے تھا یا تو معدوم ہوگئیں یا نہایت سرعت کے ساتھ معدوم ہو رہے ہیں۔ علماء یا مجتہدین جنہیں
ایرانی اخوند کہتے ہیں۔ ان کا سیاسی بساط سے غائب ہو جانا تمام اصلاحات کے لئے سب سے پہلی اور
ناگزیر شرط تھی۔ سنہ ۱۹۰۶ء کے دستور اساسی اور اس کے بعد سنہ ۱۹۰۷ء کے ضمنی دستور (Consti-
tution) دونوں نے مجتہدین کی حیثیت کو مستحکم کر دیا تھا تمام ملک کے اخوندوں کو حق دیدیا گیا تھا
کہ وہ اپنی جماعت سے ۲۰ اشخاص منتخب کر دیا کریں مجلس ان ۲۰ منتخب شدہ اشخاص میں سے ۵ ممبران
کی ایک مذہبی کمیٹی مقرر کر دیتی تھی جس کو اختیار حاصل تھا کہ وہ مجلس کے منظور کردہ قوانین کو مذہبی مصالح
کی بنا پر مسترد کر دے۔ اس کے باوجود بھی اکثر اخوندوں نے خود دستور کو غیر مذہبی اور حرام قرار دیدیا
بعد میں ان کے سرگروہ لوگوں سے دستور پر جبریہ دستخط کرائے گئے، مذہبی کمیٹی کا تجربہ ناکامیاب رہا
اور اس سے حکومت کے معطل ہو جانے کا اندیشہ ہوا اس لئے اس کو توڑ دینا پڑا۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں جمہوریت
کی تحریک ایران میں نہایت شد و مد کے ساتھ اٹھائی گئی لیکن اخوند نے فتویٰ دیا کہ یہ بھی حرام ہے
آخر مجلس نے اس مشکل اور کشمکش کو یوں حل کیا کہ قدیم خاندان شاہی کو ختم کر کے رضا شاہ پہلوی
کے سر پر تاج حکومت رکھدیا۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب تک ان مسائل میں اخوندوں کا دخل تھا

اسوقت تک ایران نئی روشنی کے مطابق نہیں ہو سکتا تھا یہ بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہو کہ اس زمانہ
میں سرکاری عدالتیں قریب قریب بالکل اخوندوں کے ہاتھوں میں تھیں لیکن ان عدالتوں کا طریق کار
اس قسم کا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی کوئی قدر و منزلت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ رشوت ستانی
اور بدکرداریوں کی کوئی حد نہ تھی ان عدالتوں کے ضابطے اور شہادت کے اصول نہایت فرسودہ
تھے۔ گواہ کے قابل اعتبار ہونیکا انحصار اس قسم کی باتوں پر تھا کہ وہ کتنے تک لف دیکتا ہو یا اس
کی ڈاڑھی کتنی لمبی ہے۔ علاوہ بریں رویت ہلال معاہدہ اور قتل ... الن... معاملات
کے لیے ایک ہی قسم کی عینی شہادت درکار ہوتی تھی۔ چنانچہ
کو مجبور کردیا کہ وہ ایک فیصلہ کن صورت اختیار کریں چنانچہ
فیصلہ کرلیا۔ رضا شاہ اور ان کی گورنمنٹ کی خواہش ہوئی
کا خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن دول خارجیہ نے معقول وجوہ کی بنا پر اس سے ...
تک اس تجویز پر راضی نہیں ہو سکتے جب تک ایرانی عدالتوں کو مذہبی طبقہ کے ہاتھوں سے بالکل
نکال نہ لیا جائے۔ ظاہر ہو کہ ان کے لئے اس امر پر راضی ہو جانا ناممکن تھا کہ غیر ایرانیوں کے مقدمات
بھی اسی قانون کے ماتحت فیصل ہوا کریں جو اخوندوں یا مذہبی پیشواؤں کا بنایا ہوا تھا۔ عام اس سے
کہ وہ قانون اچھا ہو یا برا۔ قانون اور عدالتوں کا از سر نو ترتیب دینے کا نازک اور مشکل کام شاہ
نے ایک قابل ترین ایرانی یعنی وزیر عدلیہ آغا اختر علی خان کے سپرد کیا۔ مذہبی عدالتیں اب بھی باقی
ہیں کیونکہ از روئے آئین ان کو کسی وقت توڑا نہیں جا سکتا لیکن ان کے تمام قانونی اختیارات سلب
ہوگئے۔ اب ایران میں ایک درجن سے زیادہ مرتب شدہ قوانین اور ضابطہ جات نافذ ہیں بالجملہ یہ
کہا جا سکتا ہے کہ نفس امری قوانین کے اصول اسلامی شریعت سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ قانون شہادت
اور ضابطہ عدالت کی ترتیب میں فرانسیسی قوانین کی تقلید کی گئی ہے۔ اخوندوں کی جگہ قانون جدید
کے ماہرین حاکمان عدالت کے عہدوں پر مامور کئے گئے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تمام
تبدیلیاں عوام الناس کو اپنی مرضی کے خلاف زبردستی ماننا پڑیں ایسا ہرگز نہیں ہو بلکہ واقعہ یہ ہے

[illegible] کے کسی ایک باشندہ کو بھی اپنے مذہبی پیشواؤں کے طبقہ پر اعتماد باقی نہیں۔ اگر ان مذہبی [illegible] کا بس چلتا تو یہ شرارت آمیز فتوے جاری کر دیتے لیکن نہ ان میں اتنی ہمت ہے اور نہ انہیں اس [illegible] ہے۔ ان میں سے بعض نظر بند کر دیئے گئے ہیں اور باقی خاموش ہیں بجز المدرس کے علماء [illegible] نے اپنے اس سخت ترین آزمائش کے وقت کوئی جری آدمی پیدا نہیں کیا اور سب ملکوں کی طرح ایران میں بھی ایسے لوگوں کی کوئی عزت نہیں کیجاتی جو اپنے عقائد کی خاطر مصائب برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

مذہبی علماء کے طبقہ کے فنا ہو جانے کے بعد ایران کو اس بات کا موقع ملا کہ ملکی معاملات میں ترقی کی جدید راہ پر چل سکے۔ ملک کے مالی انتظامات کو ڈاکٹر ملس پاف اور ان کے امریکن ساتھیوں نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک از سر نو ترتیب دیا اور اب یہ کام ایک نہایت قابل وزیر مالیات آقا قاسم تقی زادہ کے ہاتھوں میں ہے جو کئی سال کی جلاوطنی کے بعد اپنے ملک کی خدمت کے لئے طلب کئے گئے ہیں۔ اسی طرح نظام حکومت کا قریب قریب ہر شعبہ از سر نو درست کیا گیا ہے۔ رضا شاہ نے پہلے اپنی وزارت جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد عہد بادشاہت میں سالہا سال کی جدوجہد سے خود سر قبیلوں کی قوت کو بالکل توڑ دیا۔ اور ملک کے ایک گوشہ سے لیکر دوسرے گوشہ تک امن اور سکون پیدا کر دیا۔ تمام ملک میں جا بجا پولیس کی چوکیاں قائم ہیں اور ایران کی پولیس نہ صرف اپنے کام میں مستعد ہے بلکہ شایستہ اور خوش خلق بھی ہے اور اپنے کو اہل ملک کا ملازم سمجھتی ہے نہ کہ مالک و مخدوم۔ حکومت ایران بھی اور قومی حکومتوں کی طرح باشندگان ملک کی نجی زندگی میں بہت زیادہ دخیل ہے۔ اس لئے کہ نظام حکومت کی اصلاح بغیر قوم کی اصلاح بیکار ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر ایرانی کے لئے اپنے نام کے ساتھ ایک خاندانی نام کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ اور اسے ہر وقت اپنے پاس پروانۂ شہریت رکھنا پڑتا ہے جس میں پولیس اس کی زندگی کے خاص خاص واقعات یعنی پیدائش، نکاح، طلاق، موت وغیرہ کا باقاعدہ اندراج رکھتی ہے۔ لوگوں کی پوشاک کے متعلق بھی خاص خاص قاعدے ہیں جن کی

پابندی ضروری ہے۔ ۱۹۲۸ء کے قانون کے بموجب ہر ایرانی مرد خواہ اس کا مذہب کچھ
بھی ہو ایران کی قومی پوشاک پہننے پر مجبور ہے جس سے مراد پہلوی ٹوپی اور یورپین کوٹ ہیں۔ کالر اور
ٹائی لگانا لازمی نہیں جو شخص اس قانون کے خلاف ورزی کرتا ہے اس کو ایک ہفتہ کی سزائے قید
ہوسکتی ہے یہ کہنا بے سود ہے کہ اس قانون کی ہر شخص پابندی کرتا ہے۔ دیہاتوں میں یہ پوشاک
یورپین پوشاک کی ایک نہایت بدنما نقل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن طہران اور اور بڑے شہروں میں
مردوں کے لباس کا معیار اسی قدر بلند ہو جتنا کہ یورپ کے دا...
ایران کے مصلحین اس بات کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ
نہ بڑھ جائیں اسی وجہ سے اگرچہ ایران میں گذشتہ ۱۰ سال کے
رونما ہوئیں لیکن ان اصلاحات کا ردعمل کسی جگہ ظہور میں نہیں ...
کی طرف سے اصلاحی پالیسی کا یہ رخ آزادی نسواں کے معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہے
پردے کا جو مفہوم ہم سمجھتے ہیں جس کے ذریعہ سے عورت کو بغیر ساعت مقدمہ تمام عمر کی سزائے قید دیدی جاتی ہے
وہ مفہوم ایران میں کبھی نہیں سمجھا گیا۔ وہاں عورتوں کو شہر میں نکلنے، خرید وفروخت کے لئے باہر اور
ایک دوسرے کے مکان پر جانے آنے کی ہمیشہ اجازت رہی۔ قاچار کے عہد میں زمانہ صفوی کی
قدیم خوبصورت نسوانی پوشاک کے بجائے مغربی رقص خانوں کی پوشاک رائج ہوگئی، جو حد درجہ
حیا سوز اور ناشائستہ تھی۔ گذشتہ چند سال کے اندر اصلاحات کے سلسلہ میں معمولی مغربی پوشاک
اختیار کرلی گئی قبیلوں اور گاؤں کی عورتیں اب بھی قدیم پوشاک میں نظر آتی ہیں یہ ہندوستانی
لہنگے کے مانند ایک لانبا کرتہ ہوتا ہے۔ قصبات اور بڑے بڑے شہروں میں عورتیں فراک اور موزے
پہنتی ہیں اور باہر نکلتے وقت ایک سیاہ برقعہ جس کو چادر کہتے ہیں ڈال لیتی ہیں۔ چہرہ اکثر کھلا رہتا
ہے باریک سی نقاب پڑی رہتی ہے۔ اسی سلسلہ کے متعلق آیات قرآنی کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ ان
میں چہرہ چھپانے کا حکم نہیں ہے، بلکہ عورت کی زینت یعنی جسم اور کپڑے چھپانے کا ہے، آزادی
نسواں کی رفتار بہت تیز ہے۔ طہران میں عورتوں کی ایک بہت قلیل روشن خیال جماعت نے چادر
بھی ترک کر دی ہے۔ آیندہ پانچ سال کے اندر یا شاید اس سے بھی پہلے قدیم طرز معاشرت کا کامل

مطمطالبات بھی باقی نہ رہے گا۔

اب ہمیں ایران کی موجودہ قومی حکومت پر نظر ڈالنا ہے ۱۹۰۶ء میں مظفرالدین نے ایران کے دستور اساسی کے بنیادی قوانین پر دستخط کئے اور دوسرے سال ان کے بیٹے محمد علی کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ دستور اساسی کے اس ضمیمہ پر دستخط کریں جس میں علاوہ دیگر امور کے اس کا بھی اعلان تھا کہ فرمانروائی جمہور کا حق ہے محمد علی شاہ نے دستور اساسی کی خلاف ورزی کی متواتر کوشش کی جس کا انجام ان کے اخراج کی شکل میں نمودار ہوا اور ان کے بیٹے احمد شاہ کے زمانہ صغرسنی میں تمام اختیارات تمام دفاتر دستوری قائدین کے ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ یہ زمانہ ایران کے لئے بہت خوشگوار تھا۔ روس اور انگلستان کے غالب اثرات نے آزادی ایران کو صرف غلط بنا دیا۔ ملک کے نظم ونسق میں ابتری پیدا ہو گئی اور عمال حکومت کی حالت بگڑ گئی، باقاعدہ فوج کی تعداد کبھی مشکل سے ۴ ہزار تک پہونچی ہوگی۔ مالیہ ایران کی نصف رقم ہضم کر لی جاتی تھی صوبجات میں مرکزی حکومت کے احکام ٹھکرا دئے جاتے اور ان سے اغماض برتا جاتا تھا۔ محصولات کا وصول کرنا دول خارجہ کے اثرات کی وجہ سے مشکل ہو گیا تھا۔ اور موروثی گورنران اور سرداران قبائل سرکاری مطالبات کا ایک حصہ بھی مشکل سے ادا کرتے تھے اور رہنمایان قوم بجائے اس کے کہ نظم ونسق میں اصلاح کی کوشش کرتے اپنی جیبیں بھرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ مصائب ایران کا کسی کو بھی غم نہ تھا، کوئی مدبر اتنا دیانت وار نہ تھا کہ دوسرے کی قلعی کھول سکے۔ بدترین کا یہ گروہ جس میں صرف یہی ایک خوبی تھی کہ وہ تمام بداعمالیوں کو سر اختیار ہتا تھا برابر برسر اقتدار رہا یہاں تک کہ موسم سرما میں ایک رات ان میں کا ہر ایک اچانک گرفتار کر لیا گیا۔ رضا شاہ نے جو انقلاب برپا کیا اس کی تمامتر اہمیت اس میں مضمر ہے کہ اس نے پرانے مدبرین کے جتھے کو توڑ دیا اور اس کی جگہ قومی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ ملک کی دستوری حکومت کے بادشاہ احمد شاہ ۵ سال اور رہے لیکن تمام اختیارات جدید پارٹی نے اپنے ہی ہاتھوں میں رکھے۔ رضا شاہ نے پہلا کام یہ کیا کہ فوج اور پولیس کی از سر نو تنظیم کی اور ان کے ذریعہ سے باغی سرداروں کو دبانا

شروع کیا اور ملک میں پھر امن و امان قائم کیا یہ کام انہوں نے غیر معمولی قابلیت سے انجام دیا اور دولت ایران یعنی مرکزی حکومت کا عاملانہ اقتدار سب پر قائم کیا۔ گذشتہ ۱۱ سال کے اندر دولت ایران کی تشکیل جدید طرز پر کی گئی جس میں مذہبی طبقہ کا کوئی دخل نہ رہا۔

ایران کے دستور اساسی کی تعریف میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے سوا ان مذہبی تحفظات کے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، یہ دستور بالکل بلجیم کے دستور اساسی کی نقل ہے، اس کی بہت سی دفعات ناقابل عمل ثابت ہو چکی ہیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء و سنہ ۱۹۰۷ء میں جس کمیٹی نے [illegible]
سابقہ تجربہ اس کا نہ تھا۔ اس لئے قدرۃً اس نے مغربی ممالک
نزدیک جدید ترین اور بہترین تھا۔ ۱۹۲۱ء کے آئینی [illegible]
بوجہ کہ پس پشت ڈالدی گئیں اور جنگ عظیم کے زمانہ میں [illegible]
کے مقابلہ میں پہلوی حکومت کو بعض اوقات (ڈکٹیٹر شپ) کہا جاتا ہے لیکن یہ [illegible] ہے۔ اس
کہ اولاً تو رضا شاہ اور ان کے عمال نے اپنے تمام اختیارات اسی طریقہ پر حاصل کئے۔ کیونکہ مجلس نے ان کو تخت شاہی پر بٹھایا اور دستور اساسی کی ان ترمیمات کا جن کی رو سے بادشاہت نئے خاندان میں منتقل ہوئی یہ مفہوم بھی تھا کہ رضا شاہ اپنی اصلاحات کا کام شروع کریں گے دوسرے یہ کہ سوا دستور اساسی کی ان دفعات کے جن کو آئینی حکومت نے ناقابل عمل قرار دیکر رد کر دیا تھا، مثلاً سینیٹ ضلعے اور صوبے کی کونسلوں کا قائم کرنا، رضا شاہ نے اپنے تمام زمانہ حکومت میں بنیادی قوانین کی حرفاً و معناً نہایت دیانت داری کے ساتھ پابندی کی ہے جس بات سے دولت ایران پر ڈکٹیٹر شپ کا الزام لگایا جاتا ہے وہ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مجلس کے لئے انتخابات کا طریقہ ایک بالکل مہمل اور بے معنی ہے۔ دستور اساسی میں مجالس واضع قوانین کے دو ایوانوں کی شرط تھی۔ ایک سینیٹ ۶۰ ممبروں کی جن میں سے نصف تعداد بادشاہ کی نامزدگی کے لئے معین تھی اور نصف قوم کے انتخاب کے لئے۔ اور دوسری منتخب شدہ مجلس شورائے ملی جس کے ممبروں کی تعداد دو سو تھی۔ سینیٹ کبھی وجود میں نہیں آئی۔ اور فی الحقیقت ایک ایسے ملک

[illegible] امرا اور اس کا احترام دونوں مفقود ہوں۔ دوسرے ایوان کی گنجائش [illegible] [illegible] مجلس کے ممبروں کا انتخاب دو سال کے لئے ایک یا متعدد حلقہ ہائے انتخاب سے [illegible] ہے موجودہ مجلس جو آٹھویں مجلس ہے، ۱۱۰ ممبروں پر مشتمل ہے۔ دستور اساسی نے مجلس [illegible] اختیار دے رکھے تھے جو دوسرے ملکوں میں مجالس واضع قوانین کو عموماً نہیں دیئے جاتے [illegible] اور انتظامی افسروں کے سپرد ہوتے ہیں۔ کسی دوسری حکومت سے کوئی صلحنامہ [illegible] مجلس کی منظوری کے جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تمام منشورات جو دربارہ ملازمت سرکاری صنعت [illegible] و معاشی رعایات بحق اشخاص غیر ملکی یا باشندگان جاری ہوں تاوقتیکہ ان کو مجلس منظور نہ [illegible] ناجائز سمجھے جاتے تھے۔ حکومت کسی غیر ملکی شخص کا تقرر بغیر منظوری مجلس عمل میں نہیں لا سکتی [illegible] ہی بیکار ہے کہ مجلس کو مالیہ پر پورا اختیار حاصل ہے۔ اور وزرا مجلس کے سامنے جوابدہ ہیں۔ [illegible] مجلس کو اس وقت بشرح ۳۰۰ تومان (قریب ۶۰۰ روپیہ کے) مشاہرہ ملتا ہے لیکن یہ امر قابل لحاظ ہے۔ کہ ایران میں سرکاری ملازمت کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ صرف ۱۲۰۰ تومان ہے [illegible] کے صدر کی تنخواہ ۶۰۰ تومان ہے اور وزرا کی ۷۰۰ تومان (۱۴۰۰ روپیہ) مجلس کا عام اجلاس قریب قریب دو بار ہر ہفتہ میں ہوتا ہے۔ اجلاس بہت مختصر ہوتا ہے جو کبھی شاذ و نادر ۲ گھنٹہ سے تجاوز ہوتا ہوگا۔ تقریریں بھی بہت مختصر ہوتی ہیں لیکن اگر کوئی ممبر اعداد و شمار اور واقعات سے مسلح ہو کر طویل تقریر کرے تو یہ آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ ایران کی مجلس کے محاسن و معایب کے بارے میں جو بھی خیالات ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ مجلس اپنے زرق برق لباس و حسن اخلاق کے لحاظ سے دنیا میں بہترین مجلس ہے۔ ایوان مجلس کے باہر اکثر ارکان مجلس آپ کو تبسم آمیز احساس و سرداری کے ساتھ عالیشان باغ بہارستان کے قریب چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آئیں گے مجھے صرف ایک ہی بار ممبروں کی جماعت سنجیدہ انداز میں گفتگو کرتی ہوئی دکھلائی دی اور میں [illegible] کے بعد جلتا ہوا ان کے پاس پہونچا۔ موضوع بحث مولانا جامی رحمہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا [illegible] برآمد ہوا تھا۔ ایوان مجلس کے اندر مباحثے کوئی جوش نہیں پیدا کرتے

ملک میں کوئی مخالف پارٹی نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھی یا خوشگی زیادہ نہیں آتی مطبوعہ مذاکرات (کارروائی) کا ایک ثلث حصہ صرف آداب والقاب پر مشتمل ہوتا ہے مجلس کا عام اجلاس نمائشی ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بس ان فیصلوں کو جو کہیں اور کئے جا چکے ہیں صرف درج کارروائی کر دیتا ہے مجلس ہر چھٹے مہینہ اپنے ممبروں سے ہر وزارت کے لئے اٹھارہ ممبروں کی ایک کمیٹی یا کمیشن مقرر کرتی ہے۔ اور ممبران کمیٹی یا بالفاظ دیگر کمشنران تمام سرکاری محکمہ جات کے تیار کردہ قوانین وضوابط پر بحث و مباحثہ کر ...

کو مجلس کا اجلاس عام منظور کر لیتا ہے۔ ممبروں کو مزید تنق

کے جلسے منعقد کرنے کا حال میں انتظام کیا گیا ہے۔ پار

اس کے گرد و پیش سے نمائشی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ حکومت

منوالیتی ہے ترکوں کی قوم پرور جماعت کے مانند ایرانیوں کی کوئی جماعت نہیں ہے ہم وہ کو ایرانی انتخابات عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ کل بالغ اشخاص کو ووٹ دہی کا حق حاصل ہو۔ البتہ سنگین جرائم کے سزا یافتہ لوگ اور دیوالئے جو ان افعال کیوجہ سے اس نوبت کو پہونچے ہوں۔ اور سیاسی مجرم حق ووٹ سے محروم ہیں لیکن قانون کی یہ فیاضی بیکار ہو جاتی ہے اس لئے کہ پہلے سے کوئی فہرست انتخاب کنندگان کی تیار نہیں کی جاتی۔

ہر حلقہ انتخاب میں انتخاب کا انتظام ایک مجلس کے متعلق ہوتا ہے جس کو مجلس نظارت کہتے اور یہ حکومت کیطرف سے مقرر کیجاتی ہے۔ مجلس نظارت مختلف حلقوں میں ماتحت کمیٹیاں ووٹ جمع کرنے کے لئے مقرر کر دیتی ہے۔ امیدواران انتخاب کی باقاعدہ نامزدگی کا کوئی طریقہ وہاں رائج نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر سرکاری حکام اور مجلس نظارت رائے دہندوں کو ہدایت نہ کریں۔ تو ان کو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کتنے امیدوار مقابلہ کے لئے کھڑے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ رائے دہندہ وقت مقررہ پر حاضر ہو جاتا ہے۔ اپنے ساتھ ایک سفید کاغذ کی پرچی لاتا ہے جس پر اس امیدوار کا نام پہلے سے لکھدیا جاتا ہے جسے وہ منتخب کرانا چاہتا ہے۔ ہر شخص کے حق رائے دہندگی

[illegible] ہی وقت اور اسی جگہ ہوتا ہے اور اس کے بعد رائے دہندگان [illegible]
[illegible] جاتے ہیں۔ بالآخر رائے شماری ہوتی ہے۔ اور کامیاب امیدوار کو ایک [illegible]
[illegible] جس میں یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ کل کتنے ووٹ آئے اور اس میں سے کامیاب
امیدوار کو کتنے ووٹ ملے اس قسم کے طریق انتخاب پر تنقید کرنا عبث ہے۔ ظاہر ہے کہ انتخاب
کنندگان کی فہرست نہ ہونے کی وجہ سے اس کا موقع نہیں رہتا ہے کہ اگر کسی شخص کو اس پر کوئی
اعتراض ہو تو قانونی چارہ جوئی کر سکے یعنی یہ شہریوں کو ان کے ایک ایسے حق سے محروم کر دیا
گیا ہے جو قانوناً ان کو حاصل ہے۔ پھر چونکہ امیدوار باضابطہ نامزد نہیں کئے جاتے۔ اس لئے عملاً گویا
کسی رائے عامہ کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ مجلس نظارت اپنے فرائض بیحد جوش اور قابل تعریف وطن
پرستی کے جذبہ سے انجام دیتی ہے کہ بکس سے جب پرچیاں نکلتی ہیں ان کی تعداد عموماً ان لوگوں
کی تعداد سے کئی گنی زیادہ ہوتی ہے جو رائے دینے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے
کہ قانون کے مطابق کوئی امیدوار بغیر کلی اکثریت کے منتخب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اگر مجلس نظارت
کافی توجہ نہ کرے تو کوئی امیدوار کبھی منتخب ہی نہیں ہو سکتا۔ امیدوار کی نامزدگی کا کوئی طریقہ رائج
نہ ہونے کی وجہ سے ایک وقت سو سو امیدواروں کو ایک ایک حلقہ سے ووٹ دیئے جا سکتے ہیں۔
اس لئے مجلس کو وہی کرنا پڑتا ہے جس کی اس صورت میں ضرورت پڑتی ہے۔ یعنی فرضی اشخاص
کی طرف سے پرچیاں بکس میں ڈال دی جاتی ہیں اور مجلس ان کو نظر انداز کر دیتی ہے یہاں تک کہ رائے
شماری کا وقت آ جاتا ہے۔ پھر پرچیوں کے شمار میں البتہ پوری دیانتداری سے کام لیا جاتا ہے
کثیر تعلیمیافتہ لوگ اس قسم کے انتخابات کو تسلیم کرتے ہیں مگر بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کسی تبدیلی کے
خواہاں ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ انتخابات کے لئے ایک صحیح نظام قائم کرنے کی راہ میں بہت
بڑی دشواریاں بھی ہیں۔ ایران کی آبادی بہت تھوڑی اور بکھری ہوئی ہے تقریباً ۱۱ اشخاص فی
مربع میل اوسط ہوتا ہے اس لئے عام رائے دہندگان کے لئے عملاً یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ مقام
انتخاب تک پہونچ سکیں اکثر لوگوں کو تین یا چار دن کا سفر پیدل یا خچر پر طے کرنا پڑے گا۔ اس کے

[illegible] بھی ہے کہ اگر انتخاب کا کام باقاعدہ طور پر ہو تو کہیں سیاسی تجار کو آگے بڑھنے کا موقعہ
[illegible] اور یہ لوگ بآسانی بیرونی طاقتوں کے ہاتھ بک جائیں ۔ برخلاف اس کے قومی
حکومت اس بات کی کوشش کرتی ہو کہ جن امیدواروں کو وہ منتخب کرائے وہ اپنے انتخاب کے
بعد حب الوطنی۔ اور وطن دوستی کا ثبوت دیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ پہلوی حکومت
قائم ہی اس وجہ سے ہوئی کہ ایران اصلاحات اور جدید تہذیب اور ترقیات کی راہ پر گامزن
ہو جس قوم نے ۱۹۲۵ء میں اپنی مجلس موسسہ میں رضا شاہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے
لائحہ عمل کی تکمیل کے لیے کوشش جاری رکھیں اس قوم نے اگر [illegible]
منظوری دی تو یہ کسی طرح قابل اعتراض نہیں کہا جا سکتا
جمہوری اصول پر منتخب کردہ مجلس سے بجائے مدد [illegible]
رفتار اگر اسی طرح جاری رہی اور اس رفتار کی [illegible]
شروع کی ہیں ان کو پایہ تکمیل تک پہونچانے میں کم از کم دس سال صرف ہوں گے۔ ایران
کی غیر ذمہ دار اور نیم دستوری حکومت نے ملک کو جو فائدہ عظیم پہنچایا ہے اس سے کوئی انکار
نہیں کر سکتا۔ ایران کے اکثر ادارات اس سے بالکل مطمئن ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ
اصلاحات کا دور جب ختم ہو جائے گا تو موجودہ حکومت کی بجائے انگریزی نمونہ پر ایک
آئینی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔

انقلاب سے پہلے

اردو شاعری کی حالت

یہ ایک باب ہے عبدالقادر صاحب سروری کی کتاب "جدید اردو شاعری" کا جو عنقریب طبع ہو کر شائع ہونیوالی ہے

ادبیات کا تعلق قوم کی زندگی کیساتھ اسقدر گہرا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔ قوموں کی حیات پر جتنے انقلاب آفریں واقعات گذرتے ہیں ان سے قومی شاعری بھی متاثر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان کی شاعری مختلف زمانوں میں جدا جدا رنگ رکھتی ہے۔ انگریزی شاعری کے ارتقا کا مطالعہ کیجئے تو چاسر کے زمانے کچھ سال بعد سے لے کر سولھویں صدی کے وسط کا زمانہ بہت ہی بنجر اور قحط سالی کا دیگا مگر اس کے بعد ملکہ الزبتھ کی حکومت کا زمانہ آتا ہے جو انگریزی ادبیات کا زرین دور ہے۔ پھر ۱۶۶۰ء سے ۱۷۹۸ء تک انگریزی ادب اور شاعری کا معیار پست ہونے لگا تھا۔ اسی طرح اطالوی ادب میں بھی سولہویں صدی کے وسط کا زمانہ تاسو۔ مارونی اور چند دیگر شاعروں سے قطع نظر کرکے شاعرانہ قابلیتوں کی خوابیدگی کا زمانہ ہے۔ اردو شاعری پر بھی اس کی مختصر حیات کے دوران میں کئی موافق اور ناموافق زمانے آتے جاتے رہے۔ اور اسی تعلق کی وجہ سے اردو شاعری اور ادب کا معیار گھٹتا بڑھتا رہا۔

اردو شاعری نے اپنی پیدائش سے لیکر اب تک کئی لباس بدلے۔ نہایت سرسری اور عام مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم تین دور اس شاعری کے گذرے ہیں۔ سب سے پہلے اپنی پیدائش میں یہ زیادہ تر ہندی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی سرزمین اور اسی معاشرہ کے آب وگل سے اس کا خمیر ہوا ہے۔ بعد میں حاکم مغلوں کی زبان یعنی فارسی سے یہ اس قدر متاثر ہوئی کہ ظاہر اور باطن دونوں لحاظ سے یہ فارسی شاعری کا مثنیٰ معلوم ہونے لگی۔ پھر جب انگریزوں کا تسلط

[illegible] ہوا تو مغربی شاعری کی طرف یہ زیادہ سے زیادہ مائل ہوتی گئی۔ گویا اردو شاعری کے بھی وہی تین دور ہیں جو خود ہندوستان کی تاریخ کے سمجھے جاتے ہیں۔

اردو شاعری پر موجودہ انقلاب آنے سے پہلے، اس کی جو حالت تھی اس پر ہم یہاں تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس باب کا مطالعہ موجودہ دور میں اردو شاعری کی اصولی تبدیلی کے اسباب، قارئین کرام پر اچھی طرح ظاہر کردیگا۔ اور اس سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ ہم انقلاب سے قبل کی شاعری کا موازنہ جدید شاعری کے ساتھ بآسانی کرسکیں گے۔

اردو شاعری کا یہ دور انیسویں صدی کی ابتدا سے [illegible]

اس زمانہ میں اردو شاعری کا تعلق زیادہ تر لکھنؤ سے رہا [illegible]

[illegible] وں کی سرپرستی نصیب ہوتی رہی۔ اس دور کی [illegible]

تنزل کا نمونہ ہے۔ دہلی کی شہنشاہی کے خاتمے نے ایک [illegible]

کی سیاسی اور معاشرتی فضا میں دوڑا دی تھی۔ اس پستی سے اردو شاعری بے حد متاثر ہوئی۔ اس زمانے میں بھی اردو کے بہت سے قابل قدر شاعر پیدا ہوئے۔ لیکن چند مستثنیٰ مثالوں کے سوا جن کی ذاتی قابلیت مروجہ شاعری کے تمام تر مصنوعی اور رسمی اصولوں کو توڑ کر بلند ہوگئی۔ شاعری کی پست ہمتی اور ابتذال سے خالی ہونیکی ایک مسلسل داستان ہے۔ رنگین۔ سلیمان۔ ظفر، قائم، منت، ممنون، حسرت، قدرت، بیدار، ہدایت، فراق، ضیا، بقا، حزیں، بیان، راغ، نظیر، ناسخ، برق، بحر، آباد۔ وزیر، رشک، مہر، منیر، سعادت، اختر (واجد علی شاہ) اسیر، امانت، قلق، ذکی، درخشاں، انس، انیس، دبیر، عشق، تعشق، صابر، رشید، اوج، غالب۔ ذوق، مومن، مجروح، تیر، شیفتہ داغ، اس دور کے جلیل القدر شعرا ہیں، غیر مشہور شاعروں اور نظم نگاروں کا شمار تو حساب سے باہر ہے۔ اس مہتم بالشان فہرست کے ناموں پر نظر ڈالیں تو ہم ان کی کثرت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اگر ہر شاعر کے کلام کو انفرادی طور پر جانچیں یا ان کا تقابلی مطالعہ بھی کریں تو ہم ان کی مخصوص ذکاوت، کلام کی کثرت اور اس کے صوری تنوع سے بے حد مرعوب ہوتے ہیں

[illegible] میر البتہ ترقی، درد تا کو چھوڑ دیئے۔ یہ فلک کے ہیرے ہیں۔ اور انہیں کا اس
[illegible] کی شاعری زندہ ہے۔ لیکن اس طویل فہرست کے کسی دوسرے بلکہ بہت شاعر
[illegible] میر، درد، سودا، سوز، اثر نہیں۔ بلکہ انشا، مصحفی، جرأت اور شاہ نصیر ہی کے
[illegible] سامنے رکھئے! اس کا جادو کیسا غائب ہو جاتا ہے حق یہ ہے کہ اس دور کے شاعر قدما کو
[illegible] زندہ تھے، انہیں کی ہم نامی اور ہم نوائی کے طفیل میں شاعر مشہور ہوئے۔ ورنہ اکثر
[illegible] میں "شعریت" ان کے کلام سے کوسوں دور ہے۔

غزل گوئی اردو کے قدیم اور جدید شاعروں کا بڑا مقبول مشغلہ رہا ہے، غزل کے ارتقا،
کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے لیکر میر اور سودا تک اس میں جو ترقی ہوئی، وہ انہیں پر ختم
ہو گئی۔ انشا، جرأت اور مصحفی میر کا اتباع کرتے ہیں، اس لئے ان کی غزلیں بھی کم و بیش غزل کے
تمام اوصاف سے پُر ہیں۔ غزل اور قصیدہ کو میر اور سودا نے انتہائے کمال تک پہنچایا تھا تاہم
ان کے بعض معاصر شعرا جیسے درد، سوز، اور اثر وغیرہ یا ان کے بعد ہی آنے والے شاعر جیسے انشا
جرأت، مصحفی، شاہ نصیر میں سے ہر ایک نے اگر غزل کو ترقی دینے میں کامیابی حاصل نہیں کی تو
کم سے کم اس کو اپنی جگہ برقرار رکھنے میں انہیں بیحد کامیابی ہوئی۔ درد بھی اگر میر ہی کی طرح عاشقانہ
غزل گوئی اختیار کرتے تو نہ اس صنف میں وسعت پیدا ہوتی اور نہ خود ان کا رنگ میر کے مقابلہ
میں جم سکتا۔ تصوف کو اپنی غزل کا موضوع بنا کر درد نے شاعری کا تنوع اور اپنی انفرادیت
قائم کر دی جس کا احساس خود ان کو تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ پھولے گا اس زباں میں بھی گلزار معرفت۔
یاں میں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا۔ یہی حال انشا۔ جرأت۔ مصحفی اور شاہ نصیر کا بھی ہے جنہوں نے
غزل کو صرف میر ہی کے معیار پر لکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کے کلام میں سادگی، اپچ، عمق،
درد اور اثر غرض غزل کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ فرق صرف صناعی کا ہے۔ میر کا سا اعلیٰ
دماغ انہیں مبدء فیاض کی طرف سے عطا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس قابل تحسین جماعت کے ہاتھ
سے جب غزل مذکورہ بالا گروہ کے شعرا کے ہاتھ میں پہنچی، تو وہ نہ صرف اپنی بنیادی خصوصیات

[illegible] ہو گئی بلکہ بسا اوقات اس میں شعریت کا کوئی جز و بھی باقی نہ رہا۔ خیالات اور موضوعات کا غزل میں بہت کم اضافہ ہوا۔ لیکن اپج کا مادہ ہر جگہ اپنا کام کرتا ہے۔ اس کی بدولت ہماری شاعری کو فائدہ پہنچنے کی بجائے اکثر نقصان پہنچا۔ کیونکہ متاخرین کے اس گروہ نے جب میر سودا اور ان کے معاصرین اور تابعین کو انہیں کے میدان میں شکست دینے کی سکت اپنے آپ میں نہ پائی تو ان کی اپج کا فطری مادہ اسالیب کے تغیر کی طرف مائل ہو گیا اور ان کی پستی کا نامعلوم احساس ان کی غزل میں رعب و اور [illegible] رفتہ رفتہ غزل کے شعر معموں کی شکل اختیار کرنے لگے۔ آتش اور غالب کا ابتدائی کلام اس کا ثبوت ہے۔

ایک طرف تو غزل میں اپج اور جدت طرازی :

طرف بعض شاعروں نے میر اور سودا کے ریختہ کے مقابلہ میں ریختی ایجاد کی۔ بس جب وہ اپنی طبعی قوت کے وسیلے سے حریف پر غلبہ پانا مشکل دیکھتے ہیں تو پھر وہ عورتوں کے ذریعہ انہیں مغلوب کرتے ہیں۔ غالباً ریختی نگاروں کا بھی یہی مقصد تھا۔ لیکن ریختی گویوں کا یہ منتر بھی ریختہ گویوں کے مقابلے میں کارگر نہ ہو سکا کیونکہ اس کے موجدوں ہی نے اس کو اپنے ادنے او شہوانی جذبات کے اظہار کا آلہ بنا لیا۔ انشا سے لیکر آجتک کسی ریختی گو کا کلام اس طرح کے حیوانی جذبات سے خالی نظر نہیں آیا۔ اسی وصف نے ریختی کو اردو شاعری کی کوئی مستند صنف نہ بننے دیا۔ اور یہ جدت طرازی اس طرح ضائع ہو گئی۔ ورنہ فی نفسہ ریختی کوئی بری صنف نہ تھی۔ کیونکہ ہماری سوسائٹی میں عورتوں اور مردوں کی علیحدگی اور پردہ داری کی رسم نے عورتوں کی زبان میں چند مخصوص صفت پیدا کر دیئے ہیں۔ جو مردوں کی بول چال میں نہیں آ سکتے۔ ریختی کی ایجاد بھی اگر فحش سے نہ ہوتی تو کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ ہندی شاعری کی حریف تھی۔ غزل تنزل کے اس مرحلے پر پہنچنے کے بعد ہمارے ادب کے لئے ایک بھولی ہوئی صنف ہو جاتی اگر جدید احساس پیدا ہونے سے پہلے دہلی میں قدیم شائستگی کے چند علمبردار جیسے ذوق۔ غالب۔ اور داغ نہ پیدا ہو جاتے۔ ان

[illegible] پیدا کیا۔ ذوق نے اپنی سادگی اور سلاست سے۔ داغ نے اپنی اعلیٰ [illegible] کے ذریعہ۔ اور غالب نے اپنی بلند آہنگی کی بدولت غزل کو پھر بہتر [illegible] [illegible] کی سی مقبولیت بخشی خس و خاشاک سے پاک کرکے انہوں نے اس صنف شعر [illegible] بعد جبکہ پہونچا دیا کہ اس کا عشر عشیر بھی آج تک کسی شاعر کو نصیب نہ ہو سکا۔ غزل کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے گویا اس کا سنبھالا لیتا تھا۔

قصیدہ اپنی اصلی خصوصیات کے ساتھ اردو میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ فارسی شاعری کے قصیدے جو بادشاہوں اور امیروں کی مبالغہ آمیز مدح میں لکھے گئے تھے۔ ہمارا اصول راہنما ہو اگر ہم اسی قسم کے قصیدوں کو اپنا معیار سمجھیں تو سودا کے قصیدے لازوال شہ پارے ہیں۔ ان کے بعد سے ولی کے آخری شاعر داغ تک اس معیار کے قصیدے لکھے ہی نہیں گئے۔ قصیدے کا ارتقا اردو ادب میں، فارسی کے برخلاف بہت ہی کم ہوا۔ اس میدان میں اس سرے پر سودا اور دوسرے سرے پر ذوق۔ درمیان میں تقریباً ایک صدی کا طویل وقفہ ہے۔ جس میں قصیدہ گوئی بالکل خوابیدہ رہی۔ اس اثنا میں قصیدہ گوئی کے ذوق نے ایک اہم کام ضرور انجام دیا۔ یہ ہجو نگاری کی ترقی ہے۔ ہجو درحقیقت قصیدے کی فرع ہے۔ ہجو کے سرتاج بھی سودا ہی ہیں لیکن نقاد سودا کی شاعری کے اس پہلو کو ہمیشہ تاریک پہلو سمجھتے رہے۔ مدح سرائی کی طرح شاعروں نے مذمت میں بھی حد اعتدال کا خیال بالائے طاق رکھدیا ہے۔ اور اکثر فحش پر اتر آئے ہیں۔ اس لئے ہجو نگار شعرا نے جس قدر موشگافیاں کی ہیں وہ ضائع گئیں۔

رباعی اردو شاعری میں، فارسی شاعری کی طرح زیادہ رواج نہ پا سکی۔ قدیم شعرا نے [illegible] کی خاطر اس میں اظہار خیال فرمایا تھا۔ اس لئے اس صنف [illegible] نام و نشان اب ہوتا نظر آتا ہے لیکن قدیم اصناف سے مثنوی کو اس دور میں خاصا

[illegible]

نصیب ہوا۔ قدیم اردو میں مثنوی بہت مقبول صنف تھی چنانچہ اکثر مذہبی تعلیمات اور اخلاقی باتیں تھے، قدیم زمانہ کے شعرا مثنوی ہی میں لکھتے تھے۔ انہیں شعرا نے مثنوی کی ایک شکل بھی متعین کر دی تھی۔ شمالی ہند میں جب شاعری شروع ہوئی تو اس صنف کا رواج کچھ دنوں کے لیے کم ہو گیا تھا۔ میرؔ اور سوداؔ کا عصر دراصل غزل اور قصیدے کا عصر ہے۔ انہیں دو صنفوں کو ان شعرا نے اور ان کے مقلدین نے خوب ترقی دی۔ میرؔ اور سوداؔ کی مثنویاں نہ تو فارسی مثنوی کا تتبع ہیں، اور نہ قدیم اردو شاعروں کی مثنویوں کی تقلید میں لکھی گئی ہیں بلکہ یہ عموماً مختصری ہیں جن میں کسی خاص واقعہ کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ میرؔ اور سوداؔ کے عصر میں یا اس کے قریب ۔ ۔ ۔

وخیال سے بہتر کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ اردو مثنوی کی جو شکل

حد تک خواب وخیال سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ خواب وخیال

کے لکھے جانے تک جو عرصہ گذرا اس میں کوئی قابل ذکر مثنوی نہیں

مقبول بنایا۔ ان کی مثنوی "سحر البیان" اردو کی مثنویوں میں سب سے بلند رتبہ ہے۔

ہمارے پیش نظر دور میں جتنی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ وہ سب "سحر البیان" کی تقلید ہیں۔ ان میں بعض مثنویاں جیسے مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار ارم" اور نواب مرزا شوق کی مثنویاں بے حد قابل قدر ہیں لیکن "سحر البیان" سے ان کو کوئی نسبت نہیں۔ نازک خیالیوں اور زبان کے چٹخاروں نے ان مثنوی کو کتنا ہی مقبول کیوں نہ بنا دیا ہو، "سحر البیان" کی سادگی، صفائی اور سب سے بڑھ کر اس کی شعریت ان میں کم پائی جاتی ہے "سحر البیان" ہر مذاق کے لئے ہے۔ اور ان مثنویوں سے خاص مذاق ہی متاثر ہوتے ہیں۔ بلند پایہ ادبی کارنامے مقام اور زمان کی قید سے اعلیٰ وارفع ہونے چاہئیں۔

واسوخت اور "سبھا" اس عصر کی مخصوص منظوم اختراعات ہیں۔ واسوخت خیالی اور تقلیدی شاعری کی ایک فرع ہے۔ اس نوع کی شاعری کا نہ تو مقصد ہی اعلیٰ ہوتا ہے۔ اور نہ اس کے اچھے نمونے ہی پیدا ہوئے۔ اس لئے واسوخت کو نہ جب فروغ نصیب ہو سکا اور نہ اب ہو سکیگا۔

[illegible] موجدوں نے ریختی گویوں کی طرح، اس کی بنیاد ہی ایسے زود فنا جذبات پر رکھی کہ جلد ہی یہ صنف متروک ہو گئی، اور اب صرف تاریخ ادبیات کی زینت ہے۔ "سبھا" یقیناً بڑی قدر اختراع تھی۔ اور اگر اس عصر کا اصل اصول تقلید نہ ہوتا یا کم سے کم زمانہ اسقدر جلد بدل جاتا تو توقع تھی کہ امانت نے "اندرسبھا" کی شکل میں جس فن کی بنیاد ڈالی تھی، اسے ارتقا نصیب ہوتی اس زمانے کی تقلیدی ذہنیت کا یہ حال تھا کہ مداری لال نے جب "اندرسبھا" کو سامنے رکھکر اپنا ناٹک لکھا۔ تو اس سے آگے بڑھنا تو درکنار خود اس کی حد تک بھی نہ پہنچ سکے اور پھر ظاہر کے لحاظ سے امانت کی "اندرسبھا" اور مداری لال کی "اندرسبھا" میں کچھ فرق نہیں۔ ان سبھاؤں کی قدر اس زمانے میں بہت ہوئی۔ مگر اس لئے نہیں کہ یہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ تھیں، بلکہ صرف اس لئے کہ یہ ایک جدت تھی۔ یہ ساون کی گھاس کی طرح پیدا ہوئیں اور ابھی نشوونما بھی نہ پائی تھیں کہ سیاسی انقلاب نے انہیں فنا کر دیا۔

اس دور کی ادبی قحط سالی پوری ہو جاتی، اگر اس میں مرثیہ جیسی قابل قدر صنف کی شاعری کا نشوونما نہ ہوتا۔ مرثیہ اپنی موجودہ شکل میں درحقیقت اسی عصر کی پیداوار ہے اس کے موضوع میں اس قدر تنوع اور اس کے معمار ایسے صناع تھے کہ ان سے نہ صرف رزمیہ منظومات کی کمی پوری ہوتی ہے، بلکہ واقعات نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری کے کئی ایک قابل قدر پہلوؤں کا اردو شاعری میں اضافہ ہو جاتا ہے جب تک اردو شاعری باقی ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے نام دنیا میں استحسان کے ساتھ لئے جائیں گے۔ لیکن مرثیہ سے متعلق دو امر خاص طور سے توجہ طلب ہیں ایک تو یہ کہ انیس اور دبیر کے بعد ان کی آدھی قابلیت کے مرثیہ نگار بھی اردو میں پیدا نہ ہو سکے۔ اور اسی لئے اس کے موجد، اس کے خاتم بھی بن گئے۔ دوسرے مرثیہ کی شاعری درحقیقت مروجہ شاعری سے بیزاری کا ایک بدیہی نتیجہ ہے۔ نیز مرثیہ کی شاعری کے عروج کا زمانہ جدید شاعری کے آغاز سے اس قدر متصل ہے کہ ہم اگر اس کو جدید شاعری کی ابتدا نہ بھی سمجھیں، تاہم قدیم شاعری سے دل برداشتگی کے آثار اس میں ضرور ملیں گے۔

مرثیہ سے ہٹ کر اس دور کی شاعری میں ہم کو کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جسے ہم اردو شاعروں میں شعری احساس کی ارتقاء کا ثبوت سمجھ سکیں، ہاں اس احساس کے تنزل کا پتہ بہت آسانی سے چل جاتا ہے۔ اس لئے دور جانے کی ضرورت بھی نہیں، ہزل، زٹل، ہرسیہ وغیرہ، بیسیوں چیزیں اس زمانے میں شعر کے نام سے پھیلی ہوئی ملتی ہیں۔ حالانکہ اس طرح کی لغویات ان میں کتنی ہی اپج کیوں نہ ہو، شاعری سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں۔ اور اگر ہم انہیں شاعری میں داخل کرنے لگیں تو ہم اپنی ادبیات کی بدنامی کے ذمہ دار ہوں گے۔

غرض انقلاب سے پہلے کی اردو شاعری پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صنف شعر کی پیدائش سادگی پر ہوئی۔ بعد میں ان کا ارتقا مضامین کے اور زبان کے لحاظ سے ان میں الجھاؤ اور ظاہری شان کی طرف ترقی اردو شاعری کا عام اصول معلوم ہوتا ہے۔ غزل جو آتش، ناسخ، اور مومن اور ایک حد تک غالب کے ہاتھوں میں بیحد مصنوعی ارت... مثنوی میں میر حسن کے سادی سیدھی صناعی کی جگہ پنڈت دیا شنکر نسیم وغیرہ کے اعلیٰ دقیق تصنع نے لے لی۔ قصیدے میں بھی یہی چیز نظر آتی ہے۔ سودا کے قصیدے کتنے ہی پرشکوہ کیوں نہ ہوں لیکن ان میں سادگی ہے، اور ذوق کے قصیدوں کی سی وقت نظر کا ان میں پتہ نہیں۔ خود مرثیہ پر بھی یہ اصول ایک حد تک صادق آتا ہے۔ انیس اور دبیر دونوں معاصر ہیں اس کے باوجود میر انیس کی سادہ پرکاری کے مقابلہ میں مرزا دبیر کی فلک پیمائی قابل غور ہے۔

لیکن زندہ زبان اور زندہ ادب مخالف ماحول اور ہمت شکن فضا میں بھی کہیں کہیں اپنی حیات کا ثبوت دینے پر مجبور ہے۔ رسمی مضامین اور معین اسالیب کے درمیان سے میاں نظیر اکبر آبادی کا اٹھنا، غزل کی رونق جب بگڑ چکی تھی، غالب اور داغ جیسے باکمال غزل گو شعراء کا پیدا ہونا اور جب اردو شاعری کی قلمرو قطعاً محدود نظر آرہی تھی، انیس اور دبیر کا مرثیہ کی رزمیہ شاعری کا علم بلند کرکے اٹھ کھڑا ہونا، ہماری زبان اور ہماری شاعری کی زندگی کے منتشر ثبوت ہیں۔ اگر زیر

[illegible] شاعروں سے خالی ہوتا تو پھر اس میں پائیدار اہمیت کا ادب لاپتہ تھا، دوسرے اور [illegible] کے شاعر تو اس عصر میں بہت سے ہیں، قومی پژمردگی سے اردو شاعری اس دور [illegible] قدر متاثر ہوئی۔ شاید ہی کبھی ہوئی ہو، ہر شاعر کا کلام اکثر و بیشتر یاس انگیز جذبات سے [illegible] اور اس طرز کو متصوفانہ خیالات سے بڑی مدد ملی۔ تصوف ناواقف کے لئے بہت ہی مبہم چیز اس لئے اس دور کے شاعروں کے لئے اس رنگ میں شاعری کرنے سے بڑی آسانی پیدا ہو گئی تھی۔

قدیم شائستگی اور تمدن کے اس آخری دور میں ہماری ادبیات اور شاعری میں اعلی پایہ اور اوریجنل کارناموں کی پیدایش کا عدم تسلسل اور بلند سے بلند تر شعری احساس کی طرف ذہنیتوں کی رفتار کا منقطع ہوتا جانا اور پائدار شاعروں کا وقفوں وقفوں سے ابھرنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس کو کسی قوت محرکہ کی ضرورت ہے۔

غزل

از مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری

خود سراپا ناز کہہ لوں اس ستم آرا کو میں
کس طرح قائل کروں گا لیکن اک دنیا کو میں

حسن نے کر دیں نمایاں عشق کی مجبوریاں
کھا گیا غش۔ دیکھ کر اس چہرۂ زیبا کو میں

ہے بیابانوں سے میری وحشت دل بے نیاز
خود جنوں کی جیب میں رکھتا ہوں اک صحرا کو میں

ہوں وہ مجنوں بس مرا چل جائے دنیا میں اگر
جتنے زیور ہیں پنہا دوں لاکے سب لیلیٰ کو میں

آرزو یہ ہے کہ سینہ میں سمائے جس قدر
دل کے بدلے بھر لوں خاک یثرب و بطحا کو میں

جسم عالم میں اسی سے ہے رواں روح نشاط
دل سمجھتا ہوں جہاں کا قبۂ خضرا کو میں

کاش ہو اس کے قدم تک بھی رسائی ایک دن
چومتا رہتا ہوں اسلم جس کے نقش پا کو میں

مکالمہ عالم ارواح

ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً علماء عربی داں جرجی زیداں صاحب مصنف تمدن
اسلام اور ان کے رسالے الہلال سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جرجی زیداں صاحب کا انتقال ہوگیا
ان کے صاحبزادہ امیل زیداں صاحب نے ایک مضمون اپنے مشاہدات و مکالمہ عالم ارواح
پر لکھا ہے۔ خود مرحوم جرجی زیدان کو عالم ارواح سے بلا کر امیل صاحب نے گفتگو فرمائی ہے مضمون
کا اقتباس اور کل گفتگو کا ترجمہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش
یہ موضوع عرصہ سے ہندوستان میں بھی اہل علم
اکثر اصحاب اسکو یقینی خیال کرتے ہیں اور ان کے پاس
دلائل ہیں۔ اکثر اس کو دھوکا خیال کرتے ہیں۔ اکثر شیاطین
ہر شخص لیتا ہے اور اس فکر میں نظر آتا ہے کہ اگر واقعی یہ صحیح ہو اور اس پر بھی اسی طرح یقین ہو سکے
جس طرح سائنس کے دیگر مسائل صحیح اور قابل یقین ہیں تو انسان کو غیر معمولی ترقی حاصل ہو جائے۔

خاکسار مترجم

مضمون

کیا ارواح ہم سے کلام کر سکتے ہیں اگر ایسا ہو تو کس طرح؟ کیا انسانی جسم کے فنا ہونے پر
کل چیزیں فنا ہو جاتی ہیں؟ یا روح جسم سے نکل کر بھی زندہ رہتی ہے کیا اس کی زندگی مستقل ہے؟ کیا حوادث
اس کو اس زمین پر پیش آئے تھے وہ اس کے حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں؟
اگر روح کا وجود آئندہ فرض کر لیا جائے۔ اور اس کی مستقل زندگی بھی تسلیم کر لیجائے۔
تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس سے گفتگو اور ملاقات کر سکیں۔

مسائل ہیں جو عرصہ سے عقلاء کرہ ارضی کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ میں بھی ایک عرصہ تک [illegible] ایسی فکر میں مبتلا رہا تھا اب ایک عرصہ سے میں نے یہ خیال کرکے کہ اس کا قطعی [illegible] ہو یا حل اس کی طرف سے اپنے خیال کو ہٹالیا تھا لیکن چند سال کے بعد اتفاق سے ایسے مشاہدات پیش آئے کہ میں مجبور ہوگیا کہ اس کو پھر ایک مضمون کی شکل میں پیش کر دوں۔

میرے نزدیک دنیا میں انسان کے لئے اس موضوع سے بڑھکر کوئی موضوع نہیں۔ اگر یہ خاطر خواہ حل ہو جائے تو جو کچھ ترقی اس وقت حاصل ہوئی ہو اس مسئلہ کے حل کے بعد یہ ابکی اس آئندہ ترقی کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

میں جب یہ مضمون لکھ رہا تھا تو خود بھی متردد تھا کہ اس کو لکھوں یا نہ لکھوں مجھے یقین ہو کہ اس مضمون پر کہیں شک کیا جائیگا اور کہیں تکذیب کیجائے گی۔ میرے معلومات اور مشاہدات اس وسیع میدان میں نہایت درجہ حقیر ہیں۔ یہ مضمون اس قدر وسیع ہے کہ میرے خیال و وہم سے بھی زیادہ اس میں وسعت ہو۔ میں اسکو کسیطرح عبور نہ کرسکوں گا۔

میں اسی پس و پیش میں تھا کہ آخر کار میں نے یہ فیصلہ کرکے قلم اٹھایا کہ ہرچہ بادا باد۔ میں نے جو کچھ خود دیکھا ہے وہ ضرور لکھوں گا خواہ یقین کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اس مضمون کو لکھتے وقت میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور ان میں اب بحث و مزید تحقیقات کی گنجائش نہیں ہو۔ میں نے برسوں پہلے بھی ان امور پر غور کرکے چھوڑ دیا تھا لیکن اب جو تجربے میرے سامنے ہوئے ان کو میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دنیا کے سامنے پیش کر دوں۔ بہت سے بڑے بڑے علماء روحانیات کے قائل ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس پر یقین نہیں کرتے۔ جو لوگ روحانیات کے قائل ہیں ان میں سے یہ لوگ جیسے سر اولیور لاج۔ سر ولیم کروکس۔ سر ولیم جیمس وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ روح کے قائل ہیں اور انہوں نے کافی غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ جسم کے فنا ہونے کے بعد بھی روح زندہ رہتی ہے۔ ان کی علمی قابلیت اور شہرت ان کی اصابت رائے کی کافی دلیل ہے

ان مسائل میں روزانہ تحقیقات اور معلومات جدید ہو رہی ہیں۔ اور لوگ کثرت سے اب اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ اگرچہ اس کے اصول ابھی اس طرح مدون نہیں ہوئے جس طرح ریاضی وغیرہ علوم کے اصول مدون ہو سکے ہیں۔ نہ ان پر ابھی اس طرح یقین کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سائنس کے دیگر اصولوں پر یقین کیا گیا ہے۔ جب ہم ان اصولوں پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جس قدر اصول علمی مروج اور مسلمات میں سے ہیں وہ سب شروع میں نظریات ہی تھے۔ رفتہ رفتہ تجربوں اور علوم نے ان کی صداقت تسلیم کی۔ اور اب وہ مسلمات [illegible]

وقت ایسا بھی آئے جبکہ روحانیات کے نظریات بھی مسلمات

اصول بھی اسی طرح ناقابل تردید ہو جائیں جس طرح آج کل [illegible]

تردید ہو گئے ہیں۔ ان تمام حالات پر نظر کرتے ہوئے اگرچہ میں اپ

نتیجہ تو نہیں کہہ سکتا۔ مگر اس کو محض خرافات اور من گھڑت یا شعبدہ بازی بھی نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ علماء روحانی ترقی کر کے کوئی مفید اور ضروری مسئلہ ایسا حل کر لیں کہ دنیا کو مفید ہو۔ میں نے تو صرف اس موضوع پر مضمون لکھ کر اس دروازہ کو کھول دیا ہے جو اب تک مقفل تھا۔ ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے کہ یہ سب محض تفریح ہی ثابت ہو۔ بہرحال یہ ضرور ہے کہ کچھ نہ کچھ علماء کی توجہ سے اس پر گفتگو ہو گی اور کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔ اور وہ نتیجہ حقیقت میں علم کی ہر طرح خدمت ہی ہو گا۔

اس تمہید کے بعد میں اپنا اصل مضمون شروع کرتا ہوں۔

لبنان شام میں ایک موسم گرما کے چند ہفتے میں نے گذارے۔ میرے بعض دوست بھی اس زمانہ میں وہاں تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے مشاہدات اور مکالمہ ارواح کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ آج کل ان امور کی تحقیقات میں مصروف ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ ان حالات کو دیکھوں انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اپنے والد مرحوم کی روح کو آپ بلائیں اور ان سے گفتگو کریں ایسے اخبار اور امور جو صرف آپ دونوں کے علم میں ہوں گے ظاہر ہو جائیں گے۔ اس طرح آپ کو شک نہیں رہے گا۔ آپ کو شک کرنے کا تو حق ہے لیکن جب ایسا ثبوت بیّن موجود ہے۔ تو کم سے کم آپ کو اس پر توجہ کرنا

[illegible] ہو۔ اور یہ اسی وقت زیادہ بہتر ہوگا جبکہ آپ اپنے والد صاحب کی ہی روح کو بلا کر [illegible] حاصل کریں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم لوگ دھوکا دیتے ہیں یا یہ باتیں کچھ قابل لحاظ بھی [illegible] ان کے اصرار پر ایسے جلسے میں شریک ہونے پر راضی ہوگیا۔ چنانچہ میں ان کیساتھ جلسوں میں [illegible] میں جہاں ارواح کو بلایا جاتا، اور ان سے گفتگو کیجاتی تھی گیا۔ چند جلسوں میں تو میں کچھ نہیں سمجھا یا یہ کہنا چاہیئے کہ نہ سمجھ سکا۔ بعد میں مجھے بعض بعض باتیں معلوم ہونے لگیں۔ میرے دوست جو اس مشاہدہ کے محرک تھے ایک سال سے اس کام کو کر رہے تھے۔ انہوں نے بعض بعض مشاہدات اور تجربے ایسے ایسے مجھے بتائے کہ عقل حیران ہوتی تھی۔ مجھے ان کے فریب دینے یا دھوکہ باز جھوٹا ہونے کا گمان تک بھی نہیں ہے۔ مگر میں صرف اپنے ہی مشاہدات ہدیہ ناظرین کرونگا۔

جو طریقہ عموماً مروج ہے وہ یہ ہے کہ ایک مربع شکل کی تختی جس کا نمونہ ذیل میں درج ہے۔

ا ب ت ث ج ح خ
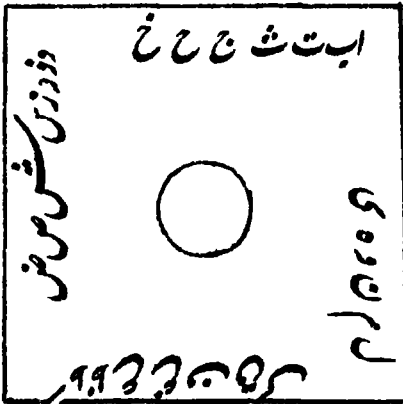
نہایت عمدہ سنگ مرمر کی ہوتی ہے۔ اور اس کے چاروں طرف حروف مفردات لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی پیالی ہوتی ہے۔ جو آسانی سے پھسل سکتی ہے۔ اس تختی کے سامنے دو آدمی جو واسطے کہلاتے ہیں، بیٹھتے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے روح سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں اپنی انگلیاں اس پیالی پر رکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اہل جلسہ جس روح کو طلب کرنا چاہیں وہ ان سے کہدیتے ہیں اور وہ روح کسی ایسی روح کے توسط سے طلب کیجا سکتی ہے جس سے پہلے ان واسطوں کی ملاقات ہو۔ یعنی وہ ان کی طلب پر پہلے آچکی ہو۔ اسی ملاقاتی روح کو پہلے طلب کیا جاتا ہے اور اس سے درخواست کیجاتی ہے کہ ہم فلاں روح سے ملنا چاہتے ہیں۔ جب یہ درخواست ملاقاتی روح سے پیش کردیجاتی ہے۔ اسوقت جملہ حاضرین خیال کرتے ہیں کہ وہ روح جو طلب کی گئی تھی آگئی۔ تھوڑی دیر میں واسطوں کو معلوم ہوتا ہے کہ پیالی حرکت کر رہی ہے۔ یہ واسطے بغرض

کے آنے کی اطلاع دیتے ہیں۔ اور جو سوال کیا جاتا ہے اس کا جواب پیالی کی حرکت سے اس
طرح ملتا ہے کہ پیالی صرف مفردات پر حرکت کرتی ہے۔ اور مفردات سے کلمہ اور کلموں سے جملے
بنتے رہتے ہیں اور جواب پورا آجاتا ہے۔ حاضرین جلسہ صرف پیالی کی حرکت دیکھ سکتے ہیں
اور کچھ نہیں معلوم کر سکتے۔ اس تفصیل کے بعد میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ واسطے
پیالی پر کچھ قدرت نہیں رکھتے۔ وہ جس طرف حرکت کرے گی یہ محض اس کی اتباع کریں گے۔
اس کی مدافعت و مخالفت نہیں کر سکتے۔ جو سوال کئے جاتے ہیں واسطے اس کو نہیں جانتے
اور اس کا معقول بلکہ ایک حد تک درست جواب آتا ہے بعض بعض سوال ہونگے جن کو واسطے اور
حاضرین میں سے کچھ لوگ جانتے ہوں لیکن بعض سوال ایسے ہیں
سوال کرنیوالے یا محض وہ روح جو طلب کی گئی ہے جانتی ہے
یا قوت نفس یا بجلی کا یہ کرشمہ ہے لیکن یہ غلط ہے اس قسم کا کوئی تار
بجلی کی روشنی میں تھے ہیں ان واسطوں کی حسن نیت اور پرہیزگاری کا قائل ہوں۔ میں
ان کو دغا باز فریبی نہیں سمجھتا۔

اب میں اس تفصیل کے بعد وہ مکالمہ درج کرتا ہوں جو میرے اور والد مرحوم کی روح
کے درمیان ہوا۔ میں نے وہ حصہ اس اشاعت سے حذف کر دیا ہے جس کا تعلق میری ذات سے
اور خانگی امور سے تھا۔ کیونکہ اس سے دنیا کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمام
جوابات ہمیشہ سوال کے مطابق اور بالکل ٹھیک آتے ہیں۔ میں نے پیالی کو چلتے ہوئے حروف
پر حرکت کرکے جملہ کلمات بناتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ پھر میں نے والد صاحب کی روح
سے اپنی خانگی زندگی اور اپنے ذاتی حالات کے سوالات کئے جن کی اشاعت میں مناسب
نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔

میں۔ (والد صاحب کی روح سے) میرے خیال میں مناسب ہے کہ میں ایک مضمون
مشاہدات و مکالمات ارواح پر لکھوں کیا جناب مجھے اس ترتیب میں مدد دیں گے۔ جناب بیان

[illegible] روح جسم سے جدا ہو کر کس طرح زندہ رہتی ہے۔

والد صاحب کی روح۔ جب روح اپنے مسکن ارضی کو چھوڑتی ہے تو وہ تنہا ایک مدت تک زمین ہی کیطرف رہتی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اپنے استحقاق کے بموجب رفع و بلندی حاصل کرتی ہے۔ عموماً چھ درجے ہیں۔ ساتواں درجہ قرب باری تعالیٰ کا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ کبھی نیچے کے درجوں میں نہیں رہا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان درجوں میں راحت نہیں ہوتی۔ اور نہ ایک سیکنڈ عذاب ضمیر سے رہائی ملتی ہے۔

میں۔ آپ کس درجہ میں ہیں اور کیا آپ اس درجہ میں پہلی ہی دفعہ پہونچ گئے ہیں

وہ۔ الحمد للہ میں چھٹے درجے میں ہوں۔ اور یہ انسان کے لیے بڑی کامیابی ہے۔ یہاں نہ تو عذاب ضمیر ہے اور نہ فکر و غم ہے۔ بلکہ یہاں عمدہ پرسکون زندگی ہے۔ البتہ میں دو درجے اس درجہ میں آنے سے پہلے بھی گذار کر آیا ہوں۔

میں۔ ان درجوں میں کیا فرق ہے۔

وہ۔ جب ایک درجہ سے انسان گذر کر دوسرے درجہ میں جاتا ہے تو عذاب ضمیر میں تخفیف ہو جاتی ہے۔

میں۔ کیا آپ نے اپنے بعض دوستوں سے بھی ملاقات کی جو مر چکے ہیں۔

وہ۔ بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔

میں۔ مثلاً کون کون۔

وہ۔ نعوم (نعوم سے مراد مرحوم نعوم یک شقیر سے تھی اور دوسرے جلسہ میں ڈاکٹر یعقوب صروف و جبران خلیل جبران اور اپنے بعض خاندانی اعزا کا بھی ذکر کیا)

میں۔ کیا روحیں آپس میں گفتگو کرتی ہیں۔

وہ۔ ہاں وہیں گفتگو بھی کرتی ہیں۔ ملتی جلتی ہیں۔ آپس میں محبت کرتی ہیں۔ تعارف ہوتا ہے۔ ہم تم کو دیکھتے ہیں۔ تمہاری خوشی سے خوش اور تمہارے رنج سے رنجیدہ ہوتے ہیں۔

لیکن ہمارے رنج اور اہل دنیا کے رنج میں فرق ہے۔ وہاں کا رنج یہاں کے رنج کی طرح نہیں ہے

میں۔ آپ کو رنج کس طرح کا ہوتا ہے اور اس کا کیا اثر ہوتا ہے

وہ۔ ہمیں تمہارے رنجوں کا احساس ہوتا ہے اور اس احساس سے متاثر ہوتے ہیں۔

میں۔ کیا آپ تکا ان کو بھی جانتے ہیں۔

وہ۔ ہاں۔

میں۔ جناب کو علم ہے کہ الہلال اپنے چالیسویں سال ... پسند کریں گے کہ الہلال کے قارئین تک آپ کا مکالمہ پہونچ...

وہ۔ ہاں ضرور لکھو۔ میں اپنی زندگی اس کی ترقی کے وقت بھی مجھے خیال رہا اور اس کی ترقی کی آرزو کرتا رہا میرا جیسا ... حالات الہلال پر آتے رہے (یہاں کچھ جملہ معترضہ تھے، جو غالباً بعض دوستوں کے جو حاضر جلسہ تھے اذہان کا نتیجہ ہوں) پھر مجھے خطاب کرتے ہوئے روح نے کہا" ایمل میری یہ تمام توتیر ایسی ہے کہ جو باپ اپنے اولاد سے کیا کرتے ہیں لیکن میری مرضی ہے کہ تم ضرور لکھو۔ مجھے الہلال پر فخر ہے اور یہ یاد رکھو کہ میری روح ہمیشہ زندہ ہے اور ہمیں تمہارے ساتھ ہوں (اس کے بعد جو الفاظ کہے گئے ان کی اشاعت سے میں معذور ہوں)

میں۔ اپنے عالم کی کچھ معلومات سے ہمیں مستفید فرمائیے۔

وہ۔ جب انسان کی ارضی حیات ختم ہوتی ہے۔ اس وقت سے حیات سماوی شروع ہوتی ہے۔ یہ وہ حیات ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ حیات یا تو جنت کی مستحق ہوتی ہے یا جہنم کی۔ یہ ان اعمال پر منحصر ہے جو دنیا میں کئے گئے ہیں۔ یہ یاد رکھو کہ روح موجود ہے، عذاب ان لوگوں پر زیادہ تر ہوتا ہے جو حیات ابد کے قائل ہیں۔ روحیں اپنے دوستوں کی اعمال

[illegible] سے باخبر بھی رہتی ہیں۔

دوسرا جلسہ

میں۔ پہلی مرتبہ جب جناب نے تکلیف فرما کر معلومات فراہم کئے تھے۔ وہ میں نے قلمبند کئے ہیں کیا جناب براہ کرم اس مضمون کو مکمل فرمائیں گے۔

وہ۔ قارئین کرام کو تعجب ہوگا جب وہ میرا نام جرجی زیدان دیکھیں گے۔ لیکن میں ان کے تعجب کو رفع بھی کر دینا چاہتا ہوں۔ قارئین کرام یاد رکھیں۔ میں جرجی زیدان ہوں میں تم کو تاکید سے کہتا ہوں کہ روح جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی زندہ ہے۔ میرے پاس اس کے بہت کافی دلائل ہیں۔ لیکن یہ دلائل صرف ان ہی کو فائدہ دے سکتے ہیں جو ان کو سنیں اور سمجھیں۔ میں تم کو وہ امور یاد دلاتا ہوں جو بالکل بھلا دیئے گئے ہیں یہی خواہش کرتا ہوں کہ تم کو روح کی آیندہ زندگی کا یقین ہوجائے اور یہ ہوش آجائے کہ جس قدر اعمال دنیا میں کئے گئے ہیں بلا کم و بیش سب کا نتیجہ دوسری دنیا میں ملنے والا ہے۔

عذاب و مصائب ان ہی لوگوں پر ہوتے ہیں جو حیات ابد کے قائل نہیں ہیں قارئین الہلال شاید ان سے فائدہ اٹھائیں۔

میں۔ روحیں مختلف لوگوں سے جبکہ ان کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں کس طرح گفتگو کرتی اور ایک دوسرے کی بات کس طرح سمجھتی ہیں

وہ۔ آپس میں سب ایک دوسرے کے مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ بات زبان سے نہیں کی جاتی بلکہ اشتغال فکر سے ایک دوسرے کا مفہوم ایک دوسرے کو معلوم ہوجاتا ہے۔

میں۔ کیا مرد عورت کی شناخت بھی روحوں میں ہوتی ہے۔

وہ۔ بیشک بلکہ جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ بھی قائم رہتی ہیں۔

میں۔ دنیا میں جو مختلف مذاہب ہیں ان کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

وہ۔ مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اپنے اپنے اعمال کی سزا سبھی کو بھگتنا ہوتی ہے

میں۔ کوئی مذہب سب سے زیادہ اچھا اور سچا سمجھا گیا ہے۔

وہ۔ تمام مذاہب جو خدا کے قائل ہیں ایک ہیں۔

میں۔ لوفرضنا اگر انسان خدا کا قائل نہ ہو۔ بلکہ خدا کا منکر ہو تو۔

وہ۔ اللہ واحد کا اعتقاد تو ضروری ہے۔

میں۔ اگر اس کی عقل اس کو خدا کے وجود کا قائل کر دے لیکن اعتماد کلی نہ ہو۔

وہ۔ تو کیا پھر قائل ہونے کے بعد کہیں اعتقاد ضائع ہو جایا کرتا ہے۔

میں۔ اور بت کے پجاری۔

وہ۔ ہلاک ہوتے ہیں۔ یعنی عذاب میں مبتلا ہوتے

میں۔ فرض کیجئے کہ انھوں نے کبھی خدا کی بابت نہیں

وہ۔ سزا تو اس کو ہوگی لیکن اس کا انتقال ترقی کیطرف ہے۔

میں۔ کیا آپ خالق کے اوصاف بیان کر سکتے ہیں۔

وہ۔ آجتک کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔

میں۔ کیا کبھی امید زیارت ہے۔

وہ۔ یقینی اور وعدہ بھی ہے۔

میں۔ کیا آپ کو مستقبل کی بابت بھی کچھ معلومات ہوتی ہے۔

وہ۔ ہم اس کی بابت کچھ کہہ نہیں سکتے۔

میں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو کچھ معلومات ہے یا نہیں۔

وہ۔ کچھ معلومات ہے سب ممکن نہیں لیکن ہم کچھ بھی اس کی بابت بیان نہیں کر سکتے۔

میں۔ کیوں؟

وہ۔ ہمیں حکم نہیں ہے۔

میں۔ کیا حیوانات کی بھی روحیں ہوتی ہیں۔

وہ۔ بیشک روحیں ہوتی ہیں لیکن ان کا کوئی مقام مقرر نہیں ہے۔

میں۔ پھر وہ کہاں چلے جاتے ہیں۔

وہ۔ فضائے بسیط میں منتشر ہو جاتے ہیں نہ پھر ہم ان کو دیکھتے ہیں نہ ہمیں ان کی نسبت کوئی علم ہوتا ہے۔

میں۔ کیا آپ کا کوئی مقررہ مرکز ہے۔

وہ۔ ہے لیکن ہمیں علم نہیں وہ کہاں ہے اور اس زمین سے کس قدر فاصلہ پر ہے۔ لیکن ہے بہت فاصلہ پر۔

میں۔ کیا میرے علاوہ کسی نے آپ کو دنیا میں طلب کر کے کچھ معلومات کی ہے۔

وہ۔ نہیں تم ہی پہلے شخص ہو جس نے مجھے بلایا۔ مدت تک ہمیں گفتگو کرنے کی قابلیت نہیں تھی اب مجھے عالم ارواح میں واپس ہونا چاہئے۔

یہ مختصر نمونہ اس گفتگو کا ہے جو مجھ سے اور والد صاحب مرحوم کی روح سے ہوئی۔ میں نے تفصیلات کچھ چھوڑ کر صرف مختصر حالات اس مضمون میں درج کئے ہیں اور قارئین کرام کے لئے یہ بحث چھوڑتا ہوں کہ وہ خود غور و فکر سے کام لیں اور سمجھ لیں کہ اس کی کوئی اصلیت حقیقت میں ہے یا نہیں۔ میرا خیال تھا کہ میں ان لوگوں کا نام بھی ظاہر کر دوں جو ان امور کو صحیح اور یقینی تصور کرتے ہیں لیکن ابھی تک میں خود انکو ایسا یقینی نہیں سمجھتا جیسا دیگر علوم کے نظریات یقینی سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے میں ان کے نام بھی ظاہر نہیں کروں گا۔ میں نے یہ بھی معلوم کیا کہ بعض ارواح اپنے مکالمات میں کچھ غلطیاں بھی کرتی ہیں۔ کچھ بھول بھی جاتی ہیں۔ تاہم جن لوگوں کو ان امور سے دلچسپی ہو ان کو چاہئے کہ وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں ممکن ہے کہ ہم کسی خاص نتیجہ پر جو آئندہ دنیا کے لئے مفید ہو پہونچ سکیں۔ تمام ترقیات اسی اصول پر ہوتی رہتی ہیں۔

اس کے بعد بھی اگر ایسے امور پیش آئے اور کہیں مکالمہ کا مجھے شرف حاصل ہوا تو میں ناظرین کی خدمت میں پیش کر سکوں گا۔

غریب خانے میں

ابھی رات زیادہ نہیں آئی تھی، لیکن فضا تیرہ و تار ہو رہی تھی، بادل چھائے ہوئے تھے، ستارے چادر ابر میں روپوش تھے، زور شور کی بارش ہو رہی تھی، بیچارہ محمود کا "غریب خانہ" بھی، جب تک چراغ مشعل راہ نہ ہو، نظر نہیں آسکتا تھا۔

محمود کی جھونپڑی میں بھی کچھ نظر نہیں آتا، ہاں ایک چراغ تھا جو بیچارا اپنی بساط کے موافق اس تاریکی سے جہاد کر رہا تھا، ایک انگیٹھی تھی، جس کی آگ ٹھنڈا
باقی رہ گئی تھیں جو عنقریب افسردہ ہونیوالی تھیں۔

اس تاریکی میں چند جھروکے اس طرح چمک رہے تھے جیسے
ادھر ادھر دیکھنے سے ایک فرش نظر آتا تھا، جس پر تین بچے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے دراز تھے۔ پاس ہی ایک عورت بیٹھی تھی، جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، دل ہی دل میں زبان حال سے وہ دعا مانگ رہی تھی کہ اس کا شوہر بخیر و عافیت واپس آجائے۔ کیونکہ حسب عادت آج بھی وہ شکار کے لئے گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

بارش اب اور تیزی سے ہونے لگی، ہوا بھی بہت تیز چلنے لگی۔ جس کے اثر سے جھونپڑی بھی لرزہ براندام ہو رہی تھی، بچے چادر میں سکڑے پڑے تھے، لیکن اس عورت کا دل خوف سے کانپ رہا تھا، اس نے خیال کیا کہ بارش کا یہ تسلسل، بجلی کی یہ کڑک، ہوا کی یہ سنسناہٹ چھتوں اور دیواروں کا دھڑا دھڑ گرنا۔ کوئی اچھی علامت نہیں ہے، اپنے شوہر کے متعلق اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک و اوہام کا ایک دریا لہریں مارنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں خیال کرنے لگی کہ میں ایک غریب اور دکھیا عورت ہوں۔ میرا نہ کوئی والی ہے نہ وارث، یہ چھوٹے چھوٹے بچے ابھی اس قابل بھی تو نہیں ہیں کہ اپنی روزی کما سکیں،

پیٹ پال سکیں، زمانہ کا سرد گرم برداشت کر سکیں۔ اے اللہ، تو مجھ ضعیف و ناتواں کے لئے اور ان معصوم بچوں کے لئے اسے بچالے جو تیری سپردگی میں ہے۔ جو اپنی زندگی تجھے سونپ کر رزق کی تلاش میں نکلا ہے، تاکہ اس چھوٹے موٹے خاندان کا کچھ انتظام کرسکے........ اب تک وہ واپس نہیں آیا، نہ معلوم قسمت اس کے ساتھ کیا کرنیوالی ہے، اور کسے معلوم کہ کیا کر چکی ہے؟ .... ہم شکاریوں کے بال بچوں کی زندگی کتنی المناک اور کس قدر اندوہ افزا ہوتی ہے، وہ ہمیں تنہا چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور دکھ کے اس اتھاہ ساگر میں ہاتھ پیر مارنے لگتے ہیں جس کی نہ کوئی حد ہے نہ پایاں، اور نہ اس کے خطرات و مہالک سے نجات کی کوئی صورت، اسی کمبخت روزی کی تلاش میں وہ ان اٹھتی ہوئی موجوں کا مقابلہ کرتے ہیں، جو بھوکے بھیڑیئے کی طرح جھپٹتی ہیں، جیسے وہ گوشت کے ٹکڑے پر جھپٹتا ہے،........ اور ہم جو قسمت سے ڈر رہے ہیں کہ جانے کیا ہو؟ تو کہیں کچھ ہو نہ چکا ہو؟ کیا قسمت سے لکڑی کے چند وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بچا لینگے جنھیں چپو کہتے ہیں؟ تھوڑی دیر تک موجوں کے ساتھ کشمکش ہوگی اور آخر کار وہ بے حد و نہایت غار میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گر جائیں گے۔ تاکہ مچھلیوں کا شکار بنیں۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ خود مچھلیوں کی تاک میں تھے۔

اب بارش ذرا کم ہو گئی تھی، ہوا بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، وہ عورت چراغ اٹھا کے دروازے کے سامنے دیکھنے لگی کہ اب صبح ہونے میں کتنی دیر باقی ہے؟ لیکن تاریکی پورے طور سے مسلط تھی، اور بارش بھی کچھ نہ کچھ ہو رہی تھی، چراغ کی روشنی ایک اور جھونپڑی پر پڑی، جس میں نہ روشنی تھی نہ حرکت، اسے یاد آ گیا کہ یہ غریب جمیلہ کی جھونپڑی ہے جس کا شوہر چند مہینے ہوئے، ڈوب کر مر گیا تھا، اور زمانہ کے شدائد و مصائب برداشت کرنے کے لئے دو بچے چھوڑ گیا تھا، اس کے جی میں آیا کہ لاؤ ذرا جمیلہ کی خبر لے آؤں؟ اس سے

لیے علم تھا کہ جمیلہ مرض الموت میں مبتلا ہے۔ وہاں پہونچکر جب اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، تو کوئی جواب نہ پاکر خود اس نے دھکا دیکے دروازہ کھول لیا، اپنے چراغ سے وہ پاس کی چیزیں دیکھ سکتی تھی، اپنے سامنے اسنے جو کچھ دیکھا اس سے اس کا دل دھڑکنے لگا، خون خشک ہوگیا، اور وہ سرتا بہ قدم کانپنے لگی۔

اس نے دیکھا کہ جھونپڑی ہوا کی شدت سے ہل رہی ہے، اور بارش کے پانی نے اندر داخل ہوکر تمام چیزوں کو تر کردیا ہے جمیلہ بالکل ساکت وصامت فرش پر دراز ہے، جب اس نے پاس سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا تو کام تمام ہوچکا ہے۔ پانی کے قطرے اس کے سر سے اور ماتھے سے ٹپک رہے ہیں، پہلے تو چپ چاپ وہ یہ د...
یک وہ چیخ اٹھی،

"خدا کی اس زمین پر یہ ہے، غریبوں اور بیکسوں:

یہ ہے وہ مرتبہ رفیع جہاں وہ زندگی کی بھر شدائد و نوائب اور مہالک و مصا...

پہونچتے ہیں، اس کارزار عالم میں وہ مجہول و مطرود زندگی بسر کرتے ہیں، نہ ان کا کوئی شناسا ہوتا ہے، نہ واقف کار، نہ نوحہ خواں ہوتا ہے نہ تیمار دار، اب وہ ایسی جگہ جاتے ہیں، جہاں نہ کوئی "ہم سخن" ہو نہ "ہم نشین"، نہ ان کے جانے کا کسی کو ملال ہے نہ قلق سنتے کہ اعزہ و اقربا بھی بے پروا ہیں۔

کیا عجب ہو کہ میرا اور میری اولاد کا بھی کل یہی حشر ہو جو آج میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں؛ اسوقت تو کوئی ایسا بھی نہ ہوگا جو اس جاں نثار پر چند آنسو بہالے۔ جس طرح ان مسکینوں کے لئے میں ماتم کناں ہوں کل میرا ماتم کرنے والا تو کوئی بھی نہیں۔"

پھر اس نے اپنی چادر جمیلہ کی لاش پر ڈال دی، اور چراغ لے کے ادھر ادھر جو دیکھا تو بچے فرش خاک پر آسودۂ خواب نظر آئے، ایک کے منہ پر ایک کا منہ تھا، اور ایک معصومانہ تبسم ان کے ابرو پر کھیل رہا تھا، گویا وہ موت سے جو ان کے چاروں طرف منڈلا رہی تھی بالکل

[illegible] اس نے بچوں کے سر پر جمیلہ کی چادر دیکھی، اسے خیال ہوا کہ گذشتہ دو گھنٹے پہلے اس [illegible] نے اپنے مرض الموت میں دیکھا ہوگا کہ پانی ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہے، بچوں کے [illegible] رہے ہیں تو اس نے مہر مادری سے مجبور ہوکر بچوں کے جسم پر یہ چادر ڈالدی ہوگی حالانکہ سب سے زیادہ وہ خود اس چادر کی حاجتمند تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تاب نہ لاسکی، اور جاں بحق ہوگئی۔

محمود کی بیوی اس ہیبت ناک اور دلدوز منظر کو دیکھنے لگی، ہوا اس وقت بھی چل رہی تھی، بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی، اور پانی کے قطرات جمیلہ کے ماتھے سے گالوں پر اس وقت بھی ڈھلک کر آرہے تھے، گویا اپنے بچوں کے فراق میں وہ آنسو بہا رہی تھی،
اب آثار صبح ظاہر ہونے لگے تھے، جب کچھ کچھ روشنی آنے لگی تو اس نے چراغ بجھا کر ایک کونے میں رکھدیا میت کے لئے دعا مانگی، پھر بچوں کی جانب بڑھی، ان پر وہ روئی اور ان دونوں کو نہایت رفق وسکون سے اپنی گود میں اٹھالیا، اور اپنی جھونپڑی میں لے گئی اپنے بچوں کے ساتھ انھیں بھی لٹادیا، اور سب پر ایک ہی چادر ڈالدی،

اس کام سے فارغ ہوکے وہ ایک جانب بیٹھ گئی، اور دل ہی دل میں کہنے لگی، نہ معلوم میں نے ان بچوں کو لاکر کوئی اچھا کام انجام دیا ہے، یا بُرا، میں جانتی ہوں کہ اللہ نے عورت کا دل یکسر رفق ومحبت سے بنایا ہے، وہ اسے نہیں برداشت کرسکتی کہ اس کے سامنے دو معصوم بچے ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں فرش خاک پر دراز ہوں، وہاں سوا ان کی ماں کی نعش کے ان کا کوئی رفیق نہ ہو، کوئی عورت اس حال میں تن تنہا انھیں نہیں چھوڑ سکتی وہی کرتی جو میں نے کیا ہے، بغیر اسے معلوم کئے کہ اس کارروائی کا اس کی ذات پر کیا اثر ہوگا؟ اور پھر جبکہ وہ یہ بھی جانتی ہو کہ اس کس مپرسی میں چھوڑ جانے کا انجام کیا ہوگا؟
یہ منظر جو میں نے دیکھا ہی اس نے مجھے عواقب ونتائج سے بے نیاز کردیا ہے، اگرچہ کچھ عرصہ

کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ میں نے غلطی کی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ اس غلطی سے میں بچ ہی سکتی تھی، میں اس کی مرتکب ہوئی، کیونکہ میرا دل گوشت اور خون کا ہے، فولاد اور پتھر کا نہیں،

میں جانتی ہوں کہ میرا شوہر نادار ہے، قلاش ہے، فاقہ مست ہے، اور میرے بچے خورد نان شبینہ کے محتاج ہیں، اب اس فقر وفاقہ کے عالم میں اپنے بچوں پران دو جدید بچوں کا اضافہ کسی طرح بھی مناسب نہیں، لیکن یہ بھی کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم اپنے راحت نفس کے مقابلہ میں ان سے بخل کریں اور ان ننھے بچوں کو اپنے سامنے بھوک ... مرنے دیں۔

یہ ہیں میرے خیالات جنھیں ابھی ابھی اپنے شوہر کی ... اپنے اس فعل پر نہ میں متوحش ہوں نہ خوف زدہ، کہ وہ مجھپر خفا ... انہیں نکال باہر کروں۔

یہ کہتے کہتے وہ دفعتاً رک گئی، کیونکہ دروازہ پر کھٹکھٹانے کی آواز آئی، اس سے وہ خوف زدہ ہو گئی، لیکن معلوم ہوا کہ یہ ہوا کی سنساہٹ تھی، تھوڑی دیر تک وہ اپنا سر جھکائے رہی، سر جھکائے ہوئے، وہ عالم خیال میں پہونچ گئی، اس بزم تخیل میں ایسے ایسے مناظر اس کے سامنے آئے کہ کبھی وہ رونے لگتی، کبھی ہنسنے لگتی، کبھی غضبناک ہو جاتی، اور کبھی مطمئن کبھی اس کا چہرہ کسی امید سے دمکنے لگتا، کبھی مایوسی کی شکنیں اس کے ماتھے پر پڑ جاتیں، کبھی اپنے شوہر کے متعلق اچھے اچھے خیالات اس کے دل میں موجزن ہوتے، کبھی طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو جاتے، غرض اسی امید وبیم اور اسی کشمکش آلام وافکار میں اس کا دل ہچکولے کھا رہا تھا کہ اتنے میں اس نے کوئی سیاہ سی چیز اپنے سامنے آتے ہوئے دیکھی، اس کا دل خوف اور وہم سے زور زور سے دھڑکنے لگا، لیکن وہ دیکھتی کیا ہے کہ اس کا شوہر کاندھے پر جال ڈالے، پیٹھ پر اس کی چھڑ رکھے چلا آرہا ہے، اور پانی اس سے ٹپک رہا ہے، اپنے شوہر محمود کو دیکھ کر

[illegible] اس نے اس کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی، کچھ سمجھ کر آنکھیں جھکالیں، پھر وہ پوچھنے [illegible] رات کیسی گذری؟ محمود نے اپنا جال اور اس کی چھڑ ایک طرف رکھ کے کہنا شروع کیا:

"ایسی رات! توبہ میں نے تو آج تک ایسی رات دیکھی ہی نہیں، اور شکار کو کیا پوچھتی ہو! وہی خالی ہاتھ آیا ہوں، اگر خدا کا مجھ پر اور تم پر فضل نہ ہوتا تو میرے ہلاک ہونے میں رہ کیا گیا تھا لیکن غم مجھ پر اس وقت تک قابو نہیں پا سکتا جب تک میں تم لوگوں کو بخیر و عافیت پاتا ہوں، بچوں کا کیا حال ہے؟

یہ سنکر وہ کانپنے لگی اور ٹالنے کے طور پر جواب دیا "اچھے ہیں"۔

محمود۔ آج کیا بات ہے کہ میں تمہیں اس قدر آشفتہ خاطر اور مضمحل دیکھ رہا ہوں، اچھا رات کیسی گذری"؟

اس نے اپنا سر جھکا لیا اور کہا

"رات کو تو ان بچوں کی قسمیں سیتی رہی، اس طوفان ابر و باد کی کڑاک اور گرج جب سنتی تھی تو تمہاری طرف سے قسم قسم کے وہم آنے لگتے تھے، لیکن اب تو الحمدللہ کچھ نہیں ہے، اچھی ہوں"۔

یہ کہہ کے اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا، کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن کہہ نہ سکتی تھی، الفاظ ہونٹ پر آ کے رہ جاتے تھے، آخر بہت کوشش کے بعد وہ کچھ کامیاب ہوئی، اور کہنے لگی،

"لیکن ایک دوسری بات ہے جس نے مجھے مضطر کر رکھا ہے"۔

"وہ کیا"؟

"تمہارے آنے سے کچھ پیشتر ہماری پڑوسن جمیلہ کا انتقال ہو گیا، اپنے پیچھے وہ دو بچے چھوڑ گئی ہے جن کا اس عالم میں نہ کوئی پرسان حال ہے نہ خبر گیر"۔

یہ سنتے ہی محمود پر ایک اضطراب و اضطرار کی کیفیت طاری ہو گئی، وہ اپنی جگہ سے

[illegible] پھر اس نے اپنی بھیگی ہوئی ٹوپی بستر پر ڈال دی، سر پر کبھی کبھی ہاتھ پھیرتا کبھی بالوں سے خلل کرنے لگتا، اس کی بیوی اس پر نظر جمائے اس کے خیالات و جذبات کا اندازہ کر رہی تھی آخر وہ فرش پر بیٹھ گیا جو جھونپڑی کے وسط میں بچھا ہوا تھا، اور آہستہ آہستہ کہنے لگا،

خدایا! اگرچہ میں علم سے بے بہرہ ہوں، جاہل ہوں، میرا یہ منصب نہیں کہ میں تیری حکمتوں کو سمجھ سکوں، اور یہ جان سکوں کہ یہ غریب بچے اپنی ماں جیسی نعمت سے کیوں محروم کر دیئے گئے؛ لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس واقعہ کے وجود سے انکار کر دوں، شاید وہ لوگ جو مجھ سے زیادہ علم و بصیرت رکھتے ہیں، تیری ان مصلحتوں اور حکمتوں کو اس سے زیادہ سمجھ سکیں، جتنا میں سمجھ سکتا ہوں،

بلاشبہ میں تہی دست و نادار ہوں، بے نوا اور میری زندگی مصادفات و اتفاقات کی رہین منت ہے۔

مجھ پر اور میرے بچوں پر ایسے کڑے دن گزرتے ہیں کہ ہمیں قوت لایموت بھی میسر نہیں، [illegible] لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں، وہ ان یتیموں پر اس سے زیادہ کڑھتا ہے جتنا فقر و فاقہ کے عالم میں وہ دکھ محسوس کرتا ہے،

پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا اور کہا،

" میں سخت متاثر ہوں، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمیلہ کی روح کھڑی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہو، اور ہم سے بالحاح و زاری کہہ رہی ہے کہ ہم اس کے بچوں کی سرپرستی کریں ان کی کفالت کریں......... لیکن میرے اللہ یہ ممکن کیونکر ہے؟ میں کروں تو کیا کروں؟

اب گویا اس کی بیوی کو ایک موقع مل گیا، اس نے کہا،

" اور مجھے تو ایسا سنائی دیتا ہے کہ وہ کہہ رہی ہے، محمود! میری مصیبت تمہاری مصیبت سے زیادہ ہے، تم اس عالم میں ہو کہ کچھ نہ کچھ کر سکتے ہو، میں اس دنیا میں ہوں کہ میرے کئے کچھ بھی نہیں ہو سکتا،"

تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہا، بیٹھے بیٹھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، پھر

"گذشتہ سال ہمارے دو بچے نذر اجل نہیں ہو چکے ہیں؟"

"کیوں نہیں!"

"اگر آج وہ دونوں زندہ ہوتے تو ہم کیا کرتے"؟

"سوا اس کے کہ ہم اپنا معاملہ خدا کو سونپ دیتے، اور اس سے استعانت چاہتے، اور کیا کر سکتے تھے"؟

"تو ہم ان دونوں یتیموں کا معاملہ بھی خدا کو سونپتے ہیں، اور اسی سے استعانت چاہتے ہیں۔ ہم یہ سمجھ لیں گے کہ ہمارے وہ دونوں بچے زندہ ہیں، یا یہ جان لیں گے کہ خدا نے انہیں از سر نو زندہ کر دیا ہے .... جاؤ ان بچوں کے پاس جاؤ اور انہیں یہاں لے آؤ، ممکن ہے وہ بچے جاگ گئے ہوں، اور اپنی ماں کا یہ حادثہ دیکھ کر خوف و دہشت سے وہ بیچارے بھی ختم ہو جائیں،

دیکھو! انہیں رفق و محبت سے لانا، اس طرح لانا کہ وہ جاگنے نہ پائیں، اور یہاں لا کر اپنے بچوں کے پاس لٹا دو، وہ منظر بھی کتنا عجیب و غریب ہو گا جب وہ بیدار ہوں گے اور ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھے گا............. آج سے میرے اوپر نبیذ[1] اور گوشت حرام ہے، جب تک میں اس خاندان کے کھانے پینے کا انتظام نہ کر لوں جس کا بخت و اتفاق سے میں ہی سردار ہوں، اللہ نے چاہا تو ان پاک اور معصوم بچوں کے طفیل ہمارا گھر روٹی اور چربی سے بھر جائے گا، ہم کھاتے کھاتے تھک جائیں گے۔ لیکن سامان رسد ختم نہیں ہو گا۔"

[1] احناف کے ہاں علماء عراق نے نبیذ کی حلت کا فتویٰ دیا ہے، اس لئے کہ اس کا نشہ ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی کو بے خود کر دے، بلکہ زیادہ سے زیادہ خمار پیدا کرتا ہے۔ مترجم

یہ سنکر جمیلہ کا چہرہ وفور مسرت سے جگمگانے لگا، وہ بچوں کی خوابگاہ کی طرف گئی، بچوں کے چہرے سے چادر اٹھائی، اور چپ چاپ محمود کی طرف دیکھنے لگی۔

محمود نے جو یہ دیکھا کہ بچے تو یہاں پہلے ہی سے موجود ہیں تو ہجوم مسرت اور فرط محبت سے اس نے جمیلہ کو گلے لگالیا، اور کہا "تمہارا دل کتنا بلند، کتنا ارفع، اور کتنا اعلیٰ ہے، تم تو اس قابل ہو کہ تمہاری پرستش کی جائے"

جمیلہ نے یہ سنا، اور محبت بھری نظروں سے محمود کو دیکھنے لگی۔

قرآن حکیم سے موجودہ مسلمانوں کا برتاؤ

(جناب شوق دہلوی از مکہ معظمہ)

کچھ اسے زینت منزل سمجھو — اور کچھ گرد محفل سمجھے
کچھ تو سمجھے ہیں اسے طب کی کتاب — اور کچھ جادو بابل سمجھے
کچھ اسے رٹتے ہیں طوطی کی طرح — اس کا بس وہ یہی حاصل سمجھے
یہ تو آیا تھا ہدایت کے لئے — اس کا مقصد ہی نہ غافل سمجھے
اب عمل اور کتابوں پر ہے — اس کو سب ترک کے قابل سمجھے
کاسہ لیسان حریفان حق — اس کی تعلیم کو باطل سمجھے
منطق و فلسفہ کے سودائی — درس کے اس کو نہ قابل سمجھے
عقل پہ جن کی پڑے ہیں پتھر — فہم کو اس کے وہ مشکل سمجھے
ہائے اس نعمت عظمیٰ کی قدر — خاک بھی تو نہ یہ جاہل سمجھے

اے خدا ہم کو عطا کر وہ دل — جو اسے رہبر کامل سمجھے
اور دے شوق عمل بھی ایسا — کسی مشکل کو نہ مشکل سمجھے

تنقید و تبصرہ

کتب

مبادی فلسفہ حصہ اوّل یا فلسفہ کی پہلی کتاب۔ اشارات تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن۔ کتاب التوحید۔ نبیوں کے قصے

مبادی فلسفہ حصہ اول یا فلسفہ کی پہلی کتاب	از مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی۔ تقطیع ۔۔ کاغذ نفیس مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ ۔۔

فاضل مصنف کے فلسفیانہ مقالات کا یہ مجموعہ ایک دیباچے ۔۔ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) فلسفہ و مذاہب فلسفہ پر ایک نظر۔

(۲) بِل کی منطق۔

(۳) مقدمہ مکالمات برکلے۔

(۴) عادت و فلسفہ عادت۔

(۵) نفس و مفروات نفس۔

(۶) ماہیت جذبات۔

اردو زبان ابھی تک فلسفیانہ مباحث سے خصوصاً فلسفۂ جدید سے بالکل غیر مانوس ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی بدولت چند کتابوں کا ترجمہ تو اردو میں ہوگیا ہے مگر مستقل تصنیف کا حوصلہ سوائے مولوی عبدالماجد صاحب کے اور کسی کو نہیں ہوا۔ اسے فلسفے کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے کہ اسے اردو دانوں سے روشناس کرنے کے لئے ایسا شخص ملا جس کا قلم الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں، خشک مضامین کو دلچسپ بنانے میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ لوگ جنھیں فلسفے کے نام سے وحشت ہوتی تھی اب اس سے مانوس ہوجائیں گے۔ یہ مجموعۂ مضامین جو ہمارے پیش نظر ہے فلسفے سے رسمی تعارف کا کام تو نہیں دے سکتا لیکن

[illegible] کے دل کو بے ساختہ اس موضوع کی طرف مائل کر دیتا ہے اور یہی طلب علم کی سب سے پہلی [illegible] سب سے اہم منزل ہے۔

اس لحاظ سے یہ کتاب طالب علموں کے لئے جن میں صرف مدارس کے متعلمین ہی نہیں بلکہ کل علم دوست حضرات شامل ہیں بے حد مفید ثابت ہو گی۔

اشارات | مصنفہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی بالقابہ۔ تقطیع کلاں، تعداد صفحات ۱۳۶، کاغذ چکنا دبیز، لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ درجے کی، جلد، خوبصورت۔ قیمت صرف ۱۲؍

ملنے کا پتہ :- ناظم دفتر تذکرہ، کٹرہ شیر سنگھ، امرت سر (پنجاب)۔

آج سے سات سال پہلے رسالہ جامعہ میں علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی مشہور کتاب "تذکرہ" پر تنقید لکھی گئی تھی۔ اس طویل خاموشی کے بعد اب انھوں نے یہ اپنی عملی کتاب "اشارات" شائع کی ہے، جس میں مسلمانوں کی اصلاح نفس کے لئے خدمت خلق کی تجویز اور اس کا طریقہ بیان کیا ہے اور ہر مسلمان کو یہ صلاح دی ہے کہ وہ بطور علامت خدمت بیلچہ یعنی کدال اپنے پاس رکھے۔ پھر ہر بستی کے مسلمان شام کے وقت ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے اپنے اپنے منتخب سرداروں کی قیادت میں خاکی لباس پہن کر اور بیلچے لے کر باقاعدہ قواعد کریں۔ پھر بلا امتیاز مذہب و ملت ہر شخص کی جس قدر ہو سکے خدمت بجا لائیں اور غروب کے بعد سب ایک ساتھ باجماعت مغرب کی نماز ادا کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

اس تحریک کا نام انھوں نے تحریک خاکساران رکھا ہے اور غالباً منجملہ دیگر وجوہات کے ایک وجہ خاکی لباس اختیار کرانے کی یہ بھی ہے کہ خاکساری اس کے اندر مضمر ہے۔

اشارات میں علامہ موصوف نے اس تحریک کا مغز اور لب لباب تفصیل کے ساتھ نہایت بلند نظری اور خوبی سے سمجھایا ہے جس سے ہر شخص اس یقین پر پہونچ سکتا ہے کہ یہ عملی تحریک مسلمانوں کی اصلاح اور ان کو منظم اور کارکن جماعت بنانے کے لئے کس قدر صحیح اور بر وقت ہے۔ اس میں نہ کسی مذہب پر خاش ہے نہ کسی قوم سے عداوت ہے، نہ حکومت سے نزاع ہے نہ سیاسی شائبہ ہے بلکہ خالص اصلاحی اور انقلابی تحریک ہے جس میں ہر مسلمان بلا کسی پس و پیش کے حصہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے علامہ موصوف [illegible] مسلمانوں کو اپنی جملہ انجمنیں اور سیاسیات [illegible] کر صرف اسی ایک تحریک میں شامل

ہم سمجھا دیں کہ یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے عام طور پر اس تحریک میں عملی حصہ لیا تو پانچ سال کے اندر
ہندوستان کو حکومت اور سلطنت مل جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانان ہند ایک مدت سے بے عمل اور غافل ہیں اور اجتماعی اعمال اور مشاغل
جو کچھ کر بھی رہے ہیں وہ عدم مرکزیت کے باعث غیر صالح ہیں جن سے کسی اچھے نتیجے کی امید نہیں ہے۔ یہ
دانشمندانہ تحریک جس میں کسی طرف سے رکاوٹ کا اندیشہ نہیں ہے اگر چل گئی تو ساری ملت کو ایک مرکز پر
لاکر متحد کر سکتی ہے جس سے توقع ہے کہ ہماری اجتماعی قوت درست ہو جائے گی۔

یہ کتاب ہر صاحب نظر اور دردمند مسلمان کو ضرور پڑھنی چا
کر رکھی گئی ہے کہ اس کے صرفے سے زیادہ نہ ہو گی۔ اس کے
کی بنیاد عقل، اخلاق اور خالص دین پر ہے نہ کہ کسی ہنگامی یا
مسلمانوں نے قبول کر لی تو کچھ بعید نہیں کہ اس کے نتائج وہی ہوں جو

تفسیر القرآن بکلام الرحمن | مصنفہ مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری سردار جماعت اہل حدیث، زبان
عربی، تقطیع کلاں، صفحات ۴۰۲، قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ۔ نیجر اخبار اہل حدیث۔ امرتسر۔

عربی زبان میں سینکڑوں تفسیریں کلام الہٰی کی لکھی گئی ہیں لیکن ہر ایک میں انسانی تفسیر ہے یعنی آیات
کے مطالب جو ائمہ اور بزرگان دین نے سمجھے یا جو رسول پاک سے روایت کئے گئے (جو اکثر حالتوں میں
صحیح نہیں ہیں) مندرج ہیں۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نے اس تفسیر میں کوشش کی ہے کہ آیات کے مطالب
خود قرآن کی آیات سے حل کئے جائیں۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ راہ بالکل اچھوتی ہے جس پر مولانا سے
پہلے کوئی دوسرا نہیں چلا تھا۔ اس لئے ان کو اس میں جو دشواریاں اٹھانی پڑی ہیں ان کا اندازہ ہر
شخص نہیں کر سکتا۔ ایک معتدبہ حصہ ہم نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ مصنف نے کس مشکل سے اپنا
راستہ آپ نکالا ہے۔ یہ اس قسم کی پہلی کوشش ہے جس میں اس سے زیادہ کامیابی حاصل کرنی مشکل تھی۔ ہاں
اب راستہ نکل گیا ہے اس لئے آئندہ آنے والے اس قسم کے مفسر کے لئے آسانیاں ہو گئی ہیں کہ وہ اس
داغ بیل پر خوشنما عمارت کھڑی کر سکے۔

فرقہ بندی کا برا ہو کہ اس تفسیر پر مولانا ہی کی جماعت کے چند سلف پرست حضرات نے طوفان

[illegible] اعتراض کرکے جو اکثر بزرگوں کے اقوال پر مبنی تھے اربعین نامی رسالے میں شائع کیا [illegible] کہ اس کا جھگڑا سلطان نجد و علمائے وہابیہ تک پہونچا اور وہاں طے ہوا۔ چنانچہ وہ فیصلہ اس تفسیر [illegible] میں شامل ہے۔ ۱۳۴۵ھ میں ہمارے سامنے پیر سلطان کی خدمت میں اس جماعت کے لوگوں [illegible] ذکر کو چھیڑا تھا لیکن انھوں نے سننا پسند نہ کیا اور موضوع سخن بدل دیا جس سے ہم نے یہ اندازہ [illegible] کہ وہ وسیع القلب ہیں اور اس قسم کے جزئی اعتراضات سے علماء سے بدظن نہیں ہو جاتے۔

کتاب التوحید | ترجمہ مولانا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی۔ تقطیع [illegible]، ضخامت ۱۰۰، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت عہ۔ مصنف سے قرول باغ دہلی کے پتے سے مل سکتی ہے۔

کتاب التوحید علامہ محمد بن عبدالوہاب بانیٔ تحریک نجدیہ کی وہ مشہور کتاب ہے جس نے نجدیوں کے دلوں میں اسلامی توحید نقش کرکے ان کو پکا ایماندار، متقی، ماحیٔ شرک اور حامیٔ اسلام بنادیا۔ یہ کتاب دراصل اس قابل ہے کہ عالم کے جملہ مسلمانوں کو اچھی طرح پڑھائی جائے تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اسلام کس قسم کی توحید سکھلانے آیا ہے اور یہ توحید کس قدر عظیم الشان نتائج پیدا کرتی ہے اور کتنی انقلاب انگیز ہے۔ سب سے پہلے یہ کتاب غالباً ۱۳۱۱ھ میں دہلی میں شائع کی گئی تھی۔ اس زمانے میں مولانا عبدالحلیم قصوری مرحوم یہاں مولانا سید نذیر حسین کی خدمت میں حدیث پڑھتے تھے۔ ان کو اس قدر پسند آئی کہ اس کا ترجمہ کرکے شائع کیا۔

اب مولانا سورتی صاحب نے اس کا عمدہ عالمانہ ترجمہ کیا ہے جو متن کے مقابل میں درج ہے۔ آغاز کتاب میں توحید کی حقیقت اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی مختصر سوانح عمری بھی لکھی ہے جس سے کتاب کے متعلق بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ جا بجا حاشیے میں توضیح طلب الفاظ اور معانی کی تشریح بھی کردی ہے۔ ترجمہ بھی سادہ اور عام فہم ہے۔ اب یہ کتاب اس قابل ہو گئی ہے کہ عام طور پر اردو خواں طبقہ اس سے نفع حاصل کر سکے اور مدارس اور اسکولوں کے طلباء کو پڑھائی جا سکے بلکہ میرے خیال میں ہر مسلمان کے گھر میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

[illegible] کے قصے | مرتبہ خواجہ عبدالحی صاحب استاذ تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ، تقطیع خورد، حجم ۵ جزو، لکھائی

[illegible] قیمت ۸ / ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ، دہلی۔

اس چھوٹی سی کتاب میں خواجہ صاحب موصوف نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسےٰ علیہ السلام تک ان انبیاء علیہم السلام کے قصے بیان کئے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور اسی قدر بیان کیا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ انسانی روایات نے ان قصوں پر جو اضافے کئے ہیں اور جن میں سے بڑا حصہ بے بنیاد بلکہ محض افسانہ ہے ان کو چھوڑ دیا ہے اور چونکہ یہ رسالہ تعلیمی ہے اور چھوٹے بچوں کے لئے لکھا گیا ہے اس لئے زبان نہایت سلیس اور سادہ رکھی ہے۔ معانی میں پیچیدگی مطلق نہیں ہے اور عبارت آسان ہے تاکہ بچے سمجھ سکیں

قرآن کریم میں انبیاء کے ذکر کی اللہ نے مدح فرمائی ہے اور
ذکر) کیونکہ ان برگزیدہ اور مقبول بارگاہ حضرات کے حالات ...

مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کے دل میں شروع ہی سے انبیاء کی مثالیں سن کر ان میں مادہ ان کے اندر ایمان، سچائی، تقویٰ اور صبر پیدا ہو، دنیا کی بڑی بڑی مشکلوں کا مقابلہ کر سکیں اور حق کے حامی اور مددگار بن جائیں۔ اس لئے اس کتاب کا بچوں کو پڑھانا نہایت مفید ہوگا۔ اسی غرض کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے اور جامعہ کے بچے اس کو پڑھتے ہیں۔

دنیا کی رفتار

(الف) ہندوستان

گول میز کی دستوری کمیٹیاں | پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام پر یہ حقیقت برطانوی مدبرین پر اچھی طرح روشن ہوگئی تھی کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی شرکت کے بغیر آئندہ دستور اساسی کے متعلق تمام فیصلے بے سود اور بے نتیجہ ہوں گے چنانچہ حکومت کی پالیسی میں تبدیلی ہوئی، گاندھی اروِن سمجھوتے پر دستخط ہوئے اور کانگریس نے چند شرائط کے ساتھ گول میز کانفرنس میں شرکت منظور کی۔ کانگریس کا واحد نمائندہ جب کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان روانہ ہوا تو بعض حلقوں میں یہ امیدیں قائم کی گئیں کہ سیاسی گتھیاں شاید اب سلجھ جائیں۔ گول میز کانفرنس کا مقصد یہ سمجھا گیا تھا کہ ہندوستان اور انگلستان کے نمائندے ایک جگہ بیٹھ کر ہندوستان اور انگلستان کے آئندہ تعلقات اور ہندوستان کے ایک آزاد دستور اساسی کے متعلق گفت و شنید کرکے کچھ طے کریں گے لیکن جب کانفرنس منعقد ہوئی تو معلوم ہوا کہ مختلف جماعتوں، فرقوں اور طبقوں کے نمائندے ہندوستان کے مال غنیمت میں سے گویا اپنا اپنا حصہ بٹانے کے لئے مجتمع کئے گئے ہیں۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ بہت زیادہ غیر متوقع نہیں ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ ہندوستان کے اہم سیاسی مسائل کو طے کرنے کے لئے برطانوی مدبر نے گول میز کانفرنس کا جو طریقہ سوچ کر نکالا تھا وہ بھی ناکام ثابت ہوا۔

... .

لیکن وزیر اعظم برطانیہ نے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو کانفرنس کے اختتامی جلسے میں کانفرنس کی ناکامی پر ایک خاص اعلان کے ذریعے سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور یہ اعلان کیا گیا کہ چونکہ بعض اہم امور مقامی طور پر تحقیقات طلب ہیں اس لئے کانفرنس تو نامعلوم مدت کے لئے ملتوی کی جاتی ہے لیکن اس عرصے میں کانفرنس کی ایک مجلس عاملہ کانفرنس کے تمام کاموں کو جاری رکھے گی اور تین کمیٹیاں مقرر کی جائیں گی جو ہندوستان جاکر ضروری تحقیقات کرکے آئندہ کانفرنس کے سامنے اپنی رپورٹ آخری منظوری کے لئے پیش کریں گی۔

مجلس عاملہ اور تینوں کمیٹیوں کے ارکان کے نام بھی شائع ہو گئے ہیں اور یہ کمیٹیاں اب ہندوستان میں اپنا کام کر رہی ہیں۔ مجلس عاملہ کی صدارت وائسرائے ہند کو دی گئی ہے اور ارکان میں ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، مسٹر جیکر، ڈاکٹر مونجے، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں وغیرہ شامل ہیں۔ کمیٹیوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ فرنچائز کمیٹی:- حق نیابت، حق رائے دہندگی اور متعلقہ امور کی تحقیقات کے لئے مقرر ہوئی ہے۔ اس کے صدر مارکوئس آف لوتھین ہیں، اور ارکین میں منجملہ دیگر انگریزوں اور ہندوستانیوں کے سر محمد یعقوب، ڈاکٹر امبیڈکر، سر سندر سنگھ مجیٹھیا بھی شامل ہیں۔

۲۔ فیڈرل فائننس کمیٹی:- اقتصادی معاملات کی تحقیق کے لئے۔ اس کے صدر رائٹ آنریبل لارڈ پرسی رکن پارلیمنٹ اور لفٹنٹ کرنل ہکسر کے نام قابل ذکر ہیں۔

۳۔ انڈین سٹیٹس فائننس کمیٹی:- یہ کمیٹی دیسی ریاستوں کے اقتصادی معاملات کی تحقیقات کرے گی اور اس کے صدر رائٹ آنریبل جے۔ سی۔ سی۔ ڈیوڈسن ہیں۔ اس کمیٹی کے تمام اراکین انگریز ہیں اور تعجب ہے کہ کوئی ہندوستانی اس میں شامل نہیں کیا گیا۔

... ...

ہر کمیٹی کے صدر کے نام وزیراعظم نے ایک مکتوب بھیجا ہے اور اس میں کمیٹی کے دائرۂ عمل کے متعلق ضروری ہدایات دی ہیں مثلاً لارڈ لوتھین صدر فرنچائز کمیٹی کو لکھا ہے کہ گول میز کانفرنس کی فرنچائز سب کمیٹی کی سفارشات کو پیش نظر رکھ کر ایسی صورتیں دریافت کی جائیں کہ کم سے کم دس فیصدی اور زیادہ سے زیادہ پچیس فیصدی آبادی کو حق رائے دہندگی آئندہ دستور اساسی میں حاصل ہو جائے۔ وزیراعظم کے تینوں مکتوبات میں بار بار اراکین گول میز کانفرنس کی اکثریت کا حوالہ دے کر اسی کی بنیاد پر مزید تحقیقات کی ہدایت کی گئی ہے حالانکہ گول میز کانفرنس میں نمائندگی آبادی کے لحاظ سے نہ تھی اور یہ پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ کوئی فیصلہ نمائندگان کی اکثریت کے لحاظ سے نہ کیا جائے گا بلکہ آپس کے سمجھوتے اور گفت و شنید سے تمام باتیں طے پائیں گی ورنہ وزیراعظم بخوبی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت اور سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمان دونوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ آئندہ دستور میں ہر بالغ کو حق رائے دہندگی ملنا چاہئے، پھر ایک ایسے واضح اور صریح فیصلے کو نظر انداز کر کے سب کمیٹی کی سفارش کے حوالے سے حق رائے دہندگی کو زیادہ

[illegible] ... کا بھی تک ... کر دینا کہاں تک حق بجانب ہے۔

... ...

[illegible] کہ گول میز کانفرنس کی کارروائیاں باشندگان ہند کے لئے صد درجہ مایوس کن تھیں لیکن چونکہ کانگریس کے واحد نمائندے نے وزیر ہند اور وزیر اعظم سے گفتگو کے بعد ان کمیٹیوں کے ساتھ آخر وقت تک تعاون کا وعدہ کر لیا تھا اس لئے پھر بھی قوم کی کچھ نہ کچھ توقعات ان کمیٹیوں سے وابستہ تھیں لیکن گاندھی ارون سمجھوتے کے ختم ہو جانے کے بعد اب ملک کی موجودہ صورت حال پھر وہی ہو گئی ہے جو دسمبر ۱۹۳۰ء اور جنوری ۱۹۳۱ء میں تھی۔ گزشتہ سال وزیر اعظم، حکومت ہند اور انگلستان کی تمام سیاسی جماعتیں اس بات پر متفق تھیں کہ بہتر سے بہتر دستور مرتب کر لیا جائے لیکن بے کار ہے جب تک کہ ملک کی فضا اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو! سائمن کمیشن نے بڑی محنت و کاوش سے ایک دستور مرتب کیا تھا لیکن اس کا جو حشر ہوا وہ معلوم ہے! پہلی گول میز کانفرنس بھی دستور اساسی کے متعلق تمام مسائل ہمہ طے کر سکتی تھی لیکن آخر کار یہی محسوس کیا گیا کہ کانگریس کی نمائندگی کے بغیر کوئی فیصلہ مناسب نہ ہوگا۔ آج کل سال بھر کے بعد پھر وہی صورت درپیش ہے لیکن ع

کل جو عریاں تھی حقیقت وہی مستور ہے آج

... ...

۔ گاندھی ارون سمجھوتے کے ختم ہو جانے کے بعد اب حکومت کا یہ منشاء معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتوں اور اقلیتوں کی مدد سے دستور مرتب کیا جائے اور اس کا نفاذ کیا جائے لیکن صورت حال ایسی بگڑتی جا رہی ہے کہ لبرل جماعت کا ایک گروہ جو بمبئی سے تعلق رکھتا ہے اس وقت بھی علانیہ حکومت سے عدم تعاون کئے ہوئے ہے بقیہ لوگوں نے بھی الہ آباد میں ایک جلسہ منعقد کر کے حکومت کی موجودہ پالیسی سے اپنی بیزاری ظاہر کی ہے۔

۔ اقلیتوں میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ پہلے ہی سے کانگریس کے ساتھ شریک ہے جداگانہ طریق انتخاب کے حامی مسلمان گول میز کانفرنس میں شریک تھے لیکن اس جماعت میں بھی حکومت کے موجودہ طرز عمل سے بے چینی پیدا ہو رہی ہے اور ایک بہت بڑا گروہ دستوری کمیٹیوں سے علیحدگی پر زور دے رہا ہے اس سے حکومت مسلمانوں کے مطالبات کا کوئی فیصلہ ... [illegible]

[illegible] جلد سے جلد حکومت نے فرقہ وارانہ مسئلہ کا خاطر خواہ فیصلہ نہ کر دیا تو علاوہ دستوری کمیٹی کے چند اراکین کے اور باقی تمام مسلمانوں کو بھی کمیٹیوں سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا۔ غرض ہر حیثیت سے صورت حال کسی طرح بھی خوشگوار نہیں ہے اور اندیشہ ہے کہ دستوری کمیٹیوں کا حشر سائمن کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ نہ ہو۔

صوبہ سرحد اور اصلاحات | گول میز کانفرنس کے آخری جلسے میں وزیر اعظم نے [illegible]
دستور اساسی میں صوبہ سرحد کو دیگر صوبجات کے مساوی اختیارات [illegible]
ترتیب اور نفاذ میں ابھی زمانہ لگے گا اس لئے فی الفور موجودہ گورنر [illegible]
کا وہاں نفاذ کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد ہی اصلاحات [illegible]
شروع کر دی گئی تھیں اور ۱۹ فروری ۱۹۳۲ء کے ایک سرکاری بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ضروری انتظامات مکمل ہو چکے تھے، اپریل کے دوسرے ہفتے میں کونسل کے انتخابات ختم ہو جائیں گے اور اس کے فوراً بعد صوبہ سرحد کی پہلی مجلس آئین ساز کا اجلاس منعقد ہو گا۔

مجلس آئین ساز کل چالیس ارکان پر مشتمل ہو گی جس میں سے ۲۸ ارکان منتخب شدہ ہوں گے اور بارہ نامزد۔ اٹھائیس منتخب نشستوں میں سے بیس نشستیں مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہیں، پانچ غیر مسلموں کے لئے، ایک سکھوں کے لئے اور دو زمینداروں کے لئے۔ نامزد ارکان میں سے ۶ سرکاری رکن ہوں گے اور ۶ غیر سرکاری۔ گورنر کی اگزیکٹو کونسل کا رکن منجملہ سرکاری ارکان کے ہو گا، اگزیکٹو کونسل میں صرف ایک ہی رکن ہو گا اور وزیر بھی ایک ہی ہوا کرے گا جس کا تقرر حسب دستور منتخب اراکین کونسل میں سے کیا جائے گا۔

... ...

یہی اصلاحات اگر چند سال قبل نافذ کی جاتیں تو شاید ان کا خیر مقدم کیا جاتا حالانکہ "مڈی مان کمیٹی" کی تحقیقات کے بعد اچھی طرح روشن ہو گیا ہے کہ صوبجات کا موجودہ دوعملی نظام حکومت بہت ناقص ہے، اس کے علاوہ یہ وقت ان اصلاحات کے نفاذ کے لئے اور بھی موزوں نہ تھا جب کہ وائسرائے کے آرڈیننس نے تمام آئین اور دستور کو معطل کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرزمین بے آئین میں آئینی دور کے افتتاح پر کسی حلقے کی طرف سے خوشی کا اظہار نہیں کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ صوبہ سرحد کے ساتھ اب تک بڑی ناانصافیاں کی گئی ہیں اور یہاں سے جلد سے جلد مکمل نظام حکومت قائم کرنے کی ضرورت ہے' لیکن ملک نے گزشتہ دس سال کے اندر سیاسی تعلیم اور سیاسی بیداری کے مدارج اس قدر جلد طے کر لئے ہیں کہ کوئی صوبہ اس فرسودہ دو عملی نظام حکومت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ صوبجات میں مکمل ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا فیصلہ خود حکومت نے کر لیا ہے ایسی صورت میں اگر حکومت واقعی صوبہ سرحد کی شکایات کو حق بجانب سمجھ کر تلافی مافات کرنا چاہتی ہے تو مکمل ذمہ دار حکومت کا نظام مرتب کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن ایک طرف بجائے اس کے نصف آزادی دینے والے اصلاحات نافذ کرنے میں حکومت غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے اور دوسری طرف آرڈیننس کے عملدرآمد میں اس قدر سختی ہے کہ اس کی وجہ سے تمام ملک میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے' ایسی فضا میں اصلاحات کیوں نافذ کی جا رہی ہیں یہ سمجھنے سے تاریخ و سیاست کا ہر طالب علم قاصر ہے۔

برطانوی تجارت اور بائیکاٹ | برطانوی ٹریڈ کمشنر مقیم ہندوستان اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ جہاں تک ہندوستانی منڈیوں کا تعلق ہے برطانوی تجارت پر ایسا نازک وقت گزرا ہے کہ اس کے مضر اثرات ایک عرصے تک محسوس کئے جائیں گے۔ برطانوی مال تجارت کی درآمد میں ۶ء۵ فی صدی تخفیف ہو گئی ہے اور ٹریڈ کمشنر کی رائے میں یہ تخفیف اس قدر غیر معمولی ہے کہ اس کی وجہ صرف تحریک بائیکاٹ قرار دی جا سکتی ہے۔

گزشتہ سال تحریک سول نافرمانی کا یہی عنصر اثر تھا جس کو تنگ نظر مدبرین انگلستان نظر انداز کرنا چاہتے تھے لیکن سابق وزیر ہند اور وائسرائے نے اسی عظیم الشان تجارتی نقصان اور اس کی اہمیت کو محسوس کر کے قوم پرست جماعت کے ساتھ سمجھوتا کیا تھا۔ ایک تو عام کساد بازاری نے تمام کاروبار کو تباہ کر رکھا ہے اس کے علاوہ بائیکاٹ کی قومی تحریک نے برطانوی تجارت کو شدید ترین نقصان پہونچایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ دستور اساسی کے تمام تحفظات اس تجارتی نقصان کو روک سکتے ہیں؟ پھر اگر برطانیہ اور ہندوستانی قوم کے تعلقات آئندہ اسی قدر کشیدہ رہے تو کیا وہ تحفظات جو لارڈ ریڈنگ اور سر سموئل ہور مجوزہ دستور اساسی کے لئے تجویز کر رہے ہیں کسی صورت میں بھی برطانوی مفاد اور برطانوی تجارت کی حفاظت کر سکیں گے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ ایک دوسرے پر اعتماد اور خوشگوار سیاسی

تعلقات جو سب سے بہتر ضمانت اور سب سے عمدہ تعلقات ہیں۔

کلکتہ، بمبئی اور کراچی سے درآمد و برآمد کے جو اعداد و شمار شائع ہوتے رہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تجارت خارجہ میں پچھلے مہینوں کے اندر معتد بہ کمی ہو گئی ہے۔ اس کا اثر سرکاری مالیات پر پڑنا لازمی ہے۔ اسی لئے بہی خواہان حکومت نے بھی گاندھی ارون سمجھوتے کے ختم ہو جانے پر پر زور احتجاج کیا تھا لیکن معاملات اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ فی الحال سیاسی فضا درست ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بائیکاٹ کی قوت برابر زور پکڑتی جا رہی ہے جو ...
بہت زیادہ نقصان رساں ثابت ہو گی۔ جرمنی کے تاوان جنگ ...
پریشان کر دیا ہے اس لئے کہ اس کا مضر اثر برطانوی ساکھ پر ...
کا مسئلہ بھی برطانیہ کے لئے کچھ کم اہم نہیں، برطانیہ کی ساکھ تجارت پر ...
حکومت کو جلد یا بدیر اس حقیقت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

تمع زندگی ہندوستان کی مخصوص آب و ہوا میں عمر کا اوسط دیگر ممالک کے مقابلے میں یوں بھی کچھ کم نہ تھا لیکن اصول حفظان صحت کی طرف سے بے توجہی نے اوسط عمر گھٹا کر ۲۵ سال سے ۲۲ سال کر دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں دیگر ممالک کا اوسط عمر برابر بڑھ رہا ہے جیسا کہ حسب ذیل اعداد سے ظاہر ہوتا ہے:-

۱۔ نیوزی لینڈ میں	۶۵ سال ہے
۲۔ امریکہ میں	۵۶ سال سے بڑھ کر ۵۸ سال ہو گیا ہے۔
۳۔ انگلستان میں	۴۹ سال سے ۵۰ سال ہو گیا ہے، اور
۴۔ جاپان میں بھی	۴۷ سال سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

ہندوستان میں بلا مبالغہ لاکھوں جانیں ہر سال ہیضہ، طاعون، بخار اور چیچک میں ضائع ہوتی ہیں اور اب کچھ عرصے سے تپ دق کا مرض بھی روز بروز بڑھتا جاتا ہے، چنانچہ اس مرض کے ایک بہت بڑے ماہر ڈاکٹر متو نے اندازہ لگایا ہے کہ کم از کم دس لاکھ جانیں ہر سال تپ دق کی بدولت ضائع جاتی ہیں اور اس مرض میں جو مبتلا ہوتے ہیں ان میں سے زیادہ تعداد نوعمروں اور نوجوانوں کی ہوتی ہے۔

[illegible] سے اس مرض کے انسداد کے لئے بہت کوشاں ہیں اور آپ نے ایک بہت بڑی [illegible] کے قریب بمقام تمبرم قائم کی ہے جہاں دق کے مریضوں کا علاج خاص ان کی نگرانی [illegible] لیکن جس تیز رفتاری سے یہ مرض اس ملک میں ترقی کر رہا ہے اس کو محسوس کر کے ڈاکٹر موصوف [illegible] کہ اس صحت گاہ کے ساتھ یہ بھی انتظام کیا جائے کہ (۱) سند یافتہ ڈاکٹر وہاں رہ کر اس مرض کی تشخیص اور علاج کے متعلق تجربات کریں (۲) مریضوں کے اعزا اور تیمارداروں کو حفظان صحت کے اصول اور غذا تیار کرنے کے طریقے بتلائے جائیں اور (۳) عام تقاریر اور تصاویر کے ذریعے سے اس مرض سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہدایات اور معلومات عوام تک پہونچائی جائیں۔

ڈاکٹر موصوف کی یہ کوشش قابل مبارکباد ہے اور ضرورت ہے کہ دیگر مقامات پر بھی اسی قسم کی تدابیر اس نامراد مرض کے انسداد کے لئے اور عامۃ الناس کو از خود موت کے منہ میں جانے سے بچانے کے لئے اختیار کی جائیں ورنہ اس طرف سے بے توجہی خودکشی کے مرادف ہوگی۔

(ب) عالم اسلامی

انتداب عراق کا خاتمہ سیاسی حلقوں میں ایک مدت سے یہ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ عراق میں برطانوی انتداب کا زمانہ عنقریب ختم ہو جائے گا۔ رائٹر کی تازہ ترین اطلاعوں نے اس خیال کی تصدیق کر دی ہے۔ اس لئے کہ انجمن اقوام نے "اصولاً اس تجویز سے اتفاق کر لیا ہے کہ عراق میں انتدابی حکومت کو ختم کر دیا جائے لیکن اس وقت جب مستقل مجلس انتدابات کی تجاویز کے مطابق دولت عراق انجمن اقوام سے چند ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عہد کرے۔" یہ ذمہ داریاں یا ضمانتیں کیا ہونگی اس کا پتہ مجلس انتدابات کی روئداد سے چلیگا۔ جب مجلس مذکور کی یہ روئداد تیار ہو جائے گی تو پھر انجمن اقوام کے بعض نمائندے برطانوی نمائندوں سے ملکر اس اعلان کا مسودہ تیار کریں گے جن میں مجلس کی سفارشات کا تذکرہ ہوگا۔ اس کے لئے حکومت عراق سے گفت و شنید کی ضرورت پڑے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس روز یہ تمام امور طے ہو گئے اس روز انتداب عراق کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اول تو یہ دیکھنا باقی ہے کہ انجمن اقوام حکومت عراق کی "ضمانتوں" کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ ثانیاً اگر انجمن اقوام نے عراق کی ضمانتوں کو منظور بھی کر لیا تو انتداب کا خاتمہ اسی روز ہو سکے گا!

جب معاہدے کی رو سے عراق باقاعدہ انجمن اقوام میں شریک ہو جائے گی۔

اب غالباً یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ان "ضمانتوں" کا تعلق جن پر انجمن اس درجہ اصرار کر رہی ہے کن امور سے ہے۔ ایک تو انجمن کو اقلیتوں کی حفاظت مقصود ہے۔ دوسرے اس کی یہ خواہش ہے کہ عدالت کا نظم و نسق اعلیٰ پیمانے پر ہو اور انتدابی حکومت کے دوران میں عراق پر جو مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا احترام کیا جائے۔ علاوہ ازیں ان بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی بھی ضروری ہے جن میں عراق نے بالواسطہ یا بلا واسطہ حصہ لیا ہے۔ یہ مسائل ہیں جو اس وقت سر فرانسس ہمفریز ہائی کمشنر عراق اور نوری پاشا وزیر اعظم عراق کے زیر غور ہیں۔ دونوں حضرات کا خیال ہے کہ انجمن اقوام کے اجلاس مئی میں اس اعلان کا مسودہ اور سر فرانسس عراق کی طرف سے تیار کر رہے ہیں۔

عراق کی آزادی کا مسئلہ ختم انتداب کا پابند ہے لیکن اس امر پر بحث ... کر دی گئی ہیں جن کے پورا کرنے کے لیے ایک مدت چاہیے۔ مزید براں ختم انتداب کے بعد بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان ضمانتوں کی موجودگی میں آزادی عراق کی صحیح نوعیت کیا ہوگی۔ بہرحال جن لوگوں کو انجمن اقوام پر اعتماد ہے اور جو لوگ مغرب کی سیاسی کارروائیوں کے متعلق حسن ظن سے کام لیتے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ دولت عراق کو اپنے سیاسی مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی ہو رہی ہے۔ امیر فیصل نے ایک تار میں تاجدار برطانیہ کا شکریہ ادا کیا ہے کہ اگر گزشتہ دس سال میں دولت برطانیہ کی اعانت ان کے شامل حال نہ ہوتی تو وہ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہوتے اور ملک معظم نے اس عظیم الشان کامرانی پر انھیں مبارکباد دیتے ہوئے یقین ظاہر کیا ہے کہ عراق و برطانیہ کا سلسلۂ محبت و مودت اسی طرح جاری رہے گا۔

سیاسیات شام | شام کے انتخابات عنقریب مکمل ہو جائیں گے۔ پچھلے مہینے وطن پسندان شام کے رویے نے حکومت کو مجبور کر دیا تھا کہ دمشق، حمص اور حماہ میں انتخابات کا سلسلہ یک قلم موقوف کر دیا جائے لیکن اب یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ جماعت وطنیین کے رویے میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہو گئی ہے اور حکومت کا خیال ہے کہ انتخابات کا نتیجہ اس کی توقعات کے مطابق ہوگا۔ انتخابات کا معاملہ ختم

[illegible] مجلس مقننہ کو نئے دستور پر غور کرنا ہوگا اور پھر اس امر کا فیصلہ ہوگا کہ آیا شام میں جمہوریت قائم کی [illegible] یا بادشاہت۔

سطور بالا سے یہ امر بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ فرانسیسی حکومت نے شامی معاملات کے متعلق کیا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اس سے ہم احرار شام کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہنوز ہنگامہ انتخابات اختتام کو نہیں پہنچا۔ انتخابات کا سلسلہ جاری تھا کہ حماۃ، حمص اور دمشق میں ان کو یک قلم موقوف کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وطن پسندان شام کا رویہ کچھ بہت زیادہ مستحسن نہیں تھا۔ گویا حکومت انتداب نے ایک طرف آئین و دستور کی نمائش قائم کر رکھی ہے۔ دوسری طرف اسے یہ بھی چاہتی ہے کہ احرار شام کے رستے میں ہر ممکن عذر کی بنا پر کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا کر دے اور انتخابات کے خاتمے پر بہر حال اس کی اکثریت قائم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ مجلس مقننہ میں جدید دستور کی تصدیق و عدم تصدیق اور شام میں جمہوریت یا بادشاہت کے قیام کا فیصلہ بھی حکومت ہی کے ایما پر ہوگا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مسئلے کے متعلق احرار شام کی کیا رائے ہے۔ بہر حال قارئین جامعہ انہیں صفحات میں پڑھ چکے ہوں گے کہ امارت شام کے لئے اس سے قبل امیر فیصل تاجدار عراق کا نام لیا جاتا تھا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ ممکن ہے عراق و شام کے الحاق سے ایک متحدہ ریاست قائم کر دی جائے۔ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ عباس حلمی پاشا معزول خدیو مصر اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ انہیں شام کا تخت حاصل ہو جائے۔ پچھلے مہینے عباس حلمی پاشا نے قدس اور ماورائے اردن کا سفر کیا۔ جہاں عمان میں انھوں نے امیر عبداللہ سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہونچے کہ امیر فیصل کے دل میں اس قسم کی کوئی خواہش نہیں کہ وہ شام پر حکومت کریں۔ یہاں سے عباس حلمی بیروت آئے اور اب قسطنطنیہ کا عزم رکھتے ہیں تاکہ وہ اس گفت و شنید کا حال معلوم کریں جو حکومت فرانس اور ان کے نمائندے کے درمیان اس بارے میں ہو رہی ہے۔

غالباً یہاں اس امر کا ذکر کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ خدیو معزول جریدۂ ٹائمز کے خلاف ایک دعویٰ دائر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بنائے دعویٰ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں ٹائمز نے سر ولینٹائن چیرول کی کتاب "مسئلہ مصر" شائع کی جس میں ان کے متعلق بعض ایسے بیانات موجود ہیں جن پر خدیو موصوف کو اعتراض ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ عباس حلمی پاشا اب تک اس معاملے میں کیوں خاموش رہے سوال کا جواب یہ ہے کہ حکومت برطانیہ او رشاہ مصر سے ان کے تعلقات حال ہی میں ٹھیک ہوئے

[illegible] کے بعد پہلی مرتبہ پچھلے سال لندن تشریف لے گئے ہیں اور غالباً اسی زمانے میں
انھوں نے ٹائمز کے خلاف اپنے دعوے کے انتظامات مکمل کئے ہیں۔

اتحاد طہران وانگورہ | قاہرہ کا ایک پیام مظہر ہے کہ توفیق رشدی پاشا وزیر خارجۂ ترکی طہران و بغداد کا عزم رکھتے ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ پاشائے موصوف سفر طہران سے فارغ ہو کر اب بغداد تشریف لے آئے ہوں گے۔

ایران و ترکی کی باہمی رقابت او عداوت کا افسانہ ایک مدت ہوئی
کی بدولت یہ دو عظیم قومیں جو اپنے مذہبی تعصب اور بے بصیرتی سے
بنی رہیں اب ایک دوسرے کو صلح و آشتی کا پیام دے رہی ہیں
مصلحت اندیشی اور مذہبی جنون وطنیت سے بدل چکا ہے۔ بایں ہمہ امور
کچھ بہت زیادہ اطمینان بخش نہیں تھے۔ خیال یہ ہے کہ دولت ایران کردوں کے جذبۂ آزادی کو اپنے مطلب کے لئے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ کردستان ایران و ترکی کی سرحد پر واقع ہے اور باغی کرد جب چاہتے تھے ایرانی علاقے میں پناہ گزیں ہو جاتے تھے لیکن جب سے رضا شاہ پہلوی کی حکومت نے ملک کے اندرونی نظم و نسق کی طرف قدم اٹھایا ہے کردی قبائل کی آزادانہ نقل و حرکت میں بہت کچھ کمی واقع ہو گئی ہے بلکہ گزشتہ دو سال کی جنگی کارروائیوں کے بعد اب ایران کی کردستانی سرحد تمام قبائلی مفاسد سے پاک ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران و ترکی کے باہمی اتحاد کی تکمیل کے لئے اب توفیق رشدی پاشا طہران گئے ہیں۔ قرار داد یہ ہے کہ ترکی سرحد کے بعض اضلاع ایران کو دیئے جائیں اور ان کی بجائے ارارات اصغر پر ترکوں کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے۔ کیونکہ یہی علاقہ کردی باغیوں اور رہزنوں کا آماجگاہ ہے۔ حکومت ایران نے اگرچہ اس کے متعلق اپنی رضامندی کا باقاعدہ اظہار نہیں کیا لیکن توفیق رشدی پاشا کو اس سفر سے غالباً اس قسم کی کوئی مفاہمت بآسانی عمل میں آجائیگی۔

البتہ بغداد کا سفر ایک دوسرے مقصد کا پابند ہے۔ قارئین جامعہ انہی صفحات میں عراق و انگورہ کے خوش گوار تعلقات کا حال ملاحظہ کر چکے ہیں۔ امیر فیصل کے سفر قسطنطنیہ کے بعد نوری پاشا وزیر اعظم عراق براہ حلب قسطنطنیہ تشریف لے گئے تاکہ عراق و ترکی کے اتحاد کا رشتہ زیادہ مضبوطی سے

[illegible] ان دوستانہ روابط کے قیام کے بعد رشدی پاشا بغداد گئے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ [illegible] ملکوں میں تجارتی تعلقات بھی قائم ہو جائیں۔ ترکوں کی خواہش ہے کہ ایرانی تجارت میں وہ از سر نو [illegible] اہمیت قائم کریں۔ آج سے آٹھ دس سال پہلے یہ خیال ظاہر کیا جاتا تھا کہ ترک فطری طور سے تجارتی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی اہمیت نہیں رکھتے لیکن اب کچھ سال سے ترک نہایت کامیابی کے ساتھ نہایت [illegible] بینک چلا رہے ہیں جن میں ترکوں کے علاوہ کسی دوسری قوم کا مطلق دخل نہیں۔ رشدی پاشا اپنے ساتھ ترکی بینکوں کے افسر اعلیٰ کو بھی لے گئے ہیں۔ طرابزون اور ارض روم کی سڑک عنقریب سرحد ایران تک پہنچ جائے گی لہٰذا ترکوں کے لئے موقع ہے کہ وہ اپنے بینک کی ایک شاخ طہران میں کھولیں اور اس طرح دونوں ہمسایہ ممالک میں تجارتی روابط قائم ہوں۔ پاشائے موصوف کا بغداد تشریف لیجانا بھی اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔

حکومت انگورہ کی مالی دشواریاں

گزشتہ چند مہینوں سے انگورہ کی مالی مشکلات نے ایک نازک صورت اختیار کر رکھی ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ترکوں کو بھی یہ دشواری پیش ہے کہ وہ اپنے میزانیہ میں کیوں کر توازن قائم کریں۔ لیکن ترکی میں جو کچھ ہوتا ہے پوشیدہ طور پر ہوتا ہے اور اکثر یہ پتہ نہیں چلتا کہ حکومت کے مدنظر کیا تدابیر ہیں۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے مجلس ملیہ کے افتتاح پر یہ اعلان کیا تھا کہ ان امور کے متعلق حکومت غیر معمولی ذرائع اختیار کرے گی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے ہر شخص کی آمدنی پر خواہ وہ ترک ہو یا غیر ترک ۱۰ فی صدی ٹیکس عائد کر دیا ہے البتہ عمال حکومت اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مجلس ملیہ اس امر پر غور کر رہی ہے کہ غیر ملکی آبادی کو ترکی حدود میں کسی کام کاج کی اجازت نہ دی جائے چنانچہ تین مہینے کے اندر اندر ان سب لوگوں کو اپنے اپنے کام کاج سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ یہ نیا قانون تمام پیشوں اور صنعتوں پر عائد ہو گا قسطنطنیہ کے فوٹوگرافر تو یہاں تک کر رہے ہیں کہ انھوں نے ایک درخواست میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ غیر ملکوں کو فوٹوگرافی کے پیشے تک کی اجازت نہ دی جائے۔

اس سے قبل حکومت ایک خفیہ حکم صادر کر چکی ہے اور وہ یہ کہ کابینۂ وزارت تمام سامان درآمد کا دو ماہ کے لئے تعین کر دیا کرے گا۔ وہ مصنوعات جو ترکی میں تیار ہوتی ہیں ان کو منگوانا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور قیمتوں کا تعین اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کی درآمد بند ہو جائے۔ تاجران درآمد کو مجبور کیا گیا ہے کہ

جس قدر مال ترکی میں آئے اتنا ہی مال ترکی سے خرید ابھی جائے۔ علاوہ ازیں حکومت نے تمام ممالک کو مجبور کر دیا ہے کہ ان کی باہمی ادائگیوں کی مقدار ایک سی رہے گویا ترک یہ چاہتے ہیں کہ ان کے تجارتی معاملات میں ایک توازن سا قائم ہو جائے۔

جہاں تک درآمد کے تعین کا تعلق ہے اس کا طریق کار یہ ہے کہ حکومت ہر دو ماہی کے لئے درآمد کی مقدار کو مقرر کر دیتی ہے اور اس کا اعلان بیس روز پہلے کر دیا جاتا ہے۔ بالفعل ۱۹۳۲ء کی درآمد کو تعین درآمد کی بنا ٹھہرایا گیا ہے جو گزشتہ سالوں کے مقابلے میں قلیل ترین مقدار ہے۔ باوجود اس کے درآمد و برآمد کا توازن مشکل نظر آتا ہے اس لئے کہ ابھی تک ۲ کروڑ پاؤنڈ کی ادائگی [illegible]

حالات فلسطین | معلوم ہوتا ہے کہ موتمر اسلام نے جن مجالس کے ذ[illegible] اپنے کام میں مصروف ہیں۔ مسلمانان ہندوستان نے اس خبر کو مسرت کے ساتھ [illegible] شہنشاہیت وملوکیت کے خلاف ایک اعلان شائع کیا ہے اور شامی عیسائیوں نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا ہے کہ حجاز ریلوے کا وقف پھر مسلمانوں کے ذمے کر دیا جائے۔

البتہ یہ امر کہ جامع اقصیٰ میں سے مصحف پاک کا وہ بیش قیمت نسخہ جو ایک عرصے سے وہاں رکھا تھا دفعۃً غائب ہو گیا ہے نہایت افسوسناک ہے۔ پچھلے دنوں یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ مصحف پاک کے صرف چند اوراق غائب ہیں۔ بہر حال مصحف پاک کا یہ ایک عدیم المثال نسخہ ہے جس کو مفتی سید امین الحسینی نے جامع عمر میں سے اٹھوا کر عجائب گھر میں بھجوا دیا تھا۔ یہ روایت جریدۂ فلسطین کے نامہ نگار مصر کی ہے اور اسی کا بیان ہے کہ یہ مصحف شیشے کے ایک صندوق میں رکھا تھا جس کی ایک کنجی سپریم کونسل اور دوسری مراکشی جماعت کے امیر کے پاس رہتی ہے۔ یہ اس لئے کہ مصحف مذکور کو سلطان ابوالحسن المرینی نے تیرھویں صدی مسیحی میں فتح جبل الطارق کے بعد تیار کیا تھا۔ پورا قرآن مجید ہرن کی کھال پر لکھا گیا ہے اور روشنائی میں مشک کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ سارا نسخہ نہایت درجے مزین ہے جس سے ابتک ہلکی سی خوشبو آتی ہے۔ ہر پارہ علیحدہ علیحدہ نقرئی جلد میں ہے جس کی زیبائش اندلسی اور مغربی صنعتکاری سے کی گئی ہے۔ ۶۵۰ سال ہوئے جب یہ نسخہ قلمبند ہوا اور اس کے لئے وہی اسلوب کتابت اختیار کیا گیا تھا جو مصحف قرطبہ کا تھا اور اس کا مقصد یہی درا صل نسخہ قرطبہ کا بدل پیدا کرنا تھا۔

ممالک غیر

تخفیف اسلحہ بارہ برس کی طویل گفت وشنید کے بعد اقوام عالم ایک مرتبہ پھر جنیوا میں جمع ہوئی ہیں تاکہ تخفیف اسلحہ کے مسئلے پر غور کریں لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مختصراً ان حالات کی طرف اشارہ کر دیا جائے جن کے ماتحت یہ سوال اول اول دنیا کے سامنے آیا۔

ہمارے لئے ان تجاویز و تدابیر کا تذکرہ بے سود ہوگا جو ۱۹۱۴ء سے قبل امتناع جنگ کے لئے وقتاً فوقتاً سیاسئین مغرب کی طرف سے مختلف انجمنوں میں پیش ہوتی رہیں۔ البتہ اختتام جنگ کے قریب جب صدر جمہوریہ امریکہ نے امن عالم کا محافظ بن کر اپنے چہاردہ نکات کا اعلان فرمایا ہے تو ان کے ارشادات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ "اس امر کا پورا پورا اطمینان کر لیا جائے گا کہ ہر قوم سامان حرب کا صرف اس قدر ذخیرہ رکھنے پائے گی جو ملک کے اندرونی امن وامان اور اس کے دفاع و محافظت کے لئے کافی ہو" بتانے کی ضرورت نہیں کہ اتحادیوں نے پریسیڈنٹ ولسن کی اس تجویز کی تائید کی اور جرمنی نے اسے منجملہ دوسری شرائط صلح کے تسلیم کیا۔ چنانچہ جنگ کے خاتمے پر جتنے بھی معاہدے مرتب ہوئے ان سب میں اسی تجویز کے الفاظ موجود تھے۔ انجمن اقوام کے تمام اراکین اس کے پابند ہیں بلکہ مجلس اقوام کا یہ فرض ہے کہ وہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے عملی تدابیر اختیار کرے۔ ۱۹۱۹ء میں جب اسی تجویز کے ماتحت جرمنی سے تخفیف اسلحہ کا مطالبہ کیا گیا ہے تو اس وقت موسیو کلیمنشو وزیر اعظم فرانس نے یقین دلایا تھا کہ یہ پہلا قدم ہے جو اقوام عالم نے تخفیف اسلحہ کی طرف اٹھایا ہے لیکن کچھ مدت کے بعد خود فرانس ہی نے اس تجویز پر یہ اعتراض کیا کہ جب تک انجمن اقوام اتنی قوت حاصل نہ کرے کہ وہ کسی ایسے ملک کو جس نے اپنے ذخائر حرب میں تخفیف کر دی ہے دوسرے حملہ آوروں سے بچا سکے اس وقت تک اس مسئلے پر غور کرنا بے کار ہوگا۔

فرانس کا یہ اعتراض ایک حد تک صحیح تھا لیکن سوال یہ ہے کہ جب جرمنی سے سامان جنگ کی تحدید کا مطالبہ کیا گیا تھا تو اس وقت موسیو کلیمنشو کو یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ بہر حال ۱۹۱۴ء میں یہ مسئلہ پھر اقوام مغرب کے سامنے آیا اور اب کے تجاویز جنیوا میں یہ طے ہوا کہ اگر سوء اتفاق سے جنگ چھڑ جائے تو مجلس اقوام کا ہر رکن اس میں حصہ لینے پر مجبور ہوگا۔ برطانیہ نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا لہٰذا ۱۹۲۶ء

میں دونوں میں ایک دوسرا اجتماع ہوا جس میں بالآخر یہ قرارداد منظور ہوئی کہ جرمنی اور فرانس دونوں کو جنگ
کی صورت میں امداد اور اشتراک عمل کا یقین دلایا جائے۔ اس اجتماع میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی،
بیلجیم، پولینڈ اور چیکوسلواکیا سات قومیں شریک تھیں۔ اگلے سال یعنی ۱۹۲۶ء سے جرمنی نے انجمن اقوام
میں شرکت کر لی ہے اور اب گویا جرمنی کو بھی تخفیف اسلحہ کے مطالبہ کا ایسا ہی حق حاصل ہے جیسا دوسری
قوموں کو۔ فرانس کا منشا یہ ہے کہ اس کی جنگی طاقت بدستور قائم رہے لیکن جرمنی یا ہنگری یا کسی دوسرے
ملک کو یہ کیوں کر گوارا ہو سکتا ہے کہ اس کے مقابلے میں ان کی فوجی قوت برابر گھٹتی رہے۔ بات اصل
میں یہ ہے کہ اختتام جنگ پر ہر قوم نے جہاں تک ممکن تھا دوسری قوم کی شکست سے فائدہ اُٹھانا چاہا
اس سے قدرتاً تمام یورپ میں صلح و آشتی کی بجائے بغض و عداوت
ہوئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جرمنی اور فرانس میں ایک دوسرے
دن بدن بھڑک رہی ہے۔ دونوں قوموں میں جنگی روح کارفر
قوم اس سے اپنی گزشتہ ناکامی کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔ اس کے لئے
خطرے کا موجب بن رہی ہے۔ ادھر اٹلی سے بھی اس کے تعلقات کچھ اچھے نہیں اور شمالی افریقہ کی
سیاسی پیچیدگیاں کچھ ایسی ہیں کہ ان سے ہر وقت جنگ وجدل کا خدشہ ہے۔ مزید برآں مشرقی یورپ
کی ریاستوں کی طرف سے اس پر جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں ان سے بھی ہر لحظہ جنگ کا امکان ہے۔
لیکن اگر ان تمام وجوہ کو باطل قرار دیا جائے، تب بھی فرانس کا یہ عذر ہے کہ امن یورپ کے قیام کے
لئے اس کے عساکر کی موجودگی ضروری ہے۔ گویا حکومت فرانس اب وہی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے
جو اس کے نزدیک جنگ سے قبل جرمنی کی تھی اور جس کے لئے اسے اب تک مطعون کیا جاتا ہے۔ بہرکیف
یہ مطلب نہیں کہ فرانس کے یہ سب عذرات حقیقت پر مبنی ہیں اور انہیں اخلاقاً بھی جائز سمجھنا چاہیے۔
ظاہر ہے کہ مدبرین مغرب اگرچہ جنگ کے خطرات سے خوفزدہ ہیں لیکن ان کے اندر کوئی ایسی اخلاقی یا
روحانی قوت موجود نہیں جس سے اقوام عالم کے درمیان تصادم نہ ہونے پائے۔ مغربی قوموں کی حالت
تو اس معاملے میں خاص طور سے افسوسناک ہے۔ ان کا جذبۂ وطنیت، ان کی ہوس استعمار اور خواہش
غصب، ان کی باہمی رقابت، مقصد انتقام، عیش پرستی اور مادیت اور لامذہبی اتحاد و اتفاق کی راہ میں
بری طرح سے حائل ہیں۔ بہرکیف ایک طرف فرانس کو اپنی عسکریت کی حفاظت مقصود ہے اور دوسری

[illegible] جرمنی قوموں کا بجا طور پر اصرار ہے کہ ان کی اور فرانس کی حالت میں یہ فرق پیدا ہو گیا [illegible] محسوس کیا جائے۔ اس پر لطف یہ کہ وہ قومیں جن کے معاملات فرانس یا جرمنی کے سے نہیں [illegible] عالم کے نام پر تخفیف اسلحہ کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اب کے جنیوا میں امریکہ اور روس کے مندوبین [illegible] مجلس میں ہیں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اس میثاق کو جو مسٹر کیلوگ کی طرف منسوب ہے عملاً [illegible] بنایا جائے گویا بساط سیاست مغرب کے سبھی مہرے ایک جگہ جمع ہیں اور اگر بہ ظاہر امن عالم کا مقصد عظیم ان کے سامنے ہے لیکن ہر قوم جو چال چلتی ہے اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ تدبیر اور [illegible] کی دنیا میں اپنی حریف قوم کو شکست دے سکے۔

ہٹلر پارٹی جرمنی کی مشہور سیاسی جماعت "ہٹلر پارٹی" نے جو اشتراکیت و وطنیت کے پردے میں اصل سابق طرز حکومت یعنی شہنشاہی اور فوجی نظام کی حامی ہے حال ہی میں قانونی ذرائع کی مدد سے اپنا اثر بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ اس کی تصریح مشہور جرمنی صحافی جارج برلن ہارڈ نے اس طرح کی ہے کہ اگرچہ مجلس حکومت میں اس وقت ہٹلر پارٹی کی تعداد ۴۰ فی صدی ہے جس میں بآسانی دو فیصدی کا اور اضافہ ہو سکتا ہے لیکن ہٹلر کو یقین ہے کہ اس کے لئے مزید ۸ فی صدی کا حاصل کرنا ناممکن ہے۔ لہذا ایڈولف ہٹلر کے سامنے دو ہی راہیں ہیں۔ یا تو وہ کسی موقعے سے فائدہ اُٹھا کر دفعۃً حکومت پر قبضہ کرے یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو بسر دست مخلوط حکومت قائم کی جائے اور جب وقت آئے تو ہر ہٹلر اپنے رفقاء کو چھوڑ کر مختار کل کی حیثیت اختیار کرے۔

ہٹلر پارٹی کی تعداد میں جس چیز نے اضافہ کیا ہے وہ جرمنی کی روز بروز پست معاشی حالت ہے۔ ہٹلر کا کہنا یہ ہے کہ اس صورت حالات کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو جرمنی کے دشمن ہیں یعنی فرانس اور امریکہ اور جو جنگ کے بعد سے برابر اس کا خون چوس رہے ہیں۔ ہٹلر کا دعویٰ ہے کہ جرمنی کی سابقہ حالت ایک مرتبہ پھر عود کر سکتی ہے۔ گویا اس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے انقلاب حکومت یا زر کی قیمت گر جانے سے نقصان اٹھایا ہے ہٹلر کے جھنڈے کے نیچے جمع ہیں یوں بھی اب تک جو سیاسی جماعتیں قائم ہو چکی ہیں ان سے کوئی خاص نتائج مترتب نہیں ہوئے لہذا لوگ یہ دیکھنا [illegible] ہیں کہ اب ہٹلر ان کے لئے کیا کرتا ہے۔

[illegible] ہٹلر کی قوت میں اس قدر جلد اضافہ نہ ہوتا لیکن ہوا یہ کہ ہٹلر نے اپنی تحریک کا آغاز
اشتراکی اصولوں کے پردے میں کیا۔ اس سے بڑے بڑے تاجروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہٹلر
کی تحریک مزدوروں کی انجمنوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لئے مفید ثابت ہوگی لہذا انہوں
نے ہٹلر کی مدد کرنا شروع کر دی۔ اس وقت ہٹلر کے ساتھ ہر قسم کے لوگ ہیں اور اس نے ان میں سے
ہر شخص کے ساتھ جیسا جس نے چاہا ویسا وعدہ کر لیا۔ اس جماعت میں سابق والیان ملک قدیم حکام، متوسط
طبقہ، مزدور، دستکار، نوجوان، اشتراکی غرضکہ ہر طرح کے آدمی شامل ہیں۔ اس وقت ایڈولف ہٹلر کی
گفت و شنید سنٹر پارٹی سے جاری ہے۔ ادھر خود سنٹر پارٹی بھی یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ ہٹلر کی بڑھتی ہوئی
جماعت کو بہت دنوں تک حکومت میں حصہ لینے سے روک نہیں سکتی۔ لہذ
وہ چاہتے ہیں کہ وہ ہٹلر کے ساتھ مل کر اس کی جماعت میں تفریق د
ے بعض اراکین جن میں قابل ذکر نام چانسلر برونگ کا ہے یہ سمجھ
حکومت میں قائم ہو گیا تو پھر مؤیدین ہٹلر یہ کوشش کریں گے کہ پوری
سنٹر پارٹی کے اس فریق کا خیال ہے کہ نیشنلسٹ سوشلسٹ جماعت کو باہمی مفاہمت کا موقع دینا چاہیے
تاکہ وہ اس امر کا فیصلہ کر سکیں کہ آیا انھیں باقی ماندہ نیشنلسٹ سوشلسٹ طبقے کو اپنے ساتھ ملا کر حکومت
کرنی ہے یا بدستور سوشلسٹ ڈیماکرٹ جماعت کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس لئے کہ ممکن ہے آئندہ انتخابات
میں سوشلسٹ نیشنلسٹ جماعت کی تعداد کم رہ جائے۔ لیکن اگر فان ہنڈنبرگ دوبارہ صدارت کی امیدواری
کے لئے تیار ہو گئے (جس کی رائٹر نے حال ہی میں تصدیق کر دی ہے) تو پھر سنٹر پارٹی ہٹلر سے اس
امر کا مطالبہ کرے گی کہ وہ ان کے اشتراک عمل کے عوض جنرل ہنڈنبرگ کی صدارت کی تائید کرے۔
مگر اب ہٹلر کا ہنڈنبرگ کی تائید کرنا اس کے سابقہ اقوال کے منافی ہوگا اور اس سے قدرتاً اس کی
جماعت میں تفریق و انتشار رونما ہو جائے گا۔ بایں ہمہ ہٹلر کے لئے اپنی قوت کو قائم رکھنے کا یہی ایک
ذریعہ ہے اس لئے کہ ہٹلر کے لئے کسی انقلاب آفریں طرز عمل کا کوئی امکان نہیں اور اسے خوب معلوم
ہے کہ اگر اس قسم کا کوئی موقع آیا تو جرمن قوم اس کی بجائے ہنڈنبرگ کے ساتھ ہوگی۔

شذرات

اردو اکادمی کا دوسرا جلسہ جس کے لئے ۱۴ر فروری کی تاریخ مقرر ہوئی تھی اس دن منعقد نہ ہو سکا کیونکہ فاضل مقرر کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔ تمام مقامی اور بیرونی اراکین کو چند دن پہلے سے تاریخ بدلنے کی اطلاع دیدی گئی تھی اور اخباروں میں بھی اعلان ہو گیا تھا پھر بھی بعض حضرات احتیاطاً ۱۴ر فروری کو بھی مختلف اوقات میں تشریف لائے۔ انھیں جو زحمت برداشت کرنی پڑی اس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔

جلسہ ۲۰ر فروری یوم شنبہ شام کو ۶½ بجے سے ۸½ بجے تک ہوا۔ صدارت جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب نے فرمائی کیونکہ پروفیسر محمد حبیب صاحب بعض وجوہ سے تشریف نہیں لا سکتے تھے۔ قاضی عبدالغفار صاحب نے اپنا فاضلانہ خطبہ "جمال الدین افغانی کی سیرت" پر پڑھ کر سنایا۔ قاضی صاحب اس موضوع کے متعلق عرصے سے تحقیقات فرما رہے ہیں اور آپ نے بڑی کاوش اور تلاش سے بہت کچھ نیا مواد جمع کیا ہے جو آج تک کسی کو ہاتھ نہیں آیا تھا مثلاً شیخ جمال الدین کے دوست اور قدرداں مسٹر بلنٹ کا روزنامچہ، عروۃ الوثقےٰ کے متعدد نمبر (یہ رسالہ پیرس سے شیخ جمال الدین اور مفتی محمد عبدہٗ کی ادارت میں شائع ہوا مگر صرف چند مہینے چل سکا۔ اس کے پرچے اب نایاب ہیں) شیخ کے خطوط مختلف احباب کے نام، ان کے خاص دوستوں کے قلمی بیانات وغیرہ وغیرہ۔ قاضی صاحب کی تقریر جس دلچسپی، توجہ اور جوش سے سنی گئی اس کی مثال علمی جلسوں میں کم ملتی ہے۔ حاضرین کی تعداد پچھلے جلسے سے کچھ زیادہ تھی اور ان میں سفارت افغانستان کے نمائندے بھی موجود تھے۔ ہم اس مقالے کا ایک حصہ مارچ کے نمبر میں شائع کریں گے اور پورا مقالہ انشاءاللہ علیحدہ رسالے کی شکل میں جون تک چھپ جائے گا۔

اکادمی کا تیسرا جلسہ ۱۹ر مارچ کو ۶ بجے شام سے شروع ہوگا۔ مولانا اسلم جیراجپوری حسب ذیل موضوع پر تقریر فرمائیں گے۔

"مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر"
امید ہے کہ مولانا محمد سورتی صاحب جلسے کی صدارت فرمائیں گے۔
اس تقریر کے بعد ایک علمی مباحثہ ہوگا۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب یہ تجویز پیش کرینگے کہ "ہندوستانی یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم مجموعی حیثیت سے ملک و قوم کے لیے مضر ہے"۔ جناب خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڑھ اس کی مخالفت میں تقریر فرمائیں گے۔ بعض اور حضرات بھی جو تعلیم کے مسئلے سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں اس موضوع پر اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔

دربار بھوپال نے مسلمان عورتوں کی دادرسی کے لیے "سار زوجین" کے نام سے جاری کیا ہے جو شوہر کے مفقود الخبر ہو جانے نیز بصورت عدم ادائے نان و نفقہ یا بصورت امراض متعدیہ خلع کے حقوق پر ہے۔
مذہب حنفی میں شوہر مفقود الخبر کی بیوی کو عمر طبیعی تک انتظار کی ہدایت کی گئی ہے جس کو کسی نے ۹ سال تجویز کیا ہے اور کسی نے اس سے بھی زیادہ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں تا بہ زندگی اس کے لئے رہائی کی صورت ممکن نہیں۔ مگر چونکہ مذہب حنفی میں اس بات کی اجازت دیگئی ہے کہ باقتضائے ضرورت دیگر ائمہ کے مسلک کو اختیار کیا جاسکتا ہے اس لئے اسی اصول کے تحت میں بمنظوری فرمانروائے بھوپال و بملاحظہ احکام شرعیہ یہ ضابطہ جاری کیا گیا ہے جس میں مفقود الخبر کی بیوی کو قاضی صاحب ریاست کے سامنے درخواست پیش کرنے پر مطابق مذہب مالکیہ زیادہ سے زیادہ چار سال کے انتظار کے بعد نکاح کا اختیار دیدیا جائے گا۔
اسی طرح اس کو حق دیا گیا ہے کہ شوہر کے مجذوم یا مبروص وغیرہ ہونے کی صورت میں بھی وہ تفریق کی درخواست محکمۂ قضا میں کرسکتی ہے اور قاضی صاحب بعد ثبوت دعوے کے مطابق قواعد شرعیہ تفریق کرا سکتے ہیں۔ دربار بھوپال کا یہ اصلاحی کام ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ہر طرح تحسین کا مستحق ہے۔

غور سے دیکھنے کے بعد اس ضابطہ میں ہم کو ایک کمی نظر آئی جس سے بعض حالتوں میں عورت کی مصیبت
رفع نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم اس کو ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک طرف تو زاد المعاد
کے ... اصول اس ضابطہ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ

"ہر وہ عیب جو باعث نفرت زوجین ہو اور اس سے مقصد نکاح حاصل نہ ہوتا ہو
اختیار فسخ کا واجب کر دے گا"

دوسری طرف امراض متعدیہ کے متعلق یہ ضابطہ کہتا ہے کہ:۔

"اگر قبل نکاح ان امراض میں مبتلا ہونے کا عورت کو علم تھا تو اس کو تفریق
حاصل کرنے کا حق نہ ہوگا"

حالانکہ یہ ممکن ہے کہ عورت باوجود علم ان امراض کے دور رس نتائج کا اس وقت اندازہ نہ
کر سکی ہو یا اس نے ان کو عارضی سمجھا ہو اور بعد میں وہ دائمی ثابت ہو گئے ہوں یا اس نے ان کو
قابل برداشت خیال کیا ہو اور بعد میں بڑھ کر وہ ناقابل برداشت ہو گئے ہوں۔ کیا ان صورتوں میں
محض اس وجہ سے کہ اس "ناقص العقل" نے جان بوجھ کر نکاح کیا تھا عدالت شرعی اس کی رہائی
کی کوئی سبیل نہ کرے اور انسانیت کی حفاظت اور طبی اصول سب کو پس پشت ڈال کر اس کو اس بلا
میں گرفتار رہنے دے جو باعث نفرت ہے اور جس سے مقصد نکاح حاصل نہیں ہوتا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہوار

جامعہ

دہلی

زیرِ ادارت

مولینا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۸ | بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرول باغ سے شائع کیا۔

جمال الدین افغانی

(یہ قاضی عبدالغفار صاحب کے اس مقالے کا آخری حصہ ہے جو موصوف نے اردو اکادمی کے جلسے میں ۱۲ فروری کو پڑھا تھا۔)

ایران میں شیخ کی عملی زندگی کا اہم ترین زمانہ ۱۸۸۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ وہ بادشاہ کے مہمان ہو کر گئے تھے لیکن ان کے افکار و عزائم شاہ کے اثرات سے بہت دور تھے۔ وہی ایک جذبہ جو ان کو مصر اور روس لے گیا تھا یا نجد و خلیج فارس کی طرف لے گیا وہی جذبہ ان کو ایران میں کھینچ کر لایا تھا اور کچھ ہی عرصے بعد اس جذبے کے مظاہرے شروع ہو گئے۔

شیخ کا بہت بڑا کارنامہ جو مصر و ایران میں ان کی زندگی کا نشان ہے یہ تھا کہ جو جماعت یعنی جماعت علمار، شہنشاہیت کی پرستار اور مددگار تھی اسی سے انھوں نے شہنشاہیت اور مطلقیت کے فنا کرنے کا کام لیا۔ تاریخ اسلامی کے اس دور میں قدامت پسند علمار کا گروہ حقوق انسانیت کا حامی نہ تھا بلکہ مخالف تھا تاہم شیخ ہی کا وہ جادو تھا جس نے اس استبداد پسند جماعت کے قلوب کو بدل دیا اور حقوق ملت کے چوروں ہی کو "آدمیت" اور انسانیت کا محافظ و پاسبان بنا دیا۔ شیخ کی سیاسی زندگی کا یہ سب سے بڑا معجزہ تھا!

ناصر الدین شاہ کی زندگی کے آخری چند سال ایران کے قومی مصائب اور ایرانی شہنشاہیت کے بدترین چند سال تھے۔ شاہ کو یورپ کی دلچسپیوں اور عیاشیوں نے اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور اس کی دولت یورپ کے بازاروں اور قہوہ خانوں میں پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ ناصر الدین شاہ کا تیسرا اور آخری سفر یورپ وہ تھا جب وہ یورپ سے اپنی شہنشاہیت کے سخت ترین دشمن کو مہمان بنا کر ساتھ لایا تھا جس طرح فرعون کے محل میں موسیٰ لائے گئے تھے۔ ناصر الدین نہ صرف اپنا خزانہ خالی کر چکا تھا بلکہ اس کی رعایا کی جیبیں بھی خالی ہو چکی تھیں۔ اب مصر کی طرح یہاں بھی یورپ

کتنا [illegible] ہے مشرقی تاجداروں کے تاجوں کو گرو رکھنے کے لئے یورپ کا بنیا بیٹھا تیار بیٹھا ہے اس لئے کہ وہ خوب جانتا ہے کہ تاج کے ساتھ تخت بھی اس کے گھر آئے گا۔
ناصرالدین کی تنگدستی نے اس کو قرض لینے اور یورپین سرمایہ داروں کو اپنے ملک میں ہر قسم کی مراعات دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۹ء میں برطانوی سرمایہ داروں کو طہران میں شاہی بنک قائم کرنے کا ٹھیکہ دے دیا گیا اور اسی کے چند روز بعد تمباکو کے اجارے کا قصہ پیش آیا، جس نے بالآخر انقلاب کے دروازے کھول دئے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو شاہ سفر یورپ سے
واپس آئے، شیخ ان کے ہمراہ تھے۔ چند ہی روز بعد تمباکو ...
ایک برطانوی کمپنی کو دے دیا گیا۔ ۸ مارچ ۱۸۹۰ء کو ایک
کاشت کا اجارہ دا ... بنایا گیا۔ تقریباً دس کروڑ کے سرمایے ...
اس اجارے کے خلاف سب سے پہلے شاہزادہ مالکم خاں نے جو لندن ...
کیا اور اسی بنا پر شاہ نے ان کو سفارت کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ مالکم خاں کی زبردست شخصیت نے اس موقعے پر اپنے تمام ذاتی اثرات کو حکومت کے خلاف نکتہ چینی میں صرف کر دیا۔ وہ اپنے عہدے سے برطرف ہو کر لندن ہی میں مقیم رہے۔ انھوں نے اخبار "قانون" جاری کیا۔ اس اخبار نے ایرانی شہنشاہیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ شیخ کے مضامین بھی "قانون" میں شائع ہونے لگے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ راز ظاہر ہو گیا کہ شیخ مالکم خاں کی اس تحریک سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح شیخ کی زبردست آواز خط کے لفافے میں طہران سے لندن جاتی تھی اور لندن سے "قانون" کے پردے میں طہران واپس آکر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل جاتی تھی۔ شاہ ان کے اصلی رنگ سے واقف ہو چکا تھا اور وہ بھی کھل کر میدان میں آگئے تھے۔ جانفروشوں کی ایک جماعت ان کے حلقے میں داخل ہو چکی تھی۔ شیخ علی قزوینی جو بعد کو قاضی عدلیہ ہوئے، مرزا آقا خاں جنھوں نے بعد کو قسطنطنیہ سے اخبار اختر جاری کیا اور پھر تبریز میں خفیہ طور پر قتل کر دئے گئے، شیخ احمد کرمانی، مرزا رضا کرمانی جس نے ناصرالدین شاہ

مجتہدین میں بہائی پاشی بابی، مرزا محمد علی خاں طہرانی، اور ایسے ہی بہت سے نام شیخ کے معتقدین کی فہرست میں تھے۔ ان میں سے بہت سے وہ نام تھے جو آج بھی تاریخ انقلاب ایران کے صفحات پر آب زر سے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس جنگ آزادی میں ہمیشہ پیش آتا ہے حکومت کے چند مشام اراکین شیخ کے بڑھتے ہوئے اثرات کو گوارا نہ کر سکے اور وزیر اعظم امین السلطنة نے بہت جلد شاہ کو شیخ کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ اس عرصے میں بہت سی خفیہ انجمنیں ملک میں قائم ہو چکی تھیں اور شاہ اپنے کو سخت خطرے میں پاتا تھا۔ شیخ بھی اب امین السلطنة اور شاہ کے منصوبوں سے بے خبر نہ تھے، چنانچہ انھوں نے شاہ سے اجازت چاہی کہ طہران کے باہر شاہ عبد العظیم کی خانقاہ میں اقامت اختیار کریں اور شاہ نے بھی اس خیال سے کہ یہ فتنہ خاص دارالسلطنت سے دور ہو جائے ان کو وہاں جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن جب وہ شاہ عبد العظیم میں جا کر بیٹھے تو وہاں بھی مشاہیر، علماء اور عوام ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہونے لگے اور شیخ کی تبلیغ و تلقین کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۸ مہینے اس طرح گذرے اور اس ۸ مہینے میں داعی حریت کی آواز ایران کے ہر گوشے میں سرایت کر گئی اور وہ ملت ایرانی کے ایک مصلح اعظم سمجھے جانے لگے۔ اسی زمانے میں شیخ نے ایک مکتوب شاہ کو بھیجا اور دریافت کیا کہ وہ کیوں ان سے بدگمان ہیں۔ لیکن اس مکتوب کے جواب میں شاہ نے شاہ عبد العظیم میں شیخ کو ان کے بستر علالت پر گرفتار کرا لیا اور وہیں سے ۵۰ سواروں کی نگرانی میں عثمانی سلطنت کی سرحد پر بھیج دیا۔ شیخ کے خارج البلد کئے جانے کی خبر نے تمام ملک میں آگ لگا دی اور شاہ کو اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ بلاشبہ شیخ کا ایران سے جانا شاہ کی موت کا آنا تھا۔

شیخ نے ایران سے نکلتے ہی مجتہدین عراق و کربلا اور علمائے ایران کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا اور جو زمین وہ تیار کر چکے تھے اس پر اپنا کام شروع کر دیا۔ جو خطوط شیخ نے علماء و مجتہدین کو لکھے ان میں سے ایک کا کچھ حصہ ان اوراق میں اس لئے پیش کرتا ہوں کہ شیخ کے ان جذبات سے آپ روشناس ہو جائیں جو ایران کے متعلق ان کے قلب کو بے چین کر رہے

ے [illegible] حاجی مرزا حسن شیرازی کو لکھتے ہیں:-

"میں حق کہتا ہوں، یہ خط شریعت اسلامی کی خاطر لکھتا ہوں جہاں کہیں وہ شریعت جاری ہو اور قائم ہو۔ یہ ایک اپیل ہے جو میں تمام حق پسند روحوں سے کرتا ہوں جو شریعت پر ایمان رکھتی ہیں اور اس کے نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہیں یعنی میں اپیل کرتا ہوں علماء اسلام سے اور یہ اپیل میں تمام علماء سے کرتا ہوں حالانکہ میرے مخاطب ان میں سے ایک بھی نہیں......

خدا نے آپ کو اس اعلیٰ نیابت پر فائز کیا ہے تاکہ آپ حقیقت عظیمہ کے نمائندے ہوں اور خدا نے ملت بیضا سے آپ کو منتخب کیا ہے کہ آپ [illegible]
ے کر شریعت اسلامی کی حفاظت و نگرانی کریں۔ اہل ایر
اپنے بیت الدین کو دیکھ کر بیتاب ہو گئے ہیں جو اغیار و کفا [illegible]
اور جس پر ان اغیار و کفار کا قبضہ قائم ہو گیا ہے۔ مگر کسی لیڈر نے ہمہ

اہل ایران پریشان ہیں، منتشر ہیں اور معطل ہیں۔ وہ حیران ہوتے ہیں، ان کا ایمان متزلزل ہوتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان مجتہدین کی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی جن کو وہ اپنا رہنما اور اسلامی مفاد کے معاملات میں اپنا لیڈر سمجھتے ہیں اور سمجھنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ تیرا ایک لفظ ان کو متحد کر دے گا اور تیری ہی حجت فیصلہ کن ہوگی، تیرا ہی حکم با اثر ہوگا اور کسی کی مجال نہ ہوگی کہ تیرے حکم پر حرف زنی کر سکے اور اگر تو چاہے گا تو متفرق عناصر کو اپنے ایک لفظ سے متحد کرا دے گا اور اس طرح خدا کے دشمنوں کے دل میں خوف خدا پیدا کر دے گا اور کفار کے ظلم سے اہل ایران کو بچائے گا۔ تیرا ہی ایک لفظ اس مصیبت و ابتلا کا خاتمہ کر دے گا جس میں اہل ایران گھرے ہوئے ہیں اور ان کو زندگی کی سختیوں سے نجات دے کر راحت و آرام عطا کرے گا۔ پس دین کی حفاظت ہو جائے گی اور اس دین کے

کو بھی اس کو سنبھال لیں گے اور اسلام کا مرتبہ بلند ہو جائے گا ...... اے
عالم اعظم! بے شبہ بادشاہ کی قوت ارادی کمزور ہے، اس کی سیرت خراب ہے اور
اس کا دل گندہ ہے۔ وہ ملک پر حکومت کرنے اور اہل ملک کے معاملات کو سدھارنے
کے قابل نہیں ہے اور اس نے حکومت کی باگیں ایک بے دین ظالم اور غاصب کی سپرد
کر دی ہیں جو رسول پر علانیہ استہزا کرتا ہے اور شریعت حقہ کی پروا نہیں کرتا، جو امرائے
شریعت کو خیال میں نہیں لاتا اور علماء پر لعنت بھیجتا ہے، اہل زہد و تقوی کو ذلیل
کرتا ہے اور سادات کی تحقیر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں کفار کے ملک سے واپس آنے کے
بعد وہ بالکل قابو سے باہر ہو گیا ہے، علانیہ شراب پیتا ہے اور کفار کی صحبتوں میں وقت
گذارتا ہے۔ یہ ہے اس کا چلن۔ مگر اس کے علاوہ اس نے ایرانی زمین کا بڑا حصہ
مع اس کے منافع کے کفار کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ (اشارہ ہے معدنیات کی طرف)
یہی نہیں بلکہ سڑکیں، کاررواں سرائیں، باغات، کھیت سب ہی کچھ اس نے وقف کر ڈالے
.... تمباکو کی تمام زراعت مع زمین و عمارات کے، انگور کی فصل مع کارخانوں
اور سامان تجارت کے، صابون، موم بتیاں اور شکر کے تمام کارخانے غرض سب کچھ مع
متعلقات اس نے کفار کی نذر کر دیا ہے، انتہا یہ ہے کہ بنک۔ آپ کیوں کر سمجھیں گے
کہ بنک کیا ہے اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ دشمنان اسلام کو گویا ساری سلطنت دے ڈالی۔
.... اب جو کچھ رہ گیا ہے اس نے روس کے سامنے پیش کر دیا
تاکہ روس خاموش رہے یعنی مندب رشت، دریائے طبرستان، سڑک انزل و خراسان
مع تمام مکانات و سراؤں اور متعلقہ اراضیات مزروعہ کے، مگر روس نے ناک بھوں
چڑھائی اس لئے کہ وہ تو کل خراسان، آذربائیجان اور مازندران کی فکر میں ہے ......
..... یہ ہے پہلا نتیجہ اس پاگل کے طرز عمل کا .... اور تو اے حجۃ الاسلام!
کیا تو اس قوم کی مدد کے لئے نہ اٹھے گا اور ان کو متحد نہ کر دے گا اور شریعت مطہرہ کی

قیمت ابن ملک کو اس گناہگار کے ہاتھ سے نجات نہ دلوائے گا؟ بلاشبہ بہت جلد
یہ اسلامی مملکت اغیار کے زیر اقتدار ہو گی جو وہاں جس طرح چاہیں گے حکومت کریں گے
اگر تو نے یہ موقع جانے دیا' اور اے امام! اگر یہ واقعہ تیری زندگی میں پیش آگیا تو اے
تو اپنا نام تاریخ کے صفحات پر روشن نہ چھوڑ جائے گا!"
اس کے بعد شیخ نے ان مظالم کا ذکر کیا ہے جو ان کے رفیقوں پر اور خود ان پر کئے گئے۔
انھوں نے اپنے ایران سے نکالے جانے کی داستان ذرا تفصیل کے ساتھ لکھی ہے کہتے ہیں کہ:۔
"اب میری داستان اور جو کچھ اس ناشکر گذار ظالم نے میرے ساتھ کیا وہ بھی
سن لیجئے۔ اس مردود نے طہران کی برف سے ڈھکی ہوئی
میرے گھسیٹے جانے کا حکم دیا جبکہ میں خانقاہ عبدالعظیم میں
تھا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے ذلیل خادموں
ایک باربردار ٹٹو پر سوار کرایا اور زنجیروں سے باندھ دیا اور یہ سب ...
جب جاڑوں کا موسم تھا' برف کے طوفان آرہے تھے اور بہت سرد ہوائیں چل رہی تھیں
اس طرح مجھے سواروں کی نگرانی میں خانقین پہنچایا گیا جہاں پہلے ہی ترک والی سے
طے کرلیا گیا تھا کہ مجھے بصرہ بھیج دیا جائے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر
مجھے آزاد چھوڑا گیا تو میں سیدھا تیرے پاس آؤں گا' اے امام! اور تجھے اس کے
مظالم سناؤں گا اور مملکت ایران کے حالات بتاؤں گا اور تجھ سے اے حجۃ الاسلام
مدد چاہوں گا!"
شیخ کا یہ زبردست اپیل ایک بجلی کی طرح ایرانی مجتہدین کی جماعت میں سرایت کرگیا اور
ایران میں تمباکو کے اجارے کے خلاف وہ شدید اور خوفناک آگ بھڑکی جس نے ناصرالدین شاہ
کا جامۂ ہستی جلا ڈالا۔ اپنے جلاوطن ہونے سے پہلے شیخ نے ایران کی سرزمین پر شہنشاہیت کے
خلاف اس قدر بارود پھیلا دی تھی کہ ان کی جلاوطنی کے چند ہی روز بعد "انقلاب" کی آواز

[illegible] کو چند بار زمین کو ہنچنے لگی۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے بظاہر اسباب شیخ کی تعلیمات [illegible] مختار بادشاہوں کی جان کی دشمن معلوم ہوتی تھیں اور یہ شبہ کچھ بیجا نہیں کہ شیخ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے شدید ترین آلات حرب استعمال کرنے کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ ہم کو اس سیاسی مذہب سے کتنا ہی اختلاف کیا جائے لیکن ان کی بے مثال قربانیوں اور ان کے اعلیٰ منتہائے خیال کے متعلق دنیا کا کوئی وطن پرست ایک حرف نہیں کہہ سکتا۔ جیسا کہ مصر کے حالات میں ظاہر کیا جا چکا ہے ان کی سیاسیات کا وہی رنگ ایران میں بھی تھا۔ علماء کے طبقے میں آگ لگا کر انھوں نے گویا ناصر الدین شاہ کی شہنشاہیت کو آگ لگا دی اور گو وہ خود اس ملک سے نکال دیے گئے لیکن اپنے بعد وہاں بہت سے سرفروش چھوڑ کر جن میں سے ایک نے بالآخر ناصر الدین سے اس کے مظالم کا خوفناک بدلہ لے لیا۔ مرزا رضا کرمانی نے اپنی گرفتاری کے بعد اور پھانسی پانے سے پہلے جو بیان عدالت میں دیا اس کی ایک معتبر نقل ہم کو براؤن کے ذریعے سے ملی ہے۔ مرزا رضا خاں کے الفاظ اس کے جذبات اور ان جذبات سے شیخ کے تعلق کی ایک دلچسپ تصویر ہیں:۔

"سید جمال الدین، اولادِ رسول نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو شاہ عبدالعظیم کی محترم خانقاہ سے اس طرح ذلت کے ساتھ گھسیٹ کر نکالا گیا کہ ان کے جسم کے کپڑے تک پارہ پارہ ہو گئے۔ یہ تمام ذلت ان کو برداشت کرنا پڑی مگر انھوں نے کیا کیا تھا سوائے سچ کہنے کے؟ .... جو لوگ میرے عقائد و خیالات سے اس ملک میں متفق ہیں ان کی تعداد بہت ہے اور وہ ہر طبقے کے لوگ ہیں۔ علماء کی جماعت میں، امراء میں، اہل حرفہ اور سوداگروں میں بہت سے میرے ہم خیال ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب سید جمال الدین اس شہر میں آئے تھے تو طہران اور شاہ عبدالعظیم میں ہزارہا آدمی ان کے خطبات اور مواعظ سنتے تھے اور چونکہ وہ جو کچھ کہتے تھے وہ خدا کے لیے تھا اور محض مفاد عامہ کی خاطر ہر شخص کو ان کے خطبات سے فائدہ

چرچا تھا اور ان کے معاصرا کا ہر شخص گرویدہ تھا۔ اس طرح انھوں نے بلند خیالات کا بیج لوگوں کے دلوں کی زمین میں بویا اور انسان جاگے اور ہوش میں آگئے۔ اب تو ہر شخص وہی خیالات رکھتا ہے جو میرے ہیں۔ لیکن میں قسم کھاتا ہوں اس خدا کی جس نے سید جمال الدین اور تمام انسانوں کو پیدا کیا کہ سوائے میرے اور سید جمال الدین کے شاہ کے قتل کے ارادے کی خبر کسی کو نہ تھی۔ سید تو اب قسطنطنیہ میں ہیں جو تمھارا جی چاہے کر دو۔"

ناصر الدین شاہ یکم مئی ۱۸۹۶ء کو قتل کیا گیا یعنی شیخ کے ایران سے نکالے جانے کے ۶ سال بعد۔ لیکن ایران کا یہ سارا دور وہ تھا جب شیخ کا ڈالا ... قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے اپنی کوششوں کے نتائج دیکھ ... یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاہ کے قتل میں شیخ کا اشارہ موجود ...

ایران سے نکل کر شیخ بصرہ پہنچے اور حاجی علی اکبر شیرازی ... تے مشورہ کر کے لندن چلے گئے جہاں مالکم خاں نے ایرانی شہنشاہیت کے خلاف بہت زیادہ زمین تیار کر لی تھی۔ غالباً لندن جانے کا اصلی باعث وہاں مالکم خاں اور بلنٹ کی موجودگی تھی۔ ۱۸۹۱ء میں وہ لندن پہنچ گئے اور براؤن کہتا ہے کہ اس کی ملاقات پہلی مرتبہ شیخ سے ہالینڈ پارک میں مالکم خاں ہی کے مکان پر ہوئی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے چند جلسوں میں "ایران کے خوفناک عہد" کے عنوان سے زبردست تقریریں کیں اور اسی زمانے میں ضیاء الخافقین کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے بہت سے اقتباسات بعد کو المنار میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ تمباکو کے خلاف علماء کا فتوی ایران میں شائع ہو چکا تھا اور اس فتوے کا یہ اثر ہوا تھا کہ خود شاہ کے محل میں شاہی قلیان کے لئے تمباکو میسر نہ آتا تھا۔ شاہ کو پہلی دفعہ پبلک کی آواز سے مجبور ہو کر اس ٹھیکے کو منسوخ کرنا پڑا اور بلاشبہ شیخ کی یہ پہلی فتح تھی۔ علاوہ ازیں یہ فتح علماء کے لئے بھی تھی۔ ضیاء الخافقین کے صفحات پر شیخ اپنے شدید ترین جذبات کا اظہار

[illegible] اس میں شبہ نہیں کہ طہران میں شیخ کی آواز کی گرج شاہ کو لرزا رہی تھی یکم اپریل ۱۸۹۱ء کی اشاعت سے شیخ کی چند سطریں نمونتاً پیش کی جاتی ہیں۔

"جب یہ بادشاہ، یہ زہریلا سانپ، یہ گناہگار سلطنت ایران پر مسلط ہوا، اس نے آہستہ آہستہ علماء کے حقوق میں دست اندازی کرنی شروع کی، ان کے رتبے کو گھٹانے لگا اور ان کے اثرات کو کم کرنے لگا تاکہ خود مطلق العنان ہو کر حکومت کرے اور اپنے ظلم و تعدی کے دائرے کو وسیع کر سکے .... مگر حق باطل کے مقابلے میں بلند ہوا اور اس نے شاہ کے ظلم کو کچل ڈالا جس طرح کہ ہر ظالم کا ظلم کچلا جاتا ہے۔
اے اسلام کے رہنماؤ، میں سچ کہتا ہوں کہ تم نے اپنے عزم و استقلال سے اسلام کے وقار کو بڑھا دیا ہے، تم غیر ملکیوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ اصل طاقت تمہاری ہے جس کو وہ نہ دبا سکتے ہیں نہ نظر انداز کر سکتے ہیں مگر خطرہ سخت ہے اور حالت نازک ہے اس لئے کہ شیطانوں نے اتحاد کر لیا ہے اور اب وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے اس پر تلے ہوئے ہیں کہ اس گنہگار (شاہ) کو بہکا کر علماء کو خارج البلد کر دیا جائے۔"

یہ مضامین وہ عموماً "سید" یا "حسینی سید" کے نام سے لکھا کرتے تھے اور جیسا کہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ الفاظ کی سختی، درشتی اور تلخی میں ان کا قلم کچھ کفایت شعار نہ تھا! ان کے عزم اور حوصلے کی اب یہ حالت تھی کہ ایک موقعے پر انھوں نے صاف کہدیا تھا کہ "ان بادشاہوں کا تخت سے اتارنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ پاؤں سے جوتے اتارنا۔"

تقریباً ڈیڑھ سال تک اس طرح لندن میں مشغول رہ کر وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں داخل ہوئے یعنی ۱۸۹۲ء میں سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت پر لندن سے قسطنطنیہ چلے گئے۔ وہاں سلطان نے شیخ کے لئے ۷۵ پونڈ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا اور ان کی مدارات میں بہت زیادہ توجہ کا اظہار کیا لیکن عبدالحمید کا شیخ کو قسطنطنیہ بلانا ایک خاص پالیسی کے ماتحت تھا۔ عبدالحمید خاں اپنے تخت و تاج کی حفاظت کے لئے اتحاد اسلامی کا ایک قلعہ تعمیر کرنا

چاہتا تھا اور خلافت اسلامی کا اشتہار دے کر وہ دنیا کی عقیدتمندی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ یورپین دول کی جانب سے جو خطرات اس کے گرد و پیش بڑھتے جاتے ہیں انکا علاج صرف یہی ہے کہ اسلامی ممالک کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوں۔ چنانچہ ان ہی منصوبوں کے تحت میں اس نے شیخ کے اثرات سے کام لے کر مکہ میں ایک انجمن کی بنیاد رکھوا دی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ شیخ کو اپنے زیر اثر رکھ کر ان کے اثرات کو جو عالم اسلامی میں مسلمہ تھے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں جب شیخ کے ساتھ اس کی توقعات بہت زیادہ وابستہ تھیں عبدالحمید خاں ہر موقع پر ان کے بہت بڑے حامی و مددگار کے بھیس میں دنیا کے سامنے آتا تھا۔ جب ناصر الدین شاہ نے چاہا کہ شیخ کی آواز ا
ذریعے سے بار بار دربار خلافت میں اس امر کی تحریک کی کہ شیخ
چنانچہ عبدالحمید خاں نے ایک دن شیخ سے کہا کہ شاہ ایران
ایران آپ سے بہت خوفزدہ ہیں" اور شیخ نے بھی سلطان کی خاطر
کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے میں شاہ ایران کو معاف کرتا ہوں" لیکن تیر شیخ کے ہاتھ سے پہلے ہی نکل چکا تھا اور وہ شرارہ ایران میں گر چکا تھا جس نے ناصر الدین کی خرمن ہستی کو جلا دیا۔ تاہم اس واقعے سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ شیخ اور خلیفہ کے تعلقات اس وقت کیسے تھے۔ اس کے بعد بھی جب ناصر الدین شاہ قتل کر دیا گیا تو حکومت ایران نے شیخ اور بعض دیگر اشخاص کو ترکی سے گرفتار کر کے لیجانا چاہا لیکن سلطان عبدالحمید خاں نے اوروں کو تو گرفتار کرا دیا لیکن شیخ کی گرفتاری کی اجازت نہ دی۔ شیخ نے اس موقع پر خلیفہ کی حکومت سے پناہ نہیں مانگی نہ انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی بلکہ غالباً وہ اس لئے مطمئن بیٹھے رہے کہ وہ سلطان عبدالحمید خاں کے منصوبوں سے بیگانہ نہ تھے اور جانتے تھے کہ سلطان کو ابھی ان کی خدمات کی ضرورت ہے۔ مکہ کی انجمن ام القریٰ کو سلطان اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے تھے اور حجاز و عراق میں شیخ کے اثرات سے کام لیا جا رہا تھا۔ لیکن بہت جلد سلطان عبدالحمید خاں کو شیخ کی رفاقت

سے مایوس ہو جاتا تھا۔ درحقیقت شیخ کا سیاسی مذہب عبدالحمید کی پالیسی کا بالکل مخالف تھا۔ عبدالحمید خلافت کے نام سے عالم اسلامی کی ہمدردیاں اپنے تخت و تاج کے ساتھ وابستہ کرکے ترکی کو یورپین دول کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور شیخ اول ہی سے ہر ایک تاج و تخت کے دشمن تھے۔ ان کا اتحاد اسلام بالکل دوسرے معنی رکھتا تھا۔ وہ ہر جگہ شہنشاہیت اور مطلقیت کے خلاف جذبات ملی کو بیدار کرنا چاہتے تھے اور ممالک اسلامی کی بیداری کو اپنے عالمگیر اتحاد اسلام کا سنگ بنیاد بنانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک تمام اسلامی ممالک شخصی حکومتوں کے جبر و ظلم سے آزاد نہ ہوں گے آپس میں ایک دوسرے سے کوئی عملی ہمدردی نہیں کر سکتے، اس لئے ان کو کوئی دلچسپی عبدالحمید خاں کی تحریک کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ یورپ نے جس چیز کا نام پین اسلامزم رکھا وہ عبدالحمید خاں کا تیار کیا ہوا ایک بھوت تھا جس نے اس وقت کی سیاسیات کے لحاظ سے بعض یورپین دول کے دفاتر خارجہ کی نیندیں حرام کر دیں مگر یورپ میں جمال الدین کے پین اسلامزم پر کوئی عمیق نظر نہیں ڈالی گئی بلکہ ان کو صرف اسلامی ممالک کا ایک فتنہ پرداز، یورپین اثرات کا دشمن اور بادشاہوں کی بادشاہت کا مخالف سمجھا گیا۔ اس کے آگے بہت کم لوگوں کی نظر گئی اور مجھے شبہ ہے کہ خود براؤن اور بلنٹ بھی شیخ کی پرواز خیال کے ساتھ دور تک نہیں چل سکے۔ بہرحال یورپ کی اصطلاح میں خلافت اور پین اسلامزم کا جو مفہوم سمجھا گیا تھا شیخ اس سے بہت بلند، بہت دور اور بہت الگ جا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عبدالحمید خاں ان سے بہت جلد مایوس اور بدگمان ہو گئے اور شیخ کی زندگی کا آخری زمانہ قسطنطنیہ میں ایک گم نام قیدی کی طرح گذرا۔

"بیوک مجاہد شیخ جمال الدین افغانی" کے عنوان سے اخبار وطن (قسطنطنیہ) میں چند سال ہوئے شیخ کی سیرت پر ایک مضمون شائع ہوا تھا گو شیخ کے سوانح نگاروں نے ان کی نظربندی کی تفصیلات بیان نہیں کیں لیکن اس مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ کو عبدالحمید خاں نے اس بنا پر قید کر دیا تھا کہ خلیفہ کے صیغہ جاسوسی نے اس کو یہ اطلاع دی تھی کہ شیخ سلطان

کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ اور یہ روایت بہت زیادہ قرین قیاس ہے اس لئے کہ عبدالحمید خاں کی سیاست کا اس زمانے میں یہی رنگ تھا کہ وہ اپنے سایے سے بھی ڈرتے تھے اور شیخ کے متعلق شبہات کا نہ پیدا ہونا پیدا ہونے سے زیادہ تعجب انگیز ہوتا۔ بہرحال اس زندگی کی مختصر روئداد ختم ہوتی ہے۔ میں نے شیخ کے علم و فضل، قرآنی مشاغل، فلسفیانہ خیالات، عقائد مذہبی اور ان کی سیرت کے بہت سے ضروری پہلوؤں کے لئے ان مختصر صفحات میں گنجائش نہ پائی اور نہ میں اپنے سننے والوں کو بہت زیادہ تھکانا چاہتا ہوں۔ وہ خبریں سب اپنے موقع پر بیان ہوں گی، بار بار بیان ہوں گی، ہزار دفعہ بیان ہوں گی، شاید کہ شیخ کی زندگی کا کو[illegible]

پہنچ جائے! میرے پاس ان کے مضامین اور ان کے خطوط کا [illegible]

ایک دلچسپ علمی دعوت کا سامان مہیا کرے گا، لیکن اس کے لئے

ایران میں جو جسمانی سختیاں شیخ نے برداشت کی تھیں ان کا بہت [illegible] پر ہو چکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ایران سے آنے کے بعد پھر وہ اپنی کھوئی ہوئی صحت کبھی حاصل نہ کر سکے۔ قسطنطنیہ میں وہ اکثر بیمار رہتے تھے اور بالآخر دوران نظربندی میں ان کو سرطان کا لاعلاج عارضہ لاحق ہوا۔ اس مرض کے سلسلے میں تین مرتبہ ان کے چہرے اور گردن پر عمل جراحی کیا گیا، لیکن اپنے رب کے پیام پر لبیک کہنے کا وقت آ چکا تھا۔

۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو اس مجاہد کی زندگی کا کام ختم ہو گیا اور قسطنطنیہ کی سرزمین پر اس نے اپنی آخری منزل کو پا لیا۔ اب یہ بحث دور از کار ہے کہ جمال الدین کو عبدالحمید خاں نے زہر دلوا دیا تھا یا نہیں۔ جتنا کام قسام ازل نے ان کی سپرد کیا تھا وہ اس کو انجام دے گئے، دنیا والے اب جس قدر بھی چاہے اس پر تنقید و تبصرے کے دریا بہا دیں، لیکن بیداری مشرق کے اس بہت بڑے پیامی کا نام اس وقت تک دنیا میں روشن رہے گا جب تک کہ دنیا آباد ہے۔ اہل نظر کے لئے یہ ایک سبق آموز داستان ہے۔

نشان طاش کے قریب ایک قبرستان میں شیخ کی قبر عرصے تک بے نشان رہی، انکے

جنازے کے ساتھ بھی ۲۰ آدمیوں سے زیادہ نہ تھے لیکن دنیا ان کو بھولی نہ تھی۔ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا ہم خود اپنے ملک کے مشاہیر کو مرنے کے بعد ایک ہفتے کے اندر بھول جاتے ہیں لیکن تعجب تو یہ ہے کہ شیخ کی زندگی کا زیادہ سرمایہ مغرب میں محفوظ رہا اور عبدالحمید کے بعد ترکوں نے انکی آخری آرام گاہ کو پھر ڈھونڈھ نکالا۔ ایک امریکن کروڑپتی نے ان کی قبر کے لئے سنگ مرمر کا ایک خوبصورت پتھر تیار کراکر بھیجا تو ایک نوجوان ترک نے ایک غیر ملکی کی اس فیاضی سے متاثر ہوکر قسطنطنیہ کے ایک اخبار میں لکھا کہ :۔

"میں نے ایک اخبار میں پڑھا ہے کہ ایک امریکن مسٹر کرآین نے اس بڑے مسلمان عالم کے لئے ایک نہایت شاندار سنگ مرمر کا مزار بنایا ہے۔ یہ امریکن کروڑپتی ہے مگر اس کی تازہ ترین قدرشناسی نے نہ معلوم کیوں میرے دل میں مسرت اور افسوس سے ملی ہوئی ایک حس پیدا کی۔ جمال الدین افغانی کے لئے ایک محتشم و شاندار مزار کا بنایا جانا حقیقتاً ایک ایسا اچھا کام ہے جس سے روح تسلی پاتی ہے۔ جمال الدین اپنی تمام زندگی میں دنیاوی جاہ و جلال سے بے پرواہ رہا اور اپنی متواضع زندگی کے شایان اسی کو سمجھا کہ اپنی قبر کے لئے دو گز زمین سے زیادہ نہ لے۔ اس میں فراعنۂ مصر کا غرور نہ تھا کہ اپنی لاش کی حفاظت کے لئے اہرام بنوائے۔ اس لحاظ سے ایک محتشم مزار کا بنایا جانا اس کے اعزاز میں کوئی اضافہ نہیں کرتا مگر انصاف شرط ہے۔ کیا اس کی یادگار کی مرمت کے لئے اس قدر اہتمام بھی اس کے مداحین پر لازم نہ تھا؟...

.....میں اس سے تو خوش ہوں کہ جمال الدین کا مزار اس کی ایک مادی یادگار ہوگا مگر میرے قلب کے ایک گہرے اور معزور گوشے میں ایک خفیف ٹھیس لگتی ہے اور میرا دل سوال کرتا ہے کہ جمال الدین کے مزار کو ایک ترک ایک افغان یا ایک ایرانی نے (جسے جمال الدین کے ایرانی ہونے پر بہت اصرار رہتا ہے) کیوں تعمیر نہ کرایا۔"

یہ تو ایک ترک کا جذبہ تھا، میں اپنے ہم وطنوں سے کیا کہوں۔ ان میں سے کتنے ہیں جو قسطنطنیہ جاتے ہیں اور وہاں کبھی جمال الدین کی قبر پر دو پھول چڑھانے کا ارادہ کرتے ہوں۔

اپنے آخری لمحوں میں جب زبان بند تھی اور چند آنسو بہانے والے دوست بستر مرگ کے قریب بیٹھے تھے، اس نے ہاتھ کے اشارے سے حلقہ بنا کر کہا تھا کہ "میں مر جاؤں گا اور میری آنکھیں اسی طرح کھلی رہیں گی جس طرح تم دیکھتے ہو۔" جو الفاظ شیخ نے اپنے مرنے سے چند روز پہلے اپنے محبس سے ایک دوست کو لکھے ان ہی کو میں ان سطور کا خاتمہ بناتا ہوں کہ وہ ان کے آخری جذبات کا بہت دردناک مرقع ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ :۔

"من بسر موقعے ایں نامہ را بدوست عزیز خود می نویسم کہ
از ملاقات دوستان خود محروم، نہ انتظار نجات دارم، نہ امید حیات
نالم بہ کشتہ شدن متوحش، خوشم برایں حبس و خوشم برایں کشتہ
آزادیٔ نوع، کشتہ می شوم برائے زندگیٔ قوم"

مجاہد حق کی یہ آواز حق تھی اور یہ جذبۂ عالی تھا جو آندھی بن کر اٹھا، بجلی بن کر چمکا اور اس طرح گرجا کہ مشرق کی سوتی ہوئی دنیا کروٹیں لینے لگی۔ آج وہ نہیں ہے مگر اس کا پیام باقی ہے۔

مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط

(قاضی عبد الغفار صاحب کے نام)

Chhindwara,
(C. P.)

۱۵ ر دسمبر ۱۹۱۵ء

برادر عزیز۔ السلام علیکم۔

زندہ رہو۔ خوش رہو۔ تمھارا کام روز دل کو خوش کرتا ہے۔

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
واتا رکھے آباد اں ساقی تری محفل کو

پہلے تمھارے سوالات کا جواب دیتا ہوں پھر راستے کی مختصر سی سرگذشت سناتا ہوں بشرائط یہاں بھی بجنسہ وہی ہیں جو لینسڈون جاتے وقت غازی آباد اسٹیشن پر صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔ یہاں کی آب و ہوا اچھی ہے مگر ہم جب یہاں پہنچے تو خلاف وقت کچھ بارش ہو رہی تھی۔ غالباً اسی کے باعث میرے اعضا میں پھر درد ہو گیا اور گو اب کم ہے مگر گھٹنوں میں اور کسی قدر کمر میں باقی ہے۔ حکیم صاحب نے حبوب گل آکھ کا استعمال بتایا تھا۔ اسے پھر جاری کیا ہے مگر بظاہر اس سے فائدہ نہیں ہوا۔ چند دنوں بعد پھر رجوع کروں گا۔ پیشاب دن کو تو کم آتا ہے' فجر اور ظہر کے درمیان ایک یا دو بار' ظہر سے مغرب تک اور بعض دن عشا تک ضرورت نہیں ہوتی۔ شب کو البتہ کوئی تین بار آتا ہے مگر دو بار تو معمول بھی تھا۔ بظاہر شکر نہیں آتی۔ کلکتے کی زندگی کے متعلق جو تم لکھتے ہو اس پر مجھے ذرا تعجب نہیں۔ عجب ملک ہے مسلمانوں میں سخت نا اتفاقی ہے۔ حسد اور کینے کی شدت ہے۔ محسنوں کا احسان ماننا کجا الٹا پریشان

کرتے ہیں۔ مدرسے اور کالج والے پھر بھی ہونہار ہیں۔ ان سے ضرور ملتے رہنا اور چونکہ ہمارا انحصار زیادہ تر آئندہ نسلوں پر ہے اس لئے ان کو قومی سانچے میں ڈھالتے رہنا۔ محسن فنڈ کے متعلق واقعات سے اپنے کو کما حقہٗ آگاہ کرلو اور مسلمانوں کے مجوزہ کالج کی گذشتہ تاریخ سے۔ افسوس ہے کہ شمس الہدیٰ نے ابتک کچھ نہیں کیا اور اس کم بخت دہلی والے مولوی کو رکھ کر مدرسہ بھی تباہ کیا۔ ہوگلی کالج میں فدا علی خاں رام پوری کالج کے ایم۔ اے میرے کلاس فیلو اور عزیز دوست عربی کے پروفیسر ہیں ان سے مشورہ جاکر گاہے گاہے مل لیا کرو یا اتوار کو انھیں بلالیا کرو۔ سلطان معقول شخص ہے اس سے ضرور دوستی ہوگئی ہوگی۔ مگر ہماری بے کلکتے کو اس پر کیا فخر۔ رسول اصول کا پکا ہے اور مجیب الرحمٰن بھی مگر یہ لوگ بھی کلکتے کے اثرات سے محفوظ نہیں ہیں۔ بہرحال ان سے مدد ملے گی۔ میرا ایک دوست
غالباً ملاقات ہوئی ہوگی۔ معین الدین مرزا گھاگرے والے کا
ملتے رہنا۔ خدا کرے کم بخت .... کا اس پر زیادہ اثر

پنشنر ڈپٹی کلکٹر نہایت سچے مسلمان ہیں ان سے ملتے رہنا۔ ان کے بھتیجے قطب الدین پر لوگ شبہ کرتے ہیں مگر مولانا خود بالکل غیر مشتبہ ہیں۔ کولوٹولے میں حاجی اسمٰعیل صاحب دہلوی معروف بہ پنکھے والے ان بزرگوں میں ہیں کہ اگر ہندوستان میں ایسے دس بیس ہوتے تو ہماری حالت اس قدر زبوں نہ ہوتی۔ اس قدر فیاض، سیرچشم، محب قوم بلکہ ہمدردِ بنی نوع انسان بہت کم لوگ ہیں۔ اللّٰھم زد فزد۔

Hasnoo Bhayya اور Uncle Sharaf سے ملاقات ہوئی یا نہیں۔
دونوں ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ حسنو تو سنا ہے جنوری میں مستعفی ہوکر پٹنے میں پریکٹس کریں گے۔ خیر جج بھی ہیں دھاک خوب بٹھادی ورنہ ہر سال ساٹھ ستر ہزار کا نقصان اٹھانا پڑا۔ جسٹس شرف الدین بیچارے زیادہ قابل نہیں مگر وضع کے پابند اور بہت خلیق ہیں۔ یہ پٹنہ ہائی کورٹ کے جج ہوکر جائیں گے۔ حسنو نے اس شرط پر ججی قبول کی تھی کہ پٹنے میں ہائی کورٹ ہو تو ضرور بھیجا جاؤں۔

کے ساتھ وعدے کا ایفا ہوا نہ علی امام بھائی کے ساتھ۔ مؤخرالذکر کو میرے علم میں تھو نے پنشن کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اب ہارڈنگ نے بھی باوجود اس قدر دوستی کے اور باوجود ان خدمات کے جو علی امام نے دکھائیں صرف جی پیش کی۔ لطف یہ ہے کہ خود ان کے ...... نے ان کے خلاف کارروائی کی۔ یہ وہ شخص ہے جب انہوں نے اپنے سے پہلے Knighthood دلوادی تھی۔ ہل جزاء الاحسان الا الاحسان۔

راستے کی کیفیت سنو۔ پہلے اطلاع شروع نومبر میں ملی تھی کہ تیار رہو۔ ایک دن پہلے اطلاع دی جائے گی۔ اسی وقت روانہ ہونا پڑے گا۔ ہم نے شروع اکتوبر ہی میں لکھ دیا تھا کہ ہمارا الاؤنس بے باق کر دینا ہوگا اور زادراہ کا انتظام کرنا ہوگا ورنہ ہم وقت مقررہ پر نہ چل سکیں گے۔ اب اطلاع پاتے ہی پھر اس کے متعلق یاددہانی کر دی مگر باوجود سرکاری تار کے اور ہمارے تار کے ہمارا الاؤنس ۲۰ دن کا ۲۰ نومبر تک نہ مل سکا۔ دو دن بعد لینسڈون پہنچا اور وہاں سے یہاں آیا۔ بھلا ہو ایک Old boy کا کہ ان سے قرض لے کر وہاں کے حسابات چکائے اور وہاں کے نوکروں کی تنخواہ ادا کی۔

سفرخرچ کی کیفیت سنئے کہ حکم ایسے خزانے کے نام دیا گیا جو عالم وجود میں بھی نہ آیا تھا یعنی Lansdown Treasury۔ خزانہ پاؤری میں ہے جو ضلع گڑھوال کا صدر مقام ہے اور پیدل کم از کم دو دن کی راہ ہے۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو جس کے متعلق ہماری ڈاک کا دیکھنا تھا فوجی افسروں کی معرفت بنیے سے روپیہ قرض لینا پڑا ورنہ ہم لوگ چل بھی نہ سکتے۔

اس خوش انتظامی کے صدقے جائیے۔ مقام کا نام پہلے سے نہیں بتایا گیا تھا۔ ہم نے جب لکھا کہ موسم کے متعلق تک ہم کو علم نہیں ہے۔ جاڑوں وغیرہ کے کپڑے سب دہلی یا رام پور ہیں، دوسرے اس کا فیصلہ کرنا ہے کہ مع اہل وعیال کے جائیں یا بلا ان کے۔ اس کا انحصار مقام کی نوعیت اور دوری پر ہے۔ تو جواب ملا کہ موسم ایام سرما میں دہلی جیسا ہے۔ اس سے خیال ہوا کہ مقام کو سات پردوں میں رکھا جائے گا۔ لیکن یکایک ۱۳ نومبر کو اطلاع ملی کہ ۲۰ نومبر

کو چند ساعتہ جاتا ہوگا۔ یہ معلوم وہ رازداری یا در تعمیل ۲۴ گھنٹے کا نوٹس) کہاں سے چلا ہے بس اطلاع کے ملنے پر ہم نے چند کارڈ دوستوں کو ڈال دیئے کہ فلاں راہ سے فلاں وقت گذریں گے۔ مضمون بلا استثنا رسب کو بھیج دیا اس لئے کہ اس میں بظاہر کوئی مضائقہ نہ تھا۔ الہ آباد میں گاڑی سات گھنٹے بعد ملتی تھی اس لئے بھائی نظورے (مساوات) کو لکھ دیا کہ برادرانم کھانا تمہارے ساتھ کھائیں گے۔ والدہ، بیوی اور بچوں کے لئے ایک گاڑی کا انتظام کر دینا کہ الہ آباد جو انھوں نے نہیں دیکھا ہے دیکھ لیں۔ چنتامنی کو لکھ دیا کہ تم سے' نہرو سے' اور پنڈت جی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ چلنے سے ایک دن پہلے اطلاع ملی کہ

ہدایت ملی ہے کہ ہماری پارٹی کا کوئی شخص کسی اسٹیشن کے باہر نہ

نہیں آیا تھا یعنی جو حکم آیا تھا اس میں یہ شرط نہ تھی۔ اس لئے

ہم نے صاف کہہ دیا کہ گورنمنٹ نے ہم کو نظر بند کیا ہے ہمارے متعلق ہو نہ

مگر ہمارے متعلقین بفضلہ تعالیٰ آزاد ہیں' وہ کسی شرط کو نہیں مان سکتے۔ تاہم ہم نے ارادہ کر لیا کہ الہ آباد اسٹیشن پر رہیں گے باہر نہ جائیں گے۔

ہم ۲۰ کو ۱۰ بجے صبح کے روانہ ہو کر تانگوں میں چلے اور ۲ بجے سہ پہر کو کوٹ دوارہ پہنچے۔ یہاں صبح ہی سے میری ہمشیرہ (والدہ فاروق) مع عثمان کے اور شوکت کے بچوں کے ملیں۔ دہلی سے صادق اور سید علی بھی آئے تھے۔ ہمارے ماموں صاحب کے خلیفہ نوشہ میاں صاحب اور ہمارے ماموں زاد بھائی بھی آگئے تھے۔

۴ بجے شام کو ریل چلی۔ ۷ بجے نجیب آباد پہنچے۔ حالانکہ ہم نے کسی کو اطلاع نہ دی تھی مگر لوگوں کو معلوم ہو گیا تو رات کے ۲ بجے تک لوگ جوق جوق آتے رہے اور ملتے رہے نجیب آباد میں چند اور اعزا اور احباب دہلی اور علی گڑھ سے آگئے۔ ۲ بجے صبح کے ان کی معیت میں مراد آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ ۴ کے قریب پہنچے۔ وہاں آنریبل سید رضا علی' یعقوب' مسعود' عبدالسلام وغیرہ تمام احباب ملنے آئے۔ رام پور سے میری اہلیہ مع حمیدہ اور گلنار اور زاہد کے آگئے تھے' وہ

[illegible]۔ ان کے علاوہ رام پور سے بہت سے عزیز اور دوست آگئے تھے۔ من و سلویٰ [illegible] ہی پر اترنا شروع ہوگیا تھا۔ مرادآباد پر اور نازل ہوا۔ رام پور صبح کے ۵ بجے پہنچے۔ وہاں پر بھی ہجوم تھا۔ حالانکہ گاڑی تین چار منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ہمارے لئے ایک Composite Carriage تھی اس میں تو ہم نے عورتوں کو سوار کرادیا تھا۔ خود معہ احباب کے ایک انٹر کی خالی کیرج کو لبالب بھر دیا تھا۔ بریلی پر علی گڈھ کے احباب رخصت ہوئے۔ انصاری رام پور سے مرادآباد آگئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن دہلی سے نجیب آباد آگئے تھے اور مرادآباد میں انصاری کے ہمراہ دہلی چلے گئے۔ بریلی میں بھائی وددو وغیرہ چائے لے کر آئے تھے شاہجہانپور میں بھی احباب ملے اور سندیلہ میں بھی۔ لکھنؤ پہنچے تو گاڑی خلاف معمول پل کے اس طرف پلیٹ فارم پر رکی مگر اس کے رک جانے کے بعد بہت سے احباب مع تقدس مآب مولانا عبدالباری صاحب قبلہ و مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی مدظلہ تشریف لائے۔ قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ معلوم ہوا کہ خواہش نہ تھی کہ لوگ کثرت سے ملیں مگر چونکہ یہ منشا نہ ہمارا تھا نہ ہمارے دوستوں کا تھا کہ ایک جم غفیر کو نمائش کے لئے جمع کیا جائے، اس لئے وہی اصحاب آئے تھے جن کو ہم نے اطلاع دی تھی یا دلوائی تھی۔ کانپور سے، علی گڈھ سے اور بارہ بنکی سے احباب آئے تھے۔ راستے کے لئے کھانا، میوہ اور مٹھائیاں اس کثرت سے آئیں کہ دونوں درجے لبالب بھر گئے اور بیٹھنے کو جگہ نہ رہی۔ بلا مبالغہ تین چار سو آدمیوں کے لئے کھانے کا سامان کافی تھا۔ راستے بھر لوگوں کو کھلاتے آئے پھر بھی ختم نہ ہوا اور یہاں تین چار دن کھایا اور بعض چیزیں تو اب تک ساتھ دے رہی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ کھانوں کی نوعیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض رسماً تیار نہیں کرائے گئے تھے، بلکہ سوچ سوچ کر یہ مزے کی چیزیں خود تیار کی تھیں۔ مولانا عبدالباری صاحب قبلہ معہ متعدد احباب لکھنؤ و بارہ بنکی و علی گڈھ کے راستے بریلی تک ہمراہ تشریف لائے۔ مولانا الہ آباد کا قصد رکھتے تھے مگر وہاں جاتے تو ایک دوست چند دن رکھے بغیر نہ چھوڑتے اس لئے راستے ہی سے واپس ہوگئے کیونکہ زیادہ قیام کے لئے وقت نہیں بچا سکتے تھے۔ مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی

قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے سے بزرگ ہیں۔ ان پر عجب کیفیت طاری تھی۔ان بزرگوں کی تحسین ہی کو ہم کو شرمسار کرتی تھی۔ برادرم ہزاروں سپاہی اور افسر اپنی اپنی قوم اور ملک کے لئے بے دریغ جانیں دے رہے ہیں۔ جو اپنے ملک و قوم اور مذہب کے لئے سربکف نہیں ہیں وہ بھی ایک حقیر سے مشاہرے کے لئے جانیں دے رہے ہیں۔ ہم نے جن کا اس قدر غلغلہ چار دانگ عالم میں ہے ابھی کیا کیا ہے کہ مولانا عبد القہاری صاحب اور مولانا محمد ابراہیم صاحب جیسے بزرگ ہمارا استقبال فرمائیں اور تحسین و آفریں کریں یا ہمارے بے شمار دوست اتنی محبت کا اظہار کریں۔ صرف یہی تو ہوا ہے کہ اپنے وطن اور کاروبار کو خیرباد کہنا پڑا لیکن یہ سنت رسولؐ ہے۔ فجر کے فرضوں

ہر مسلمان اپنے اوپر لازم سمجھے اور ہجرت کو گوارا نہ کرے، یہ کس قسم کا،

میں جبکہ ہمارا پروردگار ہم کو تشفی و تسلی دے کہ وَاللّٰہُ عَلیٰ نَصرِھِم لَقَدِیر

حق الا ان یقولوا ربنا اللہ (پروردگارا تو نے سچ فرمایا ہے۔ تو ہی ہمارا

خیرالناصرین ہے)۔ برادرم اس سفر سے پیشتر بھی اور اس سفر میں اور ہر جگہ جو خاطر و مدارات ان نظر بندوں کی ہوئی ہے اس کے بعد کس کو شک ہو سکتا ہے کہ علاوہ اس اجر عظیم کے جس کی بشارت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم (روحی فداک یا رسول اللہ) دینے ہم کو آئے تھے جو ہر عاقبت اندیش کو ملے گا خود اس دنیا میں عزت و آرام بھی پابندیٔ قرآن و حدیث میں ہے۔ معظم کے والد (میرے خسر) نے کیا خوب کہا ہے ؎

عظمت بڑے بڑے ہیں مزے راہِ عشق میں
چل تو سہی۔ بڑھا تو قدم۔ دیکھ تو سہی

ناظر، وسیم، ولایت کو ہم الہ آباد تک لے گئے کہ، گھنٹے وہاں بھی خوب گذریں گے اتفاقاً راستے میں آنریبل ڈاکٹر سپرو سے بھی ملاقات ہو گئی کیونکہ وہ ہم سفر تھے اس طرح الہ آباد کی (قدم بندی) کا بھی صدمہ نہ ہوا۔ الہ آباد سے چند اسٹیشن آگے مولانا رؤف صاحب (والد ظہور) سے اور چند اور اصحاب بھی ملے۔ آگے چل کر خود ظہور اور لکھنؤ کے سید ظہور احمد صاحب بھی ملے۔ آگے چل کر

[illegible] آباد کے اسٹیشن پر جاتے ہوئے پرندوں سے کے پر جلتے ہیں۔ پلیٹ فارم ٹکٹ بند اور اسٹیشن
[illegible] ا باہم کو ۔ گھنٹے سے قبل ہی وہاں سے کہیں اور لے جائیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ پولیس
کے [illegible]سو آدمی پہرہ دے رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ الہ آباد کے لوگوں نے اسٹیشن پر ہمیں
[illegible] دینے کی اجازت چاہی تھی مگر اجازت نہ ملی۔ مجبور ہو کر ظہور کچھ میوہ اور
کھانا اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کو دے آئے کہ اسے دیکھ بھال لو۔ اگر کوئی چیز خلاف قانون دستیاب
نہ ہو تو ہم نظربندوں کو دے دینا۔ الہ آباد کے اسٹیشن کو سوائے پولیس کے وردی والے و
بلا وردی کے خالی پایا۔ پولیس کے دو افسر ایک وردی میں ایک بلا وردی کے طبقہ یورپین یا یوریشین
سے موجود تھے۔ دونوں شوکت کے شناسائی اور ایک تو دوست نکلے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ذات شریف
نہایت کروفر کے ساتھ تشریف لائے اور پہلے اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ ان لوگوں کو اسٹیشن سے نکال دو۔
یہ لوگ ڈاکٹر ناظر الدین حسن، مسٹر محمود نسیم، مسٹر ظہور احمد بیرسٹران و سید ظہور احمد صاحب بی۔ اے وکیل
و شیخ ولایت علی صاحب بی۔ اے وکیل تھے۔ میں ان کی سلامت روی اور متانت کی تعریف کرونگا
کہ باوجود سخت غصے اور مایوسی کے وہ خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔ چلنے سے پیشتر والدہ نے انھیں بلایا
اور گلے لگایا اور کہا کہ بیٹا ان باتوں سے آزردہ خاطر نہ ہونا۔ مرد ان آزمائشوں میں سے ہنستے
ہوئے گذر جاتے ہیں۔ ہم بھی ان سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد وہ ذات شریف ہماری طرف
تشریف لائے اور کہا کہ آپ اپنی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ یہ درخواست شوکت کے دوست پہلے ہی
کر چکے تھے مگر ناکام رہے تھے۔ شوکت نے کہا کہ اس کی آخر کوئی وجہ۔ کہا میں آپ سے کہتا ہوں
آپ ایسا ہی کریں۔ ہم نے جواب دیا کہ ہم وہیں تک پابند ہیں جہاں تک گورنمنٹ کے احکام موصول
ہو چکے ہیں ورنہ ہم بالکل آزاد ہیں اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اتنے لانبے سفر کے بعد ایک تنگ
ڈبے میں مقید ہو کر بیٹھ جائیں۔ ہمیں یہاں سات گھنٹے قیام کرنا ہے۔ اس پر صاحب موصوف
بولے کہ نہیں آپ کو ساڑھے پانچ بجے کی ایک گاڑی میں یہاں سے ستنہ جانا پڑے گا اور وہاں
چند گھنٹے تک شب کی گاڑی کا انتظار کرنا پڑے گا جو یہاں سے جبلپور کو تھرو جاتی ہے۔ ہم نے

کہاکہ ہمارے احکام میں یہ داخل نہیں ہے۔ ہمیں احکام ملے ہیں کہ تین بجے کی گاڑی میں الہ آباد
پہنچیں اور شب کے دس کی ٹرین میں جبلپور جائیں۔ اس پر وہ بولے کہ نہیں گورنمنٹ نے احکام
بدل دیے ہیں۔ آپ کو ابھی جانا ہوگا۔ اس پر ہم نے کہاکہ ہمارے پاس کوئی احکام اس قسم کے موصول
نہیں ہوئے ہیں۔ جو حکم ہم کو ملا ہے اگر ہم اسکی خلاف ورزی کریں گے تو ہم تین برس کی قید بامشقت
اور ایک ایک ہزار روپے جرمانے تک کے مستوجب ہوں گے۔ اس پر فرمایا کہ میں آپ سے کہتا
ہوں کہ یہی احکام گورنمنٹ کے ہیں۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ حضور والا کی شناسائی کا بھی ہم کو
شرف حاصل نہیں ہے۔ پھر ہم تحریری اور مہر حکومت سے مزین احکام
زبانی ہدایت کو کیوں کر قبول کرلیں۔ فرمایا کہ میرا نام ...nary
ہوں اور اس اسٹیشن کا چارج میرے پاس ہے۔ میں نے جواب
مگر اس شرف نیازمندی کے حصول کے بعد بھی ہم سرکاری احکام پر
نہیں دے سکتے۔ اس پر تیکھے پن سے فرمایا کہ کیوں بے فائدہ بدمزگی پیدا کرتے ہو۔ میں نے تم سے
نہایت نرمی سے کہہ دیا کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں نے جواب دیا کہ اس میں بدمزگی کا سوال کچھ بھی
نہیں ہے اور میں نے اس قدر نرمی سے آپ سے کہہ دیا کہ ہم گورنمنٹ کے احکام کے خلاف کچھ نہیں
کرسکتے۔ اس پر نہایت تند و ترش ہوکر فرمایا کہ کیوں اسی راگ کو الاپے جاتے ہو۔ اس پر شوکت نے
آنکھیں دکھاکر کہہ دیا کہ بس اس لہجے میں گفتگو نہ کیجیے۔ اس پر ذرا ہوش میں آئے اور پھر کہاکہ بدمزگی
کیوں پیدا کرتے ہو میں تو نہایت نرمی سے کہتا ہوں کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ شوکت نے کہاکہ آپ
کی درخواست معقول نہیں ہے میں بھی آپ سے نرمی سے کہتا ہوں کہ ہم سے تعرض نہ کیجیے اور
یہاں سے چلے جائیے۔ اس پر حاکمانہ انداز سے فرمایا کہ تم مجھے مجبور کرتے ہو کہ میں اپنے احکام کی
تعمیل بجبر کراؤں۔ شوکت نے کہا شوق سے آپ ضرور کوشش کریں مگر برادرم ساڑھے تین من
کی لاش اور سوا چھ فٹ کے قد اور ڈیڑھ گز کے سینے والے سے جبریہ تعمیل احکام کرانا آسان نہیں۔
دیکھ کر بولے کہ میں سمجھا تھا کہ آپ لوگ gentlemen ہیں۔ اس پر میں نے عرض کی

[illegible] ہے کہ آپ بھی gentleman تو ہیں مگر .... اس "مگر" کے اضافے نے ان بزرگوار [illegible] آیا۔ پھر کہنے لگے کہ اب میں جبریہ تعمیل کراؤں گا۔ شوکت نے کہا کہ ہم تو کہی رہے ہیں کہ شوق سے کوشش فرمائیے۔ اس قدر گفتگو کے بعد دوسرا پولیس انسپکٹر جو وردی میں تھا آیا اور اس نے کہا کہ جناب والا اس مسئلہ کو آپ یہیں پر چھوڑ دیجئے۔ مسٹر Murray جن کے initials "P. G" ہیں اور جن کو بقول پولیس انسپکٹر کے Pig Murray کے لقب سے لوگ ملقب کیا کرتے ہیں اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بیک بینی و دوگوش جدھر سے تشریف لائے تھے ادھر کو واپس تشریف لے گئے۔ ہم سے پولیس انسپکٹر نے کہا کہ کچھ مضائقہ ہے اگر آپ انھیں کا کہا کریں یہ بھی شوکت کا شناسائی تھا۔ شوکت نے جو جواب پہلے انسپکٹر کو دیا تھا وہی اس کو بھی دیا کہ بھائی یہ معاملہ ہمارے تمہارے بیچ کے تعلقات کا نہیں ہے۔ سرکاری احکام کا ہے۔ ہم معذور ہیں اور جو آزادی اس نظر بندی میں باقی رہ گئی ہے ہم قدرتی طور پر اس کی پہلے سے بھی زیادہ قدر کرتے ہیں۔ ہم ہرگز بلا حکم سرکار کوئی کام اپنے خلاف مرضی نہیں کریں گے۔ دوسرے ہمارے معزز ترین احباب کو جس باجی پن کے ساتھ اس شخص نے یہاں سے جانے کے لئے کہلوایا ہے اس کے بعد ہم سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے مشہور ترین رہنما اور قائم مقام ہیں۔ جو صدمہ ان کو ہوا ہوگا وہ ہمیں محسوس کر سکتے ہیں۔ اس پر پولیس کے دونوں افسروں نے اعتراف کیا کہ اس شخص کا طرز عمل نہایت باجیانہ تھا اور علاوہ ازیں اسے اس امر سے کچھ بھی سروکار نہ تھا۔ بلا وجہ گھس پڑا اور حکومت جتانے لگا۔ جو پولیس انسپکٹر (Gavin) ہمارے ہمراہ کوٹ دوارے سے آیا تھا جب وہ موقع پر آیا تو اسے بھی بہت برا معلوم ہوا کہ بلا اس کی اطلاع و مشورے کے مسٹر Pig Murray نے دست اندازی کی اور سب خوش تھے کہ خوب منہ کی کھائی۔ اس کے بعد ہم Waiting-room گئے اور وضو کر کے ظہر اور بعد ازاں عصر پڑھی۔ نماز سے فارغ ہی ہوئے تھا اطلاع ملی کہ شوکت کے پرانے دوست اور میرے بھی کلکتے کے "گہرے شناسا" مسٹر Fremantle کلکٹر الہ آباد ملنا چاہتے ہیں۔ ہم گئے تو ہم سے کہا کہ یہ کیا جھگڑا ہے۔ شوکت

نے تمام کیفیت سنائی۔ اس پر کہا کہ مجھے دو تین دن سے معلوم تھا کہ تمہارے سفر کا پروگرام یہاں سے
بدل جائے گا۔ یہ معلوم نہیں احکام کیوں نہیں دئے گئے۔ بہرحال میں گھر سے چلتے وقت Bum
(چیف سکریٹری) سے ٹیلیفون پر پوچھ آیا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کو ساڑھے پانچ ہی بجے چلنا
ہوگا۔ ہم نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کے احکام کی خلاف ورزی کا کون ذمہ دار ہے۔ ہم برن کے تحریری
اور مہردار احکام مانیں یا زبانی احکام جو آپ سے سننے میں آئے ہیں۔ اس پر کہا کہ برن کہتے ہیں کہ
پروگرام تو احکام کا جزو نہ تھا صرف تمہاری سہولت کے لئے ہمرشتہ کر دیا گیا تھا۔ اس پر میں نے کہا
کہ اگر وہ جزو احکام نہیں ہے تو ہم بیل گاڑی یا گھوڑے پر چھندواڑہ جا سکتے ہیں اور پانچ چھ ماہ کے
عرصے میں پہنچ جائیں تو مضائقہ نہیں، اس لئے کہ اگر پروگرام جزو احکا
اس قدر حکم ملا ہے کہ ۲۰ کو لینسڈون سے بلا سفر توڑے ہوئے چھندو
manth پھر قائل ہوئے اور کہا کہ بہرکیف اب تو یہی حکم ہے۔ شو
سے چیف سکریٹری کا دستخط شدہ حکم ملنا چاہیے لیکن چونکہ میں تم سے واقف ہوں اس ... ہم
لیتا ہوں کہ تم وہی کہتے ہو جو چیف سکریٹری نے تم سے ٹیلیفون پر کہا ہے تاہم اسے ضبط تحریر کر دو تاکہ
برن تین برس کی قید کرانا چاہیں تو سند ہو اور وقت ضرورت کے کام آئے۔ کہا ہاں مضائقہ نہیں
ہے میں لکھ دوں گا کہ برن نے مجھے ہدایت کی ہے۔ اس پر میں نے کہا یہ لکھئے کہ گورنمنٹ نے
ہدایت کی ہے۔ کہا ہاں چیف سکریٹری ہی کے دستخط سے گورنمنٹ کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ اس پر
میں نے کہا کہ یہ درست ہے مگر یہاں تو احکام آپ کے دستخط سے جاری ہوں گے۔ کم از کم حکم
لفٹنٹ گورنر کا ہونا چاہیے۔ برن کو بحیثیت چیف سکریٹری گورنمنٹ کے احکام پر دستخط کرنے کا حکم ہے
مگر وہ خود حکم دینے کے مجاز نہیں ہیں۔ پچھلا حکم ان کا دستخطی گورنمنٹ کی مہر والا بھی مظہر ہے کہ لفٹنٹ گورنر
کی پیشگاہ سے یہ حکم صادر ہوا ہے۔ اس پر کچھ عرصے بعد غالباً برن سے ٹیلیفون پر پوچھ کر ایک حکم لکھ کر
لائے کہ پروگرام بدل دیا گیا ہے۔ آپ لوگ بجائے دس بجے شب کے آج شام ہی کو ساڑھے پانچ
بجے روانہ ہو جائیں۔ یہ حکم پاتے ہی ہم نے والدہ اور بچوں کو اطلاع کرا دی کہ گاڑی ابھی جائے گی۔

[illegible] گاڑی پر [illegible] کرکے ایک [illegible] پر بھیج دی گئی تھی آکر ٹرین میں لگ گئی۔
نوکروں نے سامان اپنے درجوں میں سے جو نکالا تھا وہ انسپکٹر سے کہہ کر بھروالیا۔ مگر بیچارے صاحب انسپکٹر
(مہربوب) جو لینسڈاؤن میں ہمارے سنسر صاحب کو خط پڑھنے میں مدد دیتا تھا اور ہمراہ جبل پور
تک مع انسپکٹر ([illegible]) کے آیا بتقاضائے حاجت گیا ہوا تھا بڑی مشکل سے چلتی گاڑی میں بیٹھا
اب اس کے بعد فرنیتل سے "دوستانہ گفتگو شروع ہوئی۔ جنگ کا ذکر آیا، ترکوں کی
پالیسی، مصر کے واپس دینے یا نہ دینے کا مسئلہ۔ یہ سب معرض بحث میں آئے۔ ہم نے کہا کہ ہم نہ کہتے
تھے۔ چار برس سے کامریڈ نے ہمیشہ گورنمنٹ کو یہی سمجھایا تھا کہ دیکھو مسلمان ۴۰ کروڑ ہیں، ہر ملک میں
پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے نہ بگاڑو۔ ان کے مذہب سے استہزا نہ کرو۔ ان کے مقدس مقامات
کی طرف رخ نہ کرو۔ خلیفۃ الرسول خادم حرمین شریفین کی محبت و عظمت ہر مسلمان کے دل میں ہونا
لازمی ہے اور ہے۔ ان سے اچھا سلوک کرو اور ان کے دل کو موہ لو تو مسلمانان عالم کے دل
تمہارے ہیں۔ کیا یہ بہترین صلاح و مشورہ نہ تھا۔ مگر سر ایڈورڈ گرے پر گلیڈاسٹون کا بھوت سوار
تھا، علاوہ ازیں جرمنی کے خوف نے انھیں بوکھلا دیا تھا۔ اس نے ان دونوں باتوں سے فائدہ
اٹھایا اور آخری نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کو تو جنگ سے روک نہ سکے مگر ترکوں کو ہاتھ سے کھو بیٹھے اور
عالم اسلام کو آج ایک سخت ہیجان میں ڈال دیا۔ اگر بجائے کامریڈ کی ضمانت ضبط کرنے کے ہم میں
سے چند مخلصین کو مقام خلافت کو بھیجا گیا ہوتا اور ترکوں کے ساتھ رشتۂ الفت و اتحاد پھر قائم
کیا گیا ہوتا اور مصر انھیں واپس دے دیا گیا ہوتا تو آج دردانیال، مصر، ایران، عراق و یمن میں
یہ حالت کیوں ہوتی، سرحد پر کیوں شورش ہوتی اور افغانستان کی طرف سے کیوں کھٹکا لگا رہتا۔
ترک اگر ساتھ بھی نہ دیتے تب بھی خلاف نہ ہوتے اور روس کو سامان جنگ پہنچانے اور وہاں سے
غلہ حاصل کرنے میں وقت نہ پیش آتی۔ روس کو قفقاز میں مشکل کا سامنا نہ ہوتا۔ نہر سے جرمنی
رہتا۔ فرانس کو الجیریا و ٹیونس سے فوجیں منگانے میں سہولت ہوتی۔ انگریزوں کو مشرق میں بیکری
نہیں اور مغرب میں دشمن کا مقابلہ آسان ہوتا۔ اسی سلسلے میں ہندوستان کی سیاست کا ذکر چھڑ گیا۔

سول سروس کی خود غرضیوں پر دیر تک مباحثہ ہوا اور خصوصاً ان قوانین و افعال کے متعلق جن کا جواز محض جنگ کی وجہ سے ہوا مگر جن کے ذریعے سے سول سروس نے اپنے معترضین سے بدلہ لیا۔ اسی مباحثے میں میں نے کہا "The war has been a godsend to the civilian" - اس پر آبدیدہ ہو کر کہا:-

It is not very generous - of you. It is very unkind when you know we are losing our brothers and cousins in such large numbers. Sir
has lost 3 sons.

اس کے جواب میں میں نے یقین دلایا کہ میرا اشارہ یو ...
بلکہ ان واقعات کی طرف جو سول سروس کی طرف سے ظہور میں آ
تعجب ہے کہ ان کو میرا مفہوم سمجھنے میں کیونکر مغالطہ ہو سکتا تھا۔ اس پر انھوں ...
آپ کو ان واقعات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جو جنگ میں پیش آ رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ ہمارے لئے کچھ بھی allowance نہیں کرتے۔ شوکت نے اس پر کہا کہ بھائی جان تم نے بھی کبھی ہمارے لئے allowances کیں۔ تم ہمیں نظر بند کرتے ہو مگر کبھی اس کا بھی خیال کیا کہ اس کا ہماری ماں پر، محمد علی کی بیوی پر اور ہماری بہن اور بچوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ محمد علی کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے سخت بیمار ہوئیں اور بچنے کی امید نہ تھی مگر ان سے ملنے تک کے لئے نہیں جانے دیا گیا۔ ہمارا بزنس تباہ کر دیا گیا اور اس کے بدلے ڈھائی سو ایک کو اور سو روپے ایک کو دیئے گئے۔ اس وقت ہمارا اور ہمارے بچوں کا خیال نہ آیا۔ جنگ تو تمہاری اپنی تھی پھر سول سروس نے اتنی بے حیائی کیوں روا رکھی کہ رخصتیں نہ منظور ہونے کے باعث جو acting کا موقع ہاتھ نہ آیا تو اس کا بھی معاوضہ مانگا اور allowances وصول کیا۔ اسی دوران میں Choice of the Tasks کے مضمون پر بھی گفتگو ہوئی اور میں نے بتایا کہ جب گورنمنٹ ضماضبط

کوٹھی میں اسی دن انگلستان کے مشہور ترین Tory اخبارات Morning Post and
Daily Telegraph اسی مضمون کی Loyalty کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ سول
سروس کمیشن اور ہندوستانیوں کو ۵ فی صدی سے کم جگہیں سول سروس میں ملنے پر گفتگو رہی۔ اس پر
انھوں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے۔ اگر حکومت ہمارے ہی ہاتھ میں رہے تو ہمارا عنصر غالب ہونا
چاہیے۔ اس پر ہم نے کہا کہ Self-government نے کیا نقصان کیا ہے جو ابدالآباد
تک حکومت آپ ہی کے ہاتھ میں رہے۔ کہا کہ ہندوستانی ابھی اس قابل نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ
تم ایسا تو کہو کہ تم ان کو اس قابل کرنا چاہتے ہو کہ وہ خود حکومت کر سکیں۔ ہم بھی انتظار کے لئے تیار ہیں
مگر جہاز کی سست رفتاری کا مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس کا رخ بندرگاہ مقصود کی طرف ہو۔ افسوس
تو اس کا ہے کہ سول سروس ہماری پالیسی کی مخالف ہے اور خود کوئی پالیسی نہیں رکھتی۔ کچھ لوگ کھلم کھلا
ہندوستانیوں کے مخالف ہیں اور کچھ ٹالے بالے کرتے ہیں۔ پھر ہم لوگوں کا ذکر آیا۔ کہا تم چند نفوس
ہو۔ تمہاری آواز ملک کی آواز نہیں ہے You represent only yourself۔ اس پر میں نے
کہا کہ کرمی اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ ڈیڑھ سو سپاہی پہرے چوکی کے لئے تم نے کیوں جمع کر رکھے ہیں
اور الہ آباد کے ہزاروں آدمیوں کو ملنے سے کیوں روکتے ہو۔ قائل ہوئے مگر کہا کہ تم لوگوں کو گمراہ
کرتے ہو۔ ہم نے کہا کہ خیر تم اس کے تو قائل ہوئے کہ لوگ ہمیں رہنما سمجھتے ہیں۔ اب سوال بیراہ روی
اور یہی ہدایت و رہنمائی کا ہے۔ مگر اس کا فیصلہ کون کرے۔ ایک فریق خود غرض تم ایک ہم۔ خود غرضی
میں زیادہ سے زیادہ دونوں یکساں۔ مگر ہم ملک کی حالت سے واقف ہیں کیونکہ رات دن کا لوگوں
کا ساتھ ہے اور تم ایک دوسری دنیا میں رہتے ہو ناواقف ہو۔ اس لئے تمہارا قول تو کسی طرح معتبر
ہو نہیں سکتا۔ غرض اسی طرح گفتگو رہی یہاں تک کہ گاڑی روانہ ہوئی اور ہم رخصت ہوئے۔ سب افسر
پولیس کے لوگ، انگریز ہندوستانی اور ہمارے دوست مسٹر قمر احمد بی اے، ایل ایل بی (علیگ)
جن کی طرف بعض لوگ وہ شعر منسوب کرتے ہیں " ہو گئے پاس ایل ایل بی میں اگر ہم اب کے
الخ " جو غازی پور سے ملنے آئے تھے اس دلچسپ مباحثے سے مستفیض ہوئے۔

رات کو ہم بارہ بجے کٹنی پہنچے۔ گاڑی وہیں تک جاتی تھی۔ نوکر اتر گئے ہم سوتے رہے جب دس بجے والی گاڑی الٰہ آباد سے آئی تو ہم پھر روانہ ہوئے۔ صبح کو جبلپور پہنچے۔ اسٹیشن پر Mr. Latham Supdt Police لے اور C.P. Government کے احکام دئے۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ ہم اسٹیشن ہی پر اور اپنی گاڑی ہی میں رہیں لیکن ہم نے کہا کہ ہمیں اس قدر آزادی ضرور حاصل ہے کہ جبل پور کی سیر کریں اور جب تک اس کے خلاف حکم نہ ہوگا ہم اپنے حقوق کا استعمال کریں گے۔ یہ شخص نہایت معقول ہیں۔ خود ہی ایک نہایت نفیس موٹر منگائی جو "کنبہ پرور" تھی۔ ہم آٹھ دس بھر گئے۔ ہم نے خود ہی درخواست کی کہ کوئی پولیس کا افسر ہمارے ساتھ چلے تاکہ رہنمائی بھی ہو اور آئندہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ کہیں جاکر "بغاوت" پھیلائی۔ اس پر ... نے کہا کہ ہمارے D.S.P بلا یونی فارم کے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم کو عذر نہیں ہمارے ساتھ ہوں اور وہ آپ کو جانتے بھی ہیں۔ علی گڈھ کے ... یہ میرے ہم جماعت نکلے۔ خوب سیر دکھائی۔ راستے میں مرزا ... D.S.P. جو Hockey کھیلنے اپنی ٹیم کے ساتھ آئے تھے مل گئے۔ وہ بھی موٹر پر آ لئے۔ خوب گپیں ہوئیں اور ہمارے ساتھ ہی رہے جب تک کہ ہم رخصت ہوئے Mr. Latham بھی ہمیں رخصت کرنے آئے۔ ان سے بھی گفتگو رہی۔ گر آدمی لائق اور خلیق ہیں اور معقول پسند۔ راستے میں ایک مقام Manipur پر گاڑی بدلی جاتی ہے۔ یہاں چند لوگ ملے جو Mundla ضلع سے ہم سے ملنے آئے تھے۔ ترجمان میں جو پروگرام چھپا تھا اس کے باعث جبلپور بھی لوگ اسٹیشن پر آئے اور ملے۔ راستے میں متعدد اسٹیشنوں پر لوگ جوق جوق آئے۔ شب کو یہاں پہنچے۔ محمد عبدالولی خاں "مجاہد طرابلس" جو یہاں نظربند تھے ملے اور چار پلائی۔ چونکہ کوئی شخص حکام میں سے رہنمائی کے لئے نہ تھا اس لئے شب کو ہم نے اور ہمراہی یورپین انسپکٹر نے جو جبلپور سے آیا تھا گاڑی ہی میں آرام کیا۔ صبح کو ایک پولیس جمعدار کے کہنے پر کہ بنگلہ تیار ہے اور سب سامان سے آراستہ ہے یہاں آئے تو بنگلہ خالی پایا۔ صرف دو کرسیاں اور ایک میز استقبال کے لئے موجود تھیں۔ مجبوری

ایک [illegible] گئے تھے۔ دو کمروں میں سے ایک گرا ہوا تھا۔ ایک میں یہ سامان کسی جا پڑا تھا۔ یہاں سب
سے پہلے اشتیاق علی صاحب E.A.C سے ملاقات ہوئی۔ معذرت کرتے تھے کہ ہم کو بالکل خبر نہ تھی
یہاں کے ڈپٹی کمشنر میرے شناسا نکلے۔ مسٹر گنگادھر چٹنویس کے سگے بھائی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو
تو اتنا کہ گورنمنٹ ہند کی طرف سے ایک ڈیڑھ مہینہ ہوا کہ عبدالمجید C.I.D کا D.S.P. شملہ سے
آکر مکان کا انتظام کر گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں کوئی حکم نہ ملا تھا۔ بہرحال مسٹر چٹنویس نے بہت عملیت
کی اور ہم ان کے سخت مشکور ہیں۔ C.P. Government نے سامان کے لئے فوراً منظوری
ان کے کہنے پر دیدی اور بنگلے سے فرنیچر اور کانپور سے دریاں آ رہی ہیں۔ پلنگ وغیرہ عاریتاً مل گئے
تھے اب یہاں مسہریاں تیار ہوگئی ہیں۔ فرنیچر بھی جلد آ جائے گا۔ بہرحال مردہ بدست زندہ اگر یہ نہ بھی
ہوتا تو ہم شاکر و صابر رہتے۔ یہاں لوگوں کو اسلامی حمیت سے پُر پایا۔ ہندو اور مسلمان سب ہم سے
اچھی طرح ملتے ہیں۔

برادرم۔ غربت میں وطن کا مزا ہے۔ باقی آئندہ۔

تم آؤ تو ناگپور ہو کر آنا۔ وہاں سے صبح کو ۸ بجے گاڑی چل کر شام کو ۵½ یہاں پہنچ
جاتی ہے۔ واپس ہو کر ناگپور سے بمبئی چلے جانا۔ شوکت اور بچوں کا سلام۔ والدہ کی دعا۔ میری اہلیہ
سلام کہتی ہیں۔ والسّلام۔

تمہارا خیر طلب اور مداح
محمد علی

گیتا کے فارسی تراجم

گیتا یا بھگوت گیتا کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں حقائق و معارف کی جو باتیں ہیں وہ درحقیقت میرے قلم سے توضیح کی محتاج نہیں۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ مختلف ہندوستانی زبانوں کے تراجم سے قطع نظر کر کے جرمنی، فرانس اور انگلستان جیسے غیر ممالک کی زبانوں میں بھی اس کے تراجم کی تعداد کچھ کم نہیں۔

ہندوستان میں مدتوں فارسی کا زور رہا ہے۔ اس عرصے میں بہت [illegible] کی بدولت بے شمار سنسکرت کتابوں نے فارسی کا جامہ زیب تن کیا۔ اور گیتا جیسی مشہور و معروف کتاب کے جو مختلف فارسی ترجمے میری [illegible] کا مختصر بیان ہدیۂ ناظرین ہے۔

(۱) ترجمۂ فیضی

اکبری دربار کے ملک الشعراء شیخ ابو الفیض فیضی فیاضی کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسی صاحب کمال شاعر کا ایک منظوم ترجمہ موسوم بہ شری بھگوت گیتا ہے۔ سنسکرت نسخے میں ۱۸ ادھیائے (یا بابیں) ہیں۔ اسی طرح اس فارسی نسخے میں بھی ۱۸ باب قائم کر رکھے ہیں اور سنسکرت کے ۷۰۰ اشلوکوں (اشعار) کا مضمون فارسی کے ۱۲۰۲ اشعار میں ادا کیا گیا ہے چنانچہ ہر ایک ادھیائے کے اشلوک اور فارسی اشعار کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

ادھیائے	تعداد اشلوک	تعداد اشعار
۱	۴۷	۷۴
۲	۷۲	۱۱۷

ادھیائے	تعداد اشلوک	تعداد اشعار
۳	۴۳	۷۵
۴	۴۲	۴۳
۵	۲۹	۵۸
۶	۴۷	۶۴
۷	۳۰	۵۹
۸	۲۸	۵۴
۹	۳۴	۸۲
۱۰	۴۲	۷۶
۱۱	۵۵	۹۱
۱۲	۲۰	۳۲
۱۳	۳۵[لہ]	۷۸
۱۴	۲۷	۴۶
۱۵	۲۰	۴۳
۱۶	۲۴	۶۳
۱۷	۲۸	۵۶
۱۸	۷۸	۱۷۰
	۷۰۱	۱۲۸۲

لہ سنسکرت کے بعض نسخوں میں صرف ۳۴ ہی اشلوک شمار کئے گئے ہیں۔ اس حساب سے تمام سنسکرت اشلوکوں کی مجموعی تعداد صرف ۷۰۰ ٹھہرے گی۔

ادا کرنے میں بعض اوقات تفصیل اور بعض اوقات اختصار سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے یہی سبب ہے کہ سنسکرت اشلوکوں اور فارسی اشعار کی تعداد میں کوئی خاص تناسب نہیں ہے۔

اب سنسکرت کے ابتدائی ۵۰ اشلوکوں کا ماحصل ذیل میں علیحدہ علیحدہ دیا جاتا ہے اور ہر ایک کے پہلو میں فارسی اشعار درج کئے جاتے ہیں تاکہ ناظرین ملک الشعرا فیضی کے ترجمے کی صحت اور قادر الکلامی کا کم و بیش اندازہ لگا سکیں۔

نمبر اشلوک	اشلوک کا خلاصہ	اشعار فیضی
(۱)	دھرتراشٹر[1] نے سنجے سے پوچھا کہ جب کوروں اور پانڈوں کو کرکشیتر کے میدان جنگ میں صف آرا ہوئے تو کیا ہوا۔	طرازندۂ دست ... کہ بدیں سار کہ پ... کہ گرنعیت بود مزرعۂ آخرت در جہاں درآں جا رسیدند چوں کوراں دگر پانڈواں از پئے کارزار چہا نست ایں قصہ اے ہوشیار
(۲)	سنجے نے جواب دیا کہ دریودھن نے جب پانڈوں کی صف آرائی	جوابش چنیں گفت کاے بادشاہ بہ بستند از ہر دو سو صف سپاہ

[1] دھرتراشٹر اور ان کے علاتی بھائی پانڈو کی اولادوں کے درمیان مہا بھارت نامی جنگ عظیم واقع ہوئی ہے جس پر درحقیقت گیتا کا دارو مدار ہے۔ دھرتراشٹر کی اولاد کوروں کے نام سے موسوم ہے۔ ان میں سب سے بڑا دریودھن ہے اور پانڈو کی اولاد پانڈوں کہلاتی ہے جو یدھشٹر، بھیم، ارجن وغیرہ پر مشتمل ہے۔

[2] اصل سنسکرت لفظ دھرتراشٹر ہے۔ اسی طرح دیگر بہت سے اسمار اکثر فارسی تراجم میں اپنے ڈھنگ پر مناسب قالب میں ڈھال لئے گئے ہیں۔

اشلوک	اشلوک کا خلاصہ	اشعار فیضی
	ایک خاص وضع پر دیکھی تو اپنے پیر و مرشد درونا چارج کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا۔	چو فرزند تو فوج دشمن بدید بہ نزد درونا چارج رسید
(۳)	محترم استاد آپ کے شاگرد رشید نے جس خاص وضع پر صف آرائی کی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے۔	بگفتش برین لشکر پانڈواں نظر کن کہ ترتیب دارد چناں درشٹدومن ہست سالار فوج جگرداریش رونق کار فوج
(۴)	اس جنگ میں بھیم اور ارجن ایسے عدیم المثال تیر انداز ہیں۔ یودہان[۱] براٹ اور دروپد ایسے سرداران لشکر ہیں۔	یلے ہمچو بھیمے بہ پہلوئے او دگر نکل و سہدیو بازوے او دگر ارجن آں چناں پہلواں کہ لرزد بخوفش بجود آسماں سرجادواں سانک نامدار قوی پنجہ بیراٹ دشمن شکار دگر راجہ مجدشاں بفوج گراں میانئے کیں ہمچو شیر ژیاں دروپدیل عرصۂ رزمگاہ کند گرد فوجش جہاں را سیاہ
(۵)	دھرشٹ کیتو۔ کاشی راج۔ کنت بھوج۔ پرجیت اور شیو سرداران	رئیس رئیساں دگر کاشی راج شہاں را از و چشم اکلیل و تاج

[۱] مراد یودھان۔

نمبر اشلوک	اشلوک کا خلاصہ	اشعار فیضی
	لشکر ہیں۔	دگر کنت بھوج و دگر شیو یار دگر ابھمن[۱۵] مرد میدان کار بصد زور و طاقت دگر یدھ است بدلہائے شیراں از و ہیبت است جہاں پہلواں اُتموجا[۱۶] دلیر دگر دھرشٹ کیت ...

دوسرے ادھیائے کے اشلوک ۱۲ لغایت ۲۴ کا

روح فانی نہیں - جس طرح کوئی شخص بوسیدہ لباس کو ترک کرے اسی طرح یہ روح بھی درحقیقت ایک جسم کو چھوڑکر دوسرے جسم میں داخل ہوجاتی ہے۔ روح آلات حرب سے کاٹی نہیں جاسکتی، یہ نہ تو پانی میں گل سکتی ہے اور نہ ہوا میں سوکھ سکتی ہے وغیرہ۔

مذکورہ بالا خیال کو ملک الشعرا نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

تغیر بجسم است وجاں فارغ است	حوادث بریں است وآں فارغ است
بگرمی و سردی تنت آشنا ست	نہ جانت کہ فارغ زہر دو سرا ست
بوقت معین اجل میرسد	بہر نیک و بد بے خلل می رسد

---

۱۵ مراد ابھمنو پسر ارجن - یہ نام اصل پانچویں اشلوک میں نہیں آیا مگر حق یہ ہے کہ اس نے میدان کارزار میں نمایاں حصہ لیا تھا -

۱۶ اُتموجا نام چھٹے اشلوک میں آیا ہے ۔

بجے پوستان لشکر کشاں | بخاک او فتادند از دست شاں
فلانے بیک وضع بودے اگر | نمی یافت فرزند جائے پدر
غم این عزیزاں چرا مے خوری | چرا پردۂ راز را مے دری
تن ہر کسے ہم چو جامہ بود | شود پارہ ہر گاہ کہنہ بود
بپوشندۂ جامہ جانست نام | خیالِ فنا گشتنش ہست خام

الغرض میں نے سنسکرت کے جستہ جستہ مقامات کا مقابلہ فارسی سے کیا اور یہ نتائج نکلے :-

(۱) ملک الشعرا نے سنسکرت گیتا کو کما حقہ سمجھا تھا۔

(۲) فارسی میں کہیں کہیں اصل سنسکرت کے بعض مؤخر امور کو مقدم یا یوں کہنا چاہئے کہ بعض مقدم امور کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ جس طرح کوئی سنسکرت داں سنسکرت گیتا سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اسی طرح ہر ایک فارسی داں فارسی نسخے سے صحیح معنوں میں مستفید ہو سکتا ہے۔

پھر یہ امر بھی کچھ کم اہم نہیں کہ فیضی نے جس بحر میں گیتا کو نظم کیا ہے وہ اس کے لئے نہایت موزوں ہے اور جس دلکش اور زوردار پیرایے میں تمام کتاب ہے اس کی بنا پر میرا یہ قیاس ہے کہ اگر کوئی صاحب ذوق کتاب کو شروع کرے تو اس کو ختم کئے بغیر نہ چھوڑے گا۔

فیضی نے گیتا کو اس شعر پر ختم کیا ہے۔

بکن سجدۂ شکر پروردگار
کہ آمد ز دست تو ایں گونہ کار

فیضی نے یہ عدیم المثال ترجمہ کب کیا تھا اس امر کا صحیح پتہ نہ تو اس کتاب سے لگتا ہے اور نہ اب تک اس بارے میں دوسرے ذرائع سے کوئی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اپنی ہر دلعزیزی کے باعث یہ ترجمہ مختلف مطابع سے شائع ہو چکا ہے چنانچہ مفصلہ ذیل

سطبع کے نسخے میری نظر سے گذرے ہیں۔
۱۔ مطبع امینی الہ آباد۔ سنہ طباعت درج نہیں۔
۲۔ مطبع ست دھرم پرچارک جالندھر ۱۹۰۱ء۔
۳۔ جارج انٹیم پریس لاہور۔ سنہ طباعت درج نہیں۔
ان کے سوا دو اور نسخے بھی بتائے جاتے ہیں:۔
۱۔ عالیجاہ دربار پریس گوالیار ۱۹۲۳ء۔
۲۔ ہندوستان پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۲۶ء۔

(۲) ترجمۂ ابوالفضل

اہل ہنود کا عقیدہ ہے کہ کاشی میں مرنے سے نجات حاصل
بہت سے لوگ آخری عمر میں کاشی آجاتے ہیں اور بقیہ عمر کو زیادہ تر مذہبی مشاغل میں صرف کرتے ہیں چنانچہ جو فارسی داں اصحاب یہاں آئے ان کی بدولت اکثر مذہبی کتابوں کی نقلیں یا ترجمے کاشی میں پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک گیتا کا ترجمہ ہے جو ملک الشعرا فیضی کے برادر خورد شیخ ابوالفضل الملقب بہ علامی کا کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور مذہبی کتابوں کے بھی قلمی نسخے دیکھنے میں آئے ہیں جن کا ذکر آیندہ حسب موقع کیا جائے گا۔

شیخ ابوالفضل کے ترجمے کا نام "ارجن گیتا" ہے۔ اس کے شائع ہونے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی اور نہ غالباً اس کا ذکر کسی کتاب میں آیا ہے۔ اسی سبب سے بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے۔ میں نے اس نایاب ترجمے کا ایک قلمی نسخہ بنارس کی 'مالتی سدن' نامی لائبریری میں دیکھا ہے جس کی مختصر کیفیت یہ ہے۔

یہ نسخہ تقریباً ۹۴ صفحات تقطیع ۱۰ × ۶½ انچ پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں تقریباً ۲۳ سطریں اور ہر سطر میں ۲۴ الفاظ کا اوسط ہے۔ خط معمولی ہے۔

کاتب کا نام و پتہ یہ ہے "کنور سنگھ ولد گلزاری مل ابن پرتھی مل قوم اگروالہ، ساکن شاہجہاں آباد"۔

کاتب موصوف مرزا شگفتہ بخت بہادر ولد مرزا جاندار شاہ بہادر کے یہاں ملازم تھے مقام و وقت کتابت بھارج دواجی ٹولہ شہر بنارس تاریخ سلخ صفر المظفر ۱۲۰۴ھ مطابق سنہ ۳۲ جلوس والا پادشاہ شاہ عالم غازی۔

کاتب موصوف نے اس ترجمے کو جس نسخے سے نقل کیا تھا اس کا کوئی حوالہ درج نہیں۔ اس نسخے کے متعلق ضروری امور ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

۱۔ ابتدا میں ایک مختصر مقدمہ منجانب فاضل مترجم ہے جس کے کچھ الفاظ یہ ہیں:-

"این نسخۂ گیتا کہ در انکشاف سرایر قدرت ذوالجلال و اکشاف حقیقت معرفت لایزال است آں را باجازت سلطان عادل، و برہان کامل دلیل قاطع خداوانی حجت ساطع رحمانی قافلہ سالار راہ حقیقی و مجازی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلداللہ ملکہ و سلطانہ شیخ ابوالفضل از زبان سنسکرت ترجمہ بعبارت فرس و عربی نمود"

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ ترجمہ دراصل شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوا تھا۔

۲۔ نفس مضمون کی ابتدائی عبارت یوں ہے:-

"دھرتراشٹ پرسید کہ اے سنجے مردم ما و جماعت پانڈواں در وقت روبرو شدن اول بچہ کار مشغول شدند۔ سنجے گفت کہ جرجودھن فوجہائے پانڈواں ایستادہ دید نزد درونہ چارج آمدہ گفت اے استاد این لشکر عظیم کہ پانڈوان آراستہ اند عمدۂ این سپاہ بھیم و ارجن اند"

مذکورہ بالا اقتباس و ترجمے کی دیگر عبارتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ منثور فارسی گیتا درحقیقت منظوم سنسکرت گیتا کا چربا ہے۔

۳. تمام ترجمے میں فاضل مترجم کے مخصوص طرزِ ادا کا رنگ ہے مگر کہیں کہیں کسی سنسکرت لفظ کو بعینہٖ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً دوسرے باب میں آیا ہے:۔

"چوں سری کرشن ارجن را با دیدہ پر آب دید ند از روئے مہربانی فرمودند کہ اے ارجن ترا در چنین محل مشکل اندیشہ کہ از نقصان عمل خبر می دہد از کجا پیدا شدہ و ایں روش بسرگ لوک[1] نمی رساند۔"

۴. ترجمے کا بیشتر حصہ نثر میں ہے مگر کہیں کہیں اشعار بھی ہیں چنانچہ ایک شعر ذیل میں دیا جاتا ہے۔

ہر کہ آمد بجہاں اہلِ فنا خواہد بود
وانکہ پایندہ و باقیست خدا خواہد بود

(۳) مترجمہ مول چند

یہ ترجمہ موسوم بہ "سری بھگوت گیتا" رائے مول چند صاحب متوطن ڈیرہ اسماعیل خاں کا ہے۔ مطبع کوہ نور لاہور سے ۱۸۶۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مترجم کون تھے۔ انھوں نے کب ترجمہ کیا۔ ان امور کا ہنوز مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔

پورا مطبوعہ نسخہ معمولی تقطیع کے ۲۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ سیدھی سادی فارسی نثر میں ہے مگر ترجمے میں سنسکرت الفاظ کا بعینہٖ استعمال جا بجا کیا گیا ہے۔ اب بطور نمونہ اس گیتا کی تھوڑی سی ابتدائی عبارت ذیل میں دی جاتی ہے۔

"آغاز سری بھگوت گیتا

دھرتراشٹ پر سید اے سنجے مردم من و جماعت پانڈواں در زمین

---

[1] سرگ لوک سے مراد بہشت بریں۔

دھرم کھیتر کورکھیتر بقصد جنگ جمع شدہ چہ کردند۔ سنجے گفت کہ درجودھن چوں
پانڈواں را استادہ دیدہ نزد درونا چارج آمد و گفت اے اوستاد ایں
لشکر عظیم پانڈواں را درشٹدمن درپدکہ شاگرد خردمند تست بہ صفوف
آراستہ نیک ملاحظہ کن"۔

آخر میں یہ عرض کردینا چاہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ گیتا جیسی گراں بہا کتاب کے دوسرے ترجمے بھی ہوئے ہوں جو میری نظر سے نہیں گذرے۔ پس اگر کوئی صاحب ذوق کسی دیگر نسخے یا نسخوں کا حال تحریر فرمائیں یا مجھے ان کا پتہ دیں تو میں بہت ممنون احسان ہوں گا۔

رام پور کا ایک ملک الشعرا

ایسا کم دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی ہستی ایک ہی وقت میں صاحب افسر و دیہیم بھی ہو اور صاحب قرطاس و قلم بھی، انتظام مملکت اور کشور آرائی کے مراحل بھی درپیش ہوں اور افواج معانی کی سپہداری بھی ہو رہی ہو، دنیا دی دنغمہ پیاں "خوش باش دمے کہ زندگانی اینست" کی دعوت دے رہی ہو [illegible] اور فقر و قناعت کے بوریے پر لطف درویشی بھی حاصل کیا جا رہا ہو [illegible]
"دشمن ایمان و آگہی" اور "رہزن تمکین و ہوش" ہوں اور دو [illegible]
"تینوں" کو نمایاں کر کے بساط عیش برہم کر دیتی ہو، کسی وقت مطر[illegible]
کیف سرور میں محو کر دیں، تو کبھی کبھی حقیقی جذبات کی تراوش وہ در[illegible]
"نوحۂ غم" میں بدل جائے۔

نواب یوسف علی خاں ناظم فرماں روائے "دارالسرور رام پور" انہی مستثنیات میں تھے۔ وہ صاحب تخت و اورنگ بھی تھے اور ایک جادو نگار شاعر بھی، وہ مالک چتر شاہی بھی تھے اور اقلیم سخن کے تاجدار بھی۔

ان کے ماحول پر نظر ڈالئے تو اور حیرت ہوتی ہے کہ ان کے دل میں جذبات کا یہ ترفع، تخیل کی یہ قدرت، انداز بیان کی یہ پاکیزگی پیدا کیوں کر ہوئی! جس شخص کو بگاڑنے کے لئے مصاحبوں اور ندیموں کا جمگھٹ ہو خوش باشوں اور خوشامدیوں کا اجتماع ہو، بڑے سے بڑے نقاد فن اور ماہر زبان کی زبان بھی جس کے حضور میں گنگ ہو جاتی ہو، تعریف و توصیف، مدح و ستائش، اور "عمرت دراز باد" کے نعرے جس کے کانوں میں ہر وقت گونجتے ہوں، اگر اسے اپنے متعلق "غلط فہمی" نہ ہو تو کس کو ہو؟ وہ اپنے ہر عیب کو ہنر نہ سمجھے تو کون سمجھے؟ اگر اس پر بھی کسی شخص کو عیب و ہنر میں تمیز باقی رہے تو اس سے بڑھ کر عاقل و فرزانہ کون ہے؟

ناظم اگرچہ ایک فرمانروا تھے، اظہارِ خیال میں بے باک تھے، نہ ان کی کوئی گرفت کر سکتا تھا نہ مشورہ دے سکتا تھا، لیکن باایں ہمہ انھوں نے وہ حسن ذوق اور کمال فن پیدا کیا کہ ان کا کلام صاحب ذوقِ سلیم کو وجد وکیف میں سرشار کر دیتا ہے۔

ان کا اشہب قلم اصناف شاعری کے ہر میدان پر یلغار کرتا ہے، لیکن تغزل ان کا حصہ ہے، اس کی آپ حقیقی تحلیل کر سکتے ہوں کر لیجئے، پھر ناظم کو اس کسوٹی پر کسیے، تو آپ اسے اپنے معیار سے زیادہ ہی پائیں گے، بالخصوص محاکات اور حسن بیان میں تو اسے یدطولیٰ حاصل ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس انداز سے کہتا ہے کہ گویا سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے، وہ جب درد والم کا اظہار کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دل کی ترجمانی ہو رہی ہے، وہ جب کسی کی بے اعتنائیوں اور تنک مزاجیوں کا تذکرہ کرتا ہے تو اس حسرت و تاسف سے کہ اگر پتھر کا دل ہو تو وہ بھی موم ہو جائے، اور چونکہ وہ ایک باعظمت و جبروت شخصیت کا مالک ہے، صاحب اقتدار و صاحب اختیار ہے، حرم سرا بھی رکھتا ہے اور محلات بھی اس لئے کبھی کبھی شاہانہ تمکنت کا اظہار بھی زبان شعر سے ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ جب ناظم ایک عاشق ناکام نہیں تھے، فراق زدہ نہیں تھے، جورِ فلک کے شاکی نہیں تھے، "کسی" کے شکوہ سنج جور و ستم نہیں تھے، تو ان کے ہاں اس درد و اثر، سوز و گداز اور بے تابی و بے قراری کے کیا معنی؟ انھیں تو امراء القیس کی طرح "شب وصل" کا نقشہ کھینچنا چاہئے تھا، اپنی لغزش رندانہ کی حکایتیں مزے لے لے کر بیان کرنی چاہئے تھیں، لیکن یہ عنصر تو کم ہے، ہے تو درد و غم کی داستان، "بے قراری کا فرقت کا بیان"۔ اسے اگر آورد نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے؟

یہ خیال صحیح نہیں، یہ کیا ضرور ہے کہ ناظم اگر رامپور کے فرماں روا تھے تو کشورِ دل بھی تسخیر کر چکے تھے؟ ہو سکتا ہے کہ دل پر ایسی چوٹ لگی ہو جس نے ان سے نشاط و مسرت کے جذبات چھین لئے ہوں، دربار میں، حرم سرا میں، مصاحبوں کے مجمع میں، کاروبارِ سلطنت میں وہ اپنا

درخشاں بھول جاتے ہوں، لیکن جب رات کی تاریکی مسلط ہوتی ہو تو وہ اپنے دل میں ایک خلش محسوس کرتے ہوں، جب لوگ مصروف خواب ہوتے ہوں، وہ کروٹیں بدلتے ہوں، جب فانوس کی روشنی کاشانۂ سلطانی کو بقعۂ نور بنا دیتی ہو تو پریم کی "اندھیری نگری" میں یاس و حسرت کے بادل چھا جاتے ہوں، جب شب ماہ کی کرنیں بام و در کو جگمگا دیتی ہوں تو ان کا دل ویران و سنسان رہتا ہو اور اس وقت ہجوم جذبات میں ان کے منہ سے نالۂ موزوں نکلنے لگتا ہو جو ہر سننے والے کے لئے دعوت درد و اثر ہو۔ میرے اس خیال کی اس سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کا کلام اٹھا کر دیکھئے تو جس جگہ وہ دل کی بیتی بیان کرتے ہیں ... یا پڑھنے والا ایک عجب خلش محسوس کرنے لگتا ہے، ورنہ اگر خالی ..

طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

تو آپ لاکھ بار سنتے اور کچھ اثر نہ ہوتا۔ "استادانہ پختگی" "بلند پرو..." الفاظ آپ کے منہ سے یہ سمجھ کر نکل جاتے کہ یہ ناسخ کا مطلع ہے اس لئے ضرور ناجواب ہوگا۔ لیکن اگر کوئی ایسا شعر سنیے کہ سنیے اور سر دھنیے، تو اسے آپ اور دیکھیے کہہ سکتے ہیں؟

اس تمہید کے بعد اب میں اپنے اصل موضوع پر توجہ کرتا ہوں اور کلام ناظم کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

عام عاشقانہ مضامین | ناظم کا کلام بھی ان جذبات و خیالات سے معریٰ نہیں ہے جو "قدر مشترک" کے طور پر تقریباً ہر شاعر کے ہاں باختلاف قوافی و ردیف ملے گا۔ اس ذیل میں ان کے جو اشعار آتے ہیں ان میں کوئی خاص بات سوا اس کے نہیں ہے کہ وہ موزوں ہیں۔ ہر شاعر کے ہاں "مزخرفات" کا ایک جزو ضرور ہوتا ہے۔ فی البدیہہ کہنے سے، فرمایشی اشعار کہنے سے، خواہ مخواہ طبیعت پر زور ڈال کر کہنے سے دیوان تیار ہو رہا ہو اور کوئی ردیف اس وقت تک نہ کہی گئی ہو تو اس کی "خانہ پری" کرنے سے ایک مجموعہ تیار ہو جاتا ہے جسے حذف ہی کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ لیکن اسے کیا کیجئے۔ ہمارے ہاں کا دستور یہ ہو گیا ہے کہ موزوں صورت میں جو کچھ جس موقع پر بھی زبان سے نکل جائے اُسے

تہذیب کلیات ضرور بنایا جائے۔ غالب بیچارے نے شارع عام سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی تھی کہ اپنے اشعار کا انتخاب شائع کرایا، باقی غیر ضروری اشعار حذف کر دئے لیکن وہ حذف شدہ اشعار اتنے سخت جان نکلے کہ ہنگامۂ غدر میں بھی صحیح سلامت رہے۔ بالآخر نواب صاحب بھوپال کے کتبخانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم اس "مجموعۂ بے رنگ" کو بھی نکال ہی لائے اور ستم یہ کیا کہ شائع بھی کر دیا۔

حاصل کلام یہ کہ ناظم کے ہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جو ان کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتے مثلاً۔

آنے کو کہا ہے اس نے ناظم ‌ ‌ ‌ ‌ کچھ تم کو ہی اعتبار ہوگا

سنا بھی تم نے تو کس سے سنا خدا کی پناہ ‌ ‌ ‌ ‌ کہا ہے غیر نے جو کچھ وہ میرا حال نہیں

اک جہاں تشنۂ انداز خود آرائی ہے ‌ ‌ ‌ ‌ آپ جو چاہیں کریں آپکی بن آئی ہے

آگے ہی کا سا طور ہے کیا اب کی بار بھی ‌ ‌ ‌ ‌ باندھا ہے تم نے عہد یہ ہے استوار بھی؟

ملے گی محشر میں داد ہم کو، بندھا ہے یہ اعتقاد ہم کو ‌ ‌ ‌ ‌ ملی نہ واں بھی مراد ہم کو تو پھر بتاؤ کہ کیا کرینگے!

جلد جم جاتا ہے ہر شخص کا نقشہ کیسا ‌ ‌ ‌ ‌ سادہ دل ہو وہ بت آئینہ سیما کیسا!

مایوسی | لیکن ان مہملات سے قطع نظر کرکے ان کے اصل کلام کا بنظر غائر مطالعہ کیجئے، تو ناظم کی خصوصیات خاصہ آپ کو رفتہ رفتہ متاثر کرتی جائیں گی۔ درد و اثر، سوز و گداز [illegible] و جفا کے

نسبت آپ نے شعرا کی زبان سے اکثر سنے ہوں گے لیکن ناظم کی آہ جگر گداز بزم و انجمن میں صاعقے کا حکم رکھتی ہے۔ اس کا درد دل جب کہ بے نیاز دعا و دوا ہو جاتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے:۔

عیسیٰ کا بھی علاج کئی بار ہو چکا　　اچھا غم فراق کا بیمار ہو چکا

اب کیوں کمی کرے تجھے کس کا لحاظ ہو　　رونے کا نام دیدۂ خونبار ہو چکا

یہاں غم فراق نے جان پر بنا دی ہے۔ "اس کی کج ادائیوں اور سرد مہریوں نے مایوس کر رکھا ہے لیکن دل ہے کہ محبوب کی طرف سے "صفائی" پیش کر رہا ہے۔ آخر خود اپنے تئیں مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔

ناظم غلط ہو مہر و محبت سے چشم داشت　　واقف نہیں۔

"اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا نہیں کرایا" آخر ناظم

شاعر ہے، ندیم ہے، قصہ خواں ہے　　پائی نہ انکے دل میں

یہاں پر تو جان پر بنی ہوئی ہے مگر ناصح صاحب ہیں کہ "فلسفۂ عشق" پر تقریر فرمائے جا رہے ہیں۔ ایسے وقت میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ

نصیحت کا نہیں اب وقت ناصح　　اٹھا ہاتھ ایسی باتوں سے دعا کر

اس "پاپ کی دنیا" میں ناظم کسی کو اپنا ہم زبان و ہم نشیں نہیں پاتے اور پائیں کیونکر جب صورت مسئلہ یہ ہو:

خدا بے نیاز اور بت سنگ دل　　کہو کس سے ہم راہ پیدا کریں!

یہ شعر ملاحظہ فرمائیے، رنجوری عشق کا کتنا باکمال مرقع پیش کیا ہے:

قاصد شکستہ پا و کبوتر شکستہ حال　　جانے کا خط کے واں کوئی عنوان ہی نہیں

دل لاکھ لاکھ سمجھاتا ہے کہ محبوب کی سرد مہری وقتی ہے، اس کی کج ادائی، التفات پنہاں کی غماز ہے لیکن

توقع ایسے [illegible] گساری کی پڑے ناظم　　کبھی بھولے سے بھی جس نے نہ پوچھا ہو کہ "کیونکر ہو"

یہ حیاتِ مستعار توکشمکش اضطراب و اضطرار میں گزری، شادکامی کا زمانہ ناکامی میں بسر ہوا، اب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "وہ"

پوچھنے آئیں گے پر جب کہ مجھے　　　بات کرنے کی نہ طاقت ہو گی

"وعدۂ یار" شرمندۂ ایفا کب ہوا ہے؟ لیکن ناظم فریب میں آگئے۔ محبوب ستم گار نہ اب آتا ہے نہ جب آتا ہے، آخر بے قرار ہو کے کہتے ہیں،

وہ اپنی ضد کے ہیں پورے نہ آئیں گے ہرگز　　　بس ان کی راہ ہم اے غمگسار دیکھ چکے

ان کا حال زار دیکھ کر ہر شخص انھیں تسلی دیتا ہے، لیکن وہ بھی "اس کی طینت سے واقف ہیں بالکل بجا طور سے جواب دیتے ہیں۔

یہ تیری سخن سازیاں ہیں ندیم　　　کسی پر وہ کیوں رحم کھانے لگے

عرضِ حال | ایک ناکام تمنا حصولِ مقصد کے لئے ہر امکانی کوشش صرف کر ڈالتا ہے، ناظم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے، انھیں بھی "کوچۂ رقیب" میں "سر کے بل" جانا پڑا، منتِ اعدا کرنی پڑی، اپنی خودداری کا خون کرنا پڑا، اور یہ سب کچھ محض اس لئے کہ کسی کے حریمِ ناز میں باریاب ہوسکیں، لیکن جب ان باتوں سے بھی کام نہ نکلا تو انھوں نے ایک بالکل نیا طریقہ نکالا جسے بظاہر کامیاب ہونا چاہئے تھا۔ اب یہ خدا کو معلوم ہے کہ وہ اس میں کامیاب کہاں تک ہوئے؟ وہ طریقہ یہ کہ انھوں نے مختلف پیرایوں میں محبوب کے جذبات پر اثر ڈالنا شروع کیا کبھی رقیب روسیہ کے معائب چن چن کے بیان کئے، کبھی اپنی وفاداریوں اور جاں سپاریوں کو شفیع لائے، کبھی حسن وفا پر لیکچر دے کہ اس زمانے میں وفا عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ اگر کسی میں یہ گوہرِ نایاب پایا جائے تو اس کی قدر کرنی چاہئے۔ کبھی کبھی رفع غلط فہمی کے خیال سے یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ اگر جفا کاریوں کا یہی عالم رہا تو ایسا مخلص اور بے ریا دل کاہے کو ملے گا؟ غرض ہر ہر طرح سے سب سے پہلے تو اپنی جاں نثاری اور وفاداری کا "سکہ" یوں بٹھاتے ہیں،

دیکھ تو بھی کہ گلا ہے تہِ خنجر لیکن　　　تجھ کو اے یار کس ارمان سے ہم دیکھتے ہیں

"معافی" دے رہے ہیں مگر میری زبان آلودۂ شکوہ بھی نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی اپیل کئے جا رہے ہیں کہ میری حالت تو یہ ہے کہ بات بھی نہیں کر سکتا اور تم ہو کہ "شکوہ" کی شکایت کر رہے ہو'

اس پہ کیجے گمان شکوے کا بات کرنے کی جس میں طاقت ہو

کنایہ ہے کہ ہم نے شکایت نہیں کی لیکن انداز بیان ملاحظہ ہو کہ خواہ مخواہ رحم آجائے۔

منہ ترا دیکھنا نصیب نہ ہو منہ سے نکلی اگر شکایت ہو

یہ شعر ملاحظہ ہو'

جان دی گو تڑپ کے پر تم کو اک تماشہ دکھا

محبوب پر احسان جتاتے ہیں

طعن عدو' ملامت احباب' جور خلق دیتے نہ تم کو دل

مسیحائی کا دم بھرتے ہو' سچ' ایسا ہی ہے لیکن کبھی اپنے مریض غم کو بھی پوچھو کہ کیسا ہے؟

اپنی کارگزاریوں کو بھی وہ قیس و فرہاد سے کم نہیں سمجھتے اور بلا کسی انکسار کے صاف صاف "عرض" کرتے ہیں۔

افسانۂ مجنوں سے نہیں کم مرا قصہ اس بات کو جانے دو کہ مشہور نہیں ہے

پوچھتے ہیں کہ بتلائیے سوا "خاکسار" کے اور

وہ کون ہیں کہ جو محبوب کے ستم سہہ کر زباں کو زمزمہ سنج دعا نہیں کرتے؟

سب سے بڑی شکایت تو یہ ہے کہ ناظم صاحب کی طرح

نہ بذلہ سنج' نہ شاعر' نہ شوخ طبع رقیب دیا ہے آپ نے صحبت میں اپنی بار کسے؟

"احتیاطاً" کبھی کبھی یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ

جفا اُدھر سے اگر بے شمار باقی ہے ادھر بھی دل پہ ابھی اختیار باقی ہے

بوالہوس کے جتنے بندے تھے وہ تو جفائے یار سے آشفتہ خاطر ہو کر اٹھ گئے، لیکن ایک ناظم صاحب کا دم تھا جو خلوص و وفا کا نام لئے بیٹھا تھا، اطلاعاً عرض کرتے ہیں،

سب اٹھ گئے ترے در سے خبر ہے ناظم کی   ستم کشوں میں یہی دل فگار باقی ہے!

درد و اثر | درد و اثر، سوز و گداز، اور یاس و حرماں کے جذبات بھی کلام ناظم کا ایک مخصوص حصہ ہیں، جذبات جب حقیقی ہوں، درد دل جب سچا ہو، منہ سے جو لفظ نکلتا ہے اس میں درد و حسرت کا ایک جہان پوشیدہ ہوتا ہے کیف و اثر کا ایک مے خانہ ہوتا ہے کہ اس شراب ناب کا ایک قطرہ بھی جس کے کام و دہن تک پہنچا وہ اپنے دل کی دنیا میں ایک انقلاب محسوس کرنے لگتا ہے۔

غالب کشور سخن کا فرماں روا تھا۔ جس زمین کو اس کی جولانی سخن نے پامال کر دیا پھر ہر شخص کے لئے خواہ وہ کتنا ہی قادر الکلام ہو اس کا تسخیر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اور اس قسم کی جرأت اگر کسی سے ہو بھی تو اصل اور نقل کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے، لیکن ناظم اپنے استاد غالب کی ایک مشہور و معروف زمین پر قدم رکھتے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں انھوں نے کوئی ٹھوکر نہیں کھائی۔ ملاحظہ ہو،

وہی تم ہو، وہی خنجر ہے، پر انصاف کرو   ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

جب نہ ہو کوئی جفاکش تو جفا کا کیا لطف   کیا کرو گر نہ کرو ترک جفا میرے بعد

خط مرا پڑھ کے تمہیں رحم تو آیا لیکن   یہ بھی قسمت کا لکھا تھا کہ پڑھا میرے بعد

اس شعر میں گو توارد کی بو آتی ہے لیکن پھر بھی سن لیجے،

کس نے اس حلقۂ کاکل میں پھنسایا دل کو   کون اس چشم کا بیمار ہوا میرے بعد

یہ شعر طالب و مطلوب کی نفسیات کا صحیح مرقع ہے کہ

مل جاتے ہیں تو کہتے ہیں اچھی طرح تو ہو   گویا ہمارے جی میں کچھ ارمان ہی نہیں

در یار کی رسائی تک جب کوئی صورت نہیں نکلتی تو کہہ اٹھتے ہیں،

ان کی خلوت میں مجھے بار کہاں ہے ناظم قصہ خواں کاش سنادے مرے افسانے کو

ناصح کے طوفانِ تکلم سے ہر شخص واقف ہے۔ ناظم کو جب سابقہ پڑا تو یہ کہہ کے اپنا پیچھا چھڑاتے ہیں،

بکے جو اس طرح کون اس کو دانشمند جانیگا مجھے سودا سہی ناصح۔ یہ کیا تجھ کو بھی سودا ہے؟

ہجر و انتظار کی کتنی صحیح تصویر کشی کی ہے،

وہ اپنے وعدے کے سچے ہیں آئیں گے لیکن مجال صبر کسے تاب انتظار کسے؟

عاشق کے حال زار کا کس قدر دردناک نقشہ کھینچا ہے،

نہ دانش درست اور نہ بینش بجا دل و دیدہ۔

جفائے یار اور جورِ دلدار سہتے سہتے امید سو چلی تھی کہ وہ

اور تلافی ستم کرے گا، عذرِ جفا کرے گا، پیمانِ وفا بندھے گا، مجھے

ساغر چھلکیں گے، لیکن نتیجہ نکلا تو یہ کہ

یاں آرزوئے عذرِ ستم اور وہاں ہنوز اپنے کیے پہ یار پشیمان ہی نہیں

ناظم کی وفا کیشیوں کا صلہ بارگاہ حسن سے ملا تو یہ کہ وہ اور زیادہ ہدف ستم بنائے گئے

بعض لوگ ہیں کہ تسکین دے رہے ہیں کہ تمھارا خیال ہی غلط فہمی پر مبنی ہے، وہ صنم حیلہ گر اب آیا اور اب آیا، لیکن دل کی آواز کہہ رہی ہے،

مجھ سے بگڑے ہوئے مدت ہوئی ان کو ناظم بیچ والے ہیں ابھی بات بنائے جاتے

سہل ممتنع | شعر و شاعری میں ایک اہم چیز سلاست و روانی یا بالفاظ اصطلاح سہل ممتنع ہے۔ ناظم اس میدان کے بھی شہسوار، یکہ تاز اور مرد میداں ہیں۔ سہل ممتنع کی تعریف یہ ہے کہ کلام روزمرہ سے اس قدر مرصع ہو کہ گمان یہ کیا جائے کہ اس سے بڑھ کر آسان اور سلیس کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ پڑھنے والے کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ تو کیا ہے میں خود اس سے کہیں بہتر کہہ سکتا ہوں لیکن دعویٰ ثابت کرنے کے لئے جب ہاتھ قلم دوات سے آشنا ہوں تو معلوم یہ ہو کہ

دل کی بیتی دل سے کہنا سہل ہے پر آسان نہیں

خیال کر لینا جتنا آسان تغافل کر کے دکھانا اس سے کہیں مشکل ہے۔ دوسری سب سے اہم خصوصیت اس کلام کی یہ ہے کہ پانی کی طرح رواں ہو، تیر کی طرح بے پناہ ہو اور محبت کی طرح دل میں گھر کرتا ہو۔

کلام ناظم کا آپ مطالعہ کیجئے، تو محسوس کریں گے کہ ناظم اس میدان کا بھی مرد میداں ہے۔
گ وظ کی ردیف بہت سخت ہے، بالعموم ایسی زمینوں میں طبع آزمائی اس وقت کرتے ہیں جب "خانہ پری" مقصود ہوتی ہے۔ لیکن ناظم کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ الفاظ وضع اسی ردیف اور ناظم کے لئے کئے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو

ہم سے چھٹتی ہے کہیں بادہ پرستی ناظم   منہ پر واعظ کے کیا کرتے ہیں ناچار لحاظ

کیا غضب ڈھائے دیکھئے ناظم   ہے برا چشم خوں فشاں کا رنگ

یہ اشعار ملاحظہ ہوں،

وصال دائمی کا ہے تصور   بہار بے خزاں ہے اور میں ہوں
مزا دیتا ہے تنہائی میں رونا   کہ اک دریا رواں ہے اور میں ہوں
تحمل کی نہیں اب تاب زنہار   نبرد آسماں ہے اور میں ہوں

یہ سوء اتفاق ملاحظہ ہو،

خوش ہو رہے تھے ہم کہ بنایا ہے ہم نے یار   دیکھا تو ان کے در پہ وہ دربان ہی نہیں

یہ شعر بغیر کسی تشریح کے سنئے،

وہ سن کر درد دل کہتے ہیں پھر میں کیا کروں ناظم + خلاصہ آپ کی تقریر کا یہ ہے کہ "مرتے ہیں"

روانی کے ساتھ جذبات کی لطافت ملاحظہ ہو،

ہم نہیں چاہتے کہ دولت ہو   کون ممنون بخت و قسمت ہو

انھیں بھی نچوڑ ڈالیں گے   اشک کے پوچھنے سے فرصت ہو

شاعرانہ مبالغے کے ساتھ جذبات کی یہ تصویر کشی کتنی خوب ہے،

شبِ غم کی درازی قصہ کوتہ یوں سمجھ لیجے   کہ یہ وہ شب ہے جس کے بعد صبح روزِ محشر ہو

باتوں باتوں میں کتنے پتے کی بات کہہ رہے ہیں،

وفا کی ہم نے اور تم نے جفا کی   تم اچھے، ہم برے، قدرت خدا کی

جنونِ عشق کے باوجود یہ "حکمتِ عملی" کتنی داد طلب ہے۔

پڑھ کے خط نامِ غیر سے ان کو   حال اپنا ۔

بہ ذیلِ "خمریات" یہ شعر بھی خوب ہے،

ناظم ہمیں نظر نہیں آتا وگرنہ آج   اس کو بھی ہوتے

ملا ہے مے کدے کا در کھلا ہوا ناظم   پھر اور کہتے ہیں تائید کردگار کسے ؟

قطعۂ ذیل روانی، سلاست، ہجوم جذبات اور وفورِ محبت کا کتنا کامیاب مرقع ہے!

کل کہا میں نے کہ اے نامہرباں   ق   آدمی کو آدمی سے کام ہے

دیکھ تو کب سے یہ تیرا دردمند   عشق میں رسوائے خاص و عام ہے

جانتا ہے تو بھی آیا یا نہیں   کوئی تیرا عاشق ناکام ہے ؟

سن کے ساری داستاں بولے کہ "ہاں   آپ کا یوسف علی خاں نام ہے"

اشعارِ ذیل بھی اپنی سادگی اور کیف و اثر کی آپ ہی نظیر ہیں،-

یوں تو چھیڑ ان کو ہر کسی سے ہے   پر عداوت فقط مجھی سے ہے

دوست بن کر ہمیں بناتے ہیں   دعویٰ دوستی ہنسی سے ہے

کیوں چھپاتا ہے حال رنجشِ غیر   ہم نے بھی سن لیا کسی سے ہے

میرا ان کا معاملہ ناظم   کچھ جدا جنگ و آشتی سے ہے

اپنے دل کی خود "مخبری" کرتے ہیں،

نہ بیاباں نہ خیاباں کوئی کوچہ ہوگا　　　جانتا ہوں دل صدپارہ جہاں رہتا ہے

یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔ ادائگی مفہوم کے ساتھ بے تکلفی زبان کا اتنا نادر نمونہ شاید ہی کہیں مل سکے۔

جب کہوں کیوں خفا ہو کیا باعث؟　　　کہتے ہیں "پوچھنے کا کیا باعث؟"

اس سلسلے میں یہ آخری شعر بھی سن لیجئے۔

کہے یہ کون کہ تم کیوں وفا نہیں کرتے؟　　　وہ کیا کہیں گے مگر یہ کہ "جا، نہیں کرتے"

قدرِ زبان و حسن بیان ناظم جب روانی و سلاست کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ غالب کے شاگرد نہیں معلوم ہوتے بلکہ میر تقی میر کے اسکول کے طالب علم یا میر درد کے حاشیہ نشیں، یا خواجہ آثر کے زلہ ربا معلوم ہوتے ہیں یا مومن کے رنگ سے ان کا رنگ مل جاتا ہے جس کے مختلف نمونے آپ سطور بالا میں ملاحظہ کر چکے ہیں لیکن جب وہ اپنی طلاقت لسانی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں، اپنی خطابت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں، اپنے جوش بیان اور زور زبان کا لوہا منوانا چاہتے ہیں تو ذوق و سودا کے ہم عصر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ جن باتوں کو وہ صاف، سادہ اور دلنشیں الفاظ میں ادا کرتے ہیں اسی مفہوم کو وہ پرجوش، زوردار اور خطیبانہ لب ولہجے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ بطور ثبوت ملاحظہ ہو۔

نوبت ہے تیری گردش چشم سیاہ کی　　　دنیا میں دور گنبد دوّار ہو چکا
ہے ناوکِ نگہ کے مقابل خدنگ آہ　　　اب میرا وار روک، ترا وار ہو چکا

چاہیئے تجھ سے رہیں بندہ و آزاد ملول　　　چاہیئے تجھ سے کریں کافر و دیندار لحاظ
نہ تجھے حشر کا اے فتنۂ ایام خیال　　　نہ تجھے خلق کا اے شوخ ستمگار لحاظ

کتنے پر شکوہ الفاظ ہیں۔ اپنے عشق کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں۔

ابتدائے عشق میں ہوں منتہی میرا آغاز اور کا انجام ہے
اور لوگ کہے کم

سن تو لیتے ہیں نہ مانیں گرچہ بات کیوں نہیں سنتے ہو یہ کیا بات ہے ؟
اپنے محبوب سے مطالبہ کرتے ہیں،

ستم کرو ہم پہ بے تحاشا، لحاظ کس کا ہے، خوف کیا ہے ؟
اگر ہے گریہ تو بے اثر ہے، اگر ہے نالہ تو نارسا ہے

رند تشنہ کام ساقی جرعہ بخش سے مخاطب ہے،

ختم بھی ہوتا تو تسلی مری ہوتی ساقی بس یہی ۔۔
افسانۂ غم ختم نہیں ہوتا تو کہتے ہیں،

حکایت غم ہجراں ابھی سنے جاؤ شکایت تعب انتظار ہی ہے
اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں،

عبث ہے اے دل فغان و زاری، عبث ہے لے دیدہ اشکباری
عدو سے مانا کہ ہے لگاوٹ، مگر وہ کس سے وفا کریں گے ؟

بڑھا ہے درباں سے ربط باہم، یقیں ہے اب سب رفیق اپنے
گلی میں ان کی پھرا کریں گے، ہم ان کے در پر رہا کریں گے

محاکات | ماہرین سخن اور نقادان فن کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ شاعری محاکات کا دوسرا نام ہے یا محاکات کو شاعری کہتے ہیں یعنی کسی واقعے کو بالخصوص کسی ایسے واقعے کو جو محبوب سے متعلق ہو اس طرح بیان کرنا کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جائے، یہ معلوم ہو کہ یہ واقعہ اپنی تمام جزئیات و تفاصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں اور حظ حاصل کر رہے ہیں۔ ناظم محاکات کے بھی بادشاہ ہیں، وہ جذبات کے بھی بہترین مصور ہیں، وہ احساسات عشق کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سماں پھر جاتا ہے مثلاً،

پڑھتے ہی درد دل کا بیاں اٹھ کھڑے ہوئے — یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنا گیا

آج پھر ان سے میں احوال دل زار کہوں گا — کہتے ہوئے ڈرتا ہوں یہ ناچار کہوں گا
غصہ میں کہا تم سے ہم اب کچھ نہ کہیں گے — گر آپ سنیں گے تو میں سو بار کہوں گا
چپکے کے دیتا ہوں تم آزردہ نہ ہونا — دلچسپ لطیفے بھی میں دو چار کہوں گا

ایک بار ناصح اپنی رو میں ناظم کے سامنے اس غارتگر صبر و شکیب کا نام لے گئے، ناظم ابل پڑے۔

رو کو تو سہی اب مجھے۔ لو۔ حضرت ناصح — لینا ہی نہ تھا نام "کسی کا" مرے آگے

شعر ذیل دیکھئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہمارے سامنے ہی ہو رہا ہے۔

کب میں نے کسی بات پہ تکرار نکالی — دیکھا مجھے اور آپ نے تلوار نکالی

ناظم ایک بار حریم ناز میں باریاب ہوئے، وہاں جو کچھ پیش آیا ان کا موئے قلم اس کی نقاشی کرتا ہے۔

گیا تھا کہ ان کی خوشامد کروں — وہ الٹا مجھی کو منانے لگے
کبھی خیر مقدم، کبھی مرحبا — زباں پر یہ الفاظ لانے لگے
کبھی میرے قربان ہوتے رہے — کبھی مجھ کو پنکھا ہلانے لگے

.. ..

وہ محفل میں آئیں تو ناظم ضرور — مغنی یہ اشعار گانے لگے

یہ سوال و جواب ملاحظہ ہوں،

کہئے اگر کہ طرز ستم ناپسند ہے — کہتے ہیں واہ آپ کی بھی کیا پسند ہے

ظلم وہ کچھ اور پھر یہ عذر بدتر از گناہ — کہتے ہیں مجبور ہوں ناظم تری تقدیر سے

عاشقانہ زندگی ناظمیں عشق و محبت کی دنیا ایک عالم ہے ماورائے عقل و ہوش۔ ایک عاشق ناکام جو ہجر و فرقت کے مصائب جھیلتا ہے، ہزیمت و پسپائی سے دوچار ہوتا ہے اور حسرت و الم سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس و جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا، عالم خیال میں اس کا صدر نشین بزم تخیل بصد ناز و ادا جلوہ فرما ہوتا ہے، تو وہ سوچتا ہے کہ آلام ہجر کی شکایت یوں کرنا چاہیئے، درد فرقت ایسے مؤثر انداز میں بیان کرنا چاہیے کہ اس کا دل بھی موم ہو جائے، دل کی بیتی کچھ اس طرح پیش کرنی چاہیئے کہ "وہ" جفا کار بھی تڑپ اُٹھے لیکن حسن اتفاق سے جب وہ موقع حاصل ہو جائے، جب حسرت تکلم پوری ہو رہی ہو، جب آنکھیں لطف دید ... وقت دماغ کے تیار کیئے ہوئے سارے نقشے درہم برہم ہو جاتے ... اور بیان مدعا کی جرأت نہیں پڑتی بلکہ اس منظر کے افتد ... کہا کیا؟ صرف حسرت دید پوری کرتے رہے، زبان حرف شکایت سے ... حد درجہ ہوش ربا اور تکلیف دہ ہوتا ہے، لیکن چونکہ "بعد از وقت" ہوتا ہے، اس لئے لاحاصل۔ یہ مواقع ناظم کو بھی پیش آئے اور اپنی حسرت کو انھوں نے بھی مختلف اسالیب سے بیان کیا ہے مثلاً

کل ہم ان سے مل کے کہہ آئے سب اپنا درد دل
پھر بھی ناظم شکوۂ بیداد در ہاں رہ گیا

رہ تو آیا اس سے لیکن ہم نشیں دل میں کہتا ہوں کہ ناظم کیا کیا؟

وعدہ پر اس سے کیوں قسم مانگی مفت بگڑی، بنی بنائی بات

بت سے ناخوش ہے تو کیوں اٹھ نہیں جاتا ناظم

دیر میں تذکرۂ کعبہ و زمزم کب تک !

اس ستم گر کے ظلم سہہ کر اور ظالم بنا دیا میں نے

وہ عذر ہائے موجّہ سنے کہ کیا کہئے ہوئے ہم ان سے گلہ کرکے شرمسار بہت

محبوب سے اختلاف | اگرچہ جذبات محبت، والہانہ حد تک پہونچے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی اپنے محبوب سے اختلاف بھی کرجاتے ہیں۔ اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیے، ان میں حسن بیان، لطف زبان، بے ساختگی الفاظ، اور واردات قلب کا جتنا مکمل نقشہ کھینچا ہے وہ تعریف و توصیف سے قطعاً بے نیاز ہے۔

تم دیدۂ گریاں کو کہا کرتے ہو ناسور میں ضد سے اسے ابر گہربار کہوں گا
آوارہ و سرگشتہ مجھے کہتے ہو اچھا میں بھی تمھیں بے مہر و ستمگار کہوں گا
گھر بیٹھے ہوئے تم جو مجھے کہتے ہو مجنوں میں تم کو نہ لیلی اسے بازار کہوں گا؟
تم چاند سے مکھڑے پہ کیا کیجیو نازش میں کاکل مشکیں کو شب تار کہوں گا

ایک بار بزم محبوب میں جو پہونچے تو بازپرس ہوئی اور حکم دیا گیا کہ تشریف لے جائیے، ناظم رخصت ہونے سے پیشتر بالفاظ ذیل "صدائے احتجاج" بلند کرتے ہیں:-

مجلس کو توڑ دیجئے، میں سب کے ساتھ ہوں لیکن مجھے نہ بزم سے تنہا اٹھائیے

شان عاشقانہ | ناظم کو اپنی عاشقانہ شان پر پندار ہے، فخر ہے اور بلا کسی تامل کے وہ صاف صاف الفاظ میں ظاہر بھی کرتے رہتے ہیں اس لئے کہ محبوب کو "غلط فہمی" نہ ہو اس لئے وعدہ خلافیوں اور اپنی انتظار آزمائیوں کو ظاہر کرتے ہیں،

وعدہ گر روز کئے جائیے گا روز سمجھوں گا کہ آج آئیے گا

اپنے متعلق "صفائی" دیتے ہیں،

[illegible] حکایت میں آکے مل جاؤ　　سبھی ہیں یاد ستم ہائے بے شمار کسے ؟

بزم حسن میں بلا اذن و اجازت باریاب ہونا چاہتے ہیں، اس لئے چاہتے ہیں کہ تقریب ملاقات کے لئے کچھ فکر کریں، اسی کشمکش میں یہ شعر ہو گیا،

گزرے گی شغل حیلہ تراشی میں شب مجھے　　جانا ہے بزم یار میں کل بے طلب مجھے

کہتے ہیں،

تمہاری ہر بات دلنشیں ہے، کسی طرح کا گلہ نہیں ہے

جو داد دیجے تو آفریں ہے، جو جفا کر...

لے ہم بھی جھوٹا سمجھتے ہیں لیکن　　خوش آئی

پھر رہا ہے وہ آج کچھ خوش خوش　　تو نے ناظم سے کیا کہا ہوگا ؟

تسلی | " اس کی ستم رانیوں اور جفا کاریوں کا جواب خود دیتے ہیں۔ جب ہم نشیں نہیں ملتا، ہمدرد و غمگسار نہیں ملتا، تو اپنے دل میں خود توجیہیں اور تاویلیں کرتے ہیں، اور دل کو مطمئن کرتے ہیں۔ یہ توجیہ و تاویل بھی اپنے اندر حسرت و الم کا نہایت ممتاز رنگ رکھتی ہے۔

خوبی قسمت سے خبر ملی کہ وہ کشور دل کا خسرو بعید شان کجکلاہی آ رہا ہے، دل بانسوں اچھلنے لگا، ہوش و حواس رخصت ہو گئے، قوت فہم و فکر زائل ہو گئی، اور مبہوت سے ہو کر رہ گئے، تو اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں کہ اس قدر اضطراب کی کیا بات ہے،

ترے گھر وہ آئے ناظم تو یہ اضطراب کیا ہے　　کوئی بادشاہ آیا کوئی شہریار آیا ؟

یہ مانا کہ نالہ نارسا ہے، آہ بے اثر ہے لیکن

ناظم تم ان سے روز کہے جاؤ حال دل　　کب تک نہ دیں گے از رہ شرم و حیا جواب

غلط سہی اثر آہ و نالہ پر ناظم   رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اچھا ہوا کہ موسم گل میں ہوئے اسیر   چھوڑا ہے ہم نے باغ کو برگ و نوا کے ساتھ
رد و قبول خلق سے ناظم غرض نہ رکھ   اچھا ہے گر معاملہ تیرا خدا کے ساتھ

لگاوٹ غیر سے اس کی جلا کر خاک کر دیتی   سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس کا ہے؛

خوف اثر تو نالہ سے ہے گو اثر نہیں   سنتے ہیں ہم کہ ان کو ہمارا خیال ہے

شکوہ | زبان کبھی کبھی حرف شکایت سے بھی آشنا ہو جاتی ہے، لیکن نہایت بے کسانہ لب و لہجے میں،

میں تو اٹھنے ہی کو تھا بزم سے کیا ہو جاتا   جام دے غیر کو دیتے تم اگر میرے بعد

شکوہ بطور طنز

میری وفا کی داد نہ جرم عدو سے بحث   کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

شبستاں میں رہو، باغوں میں کھیلو، مجھ سے کیوں پوچھو
کہ راتیں کس طرح کٹتی ہیں دن کیوں کر گزرتے ہیں

طنز | بایں دعوائے الفت و محبت، محبوب پر کبھی کبھی "چوٹ" بھی کر جاتے ہیں،

ان کو خیال تھا کہ سنیں گے خبر کچھ اور   اچھا ہوا مریض محبت، برا ہوا

خدا کا خوف ہو تو دل کی بیتابی پہ رحم آئے   وگرنہ رقص مرغ نیم بسمل بھی تماشا ہے

ہوتے ہی وہ دو دل کا ٹکڑے ٹکڑے ہوئے — یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنا گیا
تم خوش ہوئے ہو بزم میں آنے سے غیر کے — یہ بھی خبر نہیں ہے کہ ناظم خفا گیا

آپ تو
آئے تھے پونچھنے مرے آنسو کدھر چلے — گھبرا گئے تراوش خون جگر سے آپ؟

عذر ستم فریب و تمنائے صلح جھوٹ — صحبت بگڑ گئی تو بناتے ہیں اب مجھے

پتے کی باتیں | ناظم چونکہ ایک تجربے کار عاشق ہیں، راہ محبت کے گرم و سرد سے واقف ہیں، اس لئے اس معاملے پر جو بات کہتے ہیں وہ اس شان سے کہ

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے

مثلاً

لگتا ہے امتحان وفا میں سزا ہنوز — ناظم اگرچہ تجب

ناظم وفائے وعدہ کی امید ہے کسے — مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہو گیا

بھید کے معلوم کرنے کے لئے غم خوار ہیں — عاشق زار اس کے ہیں کہنے کو میرے یار ہیں
سادہ رویوں کو غلط کہتے ہو ناظم سادہ دل — ان کو بھولا کون کہتا ہے بڑے ہشیار ہیں

ہے وہ تقریب فراق اور یہ تمہید وصال — وصل سے لطف سوا نامۂ و پیغام میں ہے

چھیڑ چھاڑ | ناظم ایک شوخ و شنگ طبیعت کے مالک ہیں، عشق و محبت میں یکسر بلکہ تمام تر فتادگی و نیازش سے کام لینا پڑتا ہے، خوش طبعی اور پر لطف سخن آرائیاں اور زیادہ باعث کلفت

جھلکتا رہا لیکن ناظم اس غم والم کی فراوانی کے باوجود کبھی کبھی ہنس کر بھی نظر آتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ محبوب پر بھی کبھی کوئی فقرہ کس دیتے ہیں، کبھی کسی اور انداز سے اسے چھیڑتے ہیں، غرض اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا کوئی نہ کوئی موقع نکال ہی لیتے ہیں، فرماتے ہیں،

مدت چپ بیٹھا ہے آخر شکوۂ بیجا کریں   اس بہانے سے وہ گرم گفتگو ہو جائے گا

دیکھیں اب منع کریگا ہمیں کیوں کر درباں   طرح سے خانہ پڑی ہے در دلدار کے پاس

اپنے مقصد کے لئے تو بھی گرلائے رجوع   کاش مجذوب کہیں سب ترے دیوانے کو

تکلف کیا ہے گر صورت میں مہر و مہ سے بہتر ہو   طریق ظلم میں بھی دو قدم گردوں سے بڑھ کر ہو

رہا ناظم کوئی دن اور زندہ   ترے ناوک نے سنتا ہوں خطا کی

ناظم کبھی نہ کوچے میں تیرے قدم رکھے   بیچارہ کیا کرے کہ یہی رہ گزار ہے

کیوں چھپاتے ہے حال رنجش غیر   ہم نے بھی سن لیا کسی سے ہے

دیکھیو تو کہ وہ غصہ میں کیا کرتے ہیں ناظم   کیوں ان سے کبھی شکوۂ بےجا نہیں کرتے

<u>شوخی</u> | شعرا کا ایک اہم موضوع رندی و سرمستی، شوخی و بذلہ سنجی اور واعظ و ناصح کے ساتھ جنگ وجدل ہے۔ بلا استثنا ہر شاعر نے بقدر زور طبیعت واعظ و ناصح کی پگڑی اچھالی ہے، آوازے کسے ہیں اور ان بے چاروں کو ہر طرح آماجگاہ زور طبع بنایا ہے۔ ناظم بھی کسی سے

پیچھے نہیں ہیں۔ وہ بھی اپنی رندی و مستی کی حکایتیں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں انھیں بھی جب واعظ یا ناصح سے پالا پڑتا ہے تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے وہ فقرے کستے ہیں کہ شاید ناصح صاحب یا واعظ صاحب بھی ہنسے بغیر نہ رہتے ہوں۔ لیکن اس کا خیال رکھا ہے کہ ابتذال و سوقیت کی اپنے دامن کو ہوا کبھی نہیں لگنے دی، حالانکہ اس میدان میں "بڑے بڑے شعرا" سے "بڑی بڑی" لغزشیں ہو چکی ہیں۔ درحقیقت یہ وادی بھی ہے بہت خارزار۔ ابتذال و شوخی میں بہت کم فرق ہے، یوں تو شوخی نہایت پسندیدہ چیز ہے لیکن ذرا ابتذال کا رنگ آیا کہ شعر نظر سے گرا، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ شاعر نظر سے گرا۔

لیکن ناظم نے سنجیدگی اور ظرافت کو ساتھ ساتھ نباہنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے، مثلاً

واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں کیا بتلاؤں   میں نے ۔ ۔ :

لی محتسب نے گھر کی تلاشی تو کیا ہوا   نکلا سبوئے کہنہ میں سرکہ بھرا ہوا
عزم حجاز حضرت ناظم سے تھا بعید   سنتا ہوں راہ میں سے پھر آئے جلا ہوا

زاہد کو کیوں شراب کا یارب مزا پڑا   رسوائے شہر و کوچہ و بازار ہو گیا
سکیں کا لین دین نہ تھا مے فروش سے   آخر گدائے خانہ خمّار ہو گیا

معتقد ہوں کعبہ کا ناظم مگر یہ واں جا کر مجھے   عبرت آتی ہے کہ کیا بتخانہ ویراں ہو گیا

حرمت مے میں سنا کیجئے واعظ کا بیاں   بحث نادان سے کیوں کیجئے دانا ہو کر

مقبول سہی وہد کا مسیلہ مگر اے شیخ اچھا نہیں بایں ہمہ تمکین و وقار بھی

معرفت عالم و عابد کو کہاں ہے ناظم بس یہ اتنے ہیں کہ اورا د و مسائل جانیں

اس بت کا کوچہ مسجد جامع نہیں ہے شیخ اٹھیے اور اپنا یاں سے مصلا اٹھائیے

پڑھتا ہے شراب پی کے لاحول ناظم رندوں میں پارسا ہے

محروم کیوں رہیں گے شراب طہور سے آخر خدا کے بندے ہیں ہم بادہ خوار بھی

آج ساقی یار کے گھر دعوت اغیار ہے کیا مزا ہو گر خم مے میں نمک داں چھوڑ دے

حقائق | ناظم صرف ایک عاشق ناکام ہی نہیں ہیں کہ جن کا صحیفۂ زندگی عشق و محبت کی داستانوں، ہوا و ہوس کی حکایتوں، اور رندی و سرمستی کے ولولوں سے لبریز ہو، بلکہ وہ صحیح معنوں میں ایک "شاعر" ہیں۔ ان کی نظر فطرت کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے اور وہ وہ سب کچھ دیکھتے ہیں جو ایک مفکر دیکھ سکتا ہے۔ جب وہ حقائق و معارف، اسرار و نکات، اور حکمت و موعظت پر کچھ کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ایک نکتہ رس اور دقیقہ سنج فلسفی ہے جو رموز فطرت کی گرہ کشائی کر رہا ہے۔ اس موضوع پر جب وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی حیثیت بالکل بدلجاتی ہے۔

مثلاً منصور و نعرۂ منصور پر تقریباً ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے اور جس کی رسائی فکر جہاں تک ہو سکتی تھی وہاں تک اس نے اپنے خیالات اپنے اسلوب میں ظاہر کئے ہیں لیکن ناظم نے اس مسئلہ پر جو بات کہی ہے وہ نہ صرف اپنے انداز بیان، اور اسلوب ادا کے اعتبار سے بہت خوب ہے بلکہ نفس مسئلہ پر انھوں نے اپنی جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی ان کی دقت نظر پر شاہد

ہے۔ کہتے ہیں،

اے نوا سنج انا الحق ترا دعوے سچ ہے — لیک دستور نہیں قطرہ کو دریا کہنا

اس موقع پر مجھے اکبر الہ آبادی کا بھی ایک شعر یاد آگیا۔ انھوں نے بھی بہت معقول بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں،

حضرت منصور "انا" بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ
دار تک تکلیف فرمائیں؛ [illegible]

اکبر صاحب کہتے ہیں کہ منصور "حق" کے ساتھ [illegible] میں اتنا ہوش ہے کہ "انانیت" اب تک باقی ہے تو [illegible] جس کے ہوش و حواس گم ہو چکے ہوں اور اتنا واصل بالحق [illegible] حقیقت سے مل گیا لیکن جو شخص اس منزل پر پہنچ جائے گا وہ من و تو سے [illegible] ہو جائے گا اور آپ جب ابھی اس منزل میں ہیں کہ آپ کو "انا" کا احساس ہے تو آپ دار تک تکلیف کیجیے۔

ناظم کہتے ہیں "انا الحق" کا دعوے صحیح ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ قطرہ کو دریا کہنا کب مناسب ہے۔ تمھاری حیثیت تو ایک قطرے کی ہے اور وہ "حقیقت" ایک بحر بے کراں، تو ایک قطرے کو یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ دریا میں ہوں۔ معلوم ہوتا ہے تم اپنی حقیقت ہی نہیں سمجھتے۔

اکبر و ناظم کی فکر کا یہ لطیف فرق ارباب نظر کے لئے یقیناً باعث لطف ہوگا۔ دوسری حقیقت ملاحظہ ہو،

یوں تو ہو جاتا ہے ہر اک عیش و عشرت کا شریک — دوست کہتے ہیں اسے جو ہو مصیبت کا شریک

کون ہوگا کہ نہ ہو معتقد فصل بہار — موسم اچھا ہے یہ کہئے کہ یہ موسم کب تک

جو خود کہے اپنا کو مجھے اچھا کہیں گے وہ آئینہ کو فروغ نہیں زنگبار میں

تم اپنی چال سے بدنام ہو گئے ناظم یہ اہل صومعہ چھپ چھپ کے کیا نہیں کرتے

ہم تو پروانے کے قائل ہیں کہ چپکا جل جائے بلبل نغمہ سرا عاشق غوغائی ہے

عیش و سرمستی | اوپر کہا جا چکا ہے کہ ناظم کی زندگی کا ماحول عیش و عشرت تھا، چنگ و رباب تھا، ساغر و مینا تھا لیکن اپنے اس ماحول سے بغاوت کرکے انھوں نے اپنی زندگی کے لئے ایک نئی "شاہراہ" نکالی تھی جو وادی نجد میں جاکر ختم ہوتی تھی، لیکن پھر بھی وہ زندگی جس میں ان کی پرورش ہوئی تھی کبھی کبھی ان کے سامنے "خوش باش دمے کہ زندگانی این است" کی دعوت بھی دیدیتی ہے اور وہ بعض بعض مواقع پر ان جذبات عیش و مسرت کا اظہار بھی کردیا کرتے تھے، نمونہ

شراب و شاہد و مطرب سے کام رکھ ناظم کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا

مجلس اہل ورع نور کا دریا ہی سہی دل لگی صحبت رنداں سے آشام میں ہے

تسبیح و ورد و دلق و مصلےٰ نہیں پسند چنگ و رباب و ساغر و مینا پسند ہے

قدرت تشبیہ | تشبیہ و استعارے کو صحیح طور سے استعمال کرنا بھی ایک کمال ہے، بڑے بڑے شعرا نے اس میدان میں ٹھوکریں کھائی ہیں مثلاً آپ نے یہ زبان زد خاص و عام مصرعہ ضرور سنا ہوگا"

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

لیکن اس کا پہلا مصرعہ سنیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تشبیہ و استعارے کو "استادوں" نے کس کس طرح استعمال کیا ہے،

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی جو بات کی ..... الخ

لیکن ناظم پامال تشبیہ میں بھی ایک خاص بات پیدا کر دیتے ہیں،

لے وہ ایسا ہی سہی پر ہے تنزل در پیش بد شگونی ہے جو تجھ کو مہ کامل سمجھیں

توارد | ناظم کے کلام کا تمام و کمال مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دیوان میں ایسے اشعار بھی ہیں جو غالب سے یا بعض اور شعرا کے اشعار سے ٹکراتے ہیں۔ اب یہ آپ کی خوش فہمی پر منحصر ہے خواہ آپ اسے سرقہ سمجھیں، توارد سمجھیں، سینہ زوری سمجھیں، جو چاہیں سمجھیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے بعض اشعار دوسرے شعرا کے اشعار سے ٹکراتے ضرور ہیں۔

ناظم کا شعر ہے،

پڑھ کے خط نام غیر سے ان کو حال اپنا ...

اسی مفہوم کا ایک مشہور شعر یہ بھی ہے،

سناتے ہیں انھیں افسانۂ قیس بہانے ہیں ...

ناظم :۔ الفت بری بلا ہے کہ ناظم بایں تمیز + کرنی پڑی رقیب کی بھی التجا سبب

مومن:۔ اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل + میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ناظم :۔ لگاوٹ غیر سے اس کی جلا کر خاک کر دیتی + سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس کا ہے

غالب :۔ اشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف + عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ناظم :۔ کب میں نے کسی بات پہ تکرار نکالی + دیکھا مجھے اور آپ نے تلوار نکالی

غالب :۔ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے + تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

ناظم :۔ بار محفل میں نہ ملتا تھا کسی دن اور اب + روز دو چار گھڑی رہتی ہے خلوت مجھ سے

میر :۔ کئی بار آنا ادھر لطف سے + عطا پر عطا ہے کرم پر کرم

ناظم :۔ ملے گی محشر میں داد ہم کو بندھا ہے یہ اعتقاد ہم کو + ملی نہ واں بھی مراد ہم کو تو پھر بتاؤ کہ کیا کرینگے

غالب :۔ وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو + اب تلک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائیگا

ناظم :۔ عاشق ہوا اس آفت جاں پہ مرا ندیم + جب خوب میرا محرم اسرار ہو چکا

غالب — ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ‌ ‌ ‌ ‌ ہو گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

ایہام گوئی یا رعایت لفظی کا اگر موقع سے استعمال کیا جائے تو لطف کلام دو بالا ہو جاتا ہے لیکن آپ قدیم شعرا کے دواوین اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقریباً ہر شاعر نے اس "صنعت لطیف" سے اپنے کلام کو زینت دینا چاہی ہے۔ لیکن جب اس قسم کے اشعار کا استقصا کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ۹۵ فی صدی اشعار نہایت مہمل طور سے خراب ہو کے رہ گئے ہیں۔ ایک زمانے میں تو شاعری "رعایت لفظی" ضلع جگت اور پھکڑ بازی ہی میں منحصر ہو کے رہ گئی تھی لیکن اس دور ناسود سے پیشتر اور بعد بھی جب شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی تو بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے اکثر بالکل ناکام رہے اور جو معدودے چند کامیاب ہوئے وہ بھی صرف کسی حد تک، ورنہ ۹۵ فی صدی ان کے اشعار بھی

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

کے مصداق ہو کر رہ گئے ہیں۔

لیکن ناظم اس معاملے میں فرد فرید ہیں۔ میں نے ان کے پورے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور اس موضوع پر ان کے جو اشعار میں نے جمع کئے ان میں عیب تلاش کئے لیکن اس کا اعتراف ہے کہ کم از کم میری نظر میں کوئی شعر نہیں کھٹکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ رعایت لفظی جیسی صنعت میں کسی شاعر نے سیکڑوں اشعار رکھے ہوں اور ایک بھی ایسا نہ ملے جو مہمل کہا جا سکے یا جس سے لطف زبان میں ذرا بھی رکاوٹ نہ پیدا ہوتی ہو۔ نمونۃً چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ الفاظ خط کشیدہ ہیں جن سے اس صنعت کو ظاہر کیا گیا ہے:-

کیوں آئے ہو تربت پہ مری ساتھ عدو کے ‌ ‌ ‌ ‌ میں مردہ ہوں مردہ کو جلانا نہیں اچھا

ناظم نہ رکھ اس آہوئے وحشی سے چشم لطف ‌ ‌ ‌ ‌ جس میں نہیں ہے انس وہ انسان ہی نہیں

تھی قیدِ حق چشم وہ عطا اُس کو مل گئی ہے دخل کس کو بخشش پروردگار میں

تم بھی بن جاؤ گے لیلیٰ کی نظیر نہ کہو قیس کا ہمسر مجھ کو

رخصتِ عرضِ حال کیا مانگوں کہہ نہ بیٹھیں کہیں کہ "رخصت ہو"

بیوفائی کا داغ کیسا ہے ہم نے مانا

منہ ترا دیکھنا نصیب نہ ہو منہ سے نکلی ار

وہ اُٹھے محفل سے ناظم مجھ کو آتا دیکھ کر اور میں سمجھا کہ اُٹھتے ہیں مری تعظیم کو

تمکنت کیا ہے گر صورت میں مہر و مہ سے بہتر ہو طریق ظلم میں بھی دو قدم گردوں سے بڑھکر ہو

پھوٹی دیکھی جو صراحی مے کی میں نے جانا مری قسمت سو گی

اس کو یوں خاک پہ اے محتسب شرع نہ پھینک حرمت بادہ بہت مشرب اسلام میں ہے

بہت کہنے سے آجاتی ہے ضد انسان کو ناظم نہ کر تکرار ان سے گو مزا تکرار میں آئے

مردہ زندوں کو تری آن سے ہم دیکھتے ہیں زندہ مردوں کو تری تان سے ہم دیکھتے ہیں

فاتحہ پڑھنے کے تئیں رحم تو آیا لیکن — یہ بھی قسمت کا لکھا تھا کہ پڑھا میرے بعد

متفرق اشعار ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر شعر کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی ضرور موجود ہے لیکن چونکہ منتخب اشعار کی تعداد کم ہے اس لئے کسی مخصوص عنوان کے ساتھ دو ایک شعر کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ بہرحال وہ اشعار یہ ہیں:-

تم کرو ترک جفا کیا امکاں — ہم کریں ترک وفا کیا باعث؟

کیا اس نے قتل اور میں نے معاف — عبث اہل شہر اس کا چرچا کریں

خدا کو دینی ہے جان ہمدم، نہیں ہے مرنے کا مجھ کو کچھ غم
یہی ہے رونا کہ میں نہ ہوں گا تو پھر وہ کس پر جفا کرینگے؟

ڈرتے ہیں محتسب سے بھلا آئے تو سہی — ابھی کہی کہ ساغر و مینا اٹھایئے

کرتے ہیں عبث غرور کیا آپ؟ — ہیں کوئی جناب کبریا آپ؟

کل جو کچھ دل کی بیقراری کا — تذکرہ ان سے ایک بار ہوا
ہنس کے کہنے لگے کہ کیوں صاحب — دل کہاں تھا کہ بیقرار ہوا
اس میں وہ کیا کرشمہ ہے ناظم — جس سے پھر تو امیدوار ہوا

وعدے نے ترے زیست کی توقیر بڑھائی — مرتے ہیں یہ مرنے کی تمنا نہیں کرتے

شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلم   پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

شعرا سے کہتے ہیں کیا کتا ہے ناظم واہ وا   اس غزل کو سن کے ہیں قائل تمہارا ہو گیا

خضر ہے وادیٔ محبت کا   کیوں نہ ناظم کے ہم قدم ہو ہیں

چند اور اشعار | ناظم کی وہ مشہور نظم جو " میں نے کہا کہ دعوئے الفت "
اور وہ غزل جس کا آغاز " وہ حسن نہیں نام خدا اور ہی کچھ ہے " —
سے قصداً نظر انداز کردیں اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں بہت مشہور
تھیں کہ ان کا مشہور کلام پیش کیا جائے۔ اس صحبت کا مقصد تو صرف غیر معروف اشعار
تھی اور بس۔

ختم کلام | کلام ناظم پر غور و فکر کے بعد جو رائے قائم کی گئی تھی اور کلام ناظم کا انتخاب کیا گیا تھا وہ آپ کے سامنے پیش ہے۔

آخر میں جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں یہ اور عرض کروں گا کہ ناظم کے کلام اور غالب کے دیوان کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ناظم نے اگرچہ غالب سے استفادہ کیا لیکن ان کا رنگ طبیعت، رنگ شاعری اور طرز اسلوب غالب سے بالکل جدا ہے اور یہ فرق صرف زبان و بیان ہی میں نمایاں نہیں ہے بلکہ فکر و خیال میں بھی ایسا ہی اہم فرق نظر آتا ہے جیسا زبان و بیان میں دونوں کا رنگ ایک مستقل چیز ہے۔

غالب ایک فلسفی ہے، ایک خوددار عاشق ہے، ایک گدائے متکبر ہے، فارسی ترکیبیں اغلاق و پیچیدگی کے ساتھ اس کے کلام کا اہم جزو ہیں۔ اس کی رسائی فکر وہاں تک ہے جہاں تک ہر کہ و مہ پہنچ نہیں سکتا۔

برعکس اس کے ناظم ایک شاعر ہے، ایک سپر افگندہ عاشق ہے، ایک دل زدہ مظلوم ہے، ایک پیکر ترحم، ایک مجسمۂ حسرت ہے۔ اس کے ہاں نیائش و نفادگی ہے، جاں نثاری و جاں سپاری ہے، اور کبھی کبھی نغمۂ شادی ہے جو دیکھتے دیکھتے نوحۂ غم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

بس ان دونوں کا فرق صرف اسی قدر ہے کہ غالب اپنی تحریر خامہ کو "نوائے سروش" سمجھتا ہے اور یہ بے چارہ "رخصت عرض حال" ہی کرتا رہ جاتا ہے۔

غزل

از حضرت اصغر گونڈوی

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبار قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا؟ حلقہ ہائے دام کیا؟ رنج اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو، ہر طرح آزاد ہوتا ہے

بہار سبزہ و گل ہے، کرم ہوتا ہے ساقی کا
جواں ہوتی ہے دنیا میکدہ آباد ہوتا ہے

یہ سب نا آشنائے لذت پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

بہار انجام سمجھوں؟ اس چمن کا یا خزاں سمجھوں؟
زبان برگ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موج خون دل سے اک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدۂ دل میں
یہ نظارہ ہے؟ یا ذوق نظر برباد ہوتا ہے؟

قفس کی تیلیوں پر شاخ گل کا رنگ ہے اب تک
چمن سے چھٹنے والے کو چمن تو یاد ہوتا ہے

زمانہ ہے کہ خوگر ہو رہا ہے شور و شیون کا
یہاں وہ درد جو بے نالہ و فریاد ہوتا ہے

مگر کوتاہیِ ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہاں مستوں کے سر الزام ہستی ہی نہیں اصغر
اب اس کے بعد سر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

بدچلن بیوی

ہم چائے خانے میں بیٹھے ہوئے ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ بات میں بات نکل آتی ہے۔
کسی نے ان بھلکڑوں کا تذکرہ چھیڑ دیا جو اور باتیں تو ایک طرف خود اپنے ذاتی معاملات کو خواہ وہ
کیسے ہی اہم کیوں نہ ہوں اس طرح بھول بیٹھتے ہیں کہ سن کر نہ صرف تعجب معلوم ہوتا ہے بلکہ بالکل
یقین نہیں آتا۔ پھر کیا تھا ہر ایک نے اپنا اپنا تجربہ بیان کیا۔ سنی ہوئی مزے دار کہانیاں دہرائیں
دیکھے ہوئے قصے سنائے۔

ان قصوں اور کہانیوں کی ایک عام خصوصیت یہ تھی کہ ان کے
پروفیسر مشہور فلسفی اور سائنس داں ہی تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ
فکر کرنے کی عادت انھیں اپنے ماحول سے بالکل بے خبر کر دیتی ہے۔
چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ہماری نظریں بے اختیار پروفیسر عبدالکریم کی طرف اٹھیں۔ یہ ہم سب
جانتے تھے کہ وہ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ہیں لہذا ہمیں امید تھی کہ اس خصوص میں جناب کے واقعات
نہایت ہی دلچسپ ہوں گے۔

لیکن امین بیگ جو اتفاق سے ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا تھا بڑا مسخرہ تھا۔ اس نے پروفیسر صاحب
پر دیدے لگا دئے اور لگا انھیں سر سے پیر تک گھورنے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی عجیب الخلقت
مخلوق کا نہایت ہی غور و خوض اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہا ہے۔

پروفیسر صاحب ان تمسخر آمیز نظروں سے بہت گھبرا گئے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا امین بیگ
سے پوچھا "کیوں بھئی کیا بات ہے جو اس طرح گھور رہے ہو؟ مجھے دنیا کی کوئی نئی مخلوق تو نہیں
سمجھ رکھا ہے جو اس طرح سر سے پیر تک کا جائزہ لیتے ہو؟ میرے سر پر دو سینگ تو نہیں ہیں؟"
امین نے جھٹ سے جواب دیا "نہیں جناب مجھ سے یہ گستاخی نہیں ہو سکتی۔ میں تو دیکھ

جاتا تھا کہیں آپ اپنی نکٹائی، کالر، بوٹ یا اور کوئی چیز تو نہیں بھول گئے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے ساتھ ایسی کسی قسم کی کمی نہیں۔ لہٰذا مجھے آپ کے تبحر علمی پر شک ہوتا ہے کیونکہ اگر آپ ایسے ہی بڑے علامہ ہوتے جیسا کہ عام طور پر سمجھے جاتے ہیں تو آپ کی بھول کا کچھ نہ کچھ ثبوت ضرور ملتا۔

یہ سن کر پروفیسر صاحب مسکرائے اور فرمایا " اور تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ مجھے بھولنے کی عادت نہیں ہے ؟" پھر اپنا قصہ یوں بیان کرنے لگے۔

انسان پر بعض ایسے کڑے دن آتے ہیں کہ کسی طرح نہیں بھولتے۔ مجھ پر بھی یہی واردات گزری۔ ایک دن میں سویرے اٹھا۔ اس وقت مجھے کسی قسم کا رنج و ملال نہیں تھا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اس دن کے ختم ہونے سے پہلے مجھ پر ایسا صدمہ پڑے گا جس سے میرے دماغ کی چولیں ڈھیلی ہو جائیں گی۔

میں نے ناشتہ کیا اور صبح کی ڈاک دیکھنے بیٹھا۔ اس میں مجھے ایک خط ملا جس کے بھیجنے والے کو میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے لفافے پر بہت غور کیا لیکن پھر بھی مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ لکھنے والا کون ہے۔ ڈاک تو مقامی ہی تھی لیکن خط اتنا برا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔

پھر میں نے اس کو کھولا اور کھول کر پڑھا ہی تھا کہ دم بخود رہ گیا۔ میرے حواس بگڑ گئے، دم چڑھنے لگا اور عقل غائب غلہ ہو گئی۔ غصہ کے مارے تھرانے لگا۔

خط کا مضمون یہ تھا :

" پیارے استاد،

مجھے یہ کہتے ہوئے سخت صدمہ ہوتا ہے کہ آپ کی بیوی آپ سے بیوفائی کرتی ہے اور ایک شخص سے جس کا نام حسین بیگ ہے ناجائز تعلقات رکھتی ہے۔ شاید وہ آپ کا ملاقاتی بھی ہے۔ ان دونوں کے تعلقات قدیم ہیں اور گہرے ہیں۔ ان کی ملاقاتیں بلا ناغہ ہمیشہ ہوتی ہی رہتی ہیں۔ آپ کو کیا خبر کہ لوگ آپ پر ہنستے اور آپ پر ٹھٹھا اڑاتے ہیں۔ آپ تو ہمیشہ اپنے نظریات اور مباحث میں منہمک رہتے ہیں اور آپ کی عزت و آبرو ہے کہ بچے بچے کی زبان پر مضحکہ بنی ہوئی ہے۔ اگر آپ کو

میری بات کا یقین نہیں ہوتا ہے تو آج دن کے گیارہ بجے "دلفریب باغ" جائیے اور عاشق و معشوق کو اپنی بُرائی شکلت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھئے؛

'تمہاری بیوی اور ہیلن'

اس کے دوسرے شخص سے ناجائز تعلقات ہیں۔ یہ دونوں ہمیشہ ملتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت لوگوں کو معلوم ہے اور مجھے نہیں۔ ہائے یہ بدقسمتی وائے یہ بدنصیبی!

اس دل دہلا دینے والے لمحے میں میرے سامنے خون کی ندیاں بہنے لگیں قتل و خونریزی دار و گیر اور کشت و خون کا سماں بندھ گیا۔ ہر قسم کی سزا کا خیال جو آیا اور میں غصے سے تھرانے لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس عزت ریزی کا مجھے ضرور ہی اور بے وفا عورت کو ضرور ہی قتل کرنا چاہئے۔ اس کے ساتھ اس کے بدمعاش عاشق کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا چاہئے چاہے اس میں مجھے پھانسی پر ہی لٹکنا کیوں نہ پڑے۔

اتنے میں گھڑی نے دس بجائے اور اب ان بدمعاش عاشق و معشوق کی رذیل حرکات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے مجھے ایک ہی گھنٹہ رہ گیا تھا۔

فوراً میں اپنے کتبخانہ والے کمرے میں گیا۔ اپنا طمنچہ نکالا اور اس میں گولیاں بھرلیں۔ دنیا میری آنکھوں میں اندھیری ہوگئی۔ اب مجھے انسان کا خون بہانا بالکل آسان سی شے نظر آنے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ایک مہذب اور شریف انسان کس طرح خون کرنے پر آمادہ ہوتا ہے اور تمام مظاہر انسانیت سے عاری ہو کر ایک خونخوار درندے کی طرح کیوں کر انسانی خون سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔

لیکن اسی وقت مجھے ایک اور خیال پیدا ہوا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خط بھی اسی مکارہ نے لکھا ہو تاکہ اس بہانے سے مجھے گھر سے چلا کے اپنے عاشق کو بلائے اور مزے اڑائے۔

'ہاں ہاں یہی ہے بیشک یہی ہے!'

یعنی اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ میں "دلفروز باغ" جا کے حیران و سرگرداں پھرتا رہوں اور وہ اپنے عاشق کے ساتھ خالی گھر میں گلچھرے اڑائے۔

لیکن وہ ایسا کیوں سمجھنے لگی کہ میں اس پر شک یا گمان کر رہا ہوں۔ کیوں وہ چپ رہ کر بھی اپنے آپ کو میرے شک و شبہ کا نشانہ بناتی؟

نہیں یہ خط میرے کسی مخلص دوست ہی نے لکھا ہے تاکہ میری آنکھیں کھلیں اور میں اپنی عزت دزدی کا بدلہ لوں۔

آخر کش میں نے جانے کا عزم ارادہ کر لیا اور کپڑے پہن لئے۔ لیکن غصہ و غضب سے میں کانپ رہا تھا۔ خوف یہ تھا کہ میں اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکوں گا۔

میں نے کپڑے پہن لئے۔ سر پہ ٹوپی رکھی اور نکلنے کا ارادہ کیا اور اس وقت ....

اور صرف اس وقت جبکہ میں کامل ایک گھنٹہ غم و الم، یاس و نا امیدی اور غصہ و غضب کے دریا میں غوطے لگا چکا۔

اس وقت مجھے یاد آیا اور تب تک میں بھولا ہوا تھا کہ "ابھی میری شادی نہیں ہوئی"۔

تنقید و تبصرہ

کتب

تجلیات فرخ ۔ مثنوی حسن فطرت ۔ روح ظرافت ۔ حفظ العلوم ۔ میکدہ ۔
احقاق حق ۔ التجائے انوری ۔ معتقدات المعروف ۔ خز...
اسلامی نظام تعلیم ۔ فضائل رمض

تجلیات فرخ | مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۔ تجلیات فرخ کے نام سے
ہے تقطیع چھبی ۔ کاغذ سفید معمولی ہے ۔ علاوہ نظموں ۔ غزلوں اور رباعیات کے ایک تبصرہ اور ایک مقدمہ بھی
شامل ہے ۔ تبصرہ مولانا رضی احمد صاحب رضی بدایونی اور مقدمہ جناب ضیاء احمد صاحب ایم اے پروفیسر
علی گڈھ نے لکھا ہے تبصرہ میں شاعرانہ نظر سے اور مقدمہ میں ناقدانہ حیثیت سے جناب فرخ کے کلام پر اظہار
خیال کیا گیا ہے اور اس کی خوبیوں کو مثالیں دیکر پیش کیا ہے

جناب فرخ کے کلام میں علاوہ غزلیات کے نظموں اور رباعیوں کی معقول تعداد ہے اور ایک قصیدہ
تبقریب ولادت حضرت علی علیہ السلام خاص طور پر قابل ذکر ہے

پروفیسر ضیاء احمد صاحب کا مقدمہ زبان اردو کی تاریخ اور اس کے دور ارتقائی سے بھی بحث کرتا ہے
اور اس موقعہ پر وہ فرماتے ہیں کہ " یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ موجودہ تغزل پہلے کی نسبت واقعیت و
اصلیت کے زیادہ قریب آگیا ہے " اسی بات کو دوسری جگہ ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے کہ " یہ دور درحقیقت ۔
حقایق پرستی کا دور ہے " اور مزید تفصیل کے لئے فرماتے ہیں کہ " دور حال کے متغزلین کے خیالات دردمند دل
اور وفا پرست روح کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ از دل می خیزد بر
دل می ریزد .... "

زبان و شعر میں جس قدر انقلاب گذشتہ پچاس سال میں ہوئے وہ اہل ذوق کی نظر سے پوشیدہ نہیں ۔
لیکن زمانہ حال کے غزل گو شعراء کو ۔ ان " صفات " سے یکسر بیگانہ قرار دینا جو قدماء کی خصوصیات سمجھی جاتی

[illegible] بھی مشہور ہے اور گو یہ بحث علاحدہ ہے کہ وہ صفات بجائے خود ابھی تھیں یا بری، ادب و [illegible] و زینت و زیور تھا۔ یا ایک بدنما داغ لیکن محض یہ واقعہ کہ ہمارے شعراء حالیہ [illegible] و مستفادہ زبان و بیان میں انہیں اصولوں کے پابند ہیں بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ جس قدر [illegible] انقلاب کا رونما ہونا ظاہر کیا جاتا ہے وہ غالباً مبالغہ شاعرانہ کے حدود میں داخل ہے۔

جناب فرخ کے کلام میں لطف زبان بھی ہے اور لطف بیان بھی، مضامین میں بلند پستی و قدامت پسندی نہیں تخیل عجیب ہے اور بالعموم غزل ایسی ہے بعض اشعار نہایت عمدہ ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں ان سے انتخاب منظور نہیں ہے

فرخ اجل نے کھول دئے عقدہائے زیست
تھا انکشاف حاصل اخفائے راز کا

...   .

پھر گئی پاک گریباں کی نگاہوں میں بہار
جلوۂ گل کس قدر فرخ جنوں انگیز تھا

...   .

بقدر ذوق سجود آستاں نہیں ملتا
زمیں ملے تو ملے آسماں نہیں ملتا

...   .

جرس کی آتی ہے کانوں میں دور سے آواز
تلاش میں ہوں مگر کارواں نہیں ملتا

...   .

کتاب بحیثیت مجموعی دلچسپی سے پڑھنے کے قابل ہے قیمت عصر اور علی ہادی صاحب فرزند مصنف محلہ الغار اناؤ سے مل سکتی ہے۔

مثنوی حسن فطرت | مصنفہ جناب منشی گورکھ پرشاد صاحب عبرت مرحوم گورکھپوری مطبوعہ ایوان اشاعت

ملک کے نوجوان اہل قلم جناب مجنوں گورکھپوری کی ادبی خدمات کے سلسلہ میں یہ مثنوی حسن فطرت حاصل ہوئی ہے جو کئی حیثیتوں سے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ چمکدار دبیز سفید کاغذ پر۔ بیبی تقطیع اور عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے جناب مجنوں کا مقدمہ مثنوی کی خصوصیات پر ایک جامع مضمون ہے۔ منشی گورکھ پرشاد صاحب گورکھپور کے ممتاز وکیل ہیں۔ ادب وزبان کا ذوق رکھتے تھے اور شعر سے خاص مناسبت تھی ان کا زمانہ حالی و آزاد کا زمانہ تھا تعلیم نے اس اثر کو ا بھلا دیا خدا بخ

مثنوی لکھی تو قدیم طرز کو چھوڑ کر تمثالیہ صورت اختیار کی اور حسن . .

اور انھیں کو قصہ کے افراد قرار دے کر ایک فسانہ بنا دیا

مثنوی کی بحر بھی جداگانہ ہے زبان نہایت صاف اور محاورا

ہر ایک فتنہ کو دم دے کے وہ سلاتا ہے
وہ اپنی گود پہ ہر اک شخص کو لگاتا ہے

... ...

مری نگاہوں میں تاریک سب خدائی ہے
جگر کی چوٹ ہے فرزند کی جدائی ہے

لیکن اس جدت طرازی سے قصہ کا لطف نہایت کم ہوگیا بشاعرانہ حیثیت سے اس امر پر تنقید کرنا دشوار ہے اس لئے اس جدت طرازی نے اس کو قدیم طرز کی مثنویوں سے بالکل جداگانہ حیثیت دیدی ہے کتاب کی طباعت نہایت دیدہ زیب اور کاغذ قیمتی اور خوبصورت ہے ۱۲ر قیمت پر ایوان اشاعت گورکھپور سے حاصل ہوسکتی ہے

روح ظرافت | مرزا عظیم بیگ چغتائی ایم اے ایل ایل بی وکیل جودھپور اپنی ظرافت نگاری اور رسائل نوازی کے باعث مشہور اہل قلم ہیں۔ آپ کی ظرافت کا حلقہ بہت وسیع ہے اور وہ ہر قصہ اور ہر بات میں اس طرح چمک اٹھتی ہے کہ کثیر التعداد اردو قصے پڑھنے والے اس سے لطف اٹھاتے ہیں

[illegible] اور نوجوان طلبہ کے مذاق کی خصوصیت سے رعایت رکھتے ہیں. کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ اور بیان کا لطف کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا البتہ قصہ کی حیثیت سے نیز زبان اور ظریفانہ طرز کے اعتبار سے ان افسانوں میں ترقی کی بہت گنجائش ہے

[illegible] یہ کتاب اردو انسائکلو پیڈیا ہے جو پانچ پانچ سو صفحات کی ڈھائی سو جلدوں پر مشتمل ہوگی. اس کو میاں حفظ الرحمن صاحب برادر زادہ حاجی مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار نے نہایت کوشش اور صرف سے مرتب کرایا ہے اس کے اکثر حصے تیار ہو چکے ہیں اور علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی تحریک خاکساران کو دیدئے گئے ہیں علامہ موصوف ان جلدوں کو شائع کرانا چاہتے ہیں ان کی خواہش یہ ہے کہ اس کی پہلی جلد شائع ہو جائے جس کے لئے یا تو علم دوست حضرات بطور قرضہ کے تھوڑی تھوڑی رقم دیدیں. جو بعد فروخت کے واپس کردی جائیگی یا پیشگی خریداری کی قیمت ادا کردیں جس سے کتاب شائع کی جاسکے. پہلی جلد شائع ہو جانیکے بعد ملک اس کی ضرورت معلوم کرے گا اور پھر اللہ نے چاہا تو بقیہ جلدیں تجارتی طریقہ سے شائع ہوتی رہیں گی.

آج دنیا کی متمدن اقوام کا ذکر چھوڑیئے. خود اسی ہندوستان میں بنگالی. گجراتی. مرہٹی ہندی اور تامل زبانوں میں انسائیکلو پیڈیا موجود ہیں مگر نہیں ہیں تو اس زبان میں جو ہندوستان کی زبان عام ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے. جہاں تک قلم کا فریضہ تھا اس نے ادا کردیا اور مبسوط انسائیکلو پیڈیا تیار ہو چکی اب دولت کا فریضہ ہے کہ اس کو شائع کرے

ہم نے خود ابھی تک اس کی کوئی جلد نہیں دیکھی ہے کہ اپنی رائے دے سکیں مگر اہل علم کی ان رایوں کا ضرور مطالعہ کیا ہے جو انھوں نے اس کے اوپر لکھی ہیں اور اس کی طباعت کے لئے پر زور سفارش کی ہے.

میکدہ حکیم نیّر صاحب دہلی کی چند نظموں کا مجموعہ. لکھائی. چھپائی اور کاغذ عمدہ. تقطیع خورد جلد خوبصورت. حجم ۸۴ صفحے قیمت مجلد ۱۲ / غیر مجلد ۸ / ملنے کا پتہ: سید صفات احمد منیجر دیسی دواخانہ چوک چونے منڈی لاہور

حکیم صاحب نے اس مجموعہ میں چند قومی نظمیں درج کی ہیں اور چند ادبی. بقیہ غزلیں ہیں

اس کے بعض علمی نظمیں ہیں پھر چند اشعار متفرق کلام میں جو ندرت بندش حسبِ تجسی ہے وہ نہایت تعریف کے قابل ہے۔ زبان میں صفائی اور جدت دونوں کا لحاظ ہے ہم کو یہ نظمیں بہت پسند آئیں۔ نہ صرف بیان کے لحاظ سے بلکہ مقبولیت کے لحاظ سے بھی

احقاق حق | مصنفہ مولوی محمد ادریس خانصاحب نجیب آبادی حجم ۹۰ صفحات کتابت وطباعت معمولی۔ سائز جیبی قیمت ۵ آنہ ملنے کا پتہ مکتبہ عبرت نجیب آباد

اس رسالہ میں مہاتما گاندھی کے مذہبی و اخلاقی خیالات وعقائد پر بحث و تنقید کی گئی ہے جناب مصنف کو مہاتما جی کی غیر معمولی مقبولیت و شہرت کی بنا پر یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ
یعنی تلاش حق کی اشاعت سے ایک جدید مذہب کی بنیاد پڑ سکتی ہے "
نے اس تصنیف کی زحمت گوارا فرمائی ہے جناب مصنف کی اس تنقید
گنجائش ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن یہ بات ہر آئینہ لائق ستائش ہے۔
نہایت متین و سنجیدہ ہے اور بجز دو چار لفظوں مثلاً مہاتمائی لہجہ۔ پیغمبرانہ لہجہ۔ ضدی پن وغیرہ کے جناب مصنف نے خلق و مدارا کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے بحیثیت مجموعی کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔

انجام نوری۔ | مصنفہ نواب زادہ محمد سمیع اللہ ایس جنگ انوری حجم ۱۱ صفحے جیبی تقطیع کتابت و طباعت معمولی قیمت ۱ جناب مصنف سے الہ آباد کے پتہ پر مل سکتی ہے

ایک مسلسل نظم ہے جو مسلمانوں کی موجودہ پستی اور ادبار سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے

منتخبات المعروف بہ خزینہ صنعت۔ | مرتبہ جناب بلقیس جہاں بیگم تقطیع کلاں حجم ۴۰ صفحہ کتابت وطباعت متوسط قیمت ۱۲ غالباً خود جناب مصنف سے آگرہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

دستکاری پر اردو میں بہت سی کتابیں نکل چکی ہیں لیکن اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی گھروں کی مردہ صنعتوں اور دستکاریوں میں از سر نو جان ڈالنے کی کوشش

[illegible] مصنف کا خیال ہے کہ پرانی دستکاریوں میں جدت پیدا کی جائے تو امکان کی کوئی [illegible] اسی سلسلہ میں انھوں نے کوششیں بھی کی ہیں اور بڑی حد تک انھیں کامیابی ہوئی ہے اسی کامیابی سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں جابجا مختلف نمونے دیئے گئے ہیں اور ان کی تشریح کی گئی ہے کتاب ہر حیثیت سے کامیاب ہے ہمیں امید ہے کہ ملتوں میں اس کی بیش از بیش قدردانی کی جائے گی تاکہ اس کا بقیہ حصہ بھی شائع ہو سکے

اسلامی نظام تعلیم۔ مترجمہ جناب فضل کریم خان درانی بی اے تقطیع متوسط حجم ۷۶ صفحے کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا قیمت ۸ ملنے کا پتہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور

یہ رسالہ دراصل ایک جرمن مستشرق ڈاکٹر دانیال ہائی بیرک کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جو [illegible]ء میں شائع ہوا تھا۔ فاضل مستشرق نے نہایت جامعیت اور امعان نظر کے ساتھ قدیم اسلامی نظام تعلیم اور اسلامی مدارس کے طریقہ تعلیم پر بحث کی ہے اس موضوع پر اس سے پہلے بھی بعض حضرات نے لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن شاید مواد فراہم نہ ہونے کی وجہ سے انھیں پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی یہ رسالہ بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن نہایت تلاش و تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے بڑی خوبی یہ ہے کہ مسلمانوں کے قدیم نظام اور طرز تعلیم کا پورا خاکہ ذہن میں کھنچ جاتا ہے جو حضرات اس موضوع پر آئندہ کچھ لکھنا چاہیں گے۔ ان کے لئے یہ رسالہ اساس کا کام دے گا جناب درانی نے اس مفید علمی رسالے کا ترجمہ کرکے ایک قابل قدر خدمت انجام دی ہے ترجمہ نہایت صاف و شستہ ہے البتہ ہمیں جناب مترجم سے شکایت ہے کہ امام ابو یوسف کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا انھوں نے بجنسہ ترجمہ کردیا۔ اور اس پر فٹ نوٹ بھی نہیں لکھا ہندوستان میں مسلمانوں کا بڑا طبقہ امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں امام ابو یوسف وغیرہ کو بہت احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اس لئے عام طور پر امام صاحب کے متعلق مسلمانوں کو یہ الفاظ گراں گذریں گے

فضائل رمضان مصنفہ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور ضخامت ۷۰ صفحات۔ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۵ ملنے کا پتہ محمد احتشام الحسن کتب خانہ

ملنے کا پتہ حضرت نظام الدین اولیا ر دہلی۔

مولانا نے اس رسالہ میں رمضان لیلۃ القدر اور اعتکاف کے متعلق صحیح حدیثیں جمع فرمائیں ہیں ساتھ ہی دل نشین انداز میں ان کی تشریح بھی کی ہے جس سے .... رمضان کے زمانہ میں عبادت و ریاضت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے یہ رسالہ عام مسلمانوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ خدا حضرت مصنف کو جزائے خیر دے

رسائل واخبارات

سالنامہ اردو گزٹ۔ کارز:

سالنامہ اردو گزٹ سنہ ۱۹۳۲ء	حجم ۶۴ صفحے قیمت ۸ر مقام اشاعت

جامعہ کے کسی پچھلے پرچہ میں اس اخبار پر تبصرہ ہو چکا ہے ایڈیٹر صاحب سالانہ نمبر ہمارے پاس اظہار رائے کے لئے بھیجا ہے بڑی خوشی کی بات ہے کہ رنگون میں اردو کی ہر دلعزیزی ترقی پر ہے اور نوجوانوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے سرگرمی سے کوشش کر رہا ہے ادہر دو چار سال سے کئی اخبار بھی روزانہ اور ہفتہ وار نکل رہے ہیں ان میں اردو گزٹ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب سمرو اری لال لکھنہ پرچہ کو کامیاب بنانیکے لئے بہت کوشاں ہیں

زیر نظر رسالہ مضامین۔ تصاویر۔ کتابت وطباعت پر اعتبار سے کامیاب ہے۔ مضمون نگاروں کی فہرست میں حضرت عشرت لکھنوی۔ مولانا عیش امروہی مقیم رنگون۔ حضرت برق دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جناب محمود حسین صاحب احمر رنگونی خاص رنگون کے رہنے والے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ان کی نظم کشف الظنون بہت کامیاب ہے اسی طرح جناب صبا کا مضمون "ماندلے کے شاہی محلات۔ تاریخی حیثیت سے بہت قیمتی ہے امید ہے کہ جناب صبا برما کے دیگر قدیم تاریخی آثار پر بھی خامہ فرسائی فرمائیں گے۔

کاروان ہفتہ وار اخبار ماڈل ٹاؤن لاہور سے پنجاب کے جواں عمر اور جواں کلام شاعر حضرت ابو الاثر حفیظ جالندہری کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ دلچسپ۔ دلکش اور سراسر محرک عمل۔ امید ہے کہ یہ اخبار پنجاب کے نوجوانوں میں ولولۂ کار اور جذبہ عمل پیدا کرے گا اور ان کو صحیح راستہ پر چلائے گا۔

اس میں سب سے زیادہ دلچسپ جو چیز ہوتی ہے وہ خود حضرت حفیظ کی نظمیں ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ فلسکیپ سائز ۱۲ صفحے۔ قیمت سالانہ تین روپے

دنیا کی رفتار

(الف) عالم اسلامی

۱. افغانستان کی رفتار ترقی۔ ہز ہائینس احمد شاہ خاں وزیر دربار افغانستان نے ایک ملاقات کے دوران میں ذیل کا بیان دیا ہے۔ ہز ہائینس اعلیٰ حضرت شہریار غازی کے چچا زاد بھائی ہیں اور جلالت الملک سلطان ابن سعود سے ایک دوستانہ معاہدہ قائم کرنے کے لئے حجاز تشریف [illegible]
غازی کی طرف سے فریضہ حج بھی ادا کریں گے۔ جنہوں نے حال [illegible]
حکومت افغانستان کی طرف سے مکہ معظمہ میں ایک دار الحجاج تعمیر کر[illegible]
حج میں سہولت ہو۔

ہز ہائینس نے فرمایا کہ افغانستان نے اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی سے [illegible] رشک ترقی کی ہے۔ جس قلیل عرصہ میں اعلیحضرت نے ملک کو فتنہ و فساد سے پاک کر کے از سر نو شاہراہ کامرانی پر ڈال دیا ہے وہ بلاشبہ حیرت انگیز ہے گذشتہ خانہ جنگی کے زمانہ میں عمارتوں اور سڑکوں کو جو نقصان پہنچا تھا۔ اس کی تلافی کر دی گئی ہے۔ اور خیال ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں جدید ذرائع آمد و رفت ملک کے ہر حصے میں پھیلائے جائیں گے۔ ان طلبہ میں سے جو افغانستان کے نو قائم کردہ مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اکثر طلبا کو صنعت و حرفت سکھانے کے خیال سے یورپ اور امریکہ بھیجا گیا ہے تجارت کا حال نہایت اچھا ہے اور اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ محکمہ محصولات کی آمدنی گذشتہ سال سے دگنی ہو گئی ہے حکومت کے زیر غور اب یہ امر ہے کہ ملک کی عظیم الشان معدنی دولت سے کیونکر فائدہ اٹھایا جائے۔

خارجی تعلقات کے متعلق ہز ہائینس نے کہا کہ افغانستان کے تعلقات سب ممالک سے مساویانہ ہیں اور اس کے نزدیک کسی قوم کو دوسری قوم پر ترجیح حاصل نہیں نہ کسی قوم کو کوئی خاص مراعات دی گئی ہیں نہ اجارات۔

افغانستان میں پنچایتی طرز حکومت قائم ہے مجلس شورائے دو ایوانوں پر مشتمل ہے ان کی حضرت ملوکانہ کے فیصلوں کی تصدیق کر دیتے ہیں لیکن اگر ایوانات کے درمیان کوئی مسئلہ مختلف فیہ ہو تو آخری فیصلہ شاہ غازی کے ہاتھ میں ہوتا ہے اگرچہ اس کی اب تک نوبت نہیں آئی۔

۲۔ صدقی پاشا فلسطین میں | پچھلے مہینہ اسماعیل صدقی پاشا شام و فلسطین تشریف لے گئے اور انتدابی حکومتوں نے آپ کا پرجوش مقدم کیا اس سفر کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ حکومت مصر نے شام اور فلسطین کی مصنوعات پر محصول میں حال ہی میں بہت کافی اضافہ کر دیا تھا لہذا ان ممالک کی یہ خواہش تھی کہ حکومت مصر اپنے اس فیصلہ پر نظر ثانی کرے لیکن اسماعیل صدقی پاشا کے سفر فلسطین کے متعلق ایک دوسری رائے قائم کی گئی ہے۔ خیال یہ ہے کہ حکومت مصر نے مفتی فلسطین کی سرگرمیوں کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور موتمر انعقاد سے بھی کوئی خوشگوار نتائج مترتب نہیں ہوئے اب جو صدقی پاشا فلسطین آئے ہیں تو اس سے مقصود یہی تھا کہ دونوں حکومتوں کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کر دیا جائے۔ پچھلی مرتبہ جب ہائی کمشنر فلسطین قاہرہ گئے ہیں تو وہ خود ہی صدقی پاشا اور وزیر رسل و رسائل کو قدس آنے کی دعوت دے آئے تھے یہ گویا "سرکاری تعبیر" ہے مصر و فلسطین کے باہمی تعلقات کی ورنہ ظاہر ہے کہ مصر یا فلسطین کے کسی مسلمان کو مفتی فلسطین یا موتمر اسلامی کی سرگرمیوں پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

بہر حال ان سیاسی خیال آرائیوں کے علاوہ فلسطین میں اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ریلوی کی تعمیر کا ہے۔ اس وقت جو لوگ مصر سے آتے ہیں ان کو قنطرہ سے کشتی میں سفر کرنا پڑتا ہے جس سے اکثر تکالیف کا سامنا ہوتا ہے حکومت فلسطین کی یہ خواہش ہے کہ ریل کے انتظامات میں جو خرابیاں ہیں ان کو جلد سے جلد دور کر دیا جائے

ادھر قاہرہ میں عنقریب عربی انجمن موسیقی کا اجلاس ہونے والا ہے جس کا مقصد فنی اور نظری دونوں حیثیتوں سے موسیقی کی اصلاح کرنا ہے اسکے پیش نظر اس کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جن کی تفصیل آئندہ اشاعت میں عرض کی جائے گی۔

مطمح عراق | سیاسیات عراق میں اس وقت بہت سے اہم مسائل پیش ہیں ایک مسئلہ خاص طور پر تو کا ہے وہ عراق شمالی سرحد کے تصفیہ کا ہے اس کے علاوہ حکومت نے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ پرانے سکوں کی بجائے عراق کے سکوک کرائے جائیں لیکن اس وقت دو باتیں خاص طور سے توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں - اول شاہ عراق کا سفر طہران اور ثانیاً نوری پاشا کی مراجعت جنہوں نے مجلس لندن میں عراق کے سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق نہایت اہم بیانات دیئے

نوری پاشا نے اس امر پر اظہار تیقن کیا ہے کہ عراق کو عنقریب مجلس اقوام کی رکنیت حاصل ہو جائے گی گو یا ختم انتداب کا معاملہ اب قطعی طور سے فیصل شدہ ہے - نوری پاشا نے کہا کہ عراق اور ترکی کے مابین دوستانہ معاہدہ قائم ہو گیا ہے جس کا انضمام موصل پر ہے -

سب بیانات میں سے حیرت انگیز اطلاع یہ تھی کہ پونڈ کی قیمت گر جانے سے کہ عراق پیٹرولیم کمپنی کو جو رقم ہر سال ادا کرنی پڑتی ہے اس کا تعین جو ہے کیا جائے اس کا مطلب یہ تھا کہ کمپنی ایک لاکھ پونڈ کی زائد رقم ادا کرے یہ مسئلہ کے درمیان ما بہ النزاع تھا لیکن اب جو نوری پاشا لندن گئے ہیں اور کمیٹی کو جو مراعات اور شرائط حکومت کی طرف سے حاصل ہیں ان کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ حکومت عراق کا مطالبہ جائز ہے - لہذا خزانہ حکومت میں عنقریب اس گراں بہا رقم کا اضافہ ہو جائیگا .

نوری پاشا نے یہ بھی کہا کہ وہ تیل کی ایک دوسری کمپنی سے بھی گفت و شنید کر آئے ہیں گو انہوں نے اس کمپنی کا نام نہیں لیا . لیکن خیال ہے کہ ان کا اشارہ برٹش آئل کمپنی کیطرف ہے اس لئے کہ اس کے دو ڈائرکٹر حال ہی میں سفر بغداد سے یہاں آئے تھے . نوری پاشا کا خیال یہ ہے کہ حکومت کو اس کمپنی سے تیل کے ہر ٹن پر چار شلنگ اور حاصل شدہ تیل کا بیسواں حصہ ملیگا .

امیر فیصل کا سفر طہران | امیر فیصل نے ارادہ کیا ہے کہ اپریل کے مہینہ میں طہران کا سفر کریں قیاس یہ ہے کہ اس سفر کا مقصد ان غلط فہمیوں کو رفع کرنا ہے جو حکومت ایران و عراق کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں بالخصوص اس لئے کہ حکومت عراق نے جعفر سلطان سردار باغیان کرد کے خلاف جو طرز عمل اختیار کیا ہے اس کو طہران میں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا .

جعفر سلطان جبار کردی قبیلہ کا سردار ہے وہ سرحد عراق و ایران کے دونوں طرف آباد ہے تمام

...و جبال کی طرح یہ لوگ بھی کسی حکومت کا اقتدار تسلیم نہیں کرتے اور جنگلوں میں آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں سیلاب کے سرا میں حکومت ایران نے ان کی سرکشی کا خاتمہ کرنے کے لئے فوج کشی کی تو شروع شروع میں جعفر سلطان نہایت کامیابی کے ساتھ لڑتا رہا لیکن بالآخر اسے عراق میں پناہ لینا پڑی۔ جعفر سلطان نے سلیمانیہ کے مقام پر اپنے آپ کو حکومت کے حوالہ کر دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک سردار مذکور حکومت عراق کے زیر حراست موصل ہی میں نظر بند ہے۔ بایں ہمہ ایرانی حکومت حکام عراق کے اس طرز عمل سے خوش نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اب عراق در پردہ کرد باغیوں کے طرفدار ہیں یہی غلط فہمی ہے جس کو دور کرنے کے خیال سے شاہ عراق طہران جا رہے ہیں۔ اور امید کی جاتی ہے کہ اس کا اثر دونوں ہمسایہ حکومتوں کے باہمی تعلقات پر نہایت اچھا پڑے گا۔

مسلمانان بلغاریہ۔

اوپر کا نقشہ جرمن اور سینٹ مشن کے ماہوار رسالہ "مشرق تصاویر میں" شائع ہوا ہے۔ ای۔ ایم بیپ جو صوفیا (دارالسلطنت بلغاریہ) میں رہتے ہیں اور جنہوں نے یہ نقشہ مرتب کیا ہے ان کا۔

[illegible] ہندوستان بجاریہ کی کل تعداد آٹھ لاکھ ہے قارئین جامعہ نقشہ سے اندازہ کر سکیں گے کہ [illegible] کے مختلف اضلاع میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے

(ب) ہندوستان

سرکار کی مالی حالت

مرکزی حکومت | ناظرین کو یاد ہوگا کہ حکومت ہند کا اصل میزانیہ [illegible]
اس پر غور کرنے کے لئے ایک خاص اجلاس بماہ نومبر دہلی میں منعقد [illegible]
کو نامنظور کر دیا تھا لیکن وائسرائے نے اپنے اختیارات خصوصی سے
دسمبر ۱۹۳۱ء سے نافذ کر دیا تھا۔ اب ۲۸ فروری ۱۹۳۲ء کو وزیر مال نے ضمنی [illegible]
پیش کیا ہے اور اپنے بیان میں نہایت تفصیل سے حکومت ہند کی مالی حالت کے ایک ایک پہلو پر بحث کی ہے وزیر مال کا یہ بیان خلاف معمول اس قدر سلجھا ہوا ہے کہ ہر شخص اس کو دلچسپی سے پڑھ کر سمجھ سکتا ہے

اپریل ۱۹۳۱ء میں سال رواں ۳۲-۱۹۳۱ء کیلئے حسب ذیل تخمینہ کیا گیا تھا

آمدنی	ایک ارب ۳۴ کروڑ ۸۷ لاکھ
خرچ	ایک ارب ۳۴ کروڑ ۸۶ لاکھ

لیکن دوران سال میں سیاسی اور معاشی حالات کی وجہ سے تجارت درآمد اور برآمد گھٹ کر نصف رہ گئی ہے اس لئے تخمینہ کے خلاف محصول کروڑگیری نیز دیگر مدات میں آمدنی بہت زیادہ گھٹ گئی اور تخمینہ کیا گیا کہ اختتام سال تک ۱۹ کروڑ روپے کا خسارہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے میزانیہ میں ہوگا اور اگر مناسب تدابیر نہ اختیار کی گئیں تو ۳۳-۱۹۳۲ء میں بھی تقریباً ۱۹ کروڑ کا خسارہ ہوگا۔ چنانچہ وزیر مال نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے عام مصارف میں تخفیف اور محصولات میں اضافہ تجویز کیا ہے جس پر اب مجلس آمد

چونکہ وزیر مال کا تخمینہ گزشتہ نمبر میں یہ تھا کہ مجوزہ تخفیف مصارف اور اضافہ محصولات کے بعد سال رواں یعنی سنہ ۳۲-۱۹۳۱ کے میزانیہ میں ۱۹ کروڑ کی بجائے صرف دس کروڑ سترہ لاکھ کا خسارہ رہے گا۔ اور سنہ ۳۳-۱۹۳۲ کے اختتام پر بجائے کسی خسارہ کے ۵ کروڑ ۲۳ لاکھ کی بچت ہو گی۔ لیکن بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وزیر مال کا یہ تخمینہ ضرورت سے زیادہ صحیح تھا۔ اس لئے کہ بجائے دس کروڑ ۱۷ لاکھ کے سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے میزانیہ کے تیرہ کروڑ ۶۶ لاکھ کا خسارہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سنہ ۳۳-۱۹۳۲ کے اختتام پر جو بچت ۵ کروڑ ۲۳ لاکھ کی ہونے والی تھی اس میں سے ۲½ کروڑ روپیہ چار ہی مہینے کے اندر نکل گئے اس میں بارہ مہینہ باقی ہیں اور کل دو کروڑ پندرہ لاکھ کا فرق اب رہ گیا ہے اگر لباس اور معاشی حالات ملک کے یہی رہے جو اس وقت ہیں تو کوئی تعجب نہ ہو گا اگر سنہ ۳۳-۱۹۳۲ کے میزانیہ میں بجائے کسی بچت کے چھ سات کروڑ کا خسارہ ہو گا۔

...

مرکزی حکومت ہند کے خاص خاص ذرائع آمدنی محصول کروڑگیری، انکم ٹیکس اور محصول نمک ہیں خرچ کی مدات میں فوجی مصارف۔ قرضہ جات کا سود۔ اور مختلف دفاتر کے مصارف ہیں جس کا صحیح اندازہ ذیل کے نقشے سے کیا جاسکتا ہے۔

تخمینہ آمدنی بابتہ سنہ ۳۳-۱۹۳۲		تخمینہ مصارف بابتہ سنہ ۳۳-۱۹۳۲	
۱۔ کروڑگیری کا محصول	۵۲,۳۱,۲۷,۰۰۰	۱۔ فوجی مصارف	۴۷,۹۱,۹۶,۰۰۰
۲۔ انکم ٹیکس	۱۸,۷۳,۳۸,۰۰۰	۲۔ سود	۱۹,۹۲,۳۵,۰۰۰
۳۔ نمک محصول	۹,۴۳,۴۰,۰۰۰	۳۔ دیوانی	۹,۶۴,۹۳,۰۰۰
۴۔ ٹکسال	۳,۳۱,۱۷۰۰۰	۴۔ ریل و متفرق خرچ	۵۱,۳۲,۲۱,۰۰۰
۵۔ ریل و متفرق آمدنی	۴۹,۱۷,۰۳,۰۰۰	کل خرچ	۱,۲۷,۸۱,۴۵,۰۰۰
کل آمد	۱,۲۹,۹۶,۲۹,۰۰۰	بچت	۲۱۴۸۴۰۰۰
			۱,۲۹,۹۶,۲۹۰۰۰

... ...

آمدنی کی مدات میں سب سے زیادہ اہم محصول کروڑگیری ہے سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں اس مد سے ۴۶ کروڑ۔

۱۸ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی تھی۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں ۵۶½ کروڑ کا تخمینہ تھا لیکن کل ۴۹½ کروڑ روپیہ محصول سے آمدنی ہوئی حالانکہ آخری چار ماہ میں محصول کروڑگیری میں کافی اضافہ کردیا گیا تھا سال آئندہ کے لئے ۵۲ کروڑ ۱۳ لاکھ روپے کا تخمینہ کیا گیا ہے لیکن اول تو آمینی محصول دوسرے ملک میں سودیشی تحریک کے قوی اثرات اور تیسرے قوم کی قوت خرید کم ہو جانے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ تخمینہ صحیح ثابت نہ ہوگا۔

کروڑگیری کا دارومدار تجارت درآمد اور برآمد پر ہے درآمد میں سب سے زیادہ آمدنی۔ شکر اور سوتی کپڑے سے ہوتی ہے لیکن شکر کی درآمد نصف سے زیادہ کم ہوگئی اور تین کروڑ ۵۶ لاکھ روپے اس محصول میں نقصان ہوا ہے۔ سوتی کپڑے کی درآمد کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہوسکتا ہے۔

جنگ عظیم سے قبل اوسطاً ہر سال ۳ ارب ۲۰ کروڑ گز

جنگ عظیم کے بعد ۲۱ء تک ۱ " ۸۰ "

اب صرف ۹۰ کروڑ گز کپڑا آتا ہے

۲۹ء تک سوتی کپڑے پر ۶½ کروڑ روپیہ محصول کروڑگیری وصول ہوتا تھا۔ لیکن اب اضافہ محصول سابقہ پونے چار کروڑ روپیہ سے زیادہ اس مد میں وصول نہیں ہوتا۔ لیکن دونوں مدوں سے جو نقصان ساری آمدنی کو ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ فائدہ دیسی مصنوعات کو پہنچ رہا ہے شکر سازی اور سوتی کپڑے کی صنعتیں بیرونی مقابلہ میں بالکل تباہ ہوگئی تھیں ان کو زندہ کرنے کے لئے آمینی محصول لگانے کی شدید ضرورت تھی اب بھی ان دونوں صنعتوں کی حالت بہت زیادہ قابل اطمینان نہیں ہے بیرونی مال کی درآمد میں آمینی محصول کی وجہ سے اتنی زیادہ کمی نہیں ہوتی ہے جتنی کہ عام کساد بازاری ملک کی سیاسی حالت اور قوم کی قوت خرید کم ہوجانے کی وجہ سے اس کی اصل حالت قائم ہوجائے گی اور مزید آمین کی ضرورت ہوگی

... ...

مٹی کے تیل پر اضافہ محصول کی وجہ سے سال رواں میں زائد آمدنی کی توقع کی جاتی ہے اور یہی حال نمک کے محصول کا بھی ہے کہ باوجود ۲۵ فی صدی اضافہ محصول کے نمک کی مانگ پر اس کا

کیا انہیں پڑا اور ایک کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کی مزید آمدنی اس مد سے حاصل ہوگی چنانچہ وزیر مال اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ آئندہ اگر آمدنی میں اضافہ کرنے کی ضرورت پڑے تو ایسی ہی چیزوں پر اضافہ کیا جائے جو عوام الناس استعمال کرتے ہیں صاحب موصوف کی اس رائے سے شاید کوئی شخص اتفاق نہ کرے۔ نمک ناگزیر ضروریات زندگی سے ہے اور اس پر محصول کا اضافہ یا تخفیف کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ اگر نمک سستا ہو جائے گا۔ تو لوگ اس کو پھانکنا نہ شروع کردیں گے اور اگر بہت زیادہ گراں ہوگا تو روکھی روٹی اور بے نمک کی دال نہ کھائیں گے۔ وزیر مال کا خیال صحیح ہے کہ تھوڑے آدمیوں پر زیادہ محصول لگانے کی اب انتہا ہوچکی ہے اور اس سے زیادہ ان سے وصول نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عوام الناس پر جو باران کی آمدنی کے لحاظ سے اس وقت پڑ رہا ہے یہ بھی ناقابل برداشت ہے۔ اس پر اگر اور اضافہ کیا گیا تو ناگزیر ضروریات زندگی سے گویا کوئی چیز ان سے چھین لی جائے گی۔ وزیر مال کو ایک نہ ایک آنہ فی کس عوام الناس سے وصول کرنا زیادہ آسان نظر آتا ہے لیکن ہر ایک آنے کی قدر ان غریبوں کے دل سے کوئی پوچھے جو اس ایک آنہ سے ایک وقت اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

گذشتہ میزانیہ میں ایک بزاز کی آمدنی پر بھی انکم ٹیکس لگایا گیا تھا' لیکن وزیر مال نے اس اضافہ کے متعلق کوئی اعداد و شمار پیش نہیں کئے جس سے معلوم ہوتا کہ مجموعی آمدنی میں اس جدید محصول سے کتنا اضافہ ہوا۔

... ...

میزانیہ میں توازن پیدا کرنے کی وزیر مال نے دو صورتیں تجویز کی تھیں کہ محصولات میں اضافہ کیا جائے اور مصارف میں تخفیف کی جائے چنانچہ محصولات میں اضافہ پونے دس کروڑ کے قریب ہوگیا ہے لیکن مصارف میں تخفیف توقعات سے بہت کم ہوئی۔ تخفیف مصارف کی کمیٹی کو صدر سر عبدالرحیم کا تو یہ خیال تھا کہ میزانیہ کا خسارہ صرف مصارف میں تخفیف کے ذریعہ پورا کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہی خیال تقریباً تمام منتخب ارکین اسمبلی کا بھی تھا' لیکن حکومت اس حد تک تخفیف مصارف کے لئے کسی طرح تیار نہ تھی پھر بھی خیال تھا کہ محصولات میں جس قدر اضافہ ہوگا کم از کم اسی قدر رقم تخفیف مصارف سے حاصل ہوگی لیکن وزیر مال کے بیان سے معلوم

ہوتا ہے کہ کل ۱۹ کروڑ روپے کی تخفیف مصارف میں کی گئی ہے جس میں سے ۵ کروڑ فوجی مصارف میں اور تین لاکھ دیوانی میں اس میں بھی بیشتر حصہ بالکل عارضی ہے اور کمانڈر انچیف صاحب نے یہ جتلا دیا ہے کہ ۴۸ کروڑ روپیہ سے کم میں فوجی مصارف قطعاً نہیں چل سکتے سال رواں کے لئے۔ کمانڈر انچیف نے از راہ عنایت ½ ۴۶ کروڑ قبول قبول کرلیا ہے یہ مطالبہ قومی نقطۂ نظر سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس پر کسی رائے زنی کی ضرورت نہیں ہر ملک اپنی آمدنی اور حیثیت کے مطابق اپنی حفاظت کا انتظام کرتا ہے جس ملک میں ۹۲ فی صدی آبادی پڑھنا لکھنا نہ جانتی ہو اور جہاں بلا مبالغہ لاکھوں جانیں ہیضہ طاعون چیچک اور بخار کے نظر ہو جاتی ہوں بعض [illegible] قحط اور [illegible] معقول انتظام نہیں۔ ایسا ملک اپنی آمدنی کا تقریباً نصف حصہ فوج کے کھلانے پلانے پر کس طرح صرف کرسکتا ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک [illegible]
کرتے ہیں وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۲۶-۲۵ اور ۲۷-۲۶ [illegible]
تیار کیا گیا ہے لیکن اتنے قلیل عرصہ میں بہت زائد فرق نہیں واقع ہو سکتا ہے

ملک					
۱۔ ہندوستان	کل آمدنی کا تقریباً		۴۵ فی صدی		فوج پر صرف کرتا ہے
۲۔ جاپان	"	"	۲۶٫۵ "	"	"
۳۔ اٹلی	"	"	۲۳٫۴ "	"	"
۴۔ فرانس	"	"	۱۹٫۷۵ "	"	"
۵ امریکہ	"	"	۱۶٫۰۹ "	"	"
۶۔ برطانیہ	"	"	۱۴٫۷۵ "	"	"
۷۔ آئرلینڈ	"	"	۷٫۴۹ "	"	"
۸ جرمنی	"	"	۷٫۱۶ "	"	"
۹۔ آسٹریلیا	"	"	۶٫۵۲ "	"	"
۱۰۔ نیوزی لینڈ	"	"	۳٫۵۱ "	"	"
۱۱ جنوبی افریقہ	"	"	۳٫۱۶ "	"	"

اس طول طویل فہرست میں سب سے اول نمبر ہندوستان ہی کو حاصل ہے اور سب سے

چاہئے مثلاً دام برکاتہا کی دیگر خود مختار نوآبادیات ہندوستان اگر اپنی اس بے بسی پر شکایت کرے تو کیا بیجا ہے

... ...

محکمہ ریل کا میزانیہ | محکمہ ریل میں بمبئی حکومت کو تقریباً ۹ کروڑ روپے کا نقصان سال رواں میں ہوا ہے ابتداءً ریلوں کا حساب کتاب مرکزی حکومت کے میزانیہ میں شامل تھا لیکن ۱۹۲۰ء میں ریلوں کے انتظام کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے ایکورتھ کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ مختلف کمپنیوں کا معاہدہ ختم ہو جانے کے بعد ریلوں کا انتظام براہ راست حکومت کے ماتحت کر دیا جائے اور ریلوں کا حساب کتاب مرکزی حکومت کے میزانیہ سے علیحدہ کر دیا جائے نیز چونکہ حکومت نے تقریباً سات ارب ۶۵ کروڑ روپیہ کا سرمایہ اب تک ریلوں پر لگایا ہے اس لئے اس سرمایہ پر کچھ منافع بھی حکومت کو ملنا چاہیئے ۱۹۲۰ تک ریلوں سے کوئی منافع نہیں ہوا تھا لیکن اس کے بعد سال بہ سال معقول آمدنی ہو رہی ہے جن کا کچھ اندازہ گذشتہ چند سال کے اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔

۱۹۲۳-۲۴ء	۶½ کروڑ	۱۹۲۶-۲۷ء	۸¾ کروڑ
۱۹۲۴-۲۵ء	۱۴ کروڑ	۱۹۲۷-۲۸ء	۱۱ کروڑ
۱۹۲۵-۲۶ء	۱۸½ "	۱۹۲۸-۲۹ء	۸ "

مارچ ۱۹۲۴ء میں حکومت ہند نے ایکورتھ کمیٹی کی سفارشات کو منظور کیا اور ایک قرار داد کے ذریعہ یہ طے پایا کہ ۱۔ ریلوں کا حساب کتاب علیحدہ کر دیا جائے۔ ۲۔ حکومت کے کل سرمایہ پر ایک فی صدی کا ⅕ حصہ سالانہ محکمہ ریل سے حکومت ہند کو ادا کیا کرے۔ ۳۔ اس کے بعد اگر کچھ فاضل رقم بچے تو اس کا بھی ⅓ حصہ مرکزی حکومت کو دیا جائے اور باقی رقم سرمایہ محفوظ اور سرمایہ فرسودگی میں جمع کر دی جائے تاکہ اگر کبھی خسارہ ہو تو سرمایہ محفوظ میں سے قرض لے کر حکومت ہند کا مطالبہ ادا کر دیا جائے اس فیصلہ کے مطابق پانچ اور چھ کروڑ کے درمیان رقم حکومت ہند کو سال بہ سال محکمہ ریل سے ملنا چاہیئے۔

... ...

۱۹۲۱ تک ریلوں سے اتنا فائدہ ہوتا تھا کہ حکومت ہند کا مستقل مطالبہ ادا کرنے کے بعد ایک کافی رقم سرمایہ محفوظ میں جمع کر دی جاتی تھی لیکن ۱۹۳۱ سے ریلوں کی آمدنی میں خسارہ شروع ہوا ہے۔ پہلے سال ہی ۱۹۳۱ میں دو کروڑ روپیہ سرمایہ محفوظ سے قرض لے کر حکومت ہند کا مطالبہ ادا کیا گیا۔ دوسرے سال ۵ کروڑ ۱۲ لاکھ خسارہ ہوا۔ چنانچہ یہ رقم اور حکومت ہند کا مطالبہ ادا کرنے کیلئے کل گیارہ کروڑ روپیہ سرمایہ محفوظ سے قرض لیا گیا۔ اب اس سال ۹ کروڑ روپیہ کا نقصان ریلوں میں ہوا ہے۔ سرمایہ محفوظ میں کل ۵ کروڑ روپیہ رہ گیا تھا۔ اس لئے کروڑ کی رقم سرمایہ فرسودگی سے قرض لے کر یہ خسارہ پورا کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں حکومت ہند کا مطالبہ کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے سر جارج رینی جو اس محکمہ کے ذمہ دار ہیں تخمینہ کیا ہے کا خسارہ ہوگا۔

... ...

عالمگیر کساد بازاری کا زمانہ ہے۔ ریلوں کے محکمہ میں یہ نقصان بہت زیادہ ... ہے لیکن ریلوں کا کاروبار چونکہ تجارتی اصول پر ہے۔ اور کوئی کاروبار ایک عرصہ تک مسلسل نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسی صورتیں نکالی جائیں کہ اگر فائدہ نہ ہو تو نقصان بھی نہ ہو۔ یہ اس طرح ممکن ہے کہ کرایہ اور محصول میں اضافہ کیا جائے۔ اور انتظامی مصارف میں زیادہ سے زیادہ تخفیف کی جائے۔ چونکہ ریلوں کے کاروبار میں اجارہ داری ہے اور اس کا انتظام بھی حکومت کے ہاتھوں میں ہے اس لئے اندیشہ تھا کہ یہ نقصان صرف کرایہ ریل اور محصولات میں اضافہ سے پورا کیا جائے گا۔ اور مصارف میں صرف برائے نام تخفیف ہوگی۔ لیکن سر جارج رینی (ریلوے ممبر) نے تسلیم کیا ہے کہ کرایہ ریل اور محصول کے اضافہ سے ریلوں کی آمدنی بجائے بڑھنے کے گھٹ جائیگی۔ اس لئے اب یہ خسارہ صرف تخفیف مصارف سے پورا ہو سکتا ہے اس وقت تک ریلوے بورڈ نے جو کوششیں تخفیف مصارف کیلئے کی ہیں۔ وہ ہر طرح قابل اطمینان ہیں۔ بشرطیکہ یہ کوششیں آئندہ بھی جاری رہیں۔ یہ بھی تجویز ہے کہ ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو ریلوں کے انتظام کے متعلق از سر نو تحقیقات کرے۔ اس کمیٹی میں جرمنی اور فرانس کے واقف کار ماہرین کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش ہے تاکہ وہ اپنے ملک کے سالہا سال کے تجربات کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے متعلق مفید مشورہ دیں۔

[illegible] کا کام بھی مالی مشکلات کی وجہ سے بہت رُکا جا رہا ہے لیکن اس میں حتی الوسع کمی [illegible] ہونا چاہیئے۔ ملک کی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کا دار و مدار ذرائع نقل و حمل خصوصاً ریلوں کی ترقی پر ہے۔ ہندوستان کے اٹھارہ لاکھ مربع میل رقبہ میں کل ۴۱ ہزار میل ریل اب تک تیار ہوئی ہے۔ اس کے بالمقابل یورپ کے ۱/۲ ۷ لاکھ مربع میل (روس کو نکال کر) کے رقبہ میں ۱۰ لاکھ میل ریل موجود ہے۔ ذیل کے نقشہ سے مختلف ممالک میں ریلوں کی ترقی کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

بلجیم	فی ہزار مربع میل	۳۹۶ میل ریل
انگلستان	" "	۱۹۵ "
امریکہ	" "	۷۰ "
جاپان	" "	۳۲ "
ہندوستان	" "	۲۰ "

موجودہ کساد بازاری۔ بظاہر کوئی مستقل صورت نہیں اختیار کر سکتی اس لئے ریلوں کی توسیع کے پروگرام میں جہاں تک ممکن ہو کوئی کمی نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ بالآخر اس سے ملک کی ترقی کی راہ میں اس سے زیادہ رکاوٹیں پیدا ہوں گی جتنی کہ اس وقت موجود ہیں۔

ممالک غیر

چین و جاپان آخری خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپان نے شنگھائی کے علاقہ میں فوجی کارروائیاں بند کر دی ہیں اور انجمن اقوام کی مداخلت اور تحقیقات ہی کو منظور کر لیا ہے۔ ایک گذشتہ اشاعت میں یہ بتلایا گیا تھا کہ جاپان کو مختلف عہد ناموں کی وجہ سے جو اس نے براہ راست چین سے کئے یا جو اسے روس سے اپنی عہد آفریں فتح کے بعد ورثتاً ملے۔ منچوریا میں عرصہ تک کے لئے بہت اہم حقوق حاصل ہیں۔ ان حقوق کی بناء پر منچوریا میں فوجی کارروائی کرتے وقت جاپان کو بین الاقوامی مداخلت کا زیادہ اندیشہ نہ تھا۔ لیکن جس حد تک منچوریا میں پیش قدمی کرنے کا قصد جاپانی وزارت نے کیا تھا وہاں اس سے زیادہ پیش قدمی ہو گئی اس لئے

کہ جاپانی فوج کا اقتدار سیاست پر غالب تھا اور منچوریا جاپانی فوج کے لئے ارض مقدس ہے۔ اس زیادتی نے مجلس یورپ کے کان کھڑے کئے، اُدھر امریکہ (جو جاپان کے مقابلہ میں ہمیشہ چین کی منڈی کو اپنے لئے محفوظ کرنے کی غرض سے اس کی حفاظت کرتا ہے) نے سخت احتجاج کیا۔ لیکن جاپان نے ایک کی نہ سنی اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کی وہ تفسیر اپنے عمل سے پیش کی جس کے سامنے تمام احتجاجات اور انجمن اقوام کی تمام قرار دادیں بے اثر ثابت ہوئیں۔

منچوریا کے بعد فوجی کارروائیاں شنگھائی کے علاقہ میں نہایت شدومد کے ساتھ شروع ہوئیں
اور بلا اعلان جنگ کے گذشتہ جنگ عظیم کے ہیبت ناک مناظر دنیا نے دیکھ
ہوا سے ہوائی شہر جلے، پر امن شہری قتل ہوئے، لاکھوں آدمی بے
کا باضابطہ اعلان بھی نہیں ہوا! اب خدا خدا کرکے یہ بے ضابطہ جنگ
فوجی کارروائیوں کے آغاز اور اس وقت ان کے بند ہونے کے متعلق ..

شنگھائی میں فوجی کارروائی کا ہونا جاپان کے لئے اس واسطے ضروری تھا کہ منچوریا کی فوجی کامیابیاں شنگھائی کے تجارتی میدان میں شکست سے مبدل ہو رہی تھیں۔ جب چین منچوریا کو نہ بچا سکا تو اس نے جاپانی مال کا بائیکاٹ کیا اور اس بائیکاٹ کا مرکز شنگھائی تھا۔ چین کی تجارت، ساہوکارہ، جہازرانی اور ہر قسم کا کاروبار آکر شنگھائی میں جمع ہو گیا ہے۔ کچھ عرصہ سے سیاست کے اعتبار سے اسے کینٹن پر فضیلت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ یہیں جاپانی مال اور جاپانیوں کے بائیکاٹ کی تحریک نے زور پکڑا۔ جاپان جو منچوریا کو اس لئے اپنے تسلط میں لانا چاہتا تھا کہ اس کی تجارت کے لئے اجناس خام وہاں سے بآسانی حاصل ہو سکیں گی اسے کیسے گوارا کرتا کہ اس خام مال کو مصنوعات میں تبدیل کرنے کے بعد کوئی انھیں ہاتھ بھی نہ لگائے! چنانچہ شنگھائی میں فوجیں اتار دی گئیں اور تجارتی مال کو بیچنے کے لئے خریدنے والوں کے جان و مال کو برباد کر دیا گیا!

یہ کارروائی بلا نظیر نہ تھی۔ اس لئے کہ ۱۹۲۶ء میں چینی انقلاب کے موقع پر اپنے اغراض کی حفاظت کے لئے برطانیہ نے بھی شنگھائی میں فوج بھیجی تھی۔ لیکن انگریزی فوج اپنی وزارت کے قبضہ میں تھی اس لئے سیاسئین کی مصلحت آمیزیوں پر کسی نے کان نہ دھرا اور منچوریا کی طرح شنگھائی میں بھی سپہ سالاران جاپانی نے اپنے دل کا حوصلہ نکالا۔

غریب انجمن اقوام جس کے تمام با اثر رکن خود دل میں معاملات کو طے کرنے کے اسی جا پانی مسلک کے قائل ہیں وقتاً فوقتاً قرار دادیں منظور کرتی رہی اور جاپان ان کی طرف سے بے اعتنائی برتتا رہا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ ان احتجاج کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنے مال کو بکو انے کے لئے وہی سب کر سکتا ہے جو وہ خود کر رہا ہے۔ انجمن اقوام کی حقیقت سے اس کے شرکا سے زیادہ کون واقف ہو سکتا ہے کہ بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند لیکن پھر بھی ضمیر انسانیت ان ظالمانہ حرکتوں پر مشتعل ہوتا ہے اور کوئی ظالم اس کی طرف سے کامل بے اعتنائی نہیں برت سکتا' ہمیشہ ظالموں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس ضمیر کو اپنے کسی خواب آور عمل سے سلادیں۔ چنانچہ یہی اب جاپان کرنا چاہتا ہے۔ اس نے انجمن اقوام کی تمام تجاویز کو اچھی طرح ٹھکرایا اور اب منچوریا پر اچھی طرح تسلط قائم کر کے' وہاں ایک نام نہاد جمہوریت قائم کر کے اور شنگھائی میں جان وماں کی تباہی کے علاوہ چینی دلوں میں ہیبت پیدا کر کے وہ ضمیر انسانیت کا خیال بھی کر سکتا ہے اور "بگلہ بھگت" بن سکتا ہے!

چنانچہ انجمن اقوام کا وفد تحقیقاتی جائے گا۔ شنگھائی سے تو جاپانی فوجیں ہٹ جائیں گی مگر منچوریا پر تسلط قائم رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ امریکہ اور ایک دو مغربی دول کو بھی کچھ حقوق مل جائیں گے!

برطانیہ درآمد اشیا پر ایک عام محصول لگا کر برطانیہ بھی اصولاً تامینی تجارت کے حامیوں کی صف میں آملا ہے۔ جو لوگ آزاد اور مامون تجارت پر انگریزی ادب سیاسی ومعاشی میں مفصل بحثیں پڑھنے کے عادی ہیں اور انگلستان کو آزاد تجارت کا سب سے بڑا حامی جانتے ہیں انھیں شاید یہ تبدیلی عجیب معلوم ہو۔ لیکن عرصہ سے اس کے لئے میدان تیار ہو رہا تھا۔ اصول اگرچہ آزاد تجارت ہی کا مقبول عام تھا لیکن مخصوص صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے تامینی محاصل کی تدبیر نے جو بسا اوقات اختیار کی جا چکی تھی تامین کو بالکل نامانوس چیز نہ رکھا تھا۔ اُدھر جنگ عظیم کے بعد سے دوسری قوموں کی شدید تامینی تدابیر نے انگلستان میں بھی اس کے لئے خاصی آمادگی پیدا کر دی تھی۔ پھر خود اپنی نوآبادیوں سے تجارت کو ترجیح دینے کا خیال بہت ہر دلعزیز تھا' حال میں مزدوروں کے سیاسی اثر کی ترقی نے اجرتوں کو گھٹنے سے روکا' کام کا وقت کم کیا' اور یوں مصارف پیدائش میں اضافہ ہوا۔ دوسرے ملک جنھوں نے اپنے کو تامینی دیواروں میں محصور کر لیا تھا اپنی سستی اجرت اور طویل اوقات کار کے سبب ارزاں

چیزیں بنا بنا کر برطانیہ کے مقابلہ کا حوصلہ کیا اور انگریزی صنعت سچ یہ ہے کہ بڑے خطرہ میں پڑگئی۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے پہلے تو انگلستان نے اپنے سکہ کا تعلق سونے سے منقطع کیا اور اس طرح ملک کے اندر اپنے مال کی قیمت بڑھائی اور پردیسیوں کے لئے اسے ارزاں کیا۔ لیکن یہ تدبیر کافی نہ تھی۔ اس لئے تامین کی تدبیر اختیار کی گئی اور اب چند چیزوں کو مستثنیٰ کر کے سب درآمد پر قیمت کا ۱۰ فی صدی محصول عائد کر دیا گیا مستثنیٰ چیزوں میں سے خاص خاص یہ ہیں، گیہوں، گوشت، چاء، ربڑ، چمڑے اور کپڑے کی صنعت کے لئے اجناس خام۔ چھ مہینے کے بعد اس فہرست پر نظر ثانی کی جائے گی اور اس میں ترمیم یا توسیع حکومت وقت کے اختیار میں ہوگی۔ اس باب میں حکومت کو مشورہ دینے کے لئے ایک مشاورتی مجلس مقرر کر دی گئی ہے جو تامینی محاصل کے اثرات کا بغور مطالعہ کرتی رہے گی۔

خود برطانوی سلطنت کے مختلف اراکین کے باہمی معاشی تعلقات ... نے اُٹھا رکھا گیا ہے جو عنقریب منعقد ہونے والی ہے۔

آئرستان آئرستان کے انتخابات میں پچھلی حکومت کو شکست ہوگئی اور ڈی ولیرا کی ... گئی۔ گذشتہ سال ہی یہ بات بہت واضح ہوگئی تھی کہ آئرستان کے شہریوں میں سیاسی اختلافات نہایت گہرے ہوگئے ہیں اور اس حد سے کہیں آگے بڑھ چکے ہیں جہاں تک جمے ہوئے پارلیمنٹی نظام کی صورت میں اکثر ہوتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمہوری جماعت کی طرف سے ملک میں ایک قوی انقلابی تحریک شروع ہونے والی ہے۔ چنانچہ گذشتہ حکومت نے دستور اساسی میں ترمیم کی نہایت غیر معمولی کارروائی تک سے احتراز نہ کیا اور گذشتہ اکتوبر میں دستور کے ان دفعات میں، جن سے شخصی آزادی، اظہار خیال کی آزادی، اور باضابطہ عدالتی تحقیقات کا حق ہر شہری کو ملا تھا، ترمیم کر دی گئی۔ اور سیاسی جرموں کی تحقیقات کے لئے ایک فوجی عدالت قائم کی گئی جسے سزائے موت تک کا اختیار تھا۔ لیکن بظاہر یہ فوجی عدالت اور جمہوری جماعت کو دبانے کی کوشش ناکام رہی اور بلا خون کا ایک قطرہ بہائے یہ جماعت انتخابات میں برسر اقتدار آگئی۔ ڈی ولیرا جو جنگ آزادی کے زمانے میں بھی وطن خواہ جماعت کا سردار تھا آج پھر حکومت آئرستان کا صدر ہے۔ عہدۂ صدارت پر متمکن ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے تو ان سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جو مذکورہ بالا قانون کے ماتحت پابجولاں تھے۔ پھر یہ اعلان کیا

کو انگلستان کی وفاداری کی قسم سے کا فرض آئرستان کی پارلیمنٹ کے ارکین پر عاید نہ کیا جائیگا۔ ان مسائل پر یقیناً بہت جلد انگلستان اور آئرستان میں اختلافات رونما ہوں گے اگرچہ رفتار سیاست کا خیال کرکے یہ کہنا دشوار نہیں ہے کہ انگلستان اس سلسلہ میں بہت سے تلخ گھونٹ پینا گوارا کرے گا!

جرمنی صدر جمہوریہ کا انتخاب فیصلہ کن ثابت نہ ہوا۔ جرمن دستور کے مطابق پہلے انتخاب میں وہ شخص صدر منتخب ہو سکتا ہے جو امیدواروں سے بہیئت مجموعی زیادہ رائیں حاصل کرے۔ اگر کوئی امیدوار بھی ایسا نہ کر سکے تو پھر دوبارہ انتخاب ہوتا ہے جس میں محض اکثریت آرار انتخاب کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔ اس انتخاب نے جرمنی کے موجودہ صدر اور قیصری زمانہ کے مشہور عالم سپہ سالار فان ہنڈنبرگ کو سب سے زیادہ رائیں ملیں لیکن دوسرے امیدواروں کی مجموعی رایوں سے کم۔ اس لئے اب انتخاب دوبارہ ۱۰ اپریل کو ہوگا جس میں فان ہنڈنبرگ کا منتخب ہوجانا تقریباً یقینی ہے۔

جرمنی کی موجودہ سیاسی اور معاشی حالت کا خیال کرکے وزیر اعظم نے پہلے تو یہ کوشش کی تھی کہ سب سیاسی جماعتیں مل کر دستور اساسی میں ترمیم کردیں اور ہنڈنبرگ کا زمانہ صدارت اور بڑھا دیا جائے۔ لیکن قدامت پسند اور "قومی اشتراکی" جماعتوں کے قائد ہوگن برگ اور ہٹلر اس پر راضی نہ ہوئے۔ سیاست بھی عجیب دھوپ چھاؤں ہے، جن لوگوں نے گذشتہ انتخاب میں ہنڈنبرگ کو صدر بنوایا وہ آج اس کے مخالف ہیں اور ہنڈنبرگ کو جتنی رائیں ملیں اکثر ان جماعتوں سے جو پچھلی بار اس کے خلاف تھیں۔ آج یہ مخالف دیکھتے ہیں کہ ملک کو شاہ پسندی اور اشتراک کے خطرناک تجربوں سے اگر کوئی شخص بچا سکتا ہے تو ہنڈنبرگ۔ خانہ جنگی کو ٹال سکتا ہے تو یہ بوڑھا سپہ سالار، جمہوریت اور دستور کو قائم رکھ سکتا ہے تو قیصر کا یہ آزمودہ کار جنرل!

لیکن ہر چند ہنڈنبرگ کا انتخاب اس مرتبہ یقینی سا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس سے جرمنی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس سے صرف تغیر سیاسی و معاشی کی رفتار ذرا ہموار ہو جائے گی اور بس۔ زندگی کے شعبہ میں نہایت تیزی سے تغیر ہو رہا ہے۔ سیاسی اور معاشی انتشار ناقابل برداشت ہوتا جاتا ہے۔ ہٹلر کی جماعت بس یہی کہتی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ناقابل برداشت ہے۔ ہمیں برسر اقتدار کردو تو سب ٹھیک ہو جائے۔ وہ یہ نہیں بتلاتا کہ کیسے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، لیکن

انتشار میں لوگوں کو یہ سوال کرنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ اُدھر انتہا پسند اشتراکی کہتے ہیں کہ یہ پریشاں حالی کسی شخص کا قصور نہیں، یہ نظام سرمایہ داری کا لازمہ ہے اور اس کی ماہیت کا تقاضا ہے۔ اس نظام کو انقلاب اشتراکی سے ختم کرو، سب کچھ درست ہو جائے گا۔ اور جرمنی کے نوجوان، دیوالیے، دلوں میں تلخی رکھنے والے، طبقہ وسطیٰ کے سب وہ لوگ جن کی ساری دولت جنگ کے بعد جرمن سکہ کی خرابی کی وجہ سے دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے نکل گئی، یہ سب یا تو ہٹلر کی طرف جاتے ہیں یا اشتراکیوں کی طرف۔ اور ان سب کے معنی ہیں جرمن قوم کا بہت بڑا حصہ۔ اگر رفتار یہی رہی تو قیاس ہے کہ پہلے ہٹلر کو کامیابی ہوگی۔ جب وہ اپنے وعدے وفا نہ کر سکے گا اور ظاہر ہے کہ نہ کر سکے گا۔ تو اشتراکیوں کا موقع آئے گا اور انقلابی تحریک بہت قوی ہو جائے گی۔

اشتراکی روس کا مشہور سپہ سالار تراتسکی جو اس وقت جلا وطن ہے ایک جگہ جرمنی کے متعلق لکھتا ہے:۔

"جرمن معاملات کی رفتار پر صرف جرمنی کی قسمت کا انحصار نہیں ہے بلکہ عرصہ تک کے لئے دنیا کی قسمت کا دارومدار ہے۔ روس کی اشتراکی تعمیر، ہسپانی انقلاب کی رفتار، انگلستان میں انقلاب سے پہلے کی سی حالت کا پیدا ہونا، اور فرانسیسی سامراجیت کا آنے والا حشر، یہ سب کچھ آکر ایک نقطہ پر جمع ہو گیا ہے۔ یعنی اس سوال کے جواب پر کہ اگلے چند مہینوں میں جرمنی میں کون جیتتا ہے اشتراکی یا فاشستی (ہٹلر)؟ کسی مخروطہ کے سرے پر ایک گیند رکھ دو تو ذرا سے دھکے سے وہ سیدھی طرف لڑک سکتی ہے یا الٹی طرف۔ یہی حال اس وقت جرمنی کا ہے، اور لڑکنے کا وقت ساعت بہ ساعت قریب آتا جاتا ہے۔ بعض قوتیں چاہتی ہیں کہ گیند سیدھی طرف لڑھکے (قدامت پسندی کی طرف) اور مزدور جماعت کی کمر اس سے ٹوٹ جائے۔ بعض چاہتے ہیں کہ گیند وہیں سرے پر رکھی رہے۔ یہ لوگ ناممکن بات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ گیند وہاں نہیں رہ سکتی۔ اشتراکی چاہتے ہیں کہ گیند الٹی جانب (انقلاب کی طرف) لڑھکے اور

سرمایہ داری کی کمر توڑ دے۔ لیکن آرزوئیں کافی نہیں ہوتیں۔ عمل کی قوت درکار ہے۔"

لیکن عجب بات ہے کہ باقی دنیا کا بڑا حصہ یہی چاہتا ہے کہ گیند اوپر سرے ہی پر رکھی رہے!

شذرات

اردو اکادمی کا جلسہ جو ۱۹ مارچ کو ہونے والا تھا ملتوی کرنا پڑا۔ شہر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہو گیا جس کی رو سے ہر عام جلسہ کرنے کے لئے خاص طور پر اجازت لینے کی ضرورت تھی۔ یہ اطلاع اتنی دیر میں ملی کہ اگر اجازت کا انتظار کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ جلسہ کا وقت آپہنچے اور اس وقت تک اجازت کی اطلاع نہ آئی ہو۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ جلسہ ملتوی کر دیا جائے۔ اس تھوڑے وقت میں لوگوں کو بہ عجلت التوا کی اطلاع دیدی گئی۔ اب انشاء اللہ جلسہ ۹ اپریل کو ہوگا۔ اخباروں کے اور دعوت ناموں کے ذریعہ سے دو تین دن پہلے سب حضرات کو

فروری کے جامعہ میں جو افسانہ شائع ہوا۔ اس کا صاحب نے لکھا ہے۔ غلطی سے ان کا نام شائع نہ ہو سکا۔ ہم ان مہینہ جو افسانہ شائع ہو رہا ہے اس میں کسی کا نام نہیں اور اس کے ساتھ کوئی خط بھی ہمیں آیا یا آیا ہو تو ہمارے پاس نہیں پہنچا۔ ہمیں امید ہے کہ جن صاحب نے یہ افسانہ بھیجا ہے وہ اپنے نام نامی سے مطلع فرمائیں گے۔ انعامی مقابلہ کی جو تاریخ مقرر تھی اس کے گذر جانے کے بعد یہ افسانہ موصول ہوا ورنہ یقیناً یہ انعام کا مستحق قرار پاتا۔

دہلی یونیورسٹی کا جلسہ تقسیم اسناد ۱۹ مارچ کو منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک کے بجائے تین خطبے دئے جاتے ہیں۔ ایک صدر کا جو اس سال مقرر ہوا ہو۔ دوسرا وائس چانسلر کا اور تیسرا پرو چانسلر یعنی وائسرے کی کونسل کے ممبر تعلیمات کا۔ اس تثلیث کی علت سمجھ میں نہیں آتی مگر کچھ ہوگی ضرور۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جلسہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ وائس چانسلر صاحب یونیورسٹی کی مختصر رپورٹ سنائیں اور پرو چانسلر صاحب اس کا جواب دیں مگر چونکہ اس قسم کے جلسوں میں باہر کے کسی شخص سے خطبۂ صدارت پڑھوانے کی رسم ہے اس لئے یہ بھی

افسوس ہے کہ سر سی پی راماسوامی آئر کا خطبۂ صدارت اس توقع کو پورا نہیں کرتا جو اُن کے علم و فضل اور عملی کارناموں کی بنا پر تھی کہ وہ علم و تعلیم پر وسیع مدبرانہ نظر ڈالیں گے۔ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو خطبہ پڑھا جائے اس میں یہ تین باتیں ہوں یا کم سے کم ان میں سے ایک بات ہونی چاہیئے۔ اعلیٰ تعلیم کے نصب العین کے متعلق کوئی نظریہ جو خطبہ پڑھنے والے نے ذاتی غور اور مشاہدے سے قائم کیا ہو یا کم سے کم گہری تنقید کے بعد تسلیم کیا ہو، اور اس کے ماتحت موجودہ یونیورسٹیوں کی حالت پر تبصرہ۔ ۲۔ اس خاص یونیورسٹی کے عملی مسائل کی بحث اور ان کے حل کرنے کے لئے مفید مشورہ ۔ ۳۔ فارغ التحصیل طلبا کو عملی زندگی کے متعلق جس سے انہیں سابقہ پڑنے والا ہے ایسی ہدایتیں جن سے انہیں بصیرت اور فیضان حاصل ہو۔ یوں تو فاضل مقرر کے خطبہ میں یہ تینوں چیزیں موجود ہیں مگر کوئی اس معیار پر پوری نہیں اترتی جو ایسی وقیع علمی صحبت کی تقریروں کا ہے یا ہونا چاہئے۔

تعلیم کے نصب العین کی بحث میں موصوف نے کئی اہم مسئلے چھیڑے ہیں۔ لیکن اتنے اختصار سے کام لیا کہ نہ اپنا مطلب اچھی طرح واضح کر پائے اور نہ خیالات میں منطقی تسلسل اور ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ چند متفرق نکتے بیان کر دینے سے علمی تحقیق یا عملی رہنمائی کا فرض پورا نہیں ہوتا۔ پہلے فاضل مقرر نے یہ بحث اٹھائی کہ یونیورسٹی کی تعلیم میں عام تمدنی تربیت اور کسی خاص فن کا مطالعہ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر اتنا زور نہیں دینا چاہیئے کہ دوسرے کو نقصان پہونچے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ موصوف کے اندازِ بیان سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ ان کے نزدیک تعلیم کے ان دونوں طریقوں میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ طبیعتوں کے لئے مناسب ہے۔ بعض کو ایک طرح کی تعلیم ملنی چاہیئے بعض کو دوسری طرح کی حالانکہ یونیورسٹی کی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ علم کو مرکز بنا کر ہر نوجوان تمدنی زندگی کے ہر شعبے سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا کرے تاکہ تمدن کا ایک مجموعی تصور اس کے ذہن میں قائم ہو سکے مگر اس کے ساتھ کسی ایک چیز کا گہرا مطالعہ کرے تاکہ اس کے ذریعے سے وہ کسی

حیثیت سے معاشرت کی عملی خدمت کر سکے اور اس کی بقا اور ترقی میں معاون ہو سکے۔

اس کے بعد موصوف نے اور اہم مقاصد کی طرف اشارہ کیا مگر صرف اشارہ ہی کرکے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اعلیٰ تعلیم میں اصل چیز یہ نہیں کہ بعض معلومات اور مشاہدات حاصل کرلئے جائیں بلکہ یہ ہے کہ نظر بینا پیدا کی جائے کہ انسان اپنے طبعی اور ذہنی احول کے تغیرات کو سمجھتا رہے اور ان سے مطابقت پیدا کرکے ہم آہنگ زندگی بسر کرے اس کے علاوہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کی عملی خصوصیات و معاشی ضروریات کو پیش نظر رکھے اور نوجوانوں کو ہر قسم کے مفید پیشے اختیار کرنے کا شائق اور اس کے لائق بنادے۔ مگر سب سے بڑا کام یونیورسٹی کا طالب علموں کے ... خدمت کا ذوق، وسعت نظر اور قوت ارادی پیدا کرنا ہے۔

دہلی یونیورسٹی کی عملی ضروریات کے سلسلے میں جو یونیورسٹی اور کالجوں کی تعلیم اور ان کے فرائض کی تقسیم ... آپ نے یہ بتایا کہ تعلیم کالجوں میں ہو۔ یونیورسٹی صرف اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ اور ... فراہم کرے مگر یہ بھی مالی دقتوں کے سبب سے فی الحال ناممکن ہے۔

مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ دہلی یونیورسٹی اس وقت تک مختلف کالجوں کا نام ہے جو ایک انتظامی سلسلہ میں مربوط کر دئے گئے ہیں۔ اب ان کو ملا کر وہ اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنا جو یونیورسٹی میں ہونا چاہیئے کیونکر ممکن ہے جو حل فاضل مقرر نے بتایا ہے اس سے نہ تو پوری نظری تشفی ہوتی ہے اور نہ زیادہ عملی مدد ملتی ہے۔

آخر میں فاضل مقرر نے طلبار کو نصیحت بھی کی مگر یہ نصیحت رواج کے مطابق بس یہیں تک محدود ہے کہ انھیں سیاست میں شرکت نہیں کرنا چاہیئے اس نصیحت کی جو دلیلیں ممدوح نے پیش کی ہیں۔ وہ ان دلائل سے کہیں زیادہ معقول ہیں جو عموماً ایسے موقعوں پر پیش کی جاتی ہیں۔ موصوف نے فرمایا کہ سیاست ہمیشہ فرقہ بندی اور نفاق پیدا کرتی ہے

یونیورسٹی کے طالب علموں کی جماعت کو ایک متفقہ برادری بن کر رہنا چاہیے جس کا مشترکہ مقصد وہ ذہنی اور اخلاقی قوت پیدا کرنا ہو جو کشمکش حیات میں عملی حصہ لینے کے لئے ضروری ہے مگر فاضل مقرر نے ان نوجوانوں کی مشکلات پر غور نہیں فرمایا۔ ذہنی اور اخلاقی قوت پیدا کرنے کے لئے جن مؤثرات کی ضرورت ہے ان میں حب وطن۔ درد ملت۔ قوم کے سیاسی رہنماؤں کا احترام بھی شامل ہے۔ مگر یونیورسٹیاں حکومت کے دباؤ سے طلبہ پر ایسے قیود عائد کرتی ہیں کہ یہ جذبات بے تکلفی سے ظاہر نہیں ہونے پاتے بلکہ اپنے اظہار کی غیر معمولی راہیں ڈھونڈتے ہیں جن سے نقصان بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ پیش پا افتادہ بات ہے جسے نوجوانوں کا ہر معلم جانتا ہے بلکہ غالباً یونیورسٹیوں کے ارباب حل و عقد اور حامی حکومت سیاست داں بھی سمجھتے ہیں مگر حکومت کی مروت انہیں مجبور کرتی ہے کہ جیسے بھولے طالب علموں پر شورش پسندی کا الزام لگا دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرادارت

مولنا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے

جلد — بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ، دہلی سے شائع کیا۔

مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر

مصر میں مسلمان سنہ ۱۸ھ میں داخل ہوئے جبکہ حضرت عمر فاروق کے عہد میں عمرو بن عاص نے اس کو فتح کیا۔ اس زمانے میں مصر کی جو حالت تھی اس کو دکھلانے کے لئے ضرورت ہو کہ اختصار کے ساتھ وہاں کی قدیمی تاریخ بیان کردی جائے۔

آج کل جو حصہ زمین مصر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کا مجموعی رقبہ تین لاکھ تراسی ہزار میل مربع ہے جو بیس ضلعوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن اس رقبے میں سے مزروعہ حصہ ۱۳ ہزار میل مربع سے زائد نہیں۔ یہ آبادی اور زراعت تمام تر ان قطعات میں ہے جن میں سے دریائے نیل گذرتا ہے۔ بقیہ حصہ بنجر۔ ریگستان اور بے آب وگیاہ ہے۔ درحقیقت مصر کی ساری دولت ثروت آبادانی اور رفاہیت کا ذریعہ یہی مبارک دریا ہے جس کا نام نیل ہے اور آج سے نہیں بلکہ قدیم زمانے سے۔

مورخین کا بیان ہے کہ قدیم اہل مصر حام بن نوح کے بیٹے مصرایم کی اولاد تھے جو شام کے ملک سے آکر وادی نیل میں جابجا قبیلے قبیلے آباد ہوگئے۔ اسی وجہ سے یہ ملک مصر کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ لوگ پانچ طبقوں میں منقسم تھے۔ پہلا طبقہ کاہنوں کا تھا جو دینی پیشوا تھے۔ ان کی کسی بات کی خلاف ورزی معبود کے حکم سے سرتابی کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ دوسرا طبقہ جنگی جماعت کا تھا جو دشمنوں کی مدافعت کرتا تھا۔ باقی تین طبقے تاجروں۔ کاشتکاروں اور گلہ بانوں کے تھے۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق بجز کاہنوں اور جنگ آوروں کے کوئی دوسرا زمین کی ملکیت کا حق نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اراضی کا بڑا حصہ کاہنوں کے قبضے میں تھا اور کچھ جنگ آوروں کے۔ بقیہ تینوں طبقے زمینیں ان سے ٹھیکے یا کرائے پر لے کر کاشتکاری کرتے تھے۔

زمانۂ دراز کے بعد جب ان قبائل کی تعداد زیادہ ہوگئی اور انتظامی ضرورت نے

میسکیاؤ انھیں میں سے ایک شخص منا نامی جو جنگی جلتھے کا سرغنہ تھا بادشاہ بن گیا اور اس نے مصر میں پہلی سلطنت قائم کی جو ایک زمانے تک اس کی اولاد میں رہی۔ پھر دوسرا خاندان غالب آگیا۔ اسی طرح سلسلہ بسلسلہ ۳۱ خاندان حکراں ہوئے۔

ان اکتیس خاندانوں کا زمانہ پانچہزار سال قبل میلاد مسیح سے شروع ہوکر ۳۳۲ء ق م میں ختم ہوجاتا ہے جبکہ سکندر اعظم نے آکر مصر کو فتح کرلیا اور وہاں یونانی حکومت قائم کردی۔

یہاں یہ ظاہر کردینا ضروری ہو کہ اس قدیم تاریخ کے معتبر مصادر موجود نہیں ہیں کیونکہ میلاد مسیح سے پانسو سال قبل کی کوئی تصنیف نہیں ملی ہو سب سے پہلے مصر کا کچھ حال جس نے لکھا ہے
وہ مشہور یونانی سیاح ہیرو ڈوٹس ہے جو ابو التاریخ کہا جاتا ہے
مسیح سے پیشتر سواحل نیل سے گزرا تھا۔ اس کے دو سو سال بعد
مصر کی تاریخ لکھی جو اگرچہ مفقود ہوگئی مگر اس کے جو حصے دوسرے
وہ باقی ہیں۔ انھیں سے قدیم حکراں خاندانوں کے بادشاہوں کی فہرستیں مرتب کی گئی ہیں۔

گذشتہ صدی میں نو سال کی لگاتار کوشش کے بعد فرانس کے مشہور اثری محقق شمپولین نے ۱۸۲۲ء میں ہیروغلیفی کتابت کو حل کرلیا جس کی وجہ سے آثار قدیمہ کے کتبے پڑھے جانے لگے اور پرانے ہیکلوں، معبدوں اور ان کے ستونوں اور دیواروں کے نقوش سے بعض بعض قدیم واقعات اور بادشاہوں کے کارنامے منکشف ہوئے۔ ادھر تقریباً نصف صدی سے مصر کے پرانے کھنڈر اور قبرستان کھودے جارہے ہیں اور قدیم عمارتوں سے آثار کی جستجو ہورہی ہے جس سے کچھ کچھ تاریخی انکشافات ہوتے جاتے ہیں۔

قدیم اہل مصر جیسا کہ ان کے کتبوں سے ثابت ہوتا ہے متعدد دیوتاؤں اور دیبیوں کو پوجتے تھے۔ لیکن ان کے بڑے معبود دو ہی تھے۔ ایک فتاح یعنی خالق اکبر جس کا بت منف میں تھا جو قدیم پایہ تخت تھا۔ دوسرا رع یعنی سورج جس کی مورت الاقصر میں جو آج کل لقصر کے نام سے مشہور ہے بنائی گئی تھی۔ لیکن رع کو وہ مستقل خدا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ خالق اکبر کی ایک

[illegible] کی حیثیت سے اسکو پوجتے تھے اس کے بعد جن بت [illegible] ترقی
[illegible] ان کے معبودون کے تنوع مین بھی اضافہ ہوتا گیا۔

بادشاہ بسامتیک اول (خاندان ۲۶) کے زمانہ میں جب یونانی مصر میں گئے اور وہاں بسے تو انہوں نے علوم مصریہ یعنی۔ ریاضی ہیأۃ اور نجوم وغیرہ کے ساتھ وہاں سے علم الاصنام کو بھی سیکھا اور مصری بتوں کو مع اُن کے ناموں کے یونان میں لیگئے۔

قدما مصر کا یہ خیال تھا کہ دیوتا بعض بعض حیوانات کی شکل مین جسم اختیار کر لیتے ہیں یہی وجہ تھی کہ وہ گائے۔ مگر۔ شہباز وغیرہ کو بھی پوجتے تھے۔

انکا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ موت کے بعد روح جسم کے ساتھ تعلق قائم رکھتی ہے اسی بنا پر وہ مردوں کی ممی بناتے تھے انہوں نے ایسی دوائیں معلوم کرلی تھین جن کی بدولت جسم غیر محدود زمانہ تک سڑنے سے محفوظ رہ سکے۔ انکا خیال تھا کہ جسم اگر ضائع ہوگیا تو روح بھٹکتی پھریگی اور اسکا کوئی ٹھکانا نہیں رہیگا۔ اس لئے امیر وغریب ہر ایک اپنے مردوں کی ممی بنواتے تھے اور اسکو محفوظ تابوت اور صندوق میں بند کر کے تہ خانوں میں رکھتے تھے۔ امرا اور سلاطین ان پر پختہ عمارتیں بنوا دیتے تھے۔ چنانچہ مؤرخین کا خیال ہے کہ مصر کے اہرام وہاں کے بادشاہوں کے مقبرے ہین۔

ان میں ایک خاص رسم یہ بھی تھی کہ ممی تیار ہو جانے کے بعد پہلے اسکو ایک چبوترے پر لاکر رکھتے تھے جہاں مذہبی حکام۔ کاہن اور عوام الناس آکر جمع ہوتے اور اعلان کیا جاتا کہ اگر کسی کو اس میت پر کوئی دعوی ہو تو پیش کرے۔ اگر وہ بیگناہ نکلتا تو اسکو قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت ملتی۔ اسکے اقربا اُسی وقت اپنا ماتمی لباس اُتار دیتے اور اس کی برأت پر خوشی مناتے۔ اور اگر وہ گنہگار ٹھہرتا تو دفن سے ممنوع قرار پاتا۔ مجبوراً اسکے ورثہ اسکے تابوت کو لاکر اپنے گھر میں رکھتے جب اس قسم کے متعدد مردے کسی گھر میں جمع ہو جاتے تو کاہن زندون کی خاطر سے ان کو دفن

کو دفن کی اجازت دیتے مگر قبرستان سے الگ۔ اس آخری احتساب میں کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جاتی تھی چنانچہ خوفو اور خفرع بادشاہوں کو بھی کاہنوں نے دفن ہونے سے روک دیا تھا۔

اس دستور کی وجہ سے ان کے اخلاق اچھے تھے۔ کیونکہ آخری فضیحت اور رسوائی کے خوف سے وہ معاملات کو صاف رکھتے اور سب کے ساتھ نیک سلوک کرتے تھے۔

قدیم اہل مصر طب سے بھی واقف تھے اور اکثر بیماریوں کی شناخت اور انکی دوائیں جانتے تھے۔ ریاضی اور ہیأۃ سے بھی انکو ذوق تھا۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے دنیا میں قبطی ہی سب سے پہلی قوم ہیں جنہوں نے شمسی سال ۳۶۵ ¼ دن اور قمری ۳۵۴ دن کا قرار دیا تھا فن تعمیر میں تو اہرام اور عجیب و غریب معبد اور ہیکل انکی ایسی [illegible] دنیا حیرت کے ساتھ دیکھتی ہے۔

مصر کی اس قدیم تاریخ کو مؤرخین نے مختلف [illegible] تفصیل مقصود نہیں ہے بلکہ اُن ۳۱ خاندانوں کی خاص خاص تاریخی باتوں اور زیادہ رو [illegible] ایک سرسری نظر ڈالنی ہے۔

مصر کا سب سے پہلا ہرم جو آج ہرم کوکمہ کے نام سے مشہور ہے۔ خاندان اول کے ایک بادشاہ ونفس کا تعمیر کردہ ہے۔ دوسرے خاندان میں بادشاہ بینوتریس بہت نامور گذرا ہے جس نے یہ قانون بنایا تھا کہ خاندان میں اولاد ذکور نہ ہونے کی صورت میں عورتوں کو تخت سلطنت پر بیٹھنے کا حق ہوگا۔ اسی نے دعوی کیا تھا کہ میں خدا کا رشتہ دار ہوں اسکے زمانہ سے یہ عقیدہ برابر یونانیوں کے عہد تک ملوک مصر میں چلا آیا۔

تیسرے خاندان کے عہد میں فن کتابت اور سنگ تراشی میں ترقی ہوئی۔ ابوالہول کا عظیم الشان بت جسکا طول ۹۰ گز سے بھی زیادہ ہے اور جو اہرام جیزہ کے پاس آج بھی قائم ہے اسی زمانہ میں بنا تھا۔ اسکا جسم شیر کا ہے اور سر انسان کا جس سے قوت اور عقل

...کے اجتماع کی طرف اشارہ ہے۔

چوتھے خاندان میں سے خوفو بادشاہ نے مصر کا سب سے بڑا ہرم تعمیر کرایا جو جیزہ میں ہے اسکا ہر ضلع ساڑھے سات سو فٹ ہے اور بلندی ساڑھے چار سو۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس میں ایک لاکھ آدمی روزانہ کام کرتے تھے اور پورے تیس سال میں تیار ہوا پہاڑ سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ خلیفہ مامون عباسی جب ۲۱۶ھ میں مصر میں گیا اور لوگوں سے سنا کہ ان عمارتوں میں ملوک مصر کے خزانے ہیں تو اسی ہرم کو تڑوانا شروع کیا۔ بہزار دقت صرف ایک حصہ ٹوٹ سکا اور صرفہ بہت پڑ گیا اسلئے چھوڑ دیا۔

اسی ہرم کے سامنے دوسرا ہرم جو کسی قدر اس سے چھوٹا ہے اسی خاندان کے ایک دوسرے بادشاہ خفرع کا بنایا ہوا ہے۔ تیسرا ہرم بھی جس کی بلندی ۲۰۳ فٹ ہے۔ اسی خاندان کے ایک بادشاہ منکورع نے بنایا تھا۔ اس منکورع کی نعش سنگین تابوت میں برآمد ہوئی تھی انگریز اسکو انگلستان لے جا رہے تھے۔ راہ میں پرتگال کے ساحل پر جہاز ڈوب گیا۔ لیکن جثہ اور اسکا چوبیں غلاف جو انسان کی شکل کا تھا برآمد ہو گیا جو لندن کے میوزیم میں موجود ہے۔

چھٹے خاندان نے اپنی قوت بڑھا کر ایک طرف نوبیا اور دوسری طرف شام پر قبضہ کر لیا۔ جنگی کشتیاں بھی تیار کرائیں اور فیروزہ۔ توتیا اور تانبے کی کانیں نکالیں۔ نیز کوہ طور سے لعل و جواہر برآمد کئے۔

گیارھویں خاندان نے اپنے عہد میں تجارتی غرض کے لئے مصر اور عرب کے راستہ کو ٹھیک کرایا۔ اسمیں جا بجا منزلیں بنوائیں اور کوئیں کھدوائے۔ یہی راستہ اسلام کے زمانہ تک رہا۔

بارھوین خاندان کے اوسرتسن نامی بادشاہ نے طیبہ کا ہیکل تعمیر کرایا۔ اسی کا بنوایا ہوا ایک ستون مطریہ میں موجود ہے جسپر ہیروغلیفی میں یہ کتبہ ہے

"بادشاہ منصور، ہر موجود کی حیات، بالائی اور نشیبی مصر کے فرمانروا، دونوں

تاجوں کے مالک، خورشید کے فرزند، اوسرتسن، مطریہ کے معبودوں کے
محبوب نے، جو ہمیشہ زندہ ہے، اس نشان کو رسمی تیوہار کے آغاز میں اپنے
نام سے اس جشن کی یادگار میں نصب فرمایا۔"

چودھویں خاندان کے خاتمہ پر شام اور عرب کے قبائل نے ٹڈی دل کی طرح مصر پر
چڑھائی کی۔ جس قبیلہ نے ان کی قیادت کی وہ توریت میں عشین اور عربی تواریخ میں عمالیق کہا
گیا ہے۔ ان لوگوں نے مصر کے بڑے بڑے ہیکلوں کو ڈھادیا۔ شہروں کو آگ لگا دی۔
باشندوں کو تہ تیغ کر ڈالا اور اپنی حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے زمانہ میں حضرت ابراہیم
علیہ السلام جو انکے ہم قبیلہ تھے مصر میں تشریف لے گئے تھے اور عملیق بادشاہ نے حضرت
ہاجرہ کو ان کی خدمت کے لئے دیا تھا۔

مصر میں عمالقہ کے تین مختلف خاندانوں نے حکومت کی۔
بادشاہ ابوقیس کے عہد میں حضرت یوسف علیہ السلام کو:
اور اسکے وزیر دوفرنامی کے ہاتھ بیچا تھا۔ اسی خاندان کے آخر میں مصریوں نے پھر اپنی حکومت
قائم کرلی اور اعمس بادشاہ نے عمالقہ کو پورے چھ سو سال کے بعد مصر سے نکال کر اپنا تسلط
جمایا۔ جبل قرنہ پر دیر بحری سے اسکی ممی نکلی ہے جو جیزہ کے انتیقہ خانہ خدیوی میں موجود ہے۔

اسی خاندان کا ایک بادشاہ تحوتمس ثالث تھا جس نے ایک طرف عرب، شام، عراق
ایشیائے کوچک اور کردستان وغیرہ کو فتح کیا اور دوسری طرف بحری بیڑہ سے، قبرس
کریٹ، یونان اور اطالیہ کے جنوبی حصہ پر قابض ہوگیا۔ اسکے بنائے ہوئے دوستون مطریہ
میں تھے جو ملکہ قلیوپطرا کے عہد میں اسکندریہ میں لاکر رکھے گئے تھے۔ اب انمیں سے ایک
انگلستان میں ہے اور ایک امریکہ میں۔ اسی خاندان کا بادشاہ توت انخ عمون تھا جس کی نعش
مع اسکی ملکہ کی نعش کے بے شمار خزانہ اور طلائی تخت وغیرہ کے ساتھ آٹھ سال کا عرصہ ہوا
الاقصر سے نکلی ہے۔

انیسویں خاندان میں مصر کا سب سے بڑا بادشاہ رعمیس اکبر تھا جس کی محبت اور عظمت مصریوں کے دلوں میں حد عبادت تک پہونچگئی تھی اس نے کنعانیوں پر دو لاکھ فوج کے ساتھ حملہ کیا اور ۴۰ سال تک لڑتا رہا۔ بالآخر مصالحت ہوئی۔ چاندی کے پتروں پر صلح نامہ لکھا گیا جو آج لندن کے میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ اس رعمیس کا بیٹا منفتاح تھا یعنی وہ فرعون جو حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے سمندر میں غرق ہوا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کی نعش برآمد ہوگئی ہے۔ جیزہ کے عجائب خانہ میں رکھی ہوئی ہے اور دیکھنے والوں کے لئے عبرت کا سامان ہے۔ کہ یہ مشت خاک اور خدائی کا دعویٰ !!

بیسویں خاندان میں ایک بادشاہ رعمیس ثالث تھا جسکی ممی پیرس کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

اکیسویں خاندان کے آخری بادشاہ کے زمانہ مین اشور کے بادشاہ نمرود نے چڑھائی کر کے مصر پر حکومت قائم کرلی جو ۱۰۰ سال تک اسکے خاندان میں رہی۔ اسی زمانہ میں بابلی اور اشوری تہذیب مصر میں پہونچی۔

نمرود کے بیٹے ششنق کی صورت کرنک کے ہیکل کی چار دیواری پر موجود ہے سر پر شاہی تاج۔ ہاتھ میں مصری تلوار اور سامنے حضرت سلیمان کے بیٹے رحبعام کی تصویر جنکی گردن میں رسّی پڑی ہوئی ہے۔

چھبیسوین خاندان کے بادشاہ بسامتیک نے یونانیوں کی مدد سے تخت و تاج حاصل کیا تھا۔ اسلئے اسکے عہد میں انکو عروج ملا۔ اور بڑی بڑی جاگیریں اور امارتین دی گئین۔

ان یونانیون نے مصر مین مدارس قائم کئے جن مین ان کے ملک کے بہت سے طلبا تحصیل علم کے لئے آنے لگے۔ فیثاغورث۔ بقراط۔ جالینوس۔ افلاطون۔ اور ارسطو وغیرہ اکثر حکمائے یونان نے اپنے اپنے زمانوں میں آکر ان مین علوم حاصل کئے۔

اسی خاندان کے آخر مین کے بہمن پسر اسفندیار نے مصر کو جا کر مسخر کرلیا۔ ایک عرصہ تک

اہل فارس وہاں حکومت کرتے رہے۔ آخر میں ایک مصری رئیس تیس نامی نے ان کو مصر سے نکالا اور
اپنی حکومت قائم کرلی۔ مگر کچھ ایسے انقلابات پیش آئے کہ ۶۰ سال کے عرصے میں تین مختلف مصری خانوادوں
میں حکومت تبدیل ہوتی گئی آخر میں پھر ایرانیوں نے آکر قبضہ کرلیا۔ انھیں کی حکومت میں دارا
کا عہد تھا کہ ۳۳۲ ق م میں سکندر نے مقدونیہ سے نکل کر مصر سے طرابلس تک فتح کرلیا۔ اپنے نام
سے اسکندریہ آباد کرا کے وہاں ایک نائب چھوڑا اور ایران کو فتح کرتا ہوا ہندوستان تک پہنچا
واپسی میں بابل میں انتقال کرگیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس کا جثہ اسکندریہ میں لاکر دفن کیا گیا۔
اسکندر کی فتح سے مصر میں یونانی حکومت قائم ہوگئی جو چند سال تک ... کے خاندان
میں رہی۔ پھر بطلیموس نے جو بابل میں اس کا نائب تھا مصر پر خو...
اسی خاندان کی آخری تاجدار ملکہ قلوبطرا تھی جس نے جا...
میں اس کی حکومت قیصر آگسٹس کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس وقت...
صوبہ ہوگیا۔
۲۹۵ء میں رومی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ مغربی حصہ کا پایہ تخت روما الکبرا
رہا۔ اور مشرقی حصہ کا قسطنطنیہ قرار پایا۔ مصر اسی حصہ کا ماتحت رہا۔
آغاز عہد اسلام میں قسطنطنیہ کے تخت پر قیصر ہرقل تھا۔ اس نے ایک قبطی امیر مقوقس کو مصر
کا والی مقرر کیا تھا۔ اسی کے عہد میں ۶۲۹ء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک عظیم القبط کے
نام حاطب بن بلتعہ رضؓ لے کر گئے تھے۔ مقوقس اسلام تو نہیں لایا مگر ایک خچر جس کا نام دلدل تھا اور
اور دو لونڈیاں مع دیگر ہدیوں کے اس نے رسول اللہ کی خدمت میں بھیج دیں۔ انھیں میں سے ایک
حضرت ماریہ قبطیہ تھیں جن کے بطن سے حضور اکرم کے بیٹے ابراہیم پیدا ہوئے تھے۔
اس طرح پر حضرت ہاجرہ کے قدیمی رشتے کے بعد اہل مصر کا ایک جدید رشتہ بھی رسول عربی
کے ساتھ قائم ہوگیا۔
فتح اسلامی ۲۰ھ مطابق ۶۴۰ء میں طاعون عمواس کے بعد حضرت عمر جب فوج کے انتظام

کے لئے مدینہ سے شام میں تشریف لے گئے تو عمرو بن عاصؓ نے تنہائی میں ان سے عرض کیا کہ مجھے
مصر پر بڑھنے کی اجازت دیجئے۔ کیونکہ اس کے فتح کر لینے سے رومیوں کی قوت ٹوٹ جائے گی اور
اسلام کی شوکت بڑھے گی۔ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی کلفت اور مشقت کے خیال سے اس دور دراز
مہم میں پس و پیش کیا لیکن عمرو بن عاصؓ نے اپنے عزم راسخ سے کامیابی کی ایسی قوی امید دلائی کہ
آخر کار راضی ہو گئے اور چار ہزار سوار جو سب کے سب یمن کے قبیلہ کعب کے تھے۔ ان کے ساتھ
کر دیئے۔ وہ اس وقت اسی فوج کو لے کر روانہ ہو گئے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ جس طرح شام میں دربار
خلافت سے ہم کو مسلسل کمک آتی رہی ہے اسی طرح مصر میں بھی آئے گی۔

ان کے روانہ ہو جانے کے بعد امرار اسلامی نے تعجب ظاہر کیا کہ ایسے ملک میں جہاں کم از
کم ۸۰ ہزار فوج حفاظت کے لئے موجود ہے۔ عمرو بن عاصؓ ان مٹھی بھر آدمیوں سے کیا کریں گے
حضرت عثمان نے خود خلیفہ سے جا کر کہا کہ ابن عاص امارت کا سخت حریص اور پیش قدمی اور حملے میں
نہایت بے باک ہے ایسا نہ ہو کہ اس جماعت کو ورطۂ ہلاکت میں ڈال دے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

عمرو بن عاصؓ بیابان سینا سے گزر کر مقام عریش میں پہنچے اور اس کو فتح کر لیا۔ یہ ذی الحجہ
کی دسویں تاریخ تھی۔ وہاں قربانی کی اور فوج کو دعوت کھلائی۔

عریش سے نکل کر فرما کی طرف بڑھے یہ ایک بڑا شہر تھا جس کے گرد فصیل تھی اور ملک مصر کا دروازہ سمجھا جاتا تھا اس وجہ سے
حفاظت کے لئے رومی ترادفوجیں رکھی جاتی تھیں۔ عمرو بن عاصؓ نے محاصرہ کیا اور ایک مہینہ کے بعد المحرم کو اس کے اندر
داخل ہو گئے۔ اب رومی فوجیں مقام عین شمس پر جمع ہوئیں اور پوری طاقت سے مقابلہ کی تیاری کرنے لگیں۔ عمرو بن عاصؓ نے
دربار خلافت سے امداد طلب کی۔ وہاں سے دس ہزار فوج آئی جس میں مشاہیر صحابہ میں سے حضرت زبیر بن عوام، مقداد
بن اسود، عبادہ بن صامت، مسلمہ بن مخلد، ابوالدرداء اور شرجیل بن حسنہ وغیرہ تھے۔

رومی سپہ سالار تھیوڈر لشکر لے کر بڑھا۔ کھلے میدان میں مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں نے ایسی
شکست دی کہ اس کی بیس ہزار فوج میں سے صرف تین سو آدمی اپنی جانیں بچا سکے جو قصر شمع کی طرف
بھاگ گئے تھے باقی سب کے سب مارے گئے۔

قصر شمع ایک محفوظ قلعہ تھا جس میں والی مصر مقوقس خود موجود تھا۔ اب مسلمانوں نے بڑھ کر اس کا محاصرہ کیا۔ مقوقس نے چند روز کے بعد عمرو بن عاص کے پاس دو آدمی بھیجے اور لکھا کہ

تم لوگ ہمارے ملک میں گھس آئے اور جنگ کرنے لگے۔ اب ایک رومی لشکر آرہا ہے جو ہر طرح کے ساز و سامان سے مسلح ہے وہ یقیناً تم کو فنا کر دے گا۔ لہٰذا تمہارے حق میں بہتر یہ ہے کہ صلح کر کے چلے جاؤ ورنہ اس کے آجانے کے بعد کوئی شکوہ نہ ہو سکے گا۔

حضرت عمرو بن عاص نے جواب دیا کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لو۔ اسلام یا جزیہ یا جنگ۔

مقوقس عین شمس کی ہولناک جنگ سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مسلمان اس قلعہ کو بھی یقیناً فتح کر لیں گے۔ لہٰذا ان کے ساتھ مشورے سے اس نے عمرو بن عاص کو پھر لکھا کہ آپ اپنا قائم مقام بھیج دیں تاکہ صلح کی بات چیت ہو سکے۔ انھوں نے عبادہ بن صامتؓ کو دس آدمیوں کے ہمراہ بھیجا اور حکم دیا کہ تینوں باتوں کے سوا اور بجز ان تینوں باتوں کے جو میں نے لکھی ہیں اور کوئی بات قبول نہ کرنا۔

حضرت عبادہ کا طول قامت دس بالشت تھا اور رنگ سیاہ۔ مقوقس ان کو دیکھ کر گھبرایا اور کہا کہ تم میں سے کوئی دوسرا شخص میرے ساتھ گفتگو کرے۔ مسلمان بولے کہ وہ عقل و رائے میں ہم سے بہتر اور درجے اور رتبے میں افضل ہیں اور ہمارے امیر نے انھیں کو اپنا نمائندہ مقرر فرمایا ہے۔ مجبوراً مقوقس نے ان کو کلام کی اجازت دی۔ انھوں نے کہا کہ

"ہماری لڑائی کسی دنیاوی غرض سے نہیں بلکہ محض اعلائے کلمۃ حق کے لئے ہے نہ ہم دنیاوی آسائش کے جویا ہیں۔ راحت کی جگہ تو آخرت ہے۔ ہمارے اللہ اور رسول نے یہی ہم کو بتلایا ہے اور اس بات کا عہد لیا ہے کہ ہم اپنی ساری توجہ رضائے الٰہی کی طرف رکھیں اور دنیا کی نعمتوں سے صرف ضروری غذا اور لباس پر قناعت کریں۔"

مقوقس نے پسندیدگی سے سر ہلایا۔ پھر نصیحت کے قالب میں ڈھلی ہوئی دھمکی دینی شروع کی اور کہا کہ

"بے شک تمھاری یہی حالت ہے لیکن اب تمھارے مقابلے کے لئے ایک رومی لشکر آرہا ہے جن کی شجاعت مسلم ہے اور جو اس کی پروا نہیں کرتے کہ کس سے لڑتے ہیں اور ان کا مدمقابل کون ہے۔ تم یہاں پڑے ہوئے مصیبتیں اٹھا رہے ہو۔ اس لئے میں تمھاری حالت پر ترس کھاکر مشورہ دیتا ہوں کہ صلح کر لو۔ تم میں سے ہر ایک کو دو دو دینار امیر کو ایک سو اور خلیفہ کو ایک ہزار دیدوں گا۔ اس کو لے کر اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔ قبل اس کے کہ وہ لشکر آجائے جس کے مقابلے کی طاقت تم نہیں رکھتے۔"

حضرت عبادہ نے فرمایا۔

"تم جو رومیوں کی قوت اور ان کی کثرت سے ہم کو ڈراتے ہو تو اس دھوکے میں نہ رہو کہ اس سے ہمارے ارادوں میں کچھ بھی فتور پڑ سکے گا۔ کیونکہ ہم سب اگر قتل بھی ہوگئے تو یہ ہمارے رب کی رضامندی اور حصول جنت کا ذریعہ ہوگا جس سے بڑھ کر کوئی شے ہم کو محبوب نہیں۔ ہم میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو یہاں سے لوٹ کر اپنے اہل وعیال کے پاس جانے کا خواہشمند ہو بلکہ ہر ایک صبح اور شام یہی دعا کرتا ہے کہ اللہ اس کو شہادت سے سرخرو فرمائے۔ اس لئے تم ہمارا خیال چھوڑ دو اور اپنی مصلحت دیکھ کر ان تینوں صورتوں میں سے جو پیش کی گئی ہیں کوئی صورت اختیار کر لو۔"

مقوقس نے کہا کہ کیا ان کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس گفتگو کے بعد رخصت ہو کر واپس چلے آئے۔ مقوقس نے اپنے اصحاب کو سمجھایا کہ اسلام یا جزیہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی پسند کر لو کیونکہ تم ان کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے

لیکن انھوں نے اس کی بات نہ مانی اور جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ مگر چند ہی روز کے بعد مسلمانوں
کے سخت حملوں کی تاب نہ لا کر آخر مصالحت پر مجبور ہوئے۔ مسلمان بلائے گئے اور یہ عہد نامہ لکھا گیا۔

"عمرو بن عاص اور مقوقس باہم اس بات پر صلح کرتے ہیں کہ اہل اسلام تمام ملک میں
ہر ایک قبطی سے جو بالغ ہے خواہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ دو دینار جزیہ سالانہ لیں گے۔ بڈھے
بچے۔ عورتیں اور معذور اشخاص اس سے بری ہیں۔ اہل مصر کے اراضی و اموال
انھیں کے ہاتھ میں رہیں گے۔ اور ان کے مذہبی رسوم میں کسی قسم کا دخل نہیں دیا
جائے گا۔"

یہ عہد مقوقس نے اپنے کل ہم قوموں یعنی اقباط مصر کی طرف سے
نے کہا کہ اگر تم چاہو تو ان شرائط پر صلح کر کے مصر میں رہو نہیں تو
جب یہ عہد نامہ منظوری کے لئے ہرقل کے پاس بھیجا گیا
اور لکھا کہ عرب کی حقیر قوت کے مقابلے میں تم نے کیوں دب کر صلح کر لی اور
میں اس عہد نامے کو جائز نہیں قرار دیتا۔ رومی امیروں کو حکم بھیجا کہ تم جنگ جاری رکھو۔ مقوقس اپنی
جماعت کو لے کر قلعے سے باہر نکلا اور نیل کے اُس پار مقام جزیرہ میں اپنے قصر میں جا کر پناہ گزیں
ہو گیا۔ وہاں سے عمرو بن عاص کے پاس کہلا بھیجا کہ میں نے جو عہد نامہ لکھا ہے اس پر قائم ہوں۔ میری
قوم ان شرائط کو پورا کرے گی لہذا اس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

حضرت عمرو بن عاص نے لکھا کہ ہم بھی عہد نامے کی پابندی کریں گے لیکن قبطیوں کو چاہئے
کہ ہمارے راستے میں فلاں فلاں دو مقامات پر پل بنائیں اور جہاں جہاں ہماری فوج خیمہ زن
ہو وہاں بازار لگائیں اور سامان رسد پہنچائیں۔ قبطی اس پر رضامند ہو گئے۔

بعض مورخین نے مقوقس کے اس فعل کو خیانت اور غداری قرار دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے
کہ اس پر یہ بات روشن ہو چکی تھی کہ رومی فوج کسی طرح عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خود قیصر ہرقل اپنی
پوری قوت کے ساتھ ان کے مقابلے میں شکست پر شکست کھا کر شام کا ملک چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ اس

کے علاوہ اس کی قوم رومیوں کے ظلم وستم سے جاں بلب تھی۔ اور عربوں کی حکومت میں اس کو دینی آزادی اور دنیاوی آسائش نظر آئی۔ ایسی صورت میں اس کے لئے سوائے مصالحت کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اسی وجہ سے اس نے نہ صرف مفتوحہ علاقہ بلکہ کل ملک مصر کی طرف سے عہدنامہ لکھدیا۔

قیصر نے اس کو قسطنطنیہ طلب کیا اور باز پرس کی۔

رومیوں نے مقابلہ شروع کیا لیکن اسی درمیان میں قیصر انتقال کر گیا جس کی وجہ سے ان کا نظام ابتر ہو گیا۔ مسلمانوں نے ان کو شکست دیتے ہوئے بہت تھوڑے عرصے میں پہنچ کر اسکندریہ کا بھی جو ان کا مرکز تھا محاصرہ کر لیا۔ وہاں رومیوں کے ساتھ ۲۰ر اکتوبر ۶۴۱ء میں معاہدہ لکھا گیا عجیب بات یہ ہے کہ اس معاہدے میں رومیوں کا نمائندہ بھی مقوقس ہی تھا جو قیصر کے انتقال کے بعد اسکندریہ میں واپس آگیا تھا۔ معاہدہ کی دفعات یہ تھیں۔

(۱) یہ عارضی صلح صرف گیارہ مہینے کے لئے ہے۔ ۲۸ر ستمبر ۶۴۲ء کو اس کی مدت ختم ہو جائیگی۔

(۲) اس اثنا میں عرب رومیوں کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں کریں گے بشرطیکہ وہ کوئی مخالفانہ رویہ نہ اختیار کریں۔

(۳) کسی رومی فوج کو مصر کی سرزمین میں داخل ہونے کا حق نہیں ہے۔

(۴) مسلمان کنیسوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے نہ کسی دینی معاملے میں مداخلت کریں گے۔

(۵) یہود کو شہر اسکندریہ میں سکونت کا حق حاصل رہے گا۔

(۶) اسکندریہ کی محافظ رومی فوج اپنا سامان لے کر بحری راستے سے جا سکتی ہے۔ مگر جو لوگ خشکی سے جانا چاہیں گے ان کو جزیہ دینا ہوگا۔

(۷) شرائط معاہدے کی ضمانت کے لئے رومی فوج کے ۱۵۰ سردار مسلمانوں کے پاس بطور رہن رہیں گے۔

اس معاہدے کے بعد جنگ ختم ہو گئی اور بہت تھوڑے عرصے میں رومی فوج نے تمام مصر کو خالی کر دیا اور بالائی اور نشیبی کل علاقوں پر مسلمان قابض ہو گئے۔

اسکندریہ کے اطراف کے باشندوں نے دوران جنگ میں رومیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو نقصانات پہنچائے تھے اس لئے عمرو بن عاص نے ان سب کو مع اہل و عیال کے گرفتار کر کے خمس غنیمت کے ساتھ دربار خلافت میں بھیج دیا۔ مگر حضرت عمر نے ان کے جرائم معاف کر کے ذمیوں میں شامل کر دیا۔ اور پھر ان کو مصر میں واپس بھیج دیا کہ اپنے گھروں میں رہیں اور اپنی ملکیتوں پر قبضہ رکھیں۔

اسلامی فوج کا خیال تھا کہ مصر کو ہم نے جنگ سے فتح کیا ہے اس لئے اس کو سپاہیوں میں تقسیم کر دینا چاہئے۔ مگر عمرو بن عاص اور خلیفۂ وقت نے یہ منظور [illegible] اور اس کے باشندوں کو غلام بنا کر فوج میں تقسیم کر دیں [illegible] زمین کو خراجی قرار دیا۔

عمرو بن عاص نے کل ملک مصر کو دو سال کے عرصہ [illegible] طرابلس غرب کو بھی قبضہ میں لائے۔ تونس کا بھی ارادہ رکھتے تھے مگر حضرت عمر نے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اور حکم بھیجا کہ جس قدر علاقہ قبضے میں آچکا ہے اسی کا انتظام مکمل کر دو۔

اس وقت سے آج تک مصر مسلمانوں کے زیر حکومت ہے۔ یہ اسلامی عہد بارہ تاریخی دوروں میں منقسم ہوتا ہے۔

(۱) خلافت راشدہ	۶۳۹ء	سے	۶۶۱ء تک
(۲) بنی امیہ	۶۶۱ء	”	۷۵۰ء ”
(۳) عباسیہ اول	۷۵۰ء	”	۸۷۰ ”
(۴) طولونی	۸۷۰	”	۹۰۵ ”
(۵) عباسی بار دوم	۹۰۵	”	۹۳۴ ”
(۶) اخشیدی	۹۳۴	”	۹۶۹ ”
(۷) فاطمی	۹۶۹	”	۱۱۷۱ ”
(۸) ایوبی	۱۱۷۱	”	۱۲۵۰ ”

(۹) مالیک بحری	۱۲۵۰ء سے ۱۳۸۲ء تک
(۱۰) مالیک چرکس	۱۳۸۲ " ۱۵۱۷ "
(۱۱) عثمانیہ	۱۵۱۷ " ۱۸۰۱ "
(۱۲) خدیوی	۱۸۰۱ء سے آج تک

اب میں اختصار کے ساتھ الگ الگ عنوانات میں اس اسلامی اثر کو بیان کروں گا جو مصر اور اہل مصر پر پڑا اور جو میرے اس مقالے کا موضوع ہے۔

مرکز قدیم زمانے میں فراعنہ مصر کا دار السلطنت پہلے طیبہ تھا پھر منف جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ سکندر نے جب قبضہ کیا تو اپنے نام پر اسکندریہ کو آباد کرایا۔ اس وقت سے وہی مرکز قرار پاگیا اور ساحل بحر پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک عظیم الشان بندرگاہ اور شہر ہوگیا۔ رومیوں نے بھی اپنے عہد میں اسی کو مستقر رکھا۔

عمرو بن عاص نے جب اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کی جملہ شاہی عمارتیں ان کو خالی ملیں۔ چاہتے تھے کہ اسی کو صدر مقام رکھیں لیکن حضرت عمر جو اپنے اور کسی دوسرے اسلامی مرکز کے درمیان دریا کا حائل ہونا پسند نہیں کرتے تھے راضی نہ ہوئے۔ اس لئے دریائے نیل کے اسی پار قصر شمع کے متصل جو زمین ہے اس کو منتخب کیا۔ یہ جگہ عرب اور مصر کے قریب ترین نقطۂ اتصال پر ہے اور یہاں سے مصر کے دونوں اطراف شمالی اور جنوبی کی نگہداشت ہوسکتی ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی صحت بخش ہے۔ ایک طرف دریائے نیل ہے اور دوسری طرف کوہ مقطم اور سارا قطعہ سرسبز و شاداب ہے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ پہلے اسی مقام پر عربی فوج نے ڈیرے ڈالے تھے جب اسکندریہ کو روانہ ہونے لگے اسوقت عمرو بن عاص کے خیمے میں ایک کبوتر نے گھونسلہ بنا کر انڈے دے دئے تھے انھوں نے اس پرند کی خاطر سے اس کو اسی طرح چھوڑ دینے کا حکم دیا اور کہا کہ مت اکھاڑو ورنہ ہمارے اس مہمان کو تکلیف ہوگی۔ جب اسکندریہ کی مہم سے واپس آئے تو اسی میں اترے اور اسی

نگہ شہر تعمیر کرایا۔ ڈیرہ کو عربی میں فسطاط کہتے ہیں اس وجہ سے اس شہر کا نام فسطاط رکھدیا گیا۔ اس کے اردگرد فصیل بنوائی اور وسط میں ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کرائی جس کی سمت قبلہ کی تعیین میں ۸۰ صحابۂ کرام شریک تھے۔

عرب کے بعض قبائل مثلاً حمیر۔ ازد اور ہمدان وغیرہ کے لوگوں نے چہار دیواری کے اندر سکونت رکھنے کو شجاعت کے منافی سمجھا۔ اس لئے باجازت خلیفہ ان کو ایک دوسرے قطعے میں آباد کرایا جس کا نام جیزہ رکھا اور جو آج تک آباد ہے۔

فسطاط مدت تک مصر کا صدر مقام اور وہاں کی تہذیب اور تجارت کا مرکز رہا جس جس محلے میں چار چار ہزار گھر آباد ہوتے تھے۔ ان میں چار چار سو آدمیوں کی ... [illegible] کے زمانے میں چالیس ہزار فوج یہاں رہتی تھی۔ ابن طولون ... قدر بڑھ گئی کہ اس کو اس کے متصل ایک دوسرا شہر قطائع ... کرنا پڑا۔ چوتھی صدی ہجری کا مشہور سیاح بشاری لکھتا ہے کہ "... تجارت کا مرکز اور مسلمانوں کا مایۂ فخر ہے۔ دنیائے اسلام میں یہاں کی جامع مسجد سے زیادہ ... علمی مجالس نہیں ہوتیں نہ یہاں کی بندرگاہ سے زیادہ کہیں کشتیاں لنگر انداز ہوتی ہیں۔"

۳۵۸ھ میں جب خلفاء فاطمیہ کا مصر پر قبضہ ہوا اور شہر قاہرہ تعمیر کرکے مرکز بنایا گیا اس وقت سے فسطاط کی رونق کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ صلیبی ہنگاموں کے دوران میں وہ بالکل ویران ہوگیا۔ مگر اب تک جامع عمرو بن عاص اپنی جگہ پر موجود ہے۔

عربی سیادت کے خلاف عجمی تحریکیں

پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے عرب دنیا کے طول و عرض میں چھا گئے. کم ایسے خطے تھے جہاں کے وہ حکمراں نہ بن چکے ہوں یا کم از کم اپنے اثرات ہی سے دنیا کو متاثر نہ کیا ہو. اکثر و بیشتر مقامات پر انھیں کی تہذیب تھی اور انھیں کا تمدن، اس لئے بعض قوموں کے بعض ان افراد نے جن کا قومی، وطنی، اور مذہبی جذبہ قوی نہ تھا اس محکومیت کو قومی ذلت اور اپنی شاندار روایات کے بالکل منافی سمجھا اور اس نئی اسلامی تہذیب کو مشتبہ نظروں سے بھی دیکھا. ان کا خیال تھا کہ یہ اختلاط ایک نہ ایک دن ان کی قومیت ان کے مذہب اور لسانی امتیاز کو بالکل جڑ سے اکھاڑ کر رہے گا رسوائی کا یہ احساس اور اپنی ہستی کے فنا ہونے کا یہ خطرہ ایک سے زیادہ قوموں کے زیادہ افراد کو تھا لیکن بالخصوص ایرانیوں کو زیادہ تھا۔

ان الفرس کانوا من سعة الملك وعلو الید علی جمیع الامم وجلالة الخطیر فی انفسهم حتی انهم کانوا یسمون انفسهم الاحرار والابناء وکانوا یعدون سائر الناس عبیدا لهم فلما امتحنوا بزوال الدولة عنهم علی ایدی العرب وکانت العرب اقل الامم عند الفرس خطرا تعاظمهم الامر وتضاعفت لدیهم المصیبة.[1]

ایرانی اپنی وسیع سلطنت اور علو مرتبت کے اعتبار سے تمام قوموں پر غالب تھے اس لئے اپنے آپ کو آزاد اور دوسروں کو غلام سمجھتے تھے لیکن جب ان کی حکومت عربوں کے ہاتھ میں چلی گئی جس کو کہ یہ اپنے سے فروتر سمجھتے تھے تو یہ ان کو بہت شاق گذرا

انھیں خطرات اور اپنے ان احساسات کی بنا پر ایک ایسی چال چلنے پر مجبور ہوئے جو ایک عرصے بعد مسلمانوں کے انتشار اور ان کی سلطنت کی کمزوری کا سبب بنی. وہ چال یہ تھی کہ بظاہر مسلمان ہونے کا اظہار کیا جائے لیکن باطن میں خفیہ طور پر ان کے مٹانے کی فکر ہو. یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا کہ

(۱) الملل والنحل ابن حزم صفحہ ۱۱۵

مسلمانوں کی اس وقت کی قوت کے آگے کوئی دوسرا طریقہ مقابلہ کا مشکل تھا چنانچہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر سب سے پہلے شرعی احکامات میں تاویل اور تنقید کا رواج عام دیا۔

تحسروا عند شوکۃ الاسلام تاویل الشرائع علی وجہ تعود الی قواعد اسلافہم وذالک انہم اجتمعوا فتذاکروا ما کان علیہ اسلافہم من الملک وقالوا لا سبیل لنا الی دفع المسلمین بالسیف لغلبتہم واستیلائہم علی الممالک ولکنا نحتال بتاویل شرائعہم الی ما یعود علی قواعدنا ونستدرج بہ الضعفاء منہم فان ذلک یوجب اختلافہم واضطراب کلمتہم۔

اسلام کی بڑھتی ہوئی شوکت سے خائف ہو کر ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ شریعت کی تاویل اس طریقے پر کی جائے جو ان کے اسلاف کے طریقوں کی طرف ان کو لے جا سکے اس لئے وہ جمع ہوئے اور اپنے بزرگوں کے بلند مرتبت کو یاد کیا اور چونکہ کوئی دوسرا طریقہ مسلمانوں کی قوت و اتحا[illegible] کے اتلاف کی وجہ [illegible] کے کہ یہی ان میں [illegible] کا باعث ہو سکتا تھا

دوسرا موثر اور کارگر آلہ جو اختیار کیا گیا وہ میلان شیعت کا تھا [illegible] جماعت تھی کہ جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ ان کی اولاد سے کوئی محبت تھی، ان کے نزدیک آل علیؓ اور دیگر عرب یکساں تھے صرف اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے یہ ایک بہتر صورت تھی وہ خوب سمجھتے تھے کہ عام مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے جتنا شغف ہے کسی سے نہیں ہو سکتا۔

"ازابتدائے[2] اسلام مخصوص از روزے کہ ایران بدست سعد بن وقاص از طرف خلیفہ دویم

---

(۱) شرح مواقف

(۲) یہ اور اس کے بعد تین چار مقامات پر جو اقتباسات دئے گئے ہیں "تجلیات روح ایرانی در ادوار تاریخی" ایک فارسی رسالے کے ہیں۔ یہ رسالہ ایران کے ایک مشہور قوم پرست حسین کاظم زادہ کا ہے اس میں یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ روح خاص جو زمانۂ قدیم سے ایرانیوں میں چلی آتی ہے اب تک باقی اور زندہ ہے اور اس روح سے ان کی مراد جذبہ قوم پرستی، وطن پرستی اور مذہب پرستی ہے۔ وہ

تجدید استیلا، گردید ایرانیان کینہ و حس انتقام در دل خود می پروریدند و این حس و کینہ و انتقام در مواقع عدیدہ خود نمائی می کرد و از پردہ بیروں می افتاد تا اینکہ با آئین فرقہ تشیع بکلی ظاہر گشت۔

"محبت مخصوص از ابتدائے اسلام ایرانیان نسبت بخاندان رسول (صلعم) حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) و اولاد او بہم رسانیدہ خیلے از اسباب معلومہ یک علت سیاسی نیز دا شت۔ وگرنہ ہمہ قبائل عرب دپیشوایان اسلام برائے ایرانیاں یکے بود و یا ہیچ کدام خویشی و روابط مخصوص پیش از وقت نداشتند"

صحیح طور پر یہ بتانا کہ کس وقت اور کس کے عہد حکومت میں انھوں نے تشیع کا اظہار کیا، ذرا مشکل ہے۔ البتہ یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ بنو امیہ کے زمانے میں انھوں نے بھی اپنے مخبر، داعی، قاصد اور نقیب سلطنت امیہ کے چپہ چپہ پر پھیلادئے تھے، اور یہ وہ موقعہ تھا جب دو دو جماعتیں علویہ اور عباسیہ متحدہ سازشی قوت کے ساتھ بنو امیہ کی حکومت کو مٹانے کے درپے تھیں جو ایک خالص عربی حکومت تھی، ظاہر ہے کہ اس سے بہتر موقعہ عربوں کے خلاف ان کو اور کب مل سکتا تھا، چنانچہ ان کے مخبروں اور داعیوں نے وہ کر دکھایا جو ایک بڑی سے بڑی اور طاقتور حکومت بھی اپنے مخالف کے مقابلے میں مشکل کر سکتی، بالآخر انھیں کے ایک شخص ابو مسلم جو خالص ایرانی اور مجوسی النسل تھا بنو امیہ کی حکومت کو برباد کرنے اور ان کی جگہ عباسی حکمراں کو متعین کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بنو عباسیہ کی حکومت کو جو خود ان کی کوششوں

کا نتیجہ تھی اسی جذبہ کا اثر تھا کہ جس نے ایرانیوں کو مختلف مذاہب اور قوموں کے مقابل سینہ سپر کیا اور پھر اسلام کے خلاف بھی انھوں نے اپنے اس جذبہ کا ثبوت دیا۔

ایرانیوں کے متعلق جن خیالات کا اظہار جیسین کا ظم، ابن حزم اور ان کے علاوہ اور بہت سے دوسرے مورخین نے کیا ہے اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ اس جذبے میں ہر ایرانی مسلمان شریک تھا اس لئے کہ ایران کی سرزمین نے جہاں اس قسم کے لوگوں کو پیدا کیا وہاں بہت سے سچے مسلمان بھی موجود تھے جن کی شہادت تاریخ، علم اخلاق، تصوف وغیرہ کی کتابوں کے صفحات دے رہے ہیں۔

اور ابو مسلم کی تباہ و نظرت کی فریب کاری کا ثمرہ تھی۔ یہ لوگ اپنی خاص اور ایرانی حکومت تصور کرتے تھے

"اگرچہ خلفائے عباسی از اولاد حضرت علی ابن ابی طالب کہ ایرانیان می خواستند نبودند
ولے باز بہتر از بنو امیہ بودند چوں بدستیاری ایرانیاں و بیاثمر دی ابو مسلم خراسانی بمقام خلافت
رسیدند سلطنت ہماں یک سلطنت ایرانی شمردہ می شود"

ان کا شاید یہ گمان تھا کہ رفتہ رفتہ اثر و اقتدار بڑھا کر اس کی حکومت کو خالص ایرانی حکومت
بنالیں گے۔ لیکن خلیفہ ابو منصور کی بروقت بیداری اور اس سلسلے میں ابو مسلم خراسانی کے قتل نے
ایرانیوں کو چوکنا کر دیا۔ ان کو دھندلا سا نظر آیا کہ شاید ان کی آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

"و لے ایں انقلاب ہنوز برائے اعادۂ استقلال سیاسی حقیقی
و استقرائے عباسیان بہ مسند خلافت رفع عطش از تشنگان زلال آ
کہ ایرانیاں بداں خاندان بستہ بودند بطور دلخواہ حاصل نہ شد"

اس لئے اب یہ پہلا موقعہ تھا کہ عباسیوں کے خلاف بھی ان کی پہلی جیسی ....
لیکن سازشی تدبیروں کے علاوہ ابو مسلم کے ہمراہیوں میں سے فیروز نامی مجوسی نے جو سنباد کے
نام سے مشہور ہے باغی ہوا اور ابو مسلم کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے سے اس سلطنت کے شیرازہ
کو بکھیرنے کی تدبیر کی۔

"سنباد مجوسی کہ دوست و طرفدار او بود، ہوا خواہان زیاد بزدری دور خود جمع کردہ ابتدا،
شہر قومیش و رے را کہ ابو مسلم خزاین زیاد دریں شہر اخری گذاشتہ بود تصرف نمود و آں خزاین را
برداشت و اعلان کرد کہ خیال دارد کہ بر حجاز حملہ برد و کعبہ را خراب بکند"

رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی کارروائی جاری رکھی، یہاں تک کہ خلیفہ ہارون الرشید کا زمانہ
آگیا۔ اس زمانے میں خاندان برامکہ نے جو اثر و اقتدار اپنا حاصل کر لیا تھا اس سے ان کی یہ توقع
بیجا نہ تھی کہ اب حکومت آسانی کے ساتھ ایرانی حکومت میں تبدیل ہو سکتی ہے، مگر یکایک ہارون
چونکا اور خاندان برامکہ کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا۔ برامکہ کی تباہی جن اسباب کے ماتحت

بھی دراصل یہی سبب تھا، چنانچہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی لکھتے ہیں کہ

"خالد بن برمک ابو مسلم خراسانی کا خاص معتمد تھا۔ یہ لوگ ایرانی سلطنت قائم کرنے کے بعد آرزومند تھے، خالد بن برمک نے ابو مسلم کے قتل کے بعد کسی بات سے طرز عمل سے اپنی ناراضگی کا اظہار ہونے نہ دیا، تیاری ہو چکی تھی اور سلطنت عباسیہ کا تختہ الٹ جانے کی سازش مکمل کر چکے تھے۔ اس سازش میں علوی ان کے شریک تھے۔ برامکہ کی یہ تیاریاں ابو مسلم کے خون کا بدلہ لینے اور ایرانی سلطنت قائم کرنے کے لئے تھیں۔ انھوں نے ایک طرف علویوں اور خارجیوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا اور دوسری طرف علماء، فقہاء، اور صوفیاء کو بھی زر پاشی سے اپنا ہوا خواہ بنا لیا تھا۔"

اس واقعہ سے ایرانیوں کی آنکھیں کھل گئیں اور یہاں پہنچ کر ان کو صاف صاف معلوم ہو گیا کہ کچھ بھی ہو آخر تو خلفاء مسلمان ہیں اور ان پر عربوں کا کافی اثر ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ہمتیں پست نہیں ہوئی تھیں وہ برابر اس دھن میں لگے رہے، خلیفہ مامون کی ماں ایرانی تھی، سلطنت بھی ایک ایرانی وزیر فضل نامی جس کا باپ مجوسی تھا کی کوششوں سے حاصل ہوئی تھی اس لئے قدرتاً مامون ایرانیوں کا ہوا خواہ تھا۔ اسی وجہ سے پھر وہ ایرانی اقتدار جس کو ہارون نے ختم کر دیا تھا اس دور میں حاصل ہو گیا، اس کے علاوہ خیالات اور عقائد میں جو آزادی اس زمانے میں لوگوں کو حاصل تھی کسی زمانے میں بھی ایسی بے راہ روی نہ تھی، فارسی، یونانی اور سریانی وغیرہ زبانوں کی بہت سے فلسفیانہ کتابوں کے ترجمے نے اس بے راہ روی میں اور اضافہ کر دیا تھا، ایرانیوں نے اس موقعہ کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ جھٹ ایک بڑے گروہ نے اسماعیل اور ان کی اولاد کا ہوا خواہ بن کر ان کے لئے دعوت خلافت شروع کر دی۔ پروفیسر سلطان بک محمد کے وہ خطبات جو وقتاً فوقتاً جامعہ مصریہ کے طلبہ کے سامنے صاحب موصوف نے دئے ہیں "الفلسفۃ العربیہ والاخلاق" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں، اس میں ایک چھوٹا سا خطبہ اس جماعت پر بھی موجود ہے، چنانچہ وہ یہ کہنے کے بعد کہ فارسیوں کا یہ تھا کہ

قول حق صفحہ ۵

جذبہ تھا جو اسلامی سلطنت کے خلاف کوشش کر رہے تھے ، کہتے ہیں کہ

"...... مامونؔ کا میلان شیعیت کی طرف زیادہ تھا۔ اس کے زمانے میں فارسی یونانی اور سریانی زبانوں کی فلسفیانہ کتابیں عربی زبان میں بہت سی منتقل ہوئیں۔ لوگوں نے کثرت سے اس کی طرف دلچسپی کا اظہار کیا، پھر ہر شخص کو مذہب وغیرہ کے متعلق خیالات کے اظہار میں عام آزادی مل گئی ، فارسیوں کو یہ موقعہ غنیمت معلوم ہوا ، اس لئے وہ اسماعیلیت کی طرف بڑھے اور یہ اس وجہ سے کہ لوگوں کا رجحان آل علی کی طرف زیادہ تھا۔"

اس قدر لکھنے کے بعد یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُ...

جس میں یہ لوگ آکر شریک ہوئے ، اسماعیلیہ پہلے ایک سیا...

تھی ، جو بنو عباس کے دور حکومت میں پیدا ہوئی اور وہ اس طرح پ...

سے عقائد اور خیالات کے مختلف فرقوں اور جماعتوں میں منقسم ہوگئے ، سیاسی حیثیت سے بھی دو بڑی شاخوں میں بٹ گئے ، ان میں سے ایک گروہ اہل سنت والجماعت کا ہے اور دوسرا شیعہ ۔ اہل سنت والجماعت سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جن کا اعتقاد اس مسئلہ خاص یعنی خلافت وامامت میں یہ ہے کہ خلفاء اربعہ جس ترتیب سے خلیفہ ہوئے ٹھیک اسی ترتیب سے ان کو حق خلافت حاصل تھا۔ لیکن شیعہ جن کا عقیدہ بالکل اس کے برعکس یہ ہے کہ خلافت کے اصل حقدار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے ۔ عام مسلمانوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا کر ان کے حق میں دست اندازی کی ۔ شروع شروع میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جمہور اہل اسلام کا ابوبکرؓ کی بیعت پر متفق ہو جانے کے بعد کسی کی ہمت یہ نہ تھی کہ ان کی خلافت اور اسی طرح حضرت عمرؓ کی خلافت سے انکار کرتے لیکن حضرت عثمان کی خلافت کے ساتویں سال ۳۰ھ میں خلیفہ موصوف کی نرم مزاجی سے یہ تحریک عملاً شروع ہوئی کہ علیؓ اور ان کے خاندان میں خلافت محدود ہو ، چنانچہ اسی تحریک

---

(۱) الفلسفۃ العربیہ والاخلاق صفحہ ۱۲۹

کا نتیجہ تھا کہ حضرت عثمان رضؓ کی شہادت ہوئی اور بالآخر حضرت علی رضؓ خلیفہ منتخب ہو گئے گو اس جماعت کا مقصد حاصل ہو گیا تھا مگر اس کو کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ حضرت علی رضؓ کو بصرہ، نہروان اور صفین کی لڑائیاں لڑنی پڑیں اور آخر کار ایک خارجی نے شہید کر دیا اور معاویہ ابن ابی سفیان کے ہاتھ پر شام، حجاز، یمن اور مصر کے لوگوں نے بیعت کر لی، صرف ایک کوفہ رہ گیا تھا جس نے ان کی بیعت نہیں کی تھی، ان لوگوں نے حضرت علی رضؓ کی شہادت کے بعد امام حسنؓ حضرت علیؓ کے صاحبزادے کو خلیفہ بنایا۔ امیر معاویہ نے عراق پر حملہ کیا اور چند دن کے بعد آخر کار امام حسین خلافت سے دست بردار ہو گئے امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی خلافت اپنی ہی زندگی میں تسلیم کرانی چاہی، کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی، چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں اپنی خلافت لوگوں سے منوانی چاہی اور کوفہ والوں نے امام حسین کو خلیفہ بنانا چاہا اور اسی سلسلے میں ان کی شہادت کا دردناک واقعہ پیش آیا، یزید کے انتقال کے بعد عبداللہ بن زبیر کا حلقہ اطاعت بہت وسیع ہو چکا تھا اور دوسری طرف بنو امیہ کی اولاد تھی، ان دونوں گروہوں میں خوب خوب جنگ ہوئی اور آخر میں امیہ کا خاندان غالب آگیا اور ایک عرصے تک ان کی خلافت اور حکومت رہی، ظاہر ہے کہ جو لوگ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر متدین صحابہ کو غاصب خلافت ٹھہرا سکتے تھے، بنو امیہ کا خاندان ان بزرگوں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا تھا، اور پھر اس وقت جب بجائے اللہ کے حکومت کا دور دورہ ہو۔

لیکن اس دور حکومت میں بھی شیعہ دو بڑی شاخوں میں منقسم ہو گئے ایک زیدیہ اور دوسرے کسانیہ۔ اول الذکر خلافت و امامت کو اس جماعت میں دیکھنا چاہتی تھی جو حضرت فاطمہ کی اولاد سے ہوں، اور موخرالذکر نے محمد بن حنفیہ (حضرت علیؓ کے بڑے لڑکے) کے سلسلہ کو اپنا پیشوا اور مقتدا بنایا تھا۔ زیدیوں کے موجودہ امام زید بن علی بن حسین تھے اور کسانیہ کے ابو ہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب تھے۔ ان دونوں جماعتوں نے عباسی داعیوں کے ساتھ مل کر کام شروع کیا، جو راہ عمل اختیار کی تھی وہ یہ تھی کہ بظاہر امویوں کی خلافت تسلیم

کرتے اور خفیہ طور پر جس کو اپنا ہمدرد سمجھتے بیعت لیتے، اور راز کے پوشیدہ رکھنے کی تاکید فرماتے۔
اس کے علاوہ آپس کے تصادم سے بچنے کے لئے بہتر طریقہ یہ اختیار کر رکھا تھا کہ بجائے امام
زین العابدین، محمد بن حنفیہ یا حضرت عباس کے نام پر بیعت لینے کے صرف اہل بیت کا لفظ استعمال
کرتے، عباسی داعیوں کی یہ ایک چال تھی کہ اپنے کو ہمیشہ خود خلافت کی آرزو سے الگ اور ان کا
محض معاون ہی ثابت کرتے رہے، لیکن جب کامیابی کا موقعہ ابو مسلم کی کوششوں نے پیدا کر دیا۔
تو قدیم معاہدے کے خلاف اپنی حکومت قائم کر لی جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ علویوں کی وہ جماعتیں جس
طرح بنوامیہ کے مٹانے کے درپے تھیں عباسیہ کی فکر میں ہو گئیں چنانچہ ظہور وہ اگلی ... کوششیں ان
کے خلاف جاری تھیں۔ اسماعیلیہ جن سے ان ایرانیوں کا تعلق ...
میں شیعوں کی ایک تیسری جماعت امامیہ کی ایک مشہور شاخ ...
عقیدہ یہ ہے کہ خلافت کے مستحق دراصل حضرت علی، پھر حسن پھر حسین ...
اور پھر ان کے بیٹے جعفر صادق ہیں، جعفر صادق کے بعد دو جماعتیں پیدا ہو ...
کو موسیٰ کاظم کی نسل سے بتایا اور دوسری نے اسماعیل کی اور اسماعیلیہ کہلائے جس طرح شیعوں
کی اور دوسری جماعتیں خلافت کے لئے کوشاں تھیں اسماعیلی اس معاملے میں سرگرم رکن نہ تھے
صرف اپنے عقیدے کے مطابق امام کی موجودگی کا یقین رکھتے تھے اور ان کے لئے بیعت لیتے
پھر رہے تھے، چنانچہ مبارک جو محمد بن اسماعیل بن امام جعفر صادق کا غلام تھا۔ محمد بن اسماعیل
کی وفات کے بعد کوفے میں جا کر کوفے کے شیعوں کو مذہب اسماعیلی اختیار کرنے کی ترغیب دی
اور اسی طرح بعض اسماعیلیوں کا خفیہ طور پر شمالی افریقہ کے علاقوں میں اسی زمانے میں دعوت امامت
کا پتہ چلتا ہے، اگرچہ شیعوں کے عام عقیدے کے مطابق امام وقت اللہ کی طرف سے مخلوق پر حجت
ہوتا ہے اور اس کا وجود تبلیغ شریعت کے لئے ضروری ہے۔ کسی ایسے امام کا ظہور اسماعیل کی اولاد
میں نہیں ہوا مگر انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ امام کا ظہور ضروری نہیں بلکہ کبھی کبھی وہ مستور ہوا کرتا ہے
اور لوگوں کو ان کے حال سے آگاہی نہیں ہوتی ہے مگر ایسی حالت میں یہ لازم ہے کہ ان کا نائب

ظاہر ہو، خلق اللہ پر حجت ہو اور دعوت تبلیغ کے منصب پر قائم ہو۔

ایرانیوں کا اس تعلق کی خاطر جو انھوں نے اسماعیلیوں سے قائم کیا تھا ان کا تذکرہ کرنا ضروری تھا، اس لئے کہ یہ تعلق نہ صرف ابتدائی زمانے ہی میں ظاہر کیا گیا بلکہ تا انقراض دولت عباسیہ ہمیشہ یکساں طور پر باقی رکھا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ ساری وہ کامیابیاں جن کا ذکر آگے آئے گا اسی بنا پر ان کو حاصل ہوئیں، اس لئے قصداً ان واقعات کے بتانے میں ذرا تفصیل سے کام لیا گیا تاکہ جہاں یہ معلوم ہو سکے کہ یہ اسماعیلی کون تھے اور ان کا ظہور کن اسباب کے ماتحت ہوا، اس بات کے اندازہ کرنے میں بھی سہولت ہو کہ اس جماعت کے ساتھ شامل ہونے سے ان کا کیا فائدہ متصور ہو سکتا تھا۔ حالات اور واقعات کی بنا پر یہ نتیجہ نہایت آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس اسماعیلی جماعت کی طرف اپنے کو منسوب کرنے میں ان کا بظاہر منشا یہی تھا کہ جس طرح دوسری شیعی جماعتیں زیدیہ اور کیسانیہ دولت عباسیہ کے خلاف اپنی خلافت قائم کرنے اور عباسی حکومت کو مٹانے کے درپے تھیں، اسماعیلیوں کا بھی در اصل وہی منشا تھا اور اس پردے کی آڑ میں کچھ اور ہی مقصود تھا کہ ان کے مقابل لا کر کھڑا کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اخوان الصفاء

اس وقت کے بہت سے علماء نے جن کی ذہنیت کو یونانی فلسفہ اور منطق نے مسخ کر دیا تھا ایسے رسائل لکھے جن کا مقصود اگرچہ یہ نہ تھا کہ اس قسم کے لوگوں کی تائید کی جائے مگر باعتبار نتائج ایسا ضرور ہوا کہ انھوں نے اپنے ان خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا جو حصول مقصد میں معین ہو سکتے تھے۔ یہ رسائل اخوان الصفا کے نام سے مشہور ہیں اور یہ چار جلدوں میں ہیں۔ یہاں ایک آدھ مقام سے اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے، تاکہ یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ ان رسائل سے ان کی تائید کیسے ہوتی تھی۔ ان اسماعیلیوں کی سب سے پہلی اور بنیادی چیز یہ تھی (جیسا کہ آئندہ بتایا جائے گا) کہ لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ قرآن اور جملہ احکام الٰہی اپنے ظاہری اور باطنی معنی کے اعتبار سے دو الگ الگ چیزیں ہیں، لوگوں نے ظاہری احکام پر عمل کر کے سخت غلطی کی ہے، اسی خیال کو اخوان الصفا

کی چوتھی جلد چھٹے رسالے میں ناموس الٰہی کی ماہیت اور نبوت کے شرائط کے تحت لکھا گیا ہے

" تمام آسمانی کتابیں[1] اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے دو معنی ہیں ایک تو وہ معنی ہیں جو اس کے ظاہری الفاظ دلالت کرتے ہیں، دوسرے وہ حقیقی معنی جو کہ لفظ کی تہہ میں پوشیدہ ہیں.
اس بنا پر ہر شرعی احکام کے دو پہلو ہیں ایک اس کا ظاہر اور دوسرا اس کا باطن جو لوگ ظاہری احکام کے پابند ہوتے ہیں وہ دنیاوی حیثیت سے بیشک کامیاب ہیں لیکن اصلی اور آخری کامیابی ان لوگوں کے حصے میں ہے جو اس کے خفی معنی سے واقف اور اس کو اپنا عملی شعار بناتے ہیں.....
خدائی قانون کی غرض اصلی یہی ہے کہ لوگ اسرار سے واقف
لوگ ان اسرار سے واقف ہونے کے باوجود کوئی جدوجہد
حشر مرنے کے بعد یہ ہوگا کہ عام بہائم اور ان کے رتبے میں کو
رسالہ بعث میں عام مسلمانوں کے اس اعتقاد سے کہ
دوبارہ اٹھیں گے انکار کیا ہے جس کو اسماعیلیوں نے نفی قیامت کا پہلا زینہ قرار دیا ہے۔

یہ اسماعیلی دولت عباسیہ کے خلاف پروپیگنڈا کرتے پھرتے تھے اور یہ یقین عوام کو دلا رہے تھے کہ اب خدا کا وعدہ پورا ہونے والا ہے، حکومت اور خلافت ہمارے خاندان میں بہت جلد منتقل ہوگی۔ اس چیز کی تائید ایک دوسرے رسالے "الدعوۃ الی اللہ" سے ہوتی ہے۔

" ملک[2] اور دولت ہر زمانے اور ہر دور میں ایک خاندان سے دوسرے خاندان ایک قوم سے دوسری قوم، ایک ملک والوں سے دوسرے ملک والوں میں تبدیل ہوتی رہتی ہے، اس لئے اب یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اچھی حکومت اور دولت جو اب شروع ہونے والی ہے اور جس حکومت کے کل وزراء اچھی قوم کے اچھے افراد ہوں گے، اس کوشش کے لئے یہ

---

(۱) اخوان الصفا جلد چہارم صفحہ ۱۹۰ - ۱۸۹

(۲) اخوان الصفا جلد چہارم صفحہ ۲۲۳

طے پایا ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ کسی مخصوص مقام پر جمع ہوں ایک رائے اور طریقے پر متفق ہونے کے بعد یہ عہد کریں کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہونگے، ان کے تمام افراد کی مجموعی حیثیت تمام امور میں صرف شخص واحد کی اور تمام تدابیر میں صرف ایک نفس منفرد کی ہوگی بعد یہ معاملہ دین کی مدد اور آخرت کی طلب کا ہے۔ اس لئے صرف (خدا کی رحمت کے طلبگار ہوں گے۔)

بھائیو! اس اچھی خبر سے خوش ہو، اللہ کی مدد پر اعتماد کرو جس نے ہر کوشش کرنے والے کو اس کی کوشش کا پھل دینے کا وعدہ کیا ہے۔ والذین جاہدو منہا لنہدینہم سبلنا ولینصرن اللہ من ینصرہ، وان حزب اللہ ہم الغالبون۔

بہت سے عقائد اور خیالات جو ان اسماعیلیوں کے تھے بالکل ملتے جلتے ہوئے اکثر رسائل میں موجود ہیں جو یہاں صرف مضمون کے زیادہ بڑھ جانے کے خوف سے چھوڑے جاتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اخوان الصفا کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"چوتھی صدی ہجری کے آخر نصف میں ایک شیعی مذہبی اور سیاسی جماعت تھی جس کے عقائد اور خیالات اسماعیلی فرقے سے ملتے جلتے تھے۔ اس کا مرکز بصرہ تھا اس کے اراکین اپنے آپ کو صافی اور مومن کہتے اس لئے کہ اس کا مقصد اپنی روح کی نجات باہمی اعانت اور مدد سے حاصل کرنا تھا، اس جماعت کا نام اخوان الصفا رکھا۔ ان کے سیاسی کارناموں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، سوائے ان کے رسائل کے جو بہت مبہم زبان میں ہوتے تھے۔"

افغانوں کا سیاسی عروج و زوال

افغانوں کا نسب | تاریخ اسلام میں افغان ایک عجیب و غریب قوم ہے جس کے سلسلۂ نسب کے متعلق مشرقی اور مغربی مورخین میں سخت اختلاف ہے، افغانوں کی نسبی تحقیق و تدقیق کے متعلق محققین نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ لیکن جب ان کی تحقیقات پر غور کیا جاتا ہے تو ...

بعض مغربی مورخین کا خیال ہے کہ بعض قبائل افغان آن
سکندر اعظم کے ساتھ آئے تھے اور فتح کے بعد افغانستان کے پہاڑوں
دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ افغان قوم اُن نوآباد لوگوں کی نسل سے ...
کے عہد میں یونان سے ہجرت کر کے افغانستان میں آکر آباد ہو گئے تھے۔

مشرقی مورخین کا ایک بڑا گروہ اس بات پر متفق ہے کہ افغان قوم کا سلسلۂ نسب بنی اسرائیل سے ملتا ہے یعنی افغان سامی النسل ہیں۔

"دی افغانز" کتاب کے مصنف کا خیال ہے کہ افغان قوم کا سلسلۂ نسب البانیوں سے ملتا ہے اور یہ لوگ البانی النسل ہیں۔ مصنف موصوف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ وہ البانی قبائل جو سواحل بحر اسود اور بحر متوسط پر سکونت پذیر تھے اور جو آئے دن شاہان ایران کو پریشان کرتے رہتے تھے وہ "اغوان یا اوغان" کے نام سے مشہور تھے۔ شاہان ایران ان لوگوں کو وقتاً فوقتاً بحر اسود اور بحر متوسط کے سواحل سے جلا وطن کر کے افغانستان میں لا لا کر بساتے تھے۔ چنانچہ اس مورخ کے خیال کے مطابق افغانی البانی النسل ہیں۔

خود افغان مورخین اپنے آپ کو یہودی النسل کہتے ہیں اور اپنے آباؤ اجداد کے وسط ایشیا میں آنے کا حال اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ افغانہ جس کے نام سے افغانوں کو منسوب کیا جاتا ہے حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے ایک شخص تھا۔ بخت نصر نے یہودیوں کو قید کر کے کوہستان غور میں

[illegible] جہاں ان کی نسل پھلی پھولی اور بڑھی۔ اگرچہ یہ لوگ ارض مقدس سے دور جلاوطن کرکے [illegible] گئے تھے تاہم ان لوگوں کا مذہب ظہور اسلام تک یہودی مذہب تھا اور اس وقت تک یہ اپنے مذہب پر قائم تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بعض لوگ ارض مقدس میں آکر اپنے مذہبی جذبات تازہ کرکے واپس جاتے اور اپنے ہموطنوں کو یہودیت پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے ان لوگوں کے اسلام لانے کے متعلق یوں مشہور ہے کہ ایک یہودی خالد نامی آنحضرت کی خدمت میں آکر مشرف باسلام ہوا اور افغانستان میں اپنے بھائی بندوں کو اسلام کا پیغام پہنچایا۔ رفتہ رفتہ جب تمام افغانوں نے اسلام قبول کر لیا تو خالد نے چند افغانی سرداروں کو خدمت نبوی میں حاضر کیا۔ ان لوگوں نے خدمت نبوی میں اپنا سلسلۂ نسب بیان کیا اور کہا کہ ہم لوگ حضرت ابراہیم کی نسل سے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے ان لوگوں کے ساتھ بہت مہربانی کا سلوک فرمایا۔ انھیں افغانی سرداروں میں سے ایک سردار قیس نامی تھا آنحضرتؐ نے اس کا نام عبدالرشید رکھا۔ افغانی مورخین میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ افغانی سردار خدمت نبوی میں رہ کر بعض غزوات میں ہمرکابی کے شرف سے بھی مشرف ہوئے تھے لیکن یہ واقعہ بعید از قیاس ہے کیونکہ سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ افغانوں کے اسلام لانے کے متعلق ایک دوسری روایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے جو ایک افغانی مورخ اس طریقے پر بیان کرتا ہے کہ لفظ افغان عربی لفظ ہے جو اصل میں عبرانی سے مشتق ہے ملک طالوت جو یہودیوں کا سردار تھا اس کے ایک لڑکے کا نام افغان تھا جس کے نام سے اس کی نسل افغان مشہور ہوئی۔ یہودیوں میں آپس میں ایک عرصہ دراز تک خانہ جنگی ہوئی اور بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس تک جاری رہی۔ بخت نصر نے ستر ہزار سے زیادہ یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ ان میں سے جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ بیت المقدس سے بھاگ کر ایک عرصہ تک عرب میں سکونت پذیر رہے لیکن معاش کی قلت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ایشیا کے کسی سرسبز حصے میں جاکر آباد ہوں۔ چنانچہ انھوں نے کوہستان سلیمان کو پسند کرکے وہیں سکونت اختیار کی۔ باقی ماندہ افغان خلیفۂ اول کے عہد میں مشرف باسلام ہوئے اور ایران میں جاکر آباد ہوگئے۔ یہ لوگ چنگیزی

جا کر اسپاہان میں رہے اس کے بعد چنگیزی مظالم کی تاب نہ لا کر کوہ سلیمان میں ہجرت کر کے اپنے متعلقین کے ساتھ اقامت پذیر ہو گئے۔

افغان قوم مختلف قبائل اور جرگوں میں منقسم ہے۔ تمام افغانی قبیلوں کا دعویٰ ہے کہ یہ لوگ ملک طالوت کی نسل سے ہیں۔ افغانوں کی قومی خصوصیت آزادی۔ مہمان نوازی۔ اور شجاعت ہے۔ افغان سنی المذہب ہیں اور بعض شیعہ مذہب بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کثرت سنیوں کی ہے۔ افغانوں کی قومی زبان پشتو ہے۔ جو افغانستان کے مختلف حصوں میں مختلف لہجہ
لہجہ کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ قندھار کی پشتو ایران کے
اس کے مشرقی افغانستان کی پشتو سخت لہجہ رکھتی ہے
سمجھی جاتی ہے۔ سرکاری دفاتر تمام کے تمام فارسی ز
سرکاری زبان فارسی ہے۔

افغانستان | افغانستان فارسی کا ایک مرکب لفظ ہے جس نے "افغان" اور "ستان" سے ترکیب پائی ہے۔ جس کے معنی ہوئے افغانوں کا ملک یا افغان قوم کا مسکن۔ افغان اپنے ملک کو قلاجیت اور کابلستان بھی کہتے ہیں۔ افغانستان کے حدود اربعہ یہ ہیں شمال میں ترکستان۔ مشرق میں پنجاب۔ جنوب میں بلوچستان اور مغرب میں خراسان۔

افغانستان کا رقبہ دو لاکھ پندرہ ہزار مربع میل سے بھی زیادہ ہے۔ باشندوں کی تعداد دس ملین کے لگ بھگ ہے۔ افغانستان کے مشہور شہر یہ ہیں۔ کابل۔ غزنی۔ قندھار۔ ہرات اور جلال آباد۔ ہرات اپنے موقع و محل کی وجہ سے مغربی ایشیا اور وسطی ایشیا کا تجارتی مرکز ہے جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک روس اور برطانیہ کی استعماریت کا مرکز توجہ بنا رہا۔

افغانستان، ایران کی سطح مرتفع کا سب سے بلند حصہ ہے۔ جس کی بلندی چار ہزار فیٹ سے لیکر سات ہزار فیٹ تک ہے۔ افغانستان کا شمالی پہاڑ یعنی کوہستان ہندوکش بیس ہزار فیٹ بلند ہے۔ اور مشرق میں کوہ سلیمان ہے جس کی چوٹیاں سات ہزار فیٹ سے

سے گیارہ ہزار فیٹ تک بلند ہیں۔ کوہستان ہندوکش کی مغربی شاخیں یہ ہیں۔ کوہ بابا کوہ سفید۔ اور کوہ سیاہ۔ ان سلسلوں کے شمال میں افغانی ترکستان واقع ہے۔ افغانی اور روسی ترکستان کے درمیان حد فاصل دریائے جیحون قائم کرتا ہے۔

افغانستان ناہموار سطح کا ملک ہے۔ بلند پہاڑیوں۔ عریض و عمیق میدانوں اور ندیوں کی تنگ گھاٹیوں اور دروں سے ترکیب پاتا ہے۔ افغانستان کے میدانوں میں کثرت سے باغات ہیں جن میں انگور، سیب، شفتالو، امرود، بہی، انار۔ بادام اور پستہ بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ جو افغانی باشندوں کی ضروریات کو پورا کرکے ہندوستان کے بازاروں میں بھی خشک و تر بکثرت آتا ہے۔ افغانستان کے اونچے اونچے پہاڑوں میں جو گھنے جنگلات سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ کفتار۔ لومڑی اور بعض حصوں میں شیر اور چیتا بھی پایا جاتا ہے۔ پالتو جانوروں میں ایک قسم کی ایرانی بکری ہوتی ہے۔ جو اپنے لمبے بالوں کی وجہ سے کافی شہرت رکھتی ہے گائے، بھینس، گھوڑا، گدھا، خچر بکثرت پائے جاتے ہیں۔ افغانستان میں وہ تمام پرندے ملتے ہیں جو ایشیا کے دوسرے حصوں میں ہیں۔ قدرت نے افغانستان کو بکثرت معدنیات عطا کی ہیں۔ لیکن ابھی تک صرف چند معدنیات نکالی گئی ہیں مثلاً شورہ، گندھک، نمک، رانگا اور لوہا۔ افغانستان کا لوہا اپنی خصوصیات میں دنیا کے کسی حصہ کے لوہے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

افغانستان میں دریا بہت کم ہیں۔ سب سے بڑے دریا صرف دو ہیں رود ہلمند اور دریائے کابل۔ یہ دونوں دریا کوہ ہندوکش سے نکلتے ہیں۔ چند چھوٹی چھوٹی ندیاں بھی ہیں جن کا تذکرہ باعث طوالت ہوگا۔

افغانی حکمران خاندان | عہد بنو اُمیہ اور بنو عباس میں افغانستان اموی اور عباسی گورنروں کے ماتحت رہا۔ عباسی خلافت کے زوال کے بعد جب طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا تو افغانستان پر خراسان کے گورنر اسماعیل سامانی نے قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد الپتگین حاکم افغانستان ہوا

اس کے بعد سبکتگین اس کے بعد محمود کا دور شروع ہوتا ہے۔ جس کی تلوار ایک طرف تو وسط ایشیا میں چلی اور دوسری طرف ہندوستان میں بے نیام ہوئی۔ دولت غزنویہ کے عہد حکومت میں افغانستان اپنی قومی حکومت قائم نہیں کر سکے۔

غوری خاندان | دولت غزنویہ کی تباہی کے بعد کوہستان غور میں غوریوں نے ایک حکومت قائم کی جس کو مورخ پہلی افغانی حکومت کہتے ہیں۔ یہ دولت غوریہ وہ ہی ہے جس کے حکمرانوں میں شہاب الدین غوری بھی تھا جو ہندوستان کا مشہور فاتح اور سرزمین ہند میں اسلامی حکومت کا بانی ہے یہ خاندان چنگیزی حملہ تک افغانستان میں نہایت شاندار طریقہ پر حکومت کرتا رہا۔ چنگیزی حملہ کے بعد افغانی قوم اپنے وطن میں ایک عرصہ دراز تک کوئی حکومت قائم نہ کر سکی [illegible] نے ایشیا کی سیاست میں ایک طوفان عظیم پیدا کر دیا تھا۔

لودھی خاندان | ہندوستان میں تغلق خاندان کی تباہی [illegible] دورہ ہوگیا۔ جس سے فائدہ اٹھاکر بہلول نامی ایک لودہی سر[illegible] لیکن طوائف الملوکی کی گرم بازاری اس کے زمانہ میں بھی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانی حکومت صرف دہلی ہی تک محدود رہی۔ البتہ سکندر لودھی کے زمانہ میں سلطنت لودھی نے کافی وسعت حاصل کر لی تھی۔ سکندر بڑا عالم اور انصاف پسند حکمران تھا۔ ہمیشہ رعایا کی بہبودی کیلئے کوشاں رہتا تھا۔

سکندر لودہی کے بعد اس کے جانشینوں میں وہ قابلیت نہ تھی جو ہندوستان کے ایک حکمران میں ہونی چاہیئے۔ خود لودہی سرداروں میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ دولت خاں لودہی پنجاب کا گورنر تھا۔ اس نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور بابر نے اس کی دعوت پر ہندوستان پر حملہ کیا۔ بابر اور ابراھیم لودہی کی فوجوں کا پانی پت کے مشہور میدان میں مقابلہ ہوا۔ ابراھیم لودہی کو شکست فاش ہوئی اور وہ مارا گیا۔ یہ واقعہ ۱۵۲۶ء کا ہے۔

سوری خاندان | تیرہ چودہ سال تک افغان اپنی کوئی سلطنت قائم نہیں کر سکے اس کی وجہ یہ تھی کہ بابر کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی اور افغان اس کے مقابلہ میں کمزور تھے۔ بابر نے ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کو توسیع دینے کی سر توڑ کوشش کی جس سے ہندوستان کے مختلف صوبے مرکز یعنی حکومت آگرہ سے ملحق ہو گئے۔ بابر کے انتقال کے بعد ہمایوں نے بھی سلطنت کی توسیع و ترقی کی بے حد کوشش کی گجرات و مالوہ فتح کر کے مرکز کے ماتحت لایا۔ اور اس کے بعد چاہتا تھا کہ بنگال اور بہار کو بھی اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کرے۔ چنانچہ گجرات سے واپسی کے بعد اس نے بنگال و بہار کا رخ کیا بہار میں اس زمانے میں افغانی حکومت تھی جس کا بادشاہ ایک نابالغ شہزادہ جلال خان نامی تھا۔ حکومت کا نظم و نسق اس کی ماں اپنے ہاتھ میں رکھتی تھی۔

اس زمانہ میں ایک نوجوان افغان جو اپنی شجاعت اور علمی تبحر کی وجہ سے شہرت تامہ رکھتا تھا۔ میدان سیاست میں نمودار ہوا۔ یہ نوجوان ایک نووارد افغانی سردار کا بیٹا تھا جس کی جاگیر سہسرام میں تھی۔ عنفوان شباب میں اپنے باپ سے خفا ہو کر جونپور چلا گیا۔ جہاں اس نے فارسی ادب اور تاریخ کا بہت محنت سے مطالعہ کیا اس نے مذکورہ بالا دونوں فنوں میں زبردست قابلیت حاصل کر لی تھی۔ تاریخ ہند اس نوجوان کو شیر خان کے نام سے یاد کرتی ہے۔ شیر خان مختلف اوقات میں مختلف بادشاہوں کی خدمتیں ادا کرتا رہا۔ کبھی لودھی حکومت میں فوجی خدمت ادا کی کبھی ہمایوں کے دربار میں رہا اور ستارہ اقبال چمکا تو بہار کی افغانی حکومت میں سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا۔ شیر خان جلال خان نابالغ بادشاہ بہار کی ماں پر اس قدر اثر رکھتا تھا کہ وہ اپنے مرتے وقت حکومت بہار کا تمام نظم و نسق شیر خان کے سپرد کر گئی۔ چنانچہ اب شیر خان اور جلال خان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ جلال خان نے اپنی امداد کے لئے حاکم بنگالہ کو درخواست بھیجی۔ اس نے شیر خان پر حملہ کر دیا جس زمانے میں شیر خان اور حاکم بنگالہ کی فوجیں بر سر پیکار تھیں ہمایوں کی فوجوں نے بہار کے قلعوں پر قبضہ کر کے بنگالہ کے قدیم دارالحکومت گور کو مسخر کر لیا۔

موسم باران کی وجہ سے دو تین ماہ تک ہمایوں مع اپنی فوج کے گور میں رہا۔ اس اثنا میں شیر خاں بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوا۔ لیکن بعد میں میدانی علاقوں میں نکلکر بنارس اور جونپور پر قابض ہوگیا۔ اس طریقہ پر شیر خان نے ہمایون کا راستہ روک لیا اب ہمایوں کے لئے آگرہ سے کمک بھی نہیں آسکتی تھی۔ ہمایون نے مجبوراً برسات کی وجہ سے آگرہ واپس جانے کا ارادہ کرلیا۔ ہمایوں جب پٹنہ پہونچا تو اس کو یہ معلوم ہوا کہ شیر خان کی فوجیں راستہ روکے کھڑی ہیں۔ ہمایوں نے گنگا پار کرنے کے لئے کشتیوں کے پل تیار کرنے کا حکم دیا تاکہ دوسری طرف خیمہ زن ہوکر دشمن کا مقابلہ کرسکے اسی اثنا میں شیر خان کی طرف سے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی ہوئی
اپنے کوچ کو ملتوی رکھا۔ لیکن درحقیقت یہ صلح ایک دھوکہ
نے ہمایون پر شب خوں مارا۔

رات کے وقت شیر خانی فوجوں نے ہمایونی فوجوں پر
جس کی وجہ سے ہمایوں کو سخت شکست اٹھانی پڑی اور اس نے جان بچانے کی غرض سے اپنے ہمراہیوں کے دریا پار ہوکر بھاگنا چاہا لیکن اس کے بہت سے ساتھی غرق ہوگئے اور وہ خود بھی ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ اس جنگ کو تاریخ ہند میں جنگ بکسر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور یہ سنہ ۱۵۳۱ء کا واقعہ ہے۔

دوسرے سال ہمایوں نے شیر خان جس نے اب شیر شاہ کا لقب اختیار کرلیا تھا کی سرکوبی کے لئے از سر نو فوج تیار کی اور کوچ کیا۔ اس دفعہ شیر شاہی اور ہمایونی فوجوں کا مقابلہ دریائے گنگا پر قنوج کے قریب ہوا۔ ہمایوں کی فوج کے لئے بارش نے لشکرگاہ میں رہنا مشکل کردیا۔ اور بعض سرداروں نے عین وقت پر ہمایوں کو دغا دی۔ اس حالت میں شیر شاہی فوجیں ہمایونی فوجوں پر شدت سے حملہ آور ہوئیں۔ ہمایون کو پھر شکست ہوئی۔ افتاں وخیزاں آگرہ پہونچا شیر شاہی فوجیں برابر تعاقب کررہی تھیں۔ مزید براں آگرہ

میں ہمایوں کے بھائیوں کی ظاہری مخالفت بھی ہمایوں کیلئے شکستگی کا باعث ہوئی۔
ان اسباب کی بنا پر ہمایوں نے بادل ناخواستہ ہندوستان کو خیر باد کہا۔

ہمایوں، پنجاب اور سندھ ہوتا ہوا ایران پہونچا۔ شاہ ایران نے اس کی بڑی خاطر مدارات کی اور اپنا خاص مہمان بنا کر رکھا یہ واقعات ۱۵۴۵ء کے ہیں۔ ہمایوں کے جانے کے بعد تقریباً تمام شمالی ہند شیر شاہ کے قبضہ میں آگیا۔ شیر شاہ نے مالوہ اور مارواڑ فتح کر کے اپنی حکومت کی توسیع کی پانچ سال تک حکومت کرنے کے بعد راہی ملک عدم ہوا۔

شیر شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ ملکی زراعتی انتظامات ہیں جن کی وجہ سے اس کا نام تاریخ ہند میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اور اسی چیز نے مورخین کے اس نظریہ کو بالکل باطل کر دیا کہ افغان حکومت کرنا نہیں جانتے۔ لیکن ایک فاتح یا بہترین سپاہی بن سکتے ہیں۔ شیر شاہ کے رفاہ عام کی چیزوں میں سے آج بھی ہم کو ایک یادگار ملتی ہے۔ اور وہ مشہور سڑک اعظم ہے جو کلکتہ سے پشاور تک اب بھی رہروؤں کی رہبری کرتی ہے۔

شیر شاہ کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے نو سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کی اور اپنے باپ کے نامکمل کاموں کی تکمیل کی۔ اس کے بعد سوری حکومت نالائق حکمرانوں کے ہاتھ میں آئی جنھوں نے اپنی ناقابلیت کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں میں حکومت کھو دیا۔ سلطنت کھونے کی سب سے بڑی وجہ سوری سرداروں کا باہمی نفاق تھا۔ سوری سرداروں کی باہمی کشمکش کے دوران میں ہمایوں نے مناسب موقع پا کر ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ سوری اور ہمایونی فوجوں میں پانی پت کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ میدان ہمایوں کے ہاتھ رہا۔ سوری فوجیں بھاگ نکلیں۔ ہمایوں کامیابی و کامرانی کے ساتھ دہلی اور آگرہ پر پھر قابض ہوا ۱۵۵۶ء میں افغانی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور سلطنت مغلیہ کی از سر نو بنیاد پڑی۔

دُرّانی خاندان

سنہ ۱۷۰۷ء تک جب تک سلطنت مغلیہ میں انحطاط و تنزل نہ ظاہر ہوا تھا اس وقت تک مغلوں نے افغانوں کو بالکل دبائے رکھا تھا۔ اگر افغان سردار کسی علاقہ میں سر اٹھاتے تھے تو نہایت سختی سے ان کی سرکوبی کی جاتی تھی۔ افغانوں کا اصل وطن، افغانستان بھی ہمیشہ مغلوں کے گورنروں کے ماتحت رہا یہ حالت تقریباً دو سو برس تک رہی اس عرصہ میں افغانی کوئی اپنی قومی حکومت قائم نہ کر سکے۔

قدرت نے ایک دفعہ پھر سلطنت مغلیہ کے انحطاط کے بعد

افغانستان میں حکومت کرنے کا موقع دیا۔ اس اجمال کی تفصیل
کی ابتدا میں ایرانی حکومت نہایت تنزل و انحطاط کو
باشندوں میں سپاہیانہ جذبہ ایک دفعہ اور ابھرا۔ چنانچہ انھوں
کو پئے در پئے حملوں سے پریشان کر دیا۔ اور دوسری طرف ترکوں سے [illegible]
بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

اس زمانہ میں قدرت نے ایران کی حفاظت کے لئے نادر شاہ افشار کو پیدا کیا۔ جس نے ایک طرف تو افغانوں کو شکست دے کر ان کے وطن افغانستان پر قبضہ کیا اور دوسری طرف ترکوں کو سخت شکستیں دیکر ایرانی علاقے خالی کرائے۔ ۱۷۴۷ء میں جب نادر شاہ افشار قتل ہوا تو ہر افغانی سردار کی تمنا تھی کہ افغانستان کی عنان حکومت اس کے ہاتھ میں آئے۔ چنانچہ تمام افغانی سرداروں کا جرگہ منعقد ہوا جس میں اتفاق رائے سے یہ طے ہوا کہ احمد شاہ ابدالی شاہ افغانستان ہو۔ اور جمال خان بارک زئی اس کا وزیر اور مشیر ہو۔ احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ افشار کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ پر تھا اور نادر شاہ افشار کا مختلف معرکوں میں ہمرکاب رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے اس نے افغانستان کے سرکش قبائل کو رام کیا اس کے بعد اپنی حکومت کیلئے کوشاں ہوا۔ کشمیر پنجاب۔ سندھ۔ بلوچستان اور سیستان کو اپنی حکومت سے ملحق کر لیا۔ اور آخر میں پانی پت کے میدان

مرہٹوں کی طاقت کو پاش پاش کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد مرہٹہ طاقت پھر سنبھل نہ سکی۔ احمد شاہ نے چھبیس سال تک حکومت کی۔ اس کا دور نہایت کامیاب رہا۔ اس زمانے میں حکومت افغانستان کی حد ایک طرف مشہد تک پہونچتی تھی۔ دوسری طرف دہلی تک اس کے مرنے کے بعد اس بیٹا تیمور وارث تخت ہوا۔ اس کے زمانہ میں بھی حکومت کا وہی عالم تھا جو احمد شاہ کے زمانہ میں تھا۔ لیکن بعد اس کے جب زماں شاہ تخت افغانستان پر آیا تو ایک طرف تو سلطنت میں تنزل شروع ہوا۔ اور دوسری طرف ابدالی شہزادے عنان حکومت کے لئے برسرپیکار نظر آنے لگے۔ چنانچہ ایک قلیل عرصہ میں افغانستان کی وہ وسیع سلطنت جو احمد شاہ ابدالی نے قائم کی تھی، کوہ سلیمان کی گھاٹیوں ہی میں محدود ہوگئی۔

۱۸۰۱ء میں زماں شاہ کے بھائی شجاع نے جو پشاور میں مقیم تھا۔ اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے کابل پر حملہ کر دیا۔ لیکن محمود شاہ کی فوجوں سے شکست کھا کر درۂ خیبر میں پناہ گزین ہوا۔ لیکن ۱۸۰۲ء میں وہ تخت کابل لینے میں کامیاب گیا۔ اور محمود شاہ کو تخت سے اتار کر اسے قید کر دیا، اور خود رونق افروز تخت کابل ہوگیا۔

اس کے بعد سات سال تک شاہ شجاع نے افغانستان پر حکومت کی۔ مگر آئے دن بغاوتوں اور شورشوں سے پریشان رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ شجاع نہ تو جنگ وجدل کا مرد میدان تھا۔ اور نہ تدبر و سیاست کی چالیں جانتا تھا۔ مزید برآں بڑھاپے نے اس کے قویٰ کو اور بھی شل کر دیا تھا اس لئے ہر افغان شاہ شجاع سے نفرت کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس نفرت نے افغانستان میں ایک عالمگیر بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ ۱۸۰۹ء میں وزیر خان نے شاہ شجاع کو شکست فاش دے کر تخت کابل چھین لیا اور شجاع افغانستان کو چھوڑ کر ہندوستان میں اوّل اوّل رنجیت سنگھ کے ہاں پناہ گزین ہوا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے بجائے خاطر و مدارات کے شاہ شجاع کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا۔ شاہ شجاع کے پاس جتنے جواہر

تھے اس نے وہ سب اس سے غصب کر لئے۔

اب بحالت مجبوری شاہ شجاع نے انگریزوں کے ہاں جا کر پناہ لی۔ انگریزوں نے اسکے
لئے ایک وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن ابھی تک شاہ شجاع تخت کابل کا خواب دیکھ رہا
تھا۔ چنانچہ ایک بار اور تخت کابل کے لئے قسمت آزمائی کی۔ اس کو عملی جامہ پہنانے
کے لئے شاہ شجاع نے سکھوں اور انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ
یہ طاقتیں افغانستان کا تخت اس کے اصلی اور حقیقی وارث شاہ شجاع کو دلائیں گی۔
چنانچہ افغانستان کی پہلی جنگ کے اسباب میں سے
براہ درۂ بولان افغانستان میں داخل ہوئیں۔ قندھار
شجاع کو تخت کابل پر بٹھایا۔ دوست محمد خان جا گزئی
قابض ہوا تھا بھاگ کر امیر بخارا کے ہاں پناہ گزین ہوا لیکن جب
اس کو قید کر لیا۔ اتفاقی طور پر دوست محمد خان نے رہائی پا کر اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے
کر دیا۔ انگریزوں نے اس کو کلکتہ میں نظر بند رکھا۔ اور دو لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا
یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ افغانی قبائل شاہ شجاع کی حکومت سے ناراض تھے۔ اب اس
ناراضگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ اس نے کفار و نصاریٰ کو کابل میں بلایا تھا۔ نیز اس نے
ہمیشہ قوم کے ساتھ منافقانہ برتاؤ کیا۔ افغانستان کی پہلی جنگ کے بعد جو برطانوی فوجیں
شاہ شجاع کی حفاظت کے لئے کابل میں مقیم تھیں۔ افغان چاہتے تھے کہ ان کا کلی استیصال کر کے
برطانوی قدموں سے افغانستان کی زمین کو پاک کر دیں۔ اس زمانہ میں شاہ شجاع بظاہر تو
قوم سے ملا ہوا تھا۔ مگر خفیہ طور پر برطانوی نمائندوں سے ساز باز رکھتا تھا۔ اس چیز نے افغانوں
کو مشتعل کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے شاہ شجاع کو قتل کر ڈالا۔ الغرض ۱۸۴۳ء میں ابدالی
خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور بارک زئی خاندان نے اس کی جگہ لی۔

بارک زئی خاندان | اس زمانہ میں تمام افغانستان میں انگریزوں کے خلاف ایک عام نفرت کی

بغاوت پھیل گئے جنھوں نے ترقی پاکر بغاوت کی شکل اختیار کرلی جیساکہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ اس زمانہ میں دوست محمد خان انگریزوں کی پناہ میں کلکتہ میں مقیم تھا۔ دوست محمد خان کا بیٹا اکبر خان جو شجاعت میں اپنے باپ سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس نے افغانوں کی رہنمائی کی۔ آخر الامر انگریزوں اور اکبر خان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی تمام دفعات یہ تھیں کہ دوست محمد خان کو افغانستان کا بادشاہ بنایا جائے۔ اور انگریزوں کی فوجیں جلد سے جلد افغانستان کے تمام شہروں کو خالی کردیں۔ چنانچہ معاہدہ کی رو سے انگریزی فوجیں واپس آرہی تھیں کہ برف باری اور افغانی قبائل دونوں نے مل کر تمام انگریزی فوج کا خاتمہ کردیا۔ ایک ڈاکٹر بمشکل جلال آباد سے پشاور تک پہونچا جس کی زبانی یہ سرگذشت دوسروں کے کانوں تک پہونچی۔ اس کے بعد انگریزوں نے دوسری مہم محض اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے افغانستان روانہ کی جس نے کابل کے سب سے خوبصورت بازار کو جو ایشا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا گرا کر پیوند خاک کردیا۔ اور چن چن کر افغانوں کو قتل کرڈالا۔ اس کے بعد انگریزی فوجیں واپس ہوئیں اس وقت انگریزوں نے افغانی قیدیوں کو رہا کیا۔

اب دوست محمد خاں کو افغانستان کا امیر تسلیم کیا گیا۔ اس نے ایک عرصہ تک افغانستان پر حکومت کرنے کے بعد ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد شیر علیخان اور افضل خان افغانستان کے دعویدار ہوئے۔ شیر علی خان نے انگریزوں سے امداد کی درخواست کی جس کو انگریزوں نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ ہم نہیں چاہتے کہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کریں۔ اس خشک جواب کے بعد شیر علی خاں تن تنہا اپنی قوت بازو سے تمام افغانستان پر قابض ہوگیا۔

اس باہمی نزاع کے دوران میں انگریزوں نے موقعہ پاکر خان قلات سے ایک خفیہ معاہدہ کیا اور کوئٹہ لے لیا۔ اس چیز نے شیر علی خاں کو انگریزوں سے متنفر کردیا۔ وہ

روسی حکومت سے اپنے تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ انگریزوں نے اب تیسرا حملہ افغانستان پر کیا۔ شیر علی خان بھاگ کر روسی سرحد میں پناہ گزین ہوا۔ جہاں موت نے ہمیشہ کے لیے اس کو کشمکش زندگی سے نجات دے دی۔

اب انگریزوں نے ایک معاہدہ کی رو سے امیر یعقوب علی خاں کو تخت کا مالک بنایا۔ لیکن یعقوب علی خان سے افغان خوش نہ تھے۔ کیونکہ ابھی شاہ شجاع کی طرح اپنی حکومت انگریزی تلواروں کے زیر سایہ قائم کی تھی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے میں بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی افغانوں نے انگریزی ریزیڈنسی کو جلا دیا۔ یعقو آپ کو انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ انگریزوں نے اسے ہند مقرر کر دیا۔

یعقوب علی خان کے بعد افغانون کی حکومت کا خاتمہ جنرل رابرٹس جاری کرتا تھا۔ شیر علی خان کے دوسرے بیٹے ایوب خان نے ہرات سے میوند پر حملہ کر کے انگریزوں کو شکست دی۔ اب انگریزوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ افغانوں پر بزور شمشیر حکومت قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

چنانچہ انگریزی مدبرین نے یہ مناسب سمجھا کہ کسی افغان شہزادے کو تخت افغانستان دے کر انگریزی فوجیں ہندوستان کو واپس ہوں۔ انگریز مدبرین کی نظریں عبدالرحمان خاں پر پڑیں جو ایک عرصہ سے روس میں پناہ گزین تھا۔ اور اب روس چھوڑ کر حدود افغانستان میں اپنی قوت مجتمع کر رہا تھا۔ اور موقع کا منتظر تھا کہ اتنے مین انگریزی قاصد پیغام لے کر پہونچا۔ عبدالرحمن خان نے انگریزوں کی دعوت قبول کر کے تخت کابل کو سنبھالا اور انگریزی فوجیں ہندوستان واپس چلی آئیں۔

عبدالرحمان خان اپنے زمانہ کا ایک بڑا مدبر شخص تھا۔ انقلاب زمانہ نے اس کے ذہن کو اور جلا دیدی تھی۔ اس نے اپنے طویل عہد حکومت میں ملکی اور فوجی محکموں کی اصلاحات

کہ اس سے پہلے افغانستان پس ماندہ ممالک میں شمار کیا جاتا تھا لیکن اس کی شبانہ روز کی محنت شاقہ نے افغانستان کو تہذیب حاضر سے آشنا کر دیا۔ عبدالرحمان خان نے اس بات کی بہت کوشش کی کہ افغانستان انگریزی اور روسی اقتدار سے ہمیشہ آزاد رہے۔ چنانچہ امیر موصوف نے اپنے سب سے چہیتے بیٹے نصر اللہ خان کو انگلستان اس مقصد کے لئے بھیجا کہ شاہ انگلستان سے اس بات کی اجازت حاصل کرلے کہ افغانی اور برطانوی معاملات حکومت انگلستان سے براہ راست طے ہوا کریں۔ نہ کہ حکومت ہند کے توسط سے۔

لیکن شاہ انگلستان نے اس درخواست کو منظور نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے عبدالرحمان خان کو انگریزوں سے بددلی پیدا ہوگئی۔ انگریزوں نے اس کی تلافی اس طریقہ پر کرنی چاہی کہ راولپنڈی میں ایک دربار منعقد کر کے عبدالرحمان خان کو بلایا جس میں ویسرائے ہند اور امیر موصوف کی کی ملاقات ہوئی۔ حکومت برطانیہ نے شاہ افغانستان کے سالانہ وظیفہ میں اضافہ کر کے بارہ لاکھ کے بجائے اٹھارہ لاکھ کر دئے۔ امیر موصوف نے اس اضافہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور برطانوی مدبرین کو یقین دلایا کہ افغان ہمیشہ حکومت برطانیہ کے سچے دوست رہینگے اور وہ بوقت ضرورت حکومت برطانیہ کی مدد کرنے کو ہر طرح تیار ہیں۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں جب امیر عبدالرحمان خان نے رحلت کی تو ان کے بیٹے حبیب اللہ خان افغانستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ امیر حبیب اللہ خان نے اپنے پہلے دربار میں تمام سرداران قبائل کے سامنے اس امر کا اعلان کیا تھا کہ ان کی حکومت کی پالیسی وہی رہیگی جو ان کے والد امیر مرحوم کی تھی۔ حقیقت یہ ہے حبیب اللہ خان کو عبدالرحمان نے اپنی زندگی میں اچھی طرح ملکی معاملات کا عملی تجربہ سکھا دیا تھا۔ لیکن حبیب اللہ خان نے کوئی خاص جوہر نہیں دکھایا۔ جو اس کے باپ امیر عبدالرحمان خان میں تھا۔ امیر حبیب اللہ خان کو افغانستان کی عنان سلطنت اس وقت ملی جب تمام ملک منظم تھا۔ تمام افغانستان میں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ عبدالرحمان خان کے انتقال کے بعد تخت کے لئے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ ان حالات

میں حبیب اللہ خان کا فرض تھا کہ ملک کو ایک قدم اور آگے بڑھاتے۔ لیکن حبیب اللہ خان
میں باپ کے انتقال کے بعد وہ ولولہ نہیں رہا تھا جو وقتاً فوقتاً باپ کی زندگی میں ظاہر ہوتا
رہا۔ غرضیکہ ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی جنگ عظیم چھڑی تو اس زمانہ میں ایک جرمن و ترکی
وفد افغانستان پہونچا اور حبیب اللہ خان سے استدعا کی کہ افغانستان کی فوجیں ہندوستان
پر حملہ کرکے اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کریں۔ حبیب اللہ خان نے اس مشورہ کو ٹھکرا دیا۔
جرمن و ترکی وفد بے نیل و مرام واپس گیا۔

اس واقعہ نے نوجوان افغانوں کے دلوں میں حبیب اللہ خان
جذبات پیدا کر دئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۱۸ء میں حبیب
شکارگاہ میں ایک نوجوان افغان کے ہاتھ گولی کا نشا
تک کوئی پتہ نہیں چلا۔

حبیب اللہ خان کے بعد تخت افغانستان پر وہ شخصیت جلوہ آرا ہوئی جس کو دنیا
امان اللہ خان کے ہر دلعزیز نام سے جانتی ہے۔ امان اللہ خان بھی بلا کسی مخالفت کے شاہ
افغانستان ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں جب انگریزی قوت باوجود فتح یابی کے چور چور ہو گئی تھی۔ اسی وقت
امان اللہ خان نے زرین موقع دیکھ کر انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ چنانچہ افغانی
فوجوں نے نادر خان موجودہ شاہ افغانستان کی قیادت میں انگریزی سرحد پر حملہ کرکے انگریزوں کو
اس شرط کے ماننے پر مجبور کیا کہ حکومت برطانیہ افغانستان کے استقلال کو تسلیم کرے۔ کیونکہ افغان
اب انگریزی اقتدار کو کسی حالت میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ افغانی اور انگریزی
نمائیدوں نے راولپنڈی اور دہرہ دون میں معاہدہ تیار کیا۔ اس میں افغانستان کو دولت مستقلہ
کیا گیا۔ اور انگریزوں نے وظیفہ کی وہ رقم جو شاہان افغانستان کو سالانہ دیتے تھے بند کر دی۔
اب افغانستان کی سلطنت "دولت خداداد مستقلۂ افغانستان" کے نام سے مشہور ہوئی۔
اور تمام مشرقی اور مغربی طاقتوں نے افغانستان کے استقلال کو تسلیم کیا۔ مختلف ممالک

افغانی سفیر مقرر ہو کر رہنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ کارکنان قضا و قدر نے امان اللہ خان کو وہ ذہن رسا عطا کیا تھا کہ جس کی قدر و قیمت افغانوں جیسے قدامت پسند لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ امان اللہ خان اپنے دادا کی طرح چاہتا تھا کہ افغان قوم اقوام عالم کے ساتھ ترقی کی دوڑ میں دوش بدوش چل سکے۔ لیکن افغانوں جیسی قدامت پسند قوم نے امان اللہ خان کی شخصیت کو نہیں سمجھا۔ ایسے افراد کسی قوم میں ہر روز نہیں پیدا ہوا کرتے۔ بلکہ قدرت اپنی یہ نعمت ایک عرصۂ دراز کے بعد دیتی ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (اقبال)

۱۹۲۸ء میں امان اللہ خان نے اپنے ملک کی اصلاح و ترقی کیلئے ضروری سمجھا کہ بذات خود یورپ کے مختلف ممالک کی سیاحت کرکے وہاں کے تعلیمی، صنعتی اور تجارتی اداروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اپنے ملک، افغانستان میں ان طریقوں کو رائج کریں۔ چنانچہ امان اللہ خان نے یورپ کے مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ خصوصاً جب وہ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس میں گئے تو ان کی حکومتوں نے امان اللہ خان کا شاہانہ استقبال کیا۔ یورپ اور ایشیا کے جرائد و اخبار نے امان اللہ خان اور افغانستان پر مفصل مضامین شائع کئے۔ افغانستان کی شہرت دنیا کے دور و دراز گوشوں تک پہونچی۔ امان اللہ خان یہ سفر تقریباً سات آٹھ ماہ میں ختم کرکے بخیریت اپنے وطن کو واپس ہوئے۔ امان اللہ خان کے دل میں اپنے وطن کی محبت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے افغانستان ترقی کرکے دنیا کے متمدن ممالک میں شمار ہونے لگے۔ آتے ہی امان اللہ خان نے ملک میں اصلاحات جدیدہ جاری کر دین۔ اس فوری اقدام نے افغانی قوم کو ناراض کر دیا۔ اور قوم کی ناراضگی نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ الغرض امان اللہ خان نے کابل کو خیرباد کہہ کر

قندھار میں پناہ لی۔ باغیوں کے سرغنہ بچہ سقہ نے تخت کابل پر قبضہ کرلیا۔ اور امیر حبیب اللہ کے لقب سے تخت نشین ہوگیا۔

امان اللہ خان نے قندھار میں فوجی قوت درست کی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ باغیوں سے مقابلہ کیا لیکن اس مقابلہ میں ان کو معلوم ہوگیا کہ ان کا افغانستان میں رہنا محال اور بے فائدہ ہے۔ چنانچہ امان اللہ خان ہندوستان کی راہ یورپ چلے گئے۔ اور روم میں سکونت پذیر ہوگئے امان اللہ خان کے جانے کے بعد تمام افغانستان پر بچہ سقہ کا قبضہ ہوگیا سقوی مظالم نے افغانوں کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ [illegible]

اور نجات کے لئے ایک مریض سردار کو جو فرانس میں

کے نام سے جانتی ہے لاکر کھڑا کر دیا۔ بیماری کی حالت [illegible]

نے مجبور کیا کہ فرانس جیسے ملک کی پر لطف زندگی کو ترک

سقوی مظالم کی وجہ سے کرۂ آتش بنا ہوا تھا آئے اور ملک کو ڈاکوؤں سے [illegible] منظم حکومت قائم کرے۔ چنانچہ نادر خان نے مع اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے ۱۹۲۹ء میں افغانستان پہونچکر ملک کو ڈاکوؤں سے صاف کرکے افغانستان کے تاج کو قومی جرگہ کے سامنے رکھا۔ کہ قومی جرگہ اس تاج کے قابل جس کو سمجھے اس کے سر پر رکھ دے۔ چنانچہ تمام افغانستان کے سرداروں نے یہی فیصلہ کیا کہ موجودہ ابتری کی حالت میں افغانی تاج کا سزاوار صرف نادر خان کا سر ہوسکتا ہے۔ کیونکہ نادر خان ہی تھا کہ جس نے ۱۹۱۹ء میں ملک کو استقلال کی دولت سے مالامال کردیا تھا اور پھر اب مصیبت کے وقت ملک کو اسی نے نجات دلائی۔

اس لئے افغانی تاج نادر خان کے سامنے پیش کیا گیا۔ جسکو انھوں نے بڑے اصرار کے بعد زیب سر کیا۔ اس کے بعد سے اپنے وطن عزیز افغانستان کی ترقی اور بہبودی کے لئے برابر کوشاں ہیں۔ اور تدریجی طریقہ سے ملک کو اسی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں

جس کی طرف امان اللہ خان نہایت تیزی سے لیجانا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ امان اللہ خان اور نادر خان دو قابل فخر فرزند ہیں۔ دونوں کے دل افغان قوم کی ترقی کے لئے بے قرار ہیں۔ دونوں چاہتے ہیں کہ افغانستان تمام دنیا میں عزت و وقار حاصل کرے۔ اگر فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ امان اللہ خان بہت تیزی سے ملک کو تہذیب جدید سے آشنا کرنا چاہتے تھے اور نادر خان تدریجی طریقے پر ملک کو ترقی کی طرف لیجا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانوں جیسی قدامت پسند قوم کو یہ ہرگز گوارا نہ ہوگا کہ یک وقت تہذیب حاضرہ سے ہمکنار ہو جائیں۔ ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کو تدریجی طریقے سے ترقی کی طرف لیجایا جاوے۔

امیر عبدالرحمان خان افغانی زندگی کا سب سے بڑا نباض تھا؛ بالفاظ دیگر جس نے افغانی فطرت کا نہایت عمیق مطالعہ کیا تھا اسنے اپنے جانشینوں کو اپنی خود نوشتہ سوانح حیات میں چند نصیحتیں کی ہیں اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ کہ

"میرے جانشینوں کا یہ فرض ہے کہ جو اصلاحی تحریک ملک میں جاری کرنا چاہیں وہ سوچ سمجھ کر جاری کریں۔ ایسا نہ ہو کہ افغان قوم کے جذبات کو ٹھیس لگے مغربی تعلیم کے دار العلوم اور جمہوری طرز حکومت کے قوانین بتدریج جاری کریں"

ماہر فطرت افغانی، امیر عبدالرحمن خاں کی یہ نصیحت کس قدر تجربہ اور حقیقت پر مبنی ہے امان اللہ خان اس نصیحت کو ترک کرکے سرعت کے ساتھ اپنی قوم کو اصلاحات کی طرف لیجانا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اس لئے افغانستان کے ہر حکمران کے لئے ضروری ہے کہ وہ افغانستان کے سامنے اصلاحی پروگرام تدریجی طور پر پیش کرے۔

نادر خان نے اس قلیل عرصہ میں افغانستان کو جس طرح منظم کیا ہے۔ اس کی مثال۔ افغانی تاریخ میں مشکل سے ملیگی۔ اس وقت افغانستان خدا کے فضل سے تدریجی رفتار سے ترقی

کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آج افغانستان کی فوجیں منظم ہیں ملک کی سیاسی، تعلیمی، تجارتی، مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لئے موجودہ فرمانروا ہر طرح سے کوشاں ہے۔ مذہبی اصلاح کیلئے اس نے ایک جماعت جمعیۃ علمائے افغانستان کے نام تشکیل دی ہے۔ سیاسی ترقی کے لئے اسی سال افغانی پارلیمنٹ اور افغانی دارالامراء کا افتتاح ہو چکا ہے۔ ان اداروں کا افتتاح کرتے ہوئے نادر خان نے جو تقریریں کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فرمانروا کا دل اپنی قوم اور مذہب سے کس قدر معمور ہے اور وہ اسلامی اصولوں کے احترام و وقار کے لئے اپنی ہر چیز قربان کر دینے کے لئے آمادہ ہے

خاتمہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ افغان بجائے ...تا

ہے۔ لیکن اگر تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ...

افغانی جس طرح میدان جنگ میں سپاہیانہ جوہر دکھلا سکتا

پر انتظام مملکت بھی کر سکتا ہے۔

دولت غوریہ سے لے کر موجودہ زمانہ تک اگر افغانوں کی سیاسی تاریخ دیکھی جائے تو افغانوں میں سینکڑوں افراد ایسے ملیں گے جنھوں نے اس امر کا کافی ثبوت بہم پہونچایا ہے کہ افغان قوم اصول جہانبانی میں کسی قوم سے کم نہیں قدرت نے افغانوں کو جہاں سپاہیانہ جوہر مرحمت فرمایا ہے وہاں حکمرانی کا سلیقہ بھی عنایت کیا ہے۔ یہ سلیقہ حکمرانی افغانوں میں اگر کسی قوم سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ سکندر لودھی کا عدل و انصاف، شیر شاہ کا انتظام مملکت احمد شاہ ابدالی کی فوجی قابلیت۔ امیر عبدالرحمن خان کے سیاسی تجربات اور امان اللہ خان کی حب الوطنی اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ افغانوں کو قدرت نے جہاں سپاہیانہ مادہ عنایت کیا ہے وہاں ملک فرمانروائی میں بھی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ دونوں خاصیتیں کسی قوم میں بیک وقت کم پائی جاتی ہیں۔

افغانی حکمران خاندانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ افغانی حکومتیں رعایا پروری عدل و انصاف میں دوسرے حکمران خاندانوں سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں ہیں۔

رفاہ عام اور ملک کی اندرونی امن وامان ان کی حکومتوں کا مقصد اولین تھا۔ غوریوں کی حکومت میں تمام افغانستان میں امن وامان تھا۔ لودھیوں نے طوائف الملوکی کے زمانہ میں سلطنت ہندوستان کو جس طرح لامرکزیت سے نکال کر مرکزیت میں کر دیا۔ کیا یہ واقعہ ان کے ملک بنانی کے ثبوت کے لئے کافی نہیں؟ شیر شاہی عہد اپنی برکات کی وجہ سے تاریخ ہند میں ایک نمایاں امتیاز رکھتا ہے۔ ابدالی فتوحات افغانی تاریخ میں ایک زریں صفحہ ہے۔ بارک زئی خاندان کی شجاعت کے کارنامے ہر افغان بچے اور بوڑھے کی زبان پر جاری ہیں۔ اسی خاندان نے اپنی شجاعت اور تدبیر سے روس اور برطانیہ جیسی استعماریت پرست طاقتوں کو متعدد بار نیچا دیکھایا۔ دونوں طاقتوں کو معلوم ہوگیا کہ افغانی قوم کوئی تر لقمہ نہیں جس کو آسانی کے ساتھ ہضم کیا جاسکے۔ برطانوی مدبرین اپنی انتہائی سیاسی چالبازیوں اور فوجی طاقت کے مظاہروں کے باوجود افغانوں کو اپنے قبضہ میں نہ لاسکے۔ انگریزوں کو اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ افغانون جیسی حریت پسند قوم پر حکومت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مورخ افغانی اور برطانوی جنگوں پر تنقید کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے کہ "تیس کروڑ مصارف کثیرہ اور ہزار ہا جانیں ضائع ہونے کے باوجود ہم کو افغانوں کی عداوت کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا"

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ افغان قوم باوجود ان مندرجہ بالا خصائص کے ایک خرابی رکھتی ہے جو ان کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈالے ہوئے ہے اور وہ نفاق ہے۔ افغانی تاریخ بتاتی ہے کہ متعدد شخصیتوں نے افغانوں کو اتحاد کی تلقین کی۔ ان شخصیتوں میں نمایاں شخصیت شیر شاہ کی ہے۔ شیر شاہ نے افغانون کے اتحاد کے لئے بے انتہا کوشش کی۔ لیکن شیر شاہ کے مرنے کے بعد افغان سرداروں میں وہی نااتفاقی عود کر آئی جس نے شیر شاہ کی قائم کی ہوئی وسیع سلطنت کو تباہ وبرباد کر کے چھوڑا۔ شیر شاہ کے بعد دوسری شخصیت عبدالرحمان خان کی ہے جس نے افغان قوم کو متنبہ کیا کہ "تمہاری نااتفاقی تمہاری تباہی وبربادی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ افغانستان کی حکومت مضبوط ہو تو تمہارا

سب سے مقدم فرض ہے کہ قوم کے منتشر افراد کو رشتہ اخوت میں منسلک کرو۔
عبدالرحمان خان کے بعد اس کے پوتے امان اللہ خان نے بھی قوم کے سامنے اپنے دادا کے پیغام کو دہرایا اور کہا کہ "افغانوں کی ترقی کا راز اتحاد و در محض اتحاد میں مضمر ہے۔"
لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج تک افغان قوم نے اپنی جہالت کی وجہ سے اتحاد کی برکت کو نہیں سمجھا۔ مگر گردش زمانہ افغانوں کو ایک نہ ایک روز رشتۂ اتحاد میں منسلک کر کے چھوڑے گی۔ اس وقت یہ ملت آوارۂ کوہ و دمن میدان حاصل کرے گی۔

حوالے

اردو	(۱) نیرنگ افغانستان	از غلب حسن حسرت
	(۲) تاریخ فرشتہ	دارالترجمہ حیدر آباد
	(۳) تاریخ ہند	از ہاشمی
فارسی	(۱) تاریخ سراج الاخبار	
	(۲) تزک عبدالرحمانی	
	(۳) فارسی جرائد (افغانستان - اصلاح)	

(1) The History of Kabul vol: I by Elphinstone.

خطابت کی سحر کاریاں

شیکسپیر کا ایک مشہور ڈرامہ (جولیس قیصر) ہے یہ افسانہ عقول عوام کی ایک دردناک داستان اور خطباء کی ہوس رانیوں اور فریب کاریوں کی ایک مکمل تصویر ہے۔ تمہیں اس قصہ میں نظر آئیگا کہ جس طرح کھلاڑی فٹ بال کو اپنے حسب منشا اوپر پھینکتے نیچے گراتے اور ٹھوکریں دیتے ہیں ٹھیک اسی طرح عوام کے لیڈر، بڑے بڑے خطباء، اور اچھے سے اچھے مقررین انکے جذبات ان کے خیالات اور انکے احساسات سے کھیلتے ہیں۔ کبھی اپنے قطرہائے اشک کے سیلاب میں انہیں ڈبکیاں دیتے ہیں تو کبھی اپنے برق صفت تبسم سے انکے خرمن سکون وراحت کو جلاکر خاکستر کردیتے ہیں کبھی اپنی پرجوش تقریروں سے قلب کو گرما اور روح کو تڑپا دیتے ہیں۔ تو کبھی اپنی جادو بیانیوں سے ساری قوم کو اپنی ہواؤ ہوس اور ذاتی اغراض ومقاصد کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

بروٹس ایک ہمدرد قوم وملک اور شریف معزز رومی تھا اسنے شدت کیساتھ یہ محسوس کیا کہ جولیس قیصر نے پوری رومی قوم کو غلام بنا رکھا ہے۔ انکی شرافت نفس فنا کے گھاٹ اتر چکی ہے۔ ابدی ذلت نے انکے حواس وشعور پر پورا قابو پالیا ہے۔ انہیں اپنی زندگی کی تلخی کا احساس نہیں۔ چندے یہی لیل ونہار رہا تو بحیثیت ایک معزز وخوددار قوم کے انکا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ جائیگا۔ کافی غور وفکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس مہلک مرض کا واحد علاج قیصر کا قتل ہے۔

قیصر بروٹس کا نہایت ہی محبوب دوست تھا لیکن قوم وملک کی خاطر اسنے اپنی محبوب متاع کو اپنی ہی تلوار سے موت کے خوفناک گڑھے میں ڈھکیل دیا

رومی قوم قیصر کے قاتل سے انتقام لینے کیلئے بیتاب ہوگئی۔ لوگوں کا ایک سیلاب امنڈ آیا اور بروٹس کو گھیر لیا۔

بروٹس اس غضبناک مجمع کے سامنے تقریر کرنیکے لئے کھڑا ہوا۔ یہ نہایت ہی نازک موقع تھا

سرفرازی وسربلندی کا تاج یا ذلت ورسوائی کا قعر بے پناہ۔ بہادروں اور جان نثاروں کا درخشاں تمغہ یا خائن وغدار گروہ کا سا تاریک انجام۔ یہ ظاہر ہے کہ تقریر کی تاثیر وعدم تاثیر پر موقوف تھا۔ مجمع غصے میں بھرا ہوا تھا۔ کسی طرح تقریر سننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ زبان پر انتقام انتقام کی رٹ تھی۔ بالآخر بعض زعما کی کوششوں سے سکون کی فضا پیدا ہوئی اور بروٹس نے تقریر شروع کی۔

بروٹس کی تقریر

بزرگانِ قوم۔ کیا میں امید کروں کہ آپ حضرات میری بھلی یا بری کڑوی یا میٹھی بکواس تھوڑی دیر کیلئے عدل وانصاف کی خاطر صبر وسکون کے ساتھ سنیں گے۔

چاہتا اور نہ آپ کے جذبات واحساسات کی توہین کرنا اور آپ سے

ہوں بلکہ آپ لوگوں سے میری پرزور درخواست ہے کہ واقعہ

مطالعہ فرمائیے میں آپ لوگوں کو کامل صداقت وخلوص سے دعوت دیتا

متانت وسنجیدگی اور سکون قلب واطمینان خاطر کیساتھ عدل وانصاف کی روشنی میں کیجیے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میرا یہ اقدام مبنی برحق ہے، اسکے دامن پر کوئی ایسا داغ نہیں جسے میں آپ لوگوں کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کروں۔

برادرانِ وطن! اگر آپ میں کوئی قیصر کا دوست یہاں موجود ہو اور وہ اسکے قتل پر اپنے جگر کے ٹکڑے کر رہا ہو تو مجھے معاف کرے اگر میں اس سے یہ کہوں کہ اے میرے معزز دوست! قیصر کے قاتل بروٹس کو قیصر تم سے زیادہ محبوب تھا۔ قیصر کی وقعت تمہارے دل میں اتنی نہیں جتنی اسکے دل میں تھی۔

اکابرِ ملت! میں تمام دنیا کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہوں لیکن آپ لوگوں کے سامنے کوئی جھوٹا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے اپنے محبوب دوست قیصر کو کسی ذاتی بغض وعناد کسی شخصی عداوت ودشمنی کی بنا پر قتل نہیں کیا ہے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے قتل کیا ہے کہ روم مجھکو اس سے کہیں زیادہ محبوب تھا۔

قیصر ایک بڑی شخصیت کا مالک تھا اس لئے مجھے وہ محبوب تھا وہ شجاع اور بہادر تھا اسلئے بھی اُسکا احترام کرتا تھا لیکن وہ طماع وحریص تھا اس لئے مینے اُسکا کام تمام کر دیا۔ بس ایک ہی وقت میں میں نے اسپر آنسو بھی بہائے اور خنجر بھی چلایا۔

مجھے یقین نہین کہ آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جسے قیصر کی موت پر حقیقی اور واقعی رنج وغم اور افسوس وحسرت ہو آپ رومی ہین اور رومی کبھی ذلت کیساتھ زندہ رہنا پسند نہیں کرتا۔

آپ لوگوں میں وہ کون ایسا شخص ہے جو رومی کہلایا جانا پسند نہیں کرتا۔ وہ کون ہے جو آزاد رہنا عیب سمجھتا ہے۔ وہ کون ہے جو اپنے نفس وضمیر کی توہین گوارا کرتا ہے۔ وہ کون ہے جو اپنے وطن عزیز کی ذلت وحقارت کی اپنے اندر تاب رکھتا ہے۔ اگر آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہو تو جواب دے وہی اس بات کا حقدار ہے کہ مجھ سے قیصر کے خون کا مطالبہ کرے کیونکہ میں نے اس شخص کے علاوہ کسی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہونچایا ہے۔

مجمع۔ نہیں ہم میں کوئی ایسا نہین۔

بروٹس۔ تو پھر میں نے کسی کو اذیت نہیں دی۔

بروٹس نے مشکل ہی سے یہ جملہ ختم کیا تھا کہ قیصر کا دوست اور طالبان انتقام کا سرگروہ انٹونیو مع اپنے رفقا کے قیصر کی لاش لئے ہوئے مجمع میں نوحہ ومرثیہ خوانی کے لئے پہونچا۔ بروٹس نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے یہ قیصر کی لاش ہے اور یہ انٹونیو قیصر کا دوست ہے۔ یہاں پر یہ قیصر کے فضائل ومحاسن بیان کرنے آیا ہے۔ آپ لوگ غور سے سنئے مگر اس فرق کو ذہن میں محفوظ رکھئے کہ گنہگار قیصر اور ہے اور نیک وپرہیزگار قیصر اور ہے۔ گنہگار قیصر کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اسے تو آپ سُن چکے اب پرہیزگار قیصر کے متعلق جو کچھ کہا جائے اسے سنئے۔ آخر مین میں ایک جملہ پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

عظمائے روم! جس تلوار سے مین نے روم کے لئے قیصر کو قتل کیا ہے وہ تلوار قیصر کی

[illegible] کے سلسلے بھی جب کبھی بھی روم بپا ہے ہمیشہ معمور رہے گی۔

تقریر کا اثر

مجمع۔ زندہ باد بروٹس

ایک۔ اس جاں نثار ملک و فداکار قوم کا ایک مجسمہ نصب کرنا چاہیے۔

دوسرا۔ اس لائق فرزند وطن کو قیصر کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا جائے۔

تیسرا۔ قیصر فضل و کمال اور شرافت نفس میں اس کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔

چوتھا۔ قیصر ظالم و جفا کار تھا۔

پانچواں۔ ابھی وہ سراپا جور و ستم اور ظلم و جفا تھا

چھٹا۔ اب روم کو اس ظالم و سفاک سے نجات

ساتواں۔ کیا ہمیں انٹونیو کے ساتھ قیصر کے مرثیے

آٹھواں۔ ہاں ضرور کیونکہ بروٹس نے ہم کو حکم دیا ہے۔

بروٹس اسٹیج سے اب اتر پڑا اور مجمع پروانہ وار اس پر ٹوٹ پڑا۔ لوگوں کے دل اس کے قدموں پر لوٹ رہے تھے اور آنکھیں اس کے لئے بچھی جاتی تھیں۔ انٹونیو اسی عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ غضبناک اور خشم آلود آنکھوں نے اس کو گھورا۔ اگر بروٹس نہ روکتا تو مجمع اسے چشم زدن میں فرش زمین پر ڈھیر کر دیتا۔ انٹونیو نے اس غبار آلود فضا میں حسب ذیل معرکۃ الآرا تقریر شروع کی۔

انٹونیو کی تقریر

انٹونیو۔ اے رومیو!

ایک۔ خاموش، سنو، انٹونیو کیا کہتا ہے

دوسرا۔ نہیں، ہم نہیں سنیں گے۔ ہم اس کی بات نہیں سنیں گے۔

انٹونیو۔ پیارے بھائیو! سنو بروٹس کے حکم کی عزت کرو۔ بروٹس کی خاطر میری سنو۔

گروہ ایک۔ دیکھو سنو تو سہی کہ بروٹس کے متعلق یہ شخص کیا کہتا ہے۔
دوسرا۔ اماں، کچھ نہیں، ہم اس کی بکواس نہیں سنیں گے۔
تیسرا۔ نہیں، ہم لوگوں کو سننا چاہئے، دیکھیں کہتا کیا ہے۔
انٹونیو۔ دوستو! میں قیصر کا مرثیہ پڑھنے نہیں بلکہ اس کی نعش کو دفن کرنے اور اس کے مردہ جسم کو سپرد خاک کرنے کے لئے آیا ہوں۔

ہر شخص اپنی زندگی میں اچھے اور برے کردار کا مالک ہوتا ہے، اس کے اعمال حسنہ تو اس کی موت کے ساتھ مٹ جاتے ہیں لیکن اس کے اعمال سیئہ قیامت تک باقی رہتے ہیں قیصر بھی انسان تھا اس کے بھی حسنات وسئیات کا یہی حشر ہونا تھا اور ہوا۔

برادران قوم! اگر بروٹس مجھے اسٹیج پر آنے اور کچھ عرض کرنے کا حکم نہ دیتا تو اس وقت میں ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہ نکالتا، اس نے مجھکو حکم دیا، میں نے اس کی اطاعت کی اور اس کے فرمان والاشان کے سامنے سر تسلیم وانقیاد خم کر دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایک شریف ولائق عزت شخص ہے۔

برادران! معزز دوست بروٹس نے کہا کہ قیصر ایک طامع و حریص شخص تھا، میں اس کی مخالفت کی جرأت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ وہ ایک سچا آدمی ہے، جھوٹ نہیں بولتا۔

میں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ قیصر قناعت پسند اور بے طمع آدمی تھا کیونکہ محترم بروٹس نے اس کے خلاف اعلان کیا ہے۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ یہی وہ لالچی قیصر تھا جس نے قیدی دشمنوں سے اتنا کثیر زر فدیہ وصول کیا کہ روم کا خزانہ گہر وجواہر سے لبریز ہوگیا اور ملک دولت وثروت کی اس بارش سے سرسبز وشاداب ہوگیا۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میری ان آنکھوں نے قیصر کو غربا کے فقر وفاقے پر اکثر آنسو بہاتے، گریہ و بکا کرتے، آہیں بھرتے اور نالہ وفغاں کرتے دیکھا ہے، کتنی ہی ایسی راتیں ہیں جنھیں قیصر نے تنگدستوں کی اصلاح حال اور فراہمی معاش کی فکر میں آنکھوں میں کاٹ ڈالا ہے۔

میں نے خود کئی دفعہ "لوپرکال" میں تاج وتخت قیصر کی خدمت میں پیش کیا ہے لیکن اس نے
ہمیشہ اس سے اعراض وانکار کیا، اس کو تاج کا شوق نہیں تھا وہ تو خدمت وطن کا بھوکا تھا، اسے
کو عیش وآرام سے الفت نہیں تھی، اس کو تو قوم کی خوشحالی کی خاطر آلام ومصائب کے برداشت
کرنے میں لطف آتا تھا۔

بروٹس ایک نہایت ہی معزز شخص ہے میں کسی حال میں بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتا
ورنہ میں تم سے دریافت کرتا کہ کیا حرص وآز کا مسکن ایسا ہی قلب ہو سکتا ہے۔ کیا ایسے اکثر
دل میں، کیا ایسے خدا ترس قلب میں طمع اور لالچ کے

رومیو! آج سے پہلے قیصر تمہیں دنیا و مافیہا۔
اس کی خاطر اپنا خون بہانے کے لئے تیار رہتے تھے
قطرہ بھی تمہاری آنکھوں سے نہیں گرتا۔

اگر تم اس عمدہ صفات، بہتر خصائل اور لائق تعریف شمائل پر نہیں روتے تو نہ روؤ لیکن
کم از کم اس کے لئے تو روؤ کہ وہ تم کو محبوب تھا، تم کو پیارا تھا۔ دنیا جہان میں سب سے زیادہ تمہارا
چہیتا تھا۔ تم اس لئے روؤ کہ کل یہی وہ شخص تھا جس کی ایک جنبش لب پر بڑے بڑے بہادروں
اور سورماؤں کے دل دہل جاتے تھے جس طرح بجلی کی ایک کڑک سے اس سرے سے لے کر
اس سرے تک زمین وآسمان کی ساری فضا لرز جاتی ہے۔ لیکن آج وہی شخص ہے جو ایک
دیوار کے کنارے ذلیل وخوار بے یار و مددگار پڑا ہوا ہے۔ نہ اس کا کوئی نوحہ خواں ہے
نہ غمخوار۔ آہ آج اس پر کوئی رونے والا نہیں۔

اے عقل انسانی! آج یہ تجھ کو کیا ہو گیا ہے؟ تو کیوں انسانوں کے دلوں سے نکل کر وحشی حیوانات
کے سینوں میں سما گئی ہے؟ تو نے اپنا رستہ کیوں کھو دیا؟ تو کیوں گم کردہ راہ ہو گئی؟ تو مبہوت
ہو کر رہ گئی ہے۔ تو نے خیر کو شر اور شر کو خیر قرار دے لیا ہے۔ کیا تجھ سے قوت ممیزہ چھین لی
گئی؟ کیا تجھے اب صواب وخطا کھوٹے کھرے میں تمیز نہیں رہی؟ کیا جرائم ومحاسن کی پہچان

[illegible] ہو گئی!

دوست! میری ژولیدہ بیانی و پریشان گوئی سے اگر تم کو تکلیف ہوتی ہو تو معاف کرنا کہ اس ناگہانی و حادثۂ کبریٰ نے میرے دماغ کو منتشر اور قلب کو پراگندہ کر دیا ہے۔

دوستو! میرے پہلو میں ایک ایسا دل ہے جو تمہاری محبت و الفت میں سرشار، تمہاری خیر اندیشی و نکو کوشی میں غرق، تمہاری فلاح و بہبود کے لئے بے چین اور تمہاری آرام و آسایش کے لئے بیتاب ہے۔ اگر مجھے ڈر نہ ہوتا کہ تمہارے سینے شدت رنج و محن و کثرت و حزن و الم سے پھٹ جائیں گے تو میں کہتا قیصر مظلوم ہے وہ بلا قصور قتل کر دیا گیا۔

بروٹس اور اس کے رفقا رکار فخر قوم اور ملک کے سر نیاز فرزند ہیں۔ ان کو مجرم و خطاکار کہنے سے پہلے میرے ضمیر کو، روم کو، اور خود قیصر کی پاک روح کو بڑا دکھ ہو رہا ہے۔

اتنا کہہ کر انٹونیو خاموش ہو گیا اور اس کی چشمہائے پرنم سے آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑا۔

انقلاب

ایک۔ (اپنے ہم نشیں کی طرف مخاطب ہو کر) مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ شخص نہایت ہی معقول بات کہہ رہا ہے۔

دوسرا۔ یقیناً۔ اگر تم ذرا غور کرو تو تم پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ قیصر کا قتل سفاکی و بے رحمی کا بدترین نمونہ اور انتہائی بزدلانہ جرم ہے۔

تیسرا۔ قیصر کے تاج و تخت سے استغنا نے تو میرے دل کو اپنا لیا۔ اس کا یہ فعل کتنا مستحسن اور کس قدر مبارک ہے

چوتھا۔ وہ کیسا نرم دل، رقیق القلب اور رحم صفت تھا کہ مصیبت زدوں اور فاقہ کشوں کی حالت زار پر رنج و غم کے آنسو بہاتا اور جگر کے ٹکڑے کرتا تھا۔

پانچواں۔ فقیروں اور آفت رسیدوں کا ایسا مونس و غمخوار ایسا ہمدرد و غمگسار ظالم نہیں ہو سکتا۔

چھٹا۔ اب تو جناب! قیصر کی خونریزی نے بڑی اہم نازک صورت حال اختیار کر لی۔

ساتواں۔ قاتل سے ضرور انتقام لینا چاہئے۔
آٹھواں۔ اپنے ہم جلیس کی طرف مخاطب ہو کر۔ دیکھو انٹونیو کس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو تا اور نوحہ کرتا ہے۔
نواں۔ روم میں انٹونیو سے بڑھ کر ملک کا کوئی سچا بہی خواہ نہیں۔
انٹونیو۔ کیا آپ لوگ مجھے اس بات کی اجازت دیں گے کہ تھوڑی دیر کے لئے میں یہاں سے ہٹ جاؤں اور اس بیکس و مظلوم میت پر نذر عقیدت کے چند پھول چڑھا آؤں۔
مجمع۔ ضرور۔ ضرور۔
انٹونیو اسٹیج سے اتر آیا اور آہستہ آہستہ قیصر کی لاش
میں لپٹی پڑی ہوئی تھی جس میں کہ وہ قتل کی گئی تھی اور خنجر
تھے۔ انٹونیو نے مجمع کو پکار کر کہا۔
انٹونیو۔ لوگو! یہی وہ قیصر ہے جس کے ابر کرم کی بارش سے تم [illegible] سیراب ہو چکے ہو۔ اس کی لاش زخم و خون میں شرابور ہے۔ آؤ اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے اس کو غسل دو۔ قیصر کی لاش کا رواں رواں نہایت بے کسی و عاجزی کے ساتھ تم سے اس کا مطالبہ کر رہا ہے۔
تم سب لوگ اس لباس کو دیکھتے ہو مگر شاید اس کی تاریخ و اہمیت سے واقف نہیں ہو۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ یہ خون میں لتھڑا ہوا لباس قیصر نے اس شام کو زیب تن کیا تھا جس شام کو قیصر نے وہ شاندار فتحیابی حاصل کی تھی جس پر روم قیامت تک فخر کرے گا۔
(اس موقع پر انٹونیو نے قیصر کی عبا کے ایک شگاف کو نمایاں کیا اور کہا۔)
اسی بڑے سوراخ سے اس فاتح اعظم کے جسم کو چھلنی کیا گیا۔ اسی سوراخ سے ہو کر بروٹس کا خنجر قیصر کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اسی سوراخ سے قیصر کا بے گناہ خون بہایا گیا۔
زخموں نے خنجر کے اس بنائے ہوئے جھروکے سے اپنے قاتل کی خوفناک صورت کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھا بلکہ میرا تو خیال ہے کہ قیصر نے بروٹس سے طلب رحم کرنے سے پہلے روم کے ہر ہر فرد کو دادرسی کے لئے آواز دی مگر افسوس صد افسوس کہ کسی نے بھی اس کی دادرسی نہیں کی

... سے قتل کر دیا گیا۔

قیصر نے پہچان لیا کہ میرا قاتل میرا دوست ہے۔ وہ شخص ہے جس کی گردن اس وقت بھی میری عنایتوں اور نوازشوں، میری کرم فرمائیوں اور مہربانیوں کے بار گراں سے جھکی ہوئی ہے۔

اس خلاف توقع کمینگی و غداری سے اس کی ہمت ٹوٹ گئی، مقابلے کی جرات نہ رہی، اس ہولناک واقعے نے نفسیاتی اثر اس کے دل پر کیا وہ کسی حیثیت سے اس زخم سے جس نے اس کے لاشے کو ماہی بے آب بنا رہا تھا کم نہ تھا۔ تیغ و خنجر تیر و سناں کا خوفناک منظر اس کے لئے اتنا بھیانک اور ڈراؤنا نہ تھا جتنی کہ خیانت غداری اور بیوفائی کی مکروہ اور نفرت انگیز صورت اسی سے قیصر کے لبوں پر مہر لگ گئی اور وہ صرف اتنا آخری اور الوداعی مختصر جملہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا کہ

اور تو بھی اے بروٹس؟

قیصر مجسمہ "پامپی" کے نیچے مقتول پایا گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے چہرہ کو اپنی عبا کی آستین سے چھپا لیا تھا تاکہ اس کی روح ناشکر گزاری، احسان فراموشی اور کفران نعمت کے کریہہ و بدمنظر مجسمے دیکھنے سے دوبارہ منغص، رنجیدہ و غمگین نہ ہو۔

قیصر کی موت کے غم میں زمین و آسمان تاریک ہو گئے ہیں، شجر، حجر، بشر سبھی اپنے لخت ہائے جگر اپنی آنکھوں کی راہ سے بہا رہے ہیں مگر مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہو رہی ہے کہ تمہارے دل نہایت ہی غمگین ہیں اور تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی ہے۔ میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ تم اپنے سیلاب اشک سے سفاکانہ خونریزی و بے رحمانہ قتل و غارت کی وہ خونی علامت و نشانی مٹا رہے ہو جس سے کہ ظالموں کے ہاتھ نے اس زمین کو ملوث کر دیا تھا۔ تم قیصر کی دریدہ عبا دیکھ کر زار و قطار رو رہے ہو، اگر تم اس کی نعش کے ٹکڑے اور جسم کے شگاف دیکھو تو تمہارا کیا حال ہو۔

(انٹونیو لاش کے قریب آیا اور اس پر سے چادر ہٹا کر مجمع سے یوں مخاطب ہوا)

یہ ہیں وہ زخم اپنی زبان حال سے تم سے دادرسی و انصاف کا طالب ہے، غور سے سنو کہ مرثیہ

میں اس سے زیادہ گویائی کی قوت نہیں۔ مرثیے سے جگر پاش و دلگداز واقعہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سننے میں نہیں آسکتا۔

ایک شخص۔ کیا ہی قیامت آفریں منظر ہے۔

دوسرا۔ اے لوگو! قیصر پر رحم اور اس کے ساتھ انصاف کرو۔

تیسرا۔ قیصر کا یوم قتل نہایت ہی شر انگیز دن تھا [illegible] روایتوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

چوتھا۔ یہ دنارت اور سفلہ پن روم کے

پانچواں۔ اس خیانت اور غداری نے

چھٹا۔ انتقام، انتقام۔

مجمع۔ (سخت اشتعال میں) قاتلوں کو جلا ڈالو، ان کے جسم کے ٹکڑے فضائے آسمانی میں بکھیر دو، کسی ایک پر بھی ترس نہ کھاؤ۔ یہ رحم کے قابل نہیں۔

انٹونیو۔ ٹھہرو، ٹھہرو۔ میں تمھارے اشتعال سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ملک میں فتنہ و فساد برپا کرنا نہیں چاہتا کہ قاتلوں سے خون کا مطالبہ کرکے وطن کی فضا کو تیرہ و تاریک بنا دوں میں ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ یہ قوم کے بہی خواہ، ملک کے ہمدرد اور ملک کے معزز افراد ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ قیصر کے قتل کے ان کے نزدیک وہ معقول وجوہ موجود ہوں جن کو ہم نہ جانتے ہوں۔ میرا مطلب تو اس وقت صرف یہ ہے کہ قیصر تم کو دل و جان سے پیار کرتا تھا، اس لئے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ تم اس کا مرثیہ بیان کرو۔ مجلس عزا جماؤ اور اس پر نوحہ کرو۔ اگر مجھکو تمھارے ہاتھ سے عنان صبر کے چھوٹ جانے، تمھارے بے قابو ہو جانے کا خوف نہ ہوتا اور اگر مجھکو ڈر نہ ہوتا کہ تمھارے قلوب غم و الم میں اور رنج و محن میں ڈوب جائیں گے تو میں تمھیں اس فقید العصر کی وصیت سناتا پھر تمھیں معلوم ہو جاتا کہ قیصر کو تم کتنے زیادہ محبوب تھے، وہ تمھارا کتنا جاں نثار و فدا کار سردار تھا اور وہ ہرگز اس لائق نہ تھا کہ وہ تمھارے سامنے اس بیدردی سے قتل کر دیا جائے۔ درانحالیکہ تمھاری

[illegible] بھی ہیں اور تمھاری رگوں میں خون کی گردش ووداروش ہو۔

مجمع۔ وصیت ضرور سنائیے۔

انٹونیو۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمھارے سینے اس شہید اعظم کے قتل پر شدت حزن والم سے شق نہ ہو جائیں۔

مجمع۔ نہیں ہم وصیت ضرور سنیں گے۔

انٹونیو۔ قیصر نے وصیت کی ہو کہ رومی قوم کے ہر ہر فرد کو میرے خزانۂ خاص سے ۵، ڈنک دیئے جائیں اور تمام رومی قوم کے لئے میرے تمام باغات اور تفریح گاہیں وقف ہیں۔

ایک شخص۔ قیصر کیا ہی فیاض طبع وغریب پرور آدمی تھا۔

دوسرا۔ کیا ہی شریف وکریم تھا۔

تیسرا۔ قاتل تباہ وبرباد ہیں۔

چوتھا۔ انتقام! انتقام!!

پانچواں۔ ہم بروٹس کا گھر جلا کر رہیں گے۔

اس کے بعد طوفانی مجمع سڑکوں پر لہریں مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ ٹھیک اس طرح جس طرح ذخار سمندر میں موجیں بل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

انٹونیو تنہا اپنی جگہ پر) اے تاریک شر! اے بھیانک فتنہ! میں نے ہی تجھکو تیری خوابگاہ سے اٹھایا ہے۔ بس تو جا اور اپنا کام کر۔ تو مشتعل ہو جا اور سقف آسمان اور فرش زمین کو جلاکر خاک سیاہ کردے۔

دیکھو یہ کس قدر عبرتناک منظر ہے کہ رومی قوم نے ابھی قیصر کی غلامی سے پورے طور پر نجات بھی نہیں پائی تھی کہ انٹونیو نے اپنے دام عبودیت میں ان کو جکڑ دیا۔ جاہل وغلام ملک کی یہی حالت ہوتی ہے یا تو وہ صاحب تاج وتخت کے زیر نگیں رہتا ہے یا کسی جادو بیاں خطیب کے دام سحر کا شکار۔ (ترجمہ)

بوڑھا سیمون عرف لال بھکڑ اور ایک نوجوان تاتاری جس کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا۔ دریا کے کنارے الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ باقی تین ملاح جھونپڑی کے اندر تھے۔ سیمون کوئی ساٹھ سال کا دبلا پتلا دبو پلا آدمی تھا۔ اُس کے شانے چوڑے پھیلے تھے۔ اور چہرے سے ابھی صحت کے آثار ٹپکتے تھے۔ اس وقت وہ نشے کی ترنگ میں تھا۔ اُس کی جیب میں شراب کی بوتل تھی۔ اور ۔۔۔ میں یہ
سے جتنہ نہ مانگ بیٹھیں۔ یہ نہ ہوتا تو وہ کبھی کا سو جاتا۔ تاتار ۔۔۔
سے پہلے، صوبہ سمبرسک کی مزے دار زندگی اور اپنی بیوی ۔۔۔
کر رہا تھا۔ اس کی زیادہ سے زیادہ عمر پچیس ۲۵ سال ہوگی۔ مگر الاؤ کی روشنی میں اس کے زرد بیمار اور مغموم چہرے کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا۔ کہ ابھی لڑکا سا ہے۔

لال بھکڑ بولا "بھئی یہ جگہ کچھ جنت تو ہے نہیں۔ تم خود ہی دیکھتے ہو۔ کہ سوائے پانی اور دریا کے ننگے کناروں، اور لیسدار مٹی کے کچھ بھی نہیں۔ جاڑا ہو چکنے کو آیا۔ دریا میں برف بہ کر آ رہی ہے۔ آج سویرے بھی تھی "

تاتاری نے کہا، مصیبت ہے مصیبت! اور گھبرا کر چاروں طرف نظر ڈالی۔

دس قدم کے فاصلے پر ٹھنڈا برف کا سیاہ دریا بہ رہا تھا جھلاتا تھا، کھوکھلے رتیلے ساحل سے ٹکراتا تھا اور کہیں دور سمندر کی طرف تیزی سے بہتا چلا جا رہا تھا، کنارے سے ملی ہوئی ایک بڑی ناؤ کی سیاہ پرچھائیں نظر آتی تھی۔ بہت دور دریا کے اُس پار، روشنیاں کبھی دھندلی ہو جاتی تھیں۔ کبھی جھلملانے لگتی تھیں۔ اور چھوٹے چھوٹے سانپوں کی طرح بل کھاتی تھیں، یہ پچھلے سال کی گھاس تھی جو جلائی جا رہی تھی ان سنپولیوں کے پیچھے پھر اندھیرا تھا۔ ہوا مرطوب اور سرد تھی۔

تاتاری نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ اُس کے وطن میں بھی اتنے ہی تارے تھے، چاروں

قدر اندھیرا تھا۔ لیکن یہاں کسی بات کی کمی محسوس ہوتی تھی، صوبہ سمبرسک میں تارے یہاں سے بالکل مختلف تھے۔ اور آسمان بھی دوسرا تھا۔

تاتاری نے پھر کہا۔ "مصیبت ہے مصیبت"

سیموں ہنسا، رفتہ رفتہ طبیعت مانوس ہو جائیگی، ابھی پکتے ہو..... منہ سے ابھی دودھ بو آتی ہے۔ اپنی نادانی سے سمجھتے ہو کہ مجھ سے زیادہ برا حال کسی کا نہیں۔ کوئی دن جاتا ہے۔ اپنے دل میں کہو گے، خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے! مجھے دیکھو۔ ہفتہ بھر میں پانی اتر جائیگا۔ ڈونگے چلنے لگیں گے۔ تم سب سائبیریا کا راستہ لوگے، میں یہاں پڑا اس کنارے سے اس کنارے، اس کنارے سے اس کنارے کشتی کھیتا رہ جاؤں گا۔ بائیس سال سے میرا دن رات یہی کام ہے۔ پانی کے تلے مچھلیاں، پانی کے اوپر میں، پھر بھی شکر ہے کہ مجھے کسی بات کی شکایت نہیں۔ خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!

تاتاری نے آگ میں کچھ خشک ٹہنیاں جھونکیں اور شعلوں کے قریب سکڑ کر بیٹھ گیا اور بولا میرے والد ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ میری ماں اور بیوی وعدہ کر چکی ہیں، کہ ان کے مرنے کے بعد یہاں آجائیں گی۔

لال بھجکڑ نے پوچھا ماں اور بیوی کو لے کر کیا کروگے؟ ارے میاں اس حماقت میں نہ پڑو۔ شیطان ملعون تم کو بہکا رہا ہے۔ اس مردود کی ایک نہ سنو! اس کے دم میں ہرگز نہ آؤ۔ اگر وہ عورتوں کا ذکر چھیڑ کے ورغلائے۔ تو اسے جلانے کے لئے کہ دو، مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ آزادی کے بہانے اکسائے تو اس کا مردوں کی طرح مقابلہ کرو۔ اور کہ دو مجھے نہیں چاہئے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بیوی، نہ آزادی، نہ ڈاک، نہ کھیت کھلیان، خدا ان سب کا ستیاناس کرے مجھے ان میں سے کچھ نہیں چاہئے۔

لال بھجکڑ نے اپنی بوتل میں سے ایک گھونٹ لیا۔ اور پھر بولنا شروع کیا "میں معمولی کسان یا مزدوری پیشہ لوگوں میں سے نہیں۔ ایک پادری کا لڑکا ہوں، جب آزاد تھا۔ تو

گزشت میں رہتا تھا۔ ایک زمانے میں میں بھی فراک کوٹ ڈانٹا کرتا تھا۔ مگر میں نے اپنا یہ حال بنالیا ہے
کہ زمین پر ننگا سو سکتا ہوں۔ اور ضرورت پڑے تو جڑی بوٹی پر گذارہ کرنے کو تیار رہوں۔ خدا سب
کو ایسی زندگی نصیب کرے! نہ منہ سے کچھ مانگتا ہوں۔ نہ دل میں کسی سے دبتا ہوں۔ اپنے سے زیادہ
شاد اور آزاد کسی کو نہیں سمجھتا جس دن سے روس سے یہاں بھیجا گیا، میں نے دل کڑا کرکے ٹھان لی مجھے
کچھ نہیں چاہئے۔ شیطان نے مجھے بھی، بیوی، گھر، آزادی کا دم دے دے کر پھسلانا چاہا۔ میں نے اُس
سے صاف کہدیا، مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ اور اپنے خیال پر جما رہا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کتنے مزے
میں ہوں۔ کسی بات کی مطلق شکایت نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ جو [illegible]
فیصلہ ہوا۔ پھر بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ چند یا تک دل:
تم دہقان لوگ ہی شیطان کی چالوں میں نہیں
ہیں۔ کوئی پندرہ سال کا ذکر ہے کہ ایک شخص روس سے جلا د [illegible]
جائیداد کی تقسیم اور جعلی وصیت کا کچھ جھگڑا تھا، لوگ سمجھے کہ ہو نہ ہو یہ ضرور کوئی شہزادہ یا جاگیردار ہے،
یہ بھی ممکن ہے۔ صرف معمولی سرکاری ملازم ہو۔ کسی کو کیا معلوم؟ خیر، تو وہ صاحب یہاں تشریف لائے
اور آتے کے ساتھ ہی انہوں نے ایک مکان اور کچھ زمین خرید لی۔ فرمانے لگے' میں خود روزی کما
کر کھاؤنگا۔ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی پر گذارا کروں گا۔ میں اب رئیس نہیں رہا۔ معمولی جلاوطن
ہوں'، میں نے سنکر کہا ارادہ تو بہت نیک ہے!

وہ اس وقت نوجوان تھا۔ مزاج میں دوڑ دھوپ کے ساتھ احتیاط کا مادہ بھی تھا۔ خود گھاس
کاٹتا اور مچھلیاں پکڑتا، گھوڑے پر ساٹھ میل کی سواری اس کے لئے معمولی بات تھی، مگر آگے چل کر یہ
نقشہ بدل گیا۔ پہلے ہی سال گھوڑے پر چڑھ کر ڈاک لینے کائی رینو آنے جانے لگا۔ میری کشتی میں کھڑا
ہو جاتا۔ ادھر ٹھنڈا سانس کھینچ کر کہتا۔ کیوں، شیموں گھر والوں نے کتنے عرصہ سے خرچ نہیں بھیجا! میں،
کہتا، وسیلائی سرگے یوچ، روپے کی تمہیں ضرورت نہیں، روپیہ لے کر کیا کروگے؟ اگلے زمانہ
کو بھلا دو۔ جیسے کبھی تھا ہی نہیں، یا اگر تھا بھی، تو محض ایک خواب تھا، نئے سرے سے زندگی شروع

کہ شیطان کی گھاتوں میں نہ آؤ! اس کا انجام بُرا ہوگا۔ اُس کے جال میں پھنس جاؤ گے۔ ابھی کچھ روپیہ چاہتے ہو، تھوڑے دنوں میں کچھ اور چاہو گے۔ پھر کچھ اور، پھر کچھ اور...... خوش رہنے کی ترکیب یہ ہے۔ کہ کسی چیز کی خواہش نہ کرو... اگر تقدیر نے ہم پر تم پر زیادتی کی، تو اُس کے آگے ہاتھ پھیلانے اور سر جھکانے سے فائدہ؟ چاہیئے یہ کہ اُسے ٹھکراؤ، اس کا مذاق اُڑاؤ؛ نہیں تو وہ تمہارا مذاق اُڑائے گا، میں اسے یہ مشورہ دیتا رہا.......

اس کے دو سال بعد مجھے اُسے دریا کے اُس پار اُتارنے کا اتفاق ہوا۔ خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا تھا۔ کہنے لگا، اپنی بیوی کو لینے گائی رنیو جا رہا ہوں، آخر اُس کا دل پسیج گیا۔ اور وہ یہاں آنے پر رضامند ہو گئی۔ کتنی نیک اور مہربان ہے! اُس کی باچھیں کھلی جاتی تھیں، دوسرے دن وہ بیوی سمیت واپس ہوا۔ وہ سر پر ٹوپی لگائے ایک نوجوان بانکی عورت تھی، گود میں ایک دودھ پیتی بچی تھی، اور منوں نے مختلف قسم کا مال اسباب، سرگے یوچ صاحب اُس کا طواف کر رہے تھے۔ کیا مجال ہے جو آنکھیں دم بھر کو بیوی کے چہرے سے اُٹھ جائیں، اُس کی تعریف میں اُن کا منہ سوکھتا تھا۔ مجھ سے فرمانے لگے، ہاں بھائی سیموں، لوگ سائے بیریا میں بھی لطف سے زندگی بسر کر سکتے ہیں! میں نے دل میں کہا، یہ چند دن کی بہار ہے، رت بدلتے دیر نہیں لگتی، اُس دن سے ہر ہفتہ اس کا معمول بندھ گیا، کہ ڈاک خانہ جا کر پوچھے کہ گھر سے روپیہ تو نہیں آیا۔

ایک دن مجھ سے کہا، میری خاطر وہ اپنا حُسن، اپنی جوانی سائے بیریا میں گنوا رہی ہے اور میرے ساتھ کڑیاں جھیل رہی ہے، لہٰذا مجھ پر واجب ہے، کہ اُس کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھوں، بیگم صاحبہ کا جی بہلانے کے لئے اُس نے مقامی افسروں اور ایرا غیرا سب سے راہ و رسم پیدا کی، پھر لازم ہوا اس لشکر کی خاطر و تواضع کا بندوبست ہو، ضروری سمجھا گیا کہ ایک پیانو خریدا جائے۔ اور صوفا پر ایک بالوں والا گدہ کا کتا ہو۔ غارت ہو کم بخت! الغرض، ہر طرح کے ٹھاٹ، بلکہ عیاشی ہونے لگی، اس پر بھی وہ نک چڑھی بیگم زیادہ عرصہ تک اُس کے پاس نہ ٹکیں۔ اور ٹکتیں بھی کیوں! کیچڑ اور پانی، کڑاکے کی سردی، نہ پھل نہ پھلواری، لوگوں کو دیکھو

لوہڑی مشرقی، جنہیں نہ اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ، نہ بات کرنے کا ڈھنگ۔ اور وہ نیئرہیں ماشاءاللہ پیٹربرگ یا ماسکو کی مزاج دار خاتون ... یہاں اُن کے لئے مکھیاں مارنے کے علاوہ کیا دھرا تھا، اس پر طرہ یہ کہ خاوند کی حیثیت بھی پہلے سے گرگئی تھی، ایک بیچارے جلاوطن کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔

اس کے تین سال بعد کا ذکر ہے، مجھے خوب یاد ہے۔ کہ لیلۃ القدر کی شام کو پرلے کنارے سے کسی نے زور سے پکارا، میں ناؤ اُدھر لے کر پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں ... اور محو لپیٹے کھڑی ہیں، اور پہلو میں ایک نوجوان ...

میں نے انہیں پار اتار دیا، وہ گاڑی میں بیٹھ کر یہ جا ...
گھوڑا اڑاتے وسیلائی سرگے یوچ صاحب گھاٹ پر ...
بیوی تو کسی عینک والے آدمی کے ساتھ پار نہیں گئی؟ میں نے جواب دیا، جی ہاں، اب میدانوں میں جاکر ہوا پر ٹپکل مارینے! اس نے ان کے پیچھے سرپٹ گھوڑا ڈال دیا، دن رات پانچ روز تک اُن کا تعاقب جاری رکھا۔ واپسی پر جب میں اسے پار اتار رہا تھا۔ تو وہ بے دم ہوکر میری کشتی میں ڈھیر ہوگیا۔ اور اپنا سر تختوں پر پٹختا اور چیخیں مار مار کے روتا رہا۔ میں نے کہا تو یہ معاملہ ہے ہنس کر اسے یاد دلایا کہ، لوگ سائبیریا میں بھی لطف سے زندگی بسر کر سکتے ہیں!' وہ اپنا سر اور زور سے پیٹنے لگا۔

اس کے بعد آزادی کی ہوس اُس کے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اُس کی بیوی فرار ہوکر روس پہنچ چکی تھی، اُس کے دل میں ہوک اٹھی کہ جاکر اُسے عاشق کے پنجے سے چھڑاؤں، میاں! اُس دن سے وہ مارا مارا صبح شام گھوڑا دوڑاتے پھرنے لگا، کبھی ڈاک خانہ ہے، تو کبھی کپتان کا دفتر، عرضیوں کا تانتا باندھ دیا۔ کہ میرے حال پر رحم کیا جائے۔ اور روس واپس جانے کی اجازت دیدی جائے۔ زمین بیچ ڈالی مکان یہودیوں کے ہاتھ رہن کردیا۔ بال سفید ہوگئے۔ کمر جھک گئی۔ چہرہ دق کے ماروں کی طرح زرد پڑگیا۔ بھلا چنگا ایکا ایکی

[illegible] اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتا۔ اس طرح آٹھ سال تک عرضیوں کا تار باندھو [illegible] اب پھر اس کی جان میں جان آگئی ہے۔ کیوں نہ ہو خیر سے بیٹی کے سیانے ہونے سے [illegible] ہاتھ لگ گیا ہے۔ وہ اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اور آنکھ کی پتلی کی طرح رکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے۔ کہ لڑکی میں کسی قسم کا عیب نہیں، اچھی شکل، کالی کالی بھویں، مزاج میں شوخی، ہر اتوار کو اسے ساتھ لے کر گرجا جاتا تھا۔ دونوں کشتی میں پاس پاس کھڑے ہو جاتے، لڑکی مسکراتی، اور باپ کی نظریں بیٹی کے مکھڑے سے پل بھر کو اٹھنے کا نام نہ لیتیں۔ کہتا، یہاں اسمیوں، سائے بیریا میں بھی زندگی لطف سے بسر ہو سکتی ہے، سائے بیریا میں بھی انسان خوش رہ سکتا ہے۔ میری بیٹی کو دیکھو، ماشاءاللہ کتنی پیاری ہے! میں شرط لگاتا ہوں کہ اتنی پیاری لڑکی تم چراغ لے کر ڈھونڈو تب بھی نہیں پا سکتے، میں جواب دیتا، بے شک تم ٹھیک کہتے ہو، تمہاری لڑکی میں کوئی خرابی نہیں، اور اپنے دل میں کہتا، ذرا صبر کرو...... اس کی اٹھتی جوانی ہے۔ خون میں اُبال ہے، جی میں مرادیں ہیں، یہاں بھلا راگ رنگ کہاں! اور یہاں، لڑکی سچ مچ گھلنے لگی، سوکھتی گئی، سوکھتی گئی، اور ایڑیاں رگڑ رگڑ رینگ رہی ہے، دق...........

دیکھ لی آپ نے سائے بیریا کی خوشی، لعنت ہو کم بخت پر، یہاں زندگی اس طور سے بسر ہوتی ہے.... خیر تو اب ڈاکٹروں کی ڈھونڈ مچی، ایک کو چھوڑا، دوسرے کو پکڑا۔ آج ابھی دکھا، کل اُسے، جہاں کسی ڈاکٹر یا جادوگر کا پتہ چلا اور اسے لینے پہنچا، ڈاکٹروں کے پیچھے ہزاروں روپیہ برباد کر دیا۔ میرے نزدیک تو بہتر ہوتا، کہ یہ روپیہ شراب میں اُڑا دیتا، لڑکی تو مر کے رہیگی، اب کسی کے بچائے نہیں بچتی، پھر اس کی کمر ٹوٹ جائیگی، اور اس کا یقین رکھو کہ یا تو صدمے سے خودکشی کرے گا۔ یا روس بھاگ جائے گا، فرار ہوگا، پکڑا جائے گا، مقدمہ چلے گا، سزا ہوگی،

تاتاری بھی تھے جو سردی میں سکڑ رہا تھا، بڑبڑا کر کہا، اچھا ہے، اچھا ہے، اچھا ہے، اکیلا اچھا ہے

اُس کی بیوی، اُس کی بیٹی... اس کے مقابلہ میں قیدکی، صدمے کی کیا حقیقت ہے!
اپنی بیوی! اپنی بیٹی کی شکل تو دیکھنے کو مل گئی.... تم کہتے ہو، کچھ نہ مانگو، یہ نہوت بُری، اس کی بیوی
تین سال تک اُس کے ساتھ رہی، یہ پروردگار کی دین تھی، نہوت بُری، تین سال اچھے، کچھ بھی
بھی!

سردی سے اٹک اٹک کے اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے روسی لفظ سوچ سوچ کر، اُسے صرف
گنتی کے روسی لفظ آتے تھے، تاتاری نے کہنا شروع کیا، کہ "خدا... گھڑی نہ لائے، کہ کوئی بیمار
پڑے اور پردیس میں جان دے، اور ٹھنڈی، کالی زمین
دن بھر نہ سہی، گھنٹہ بھر کو آجائے، تو اس نعمت کے
خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا، خوشی کا ایک دن ہو نہ۔

وہ پھر اپنی حسین و ذہین بیوی کی حکایت لے بیٹھا، پھر اُس نے اپنا سر ہاتھوں پر [illegible]
اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، سمیوں کو اس نے یقین دلایا کہ "میں بے گناہ ہوں" اور
مفت میں مصیبت بھگت رہا ہوں، میرے دو بھائیوں اور چچا نے مل کر اُس کسان کے گھوڑے کا گم
صاف کیا تھا، اور انہی نے گھوڑے والے کو مار مار کے ادھ موا کیا تھا، پنچائت نے انصاف سے
کام نہیں لیا، بلکہ کچھ ایسی کاری گری کی، کہ ہم بھائیوں کو کالا پانی ہوگیا، اور ہمارا پیسے والا
چچا صاف چھوٹ گیا۔

سمیوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا، کچھ دنوں میں خود بخود جی لگ جائے گا،
تاتاری دم بخود بیٹھا اپنی اشک آلود آنکھوں سے آگ کی طرف دیکھتا رہا۔ چہرے سے حیرانی
اور تردد پڑا ٹپکتا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیوں گھر سے اتنی دور اِس تاریکی اور نمی میں
انجان لوگوں کی صحبت میں پڑا سڑ رہا ہوں،
لال بھبکڑا آگ کے قریب لیٹے لیٹے کسی بات کا دھیان کرکے آپ ہی آپ ہنسا، اور دھیمی
لے سے ایک دُھن گنگنانے لگا۔

[illegible] بولا، ڈگی کے لئے باپ کی صحبت میں کیا لطف ؟ یہ ضرور ہے کہ وہ اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ مگر، بھائی، اس کے سامنے انسان کو اپنے شش۔ تی حمیال گھٹنا پڑتا ہے بڈھا مزاج کا سخت اور چڑچڑا ہے، جوان لڑکیوں کو بھلا سختی سے کیا سروکار ؟ انہیں تو چاہو نچلے چاہئیں۔ اور ہا ہا ! ہو ہو ہو ! عطر چاہیئے۔ اور غازہ چاہیئے۔ جی ہاں ... آہ، زندگی زندگی، سمیوں نے دقت کے ساتھ اُٹھتے ہوئے ایک آہ کھینچی۔ شراب ختم۔ معلوم ہوتا ہے سونے کا وقت آپہنچا۔ میاں، میاں تو چلا.....،

تاتاری اکیلا رہ گیا، تو اُس نے الاؤ میں کچھ اور ٹہنیاں ڈالیں۔ لیٹ رہا۔ اور شعلوں پر ٹکٹکی باندھکر اپنی بیوی کے تصوریں ڈوب گیا۔ مہینہ بھر، دن بھر کو وہ میرے پاس آجاتے۔ خواہ جی چاہے تو پھر چلی جائے۔ ایک مہینہ یا ایک دن سدا کی محرومی سے بہتر ہے۔ اچھا، فرض کرو، اس نے اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ اور وہ آبھی گئی۔ آخر کھائیگی تو کیا کھائیگی ؟ رہیگی تو کہاں رہیگی ! سوچتے سوچتے اُس کی زبان سے نکلا، کھانے کو کچھ نہوا، تو رہیگی کیونکر ؟

دن رات چپو چلانے پر بھی کُلّھم دس کوپک اُس کے پلے پڑتے تھے، یہ سچ ہے کہ سواریاں شراب یا چائے کے لئے کچھ بخشش دے دیتی تھیں۔ وہ دوسرے ملاح آپس میں بانٹ لیتے تھے، اور نہ صرف بیچارے تاتاری کو سوکھا ٹرخاتے تھے، بلکہ اُس کا اُلٹا مذاق اُڑاتے تھے، خرچ کی تنگی کی وجہ سے وہ بھوک، سردی اور وحشت کا شکار تھا..

اب کہ وہ سردی کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا، اور اُس کا جوڑ جوڑ ٹوٹا جاتا تھا۔ چاہیئے تھا کہ وہ جھونپڑی میں جاکر پڑ رہتا، اور سو جاتا، مگر وہاں اس کے پاس اوڑھنے کو کوئی چیز نہ تھی، اور اندر سردی باہر سے بھی زیادہ تھی، ساحل پر بھی اگرچہ اوڑھنے کو کچھ نہ تھا، مگر کم از کم آگ تو دہکا سکتا تھا۔

ہفتہ بھر میں پانی اتر جائیگا۔ اور چھوٹے ڈونگے چلنے لگیں گے۔ اور سوائے سمیوں کے کسی ملاح کی ضرورت نہیں رہیگی، تب تاتاری گاؤں گاؤں روزگار ڈھونڈتا اور بھیک مانگتا پھریگا

اس کی بیوی صرف سترہ سال کی تھی، خوب صورت، نازک مزاج، شرمیلی، کیا وہ بھی شرم وحیا
چھوڑ، نقاب اُلٹ در بدر جھولی لئے پھرے گی؟ نہیں اس کے خیال ہی سے اُس کے بدن
کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے...

پو پھٹ رہی تھی، کشتی، پانی میں بید مجنوں کی جھاڑیاں، دریا کی لہریں صاف چمکنے لگی تھیں
پلٹ کر دیکھنے سے ترچھی ریتلی ڈھال نظر آتی تھی، اس کے دامن میں چھپر کی جھونپڑی تھی، ذرا
اوپر گاؤں کی جھونپڑیاں پاس پاس پڑی تھیں، گاؤں میں مرغ بانگ دینے لگے تھے۔

تاتاری سوچنے لگا، کہ یہ سرخ ریتلی ڈھال، کشتی، در ...
پیاس، بیماری، شاید یہ سب مایا ہو، بلکہ بعید نہیں کہ ...
معلوم ہوا، کہ میں سو رہا ہوں، اور اپنے خراٹوں کی آ...
وطن سمبرسک میں ہے، اُس نے اپنی بیوی کو نام لیکر پکارا ...
میں اس کی ماں ہے۔ لوگ کیسے کیسے ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں! خواب آخر نظر کیوں آتے ہیں؟
تاتاری نے مسکرا کر آنکھیں کھولیں۔ یہ کون سا دریا ہے؟ والگا؟

برف پڑ رہی تھی

"کشتی! دریا کے دوسرے کنارے پر کوئی شخص چیخ رہا تھا، کشتی!

تاتاری چونک کر اُٹھ بیٹھا اور دوسری طرف جانے کے لئے اپنے ساتھیوں کو جگانے لگا،
رواروی میں پھٹی پرانی بھیڑ کی کھالیں پہن، اپنی بھاری نیند بھری آواز میں گالیاں دیتے
سردی سے ٹھٹھرتے ملاح گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ کچی نیند سے اُٹھ کر دریا کی تیز ہوا اُن کے
بدن کے پار ہوئی جاتی تھی، آہستہ آہستہ سب اچھل کر کشتی میں سوار ہوئے،... تاتاری اور
تین اور ملاحوں نے بڑے بڑے، چوڑے پھل کے پتوار سنبھالے جو اندھیرے میں کیکڑوں کے
پنجے معلوم ہوتے تھے، سیموں پیٹ کے بل پتوار کے پیرم کے سہارے لیٹ گیا، دوسرے کنارے
سے چیخنے کی آواز بدستور آرہی تھی، دو مرتبہ تمنچہ شاید اس خیال سے چلایا گیا۔ کہ ممکن ہے ملاح

ہوں، یا گاؤں کے شراب خانے میں گئے ہوئے ہوں،
"ممن یا" آخر ایسی کیا گھبراہٹ ہے؟ لال بھکڑ کے لہجے سے ٹپکتا تھا، کہ اس میں جلدی کرنا فضول ہے، یا کم از کم جلدی کا کوئی نتیجہ نہیں"
لمبی چوڑی، بھدی ناؤ کنارے سے روانہ ہوئی، اور بید مجنوں کی جھاڑیوں میں سے ہو کر چلنے لگی۔ درخت چلتے نظر آتے تھے۔ اور صرف اسی بات سے اندازہ ہوتا تھا، کہ کشتی ساکن نہیں، بلکہ حرکت میں ہے، ملاح پیچھے تلے ہاتھوں سے چپو چلا رہے تھے، لال بھکڑ پیٹ کے بل کمان کی شکل لیٹا تھا، کبھی اس طرف کو لڑھک جاتا کبھی اس طرف کو، اندھیرے میں یہ معلوم ہوتا تھا، کہ ملاح کسی بادا آدم کے وقت کے لمبے لمبے پنجوں والے دقیانوسی جانور کی پشت پر بیٹھے ایک برفانی لق ودق ملک میں سے چلے جا رہے ہیں، ایک ایسے ملک میں جو کبھی کبھی ڈراؤنے خواب میں دکھائی دیتا ہے، ناؤ بید مجنوں کی جھاڑیوں سے نکل کر کھلے دریا پر بہنے لگی، چپوؤں کے برابر برابر چلنے کی آواز دریا کے دوسرے کنارے پر سنائی دیتی تھی، کوئی شخص چلائے جاتا تھا۔ جلدی کرو! جلدی کرو!

دس منٹ کے بعد ناؤ زور سے گھاٹ سے جا کر ٹکرائی،

سیموں اپنے منہ سے برف پونچھتے ہوئے بڑبڑایا۔ برف کی بوچھاڑ ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتی، خدا جانے اتنی برف کہاں سے نازل ہوتی ہے،

کنارے پر ایک میانہ قد وقامت کا مختصر سا آدمی لومڑی کی کھال کا چھوٹا کوٹ پہنے سفید بھیڑ کی کھال کی ٹوپی اوڑھے بے حس وحرکت اپنے گھوڑے سے الگ ہٹ کر کھڑا تھا۔ غم واندوہ اور از خود رفتگی اُس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ گویا کوئی بھولی بسری بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اپنے ناقص حافظہ پر دانت پیس رہا ہے، سیموں اس کے قریب پہنچا، اور مسکرا کر ٹوپی اُتاری، اُس نے کہا مجھے انستاسائیفسکا جانے کی جلدی ہے۔ میری لڑکی کی حالت پھر خراب ہوگئی، سُنا ہے کہ وہاں کوئی نیا ڈاکٹر آیا ہے۔

گاڑی ناؤ میں دھکیلی گئی، اور ملاحوں نے اسے بہاؤ کے خلاف کھینا شروع کیا۔ وہ شخص
جسے سیموں نے دیلائی سرگے یوپچ کے نام سے پکارا تھا بالکل ساکت کھڑا اپنے موٹے موٹے ہونٹ
دبائے ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ کوچوان نے اُس سے سگریٹ پینے کی اجازت مانگی
تو اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ سیموں نے اُس کی طرف طنز کی نظر سے دیکھا۔
اور کہا جی ہاں، سائبیریا میں بھی لوگ لطف سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ لطف سے! "لال جھگڑے کے
چہرے پر فاتحانہ رنگ جھلک رہا تھا، جیسے اس نے کوئی بات ثابت کر دی، اور اسے خوشی ہے کہ
میری پیشین گوئی پوری ہو کے رہی، صاف ظاہر تھا کہ وہ۔۔۔
بہت لطف اٹھا رہا ہے،

جب گھوڑے ساحل پر پہنچ کر جوتے جانے لگے۔
اس موسم میں آپ کو بہت کیچڑ ملے گی، آپ کو چاہئے تھا کہ ابھی۔۔۔
سرے سے سفر کا خیال ہی دل سے نکال دیتے، سفر سے کچھ حاصل ہو، تب بھی ایک بات ہے۔
مگر آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ سالہا سال سے دن رات اِدھر سے اُدھر حیران و پریشان مارے
مارے پھرتے ہیں، ایمان کی بات تو یہ ہے، کہ اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ خاک نہیں نکلتا۔
دیلائی سرگے یوپچ چپ چاپ اسے انعام دیکر گاڑی میں بیٹھا، اور روانہ ہو گیا،
سیموں نے سردی سے سکڑ کر کہا، پھر وہی ڈاکٹر کی تلاش! گویا معقول ڈاکٹر کا ملنا اتنا
ہی آسان ہے، جتنا میدان کی ہوا کا، یا شیطان ملعون کی دُم کا ہاتھ آنا! عجب آدمی ہے، خدایا،
مجھ گناہ گار کو معاف کر!

تاتاری، لال جھگڑے کے قریب پہنچا، اور تھوڑی دیر تک اُسے نفرت اور بیزاری کی نظروں
سے دیکھتا رہا۔ پھر سردی سے تھرتھراتے ہوئے اپنی ٹوٹی پھوٹی روسی میں تاتاری الفاظ گڈمڈ
کر کے اُس نے کہنا شروع کیا، وہ نیک ہیں، نیک، اور تم بُرے ہو، تم بُرے ہو! ان کی روح
پاک ہے اور تم حیوان ہو، پلید! وہ زندہ ہیں اور تم ایک مُردہ لاش ہو۔ خدا نے انسان کو

اس نے بنایا ہے۔ کیونکہ سکہ ہے، تمہارے دل میں کوئی خواہش نہیں، تم بے جان ہو... تم پتھر ہو، مٹی کا ڈھیر ہو!

اللہ میاں تمہیں نہیں چاہتا، انہیں چاہتا ہے!

ملاح ہنسنے لگے، تاتاری کی پیشانی پر حقارت سے بل آگیا۔ ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اُس نے اپنے پھٹے پُرانے چیتھڑے بدن سے لپیٹ لئے، اور الاؤ کے قریب چلا گیا، سیموں اور دوسرے ملاح ٹہلتے ہوئے جھونپڑی کی طرف چلے گئے۔

ایک ملاح خشک گھاس پر لیٹے ہوئے بھاری آواز میں بولا، سردی ہے!

دوسرے نے اتفاق کیا، ہاں، گرمی نہیں ہے، زندگی کیا ہے جنجال ہے۔ . . ،

سب لیٹ گئے دروازہ ہوا کے جھونکے سے کھل گیا، اور برف کی بوچھاڑ اندر آنے لگی، کسی میں مارے سردی اور کاہلی کے اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اُٹھ کر دروازہ بند کر دیتا۔

سیموں غنودگی کا جھونکا آتے وقت بولا، میں تو مزے میں ہوں، خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!'

تمہاری دلاوری کا لوہا ہم سب مانتے ہیں، شیاطین بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگائیں گے!

باہر سے ایسی چیخیں آئیں جیسے کوئی کُتا بھوں بھوں کر رہا ہے،

کیا ہے؟ کون ہے؟

تاتاری باہر بیٹھا رو رہا ہے،

عجب دیوانہ ہے!

سیموں نے کہا، رفتہ رفتہ عادی ہو جائیگا، اور فوراً اُس کی آنکھ لگ گئی،

باقی لوگ بھی تھوڑی دیر میں سو گئے۔ دروازہ کھلا پڑا رہا،

بے چخوف،

خواجہ منظور حسین

تنقید و تبصرہ

کتب

المسیح الدجال و یاجوج ماجوج ۔ مثنوی یاد اسلام ۔ پانصد در نادر ۔ جواہرات اسلام ۔ تناسخ ۔ پیام عمل ۔

المسیح الدجال و یاجوج ماجوج | مصنفہ مولوی محمد علی
چھپائی اور کاغذ معمولی ۔ تقطیع [illegible] ۔ ضخامت ۸۰
ملنے کا پتہ : احمدیہ انجمن اشاعت اسلام ۔ لاہور ۔

اس رسالہ میں مولوی محمد علی صاحب نے بعض علامات قیامت کی تشریح کی ہے ۔ مثلاً یاجوج ماجوج ۔ مسیح دجال ۔ دابۃ الارض اور مغرب سے طلوع شمس ۔ یاجوج ماجوج جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے ان کے متعلق کوئی تفصیلی بحث مولوی صاحب نے نہیں کی نہ ان کے تاریخی حالات پڑھنے کی زحمت گوارا کی نہ ان کتابوں کا مطالعہ کیا جو خود علماء مغرب یا بائبل کے شارحین نے اس موضوع پر لکھی ہیں ۔ صرف حزقیل نبی کی کتاب کے حوالے سے اقوام مغرب کو یاجوج ماجوج قرار دیدیا ۔ زیادہ توجہ انھوں نے مسیح دجال پر صرف کی ہے بلکہ یہ سارا رسالہ اسی کے متعلق ہے ۔ مگر اس بحث میں تاویلیں اس قدر کمزور ہیں جن کے لکھنے کی جرات صرف انھیں کو ہوسکتی ہے مثلاً دعویٰ یہ ہے کہ یاجوج ماجوج اور دجال دونوں ایک ہی ہیں ۔ دلیل یہ ہے کہ

> "صحیح حدیث نے سورہ کہف کو فتنۂ دجال کا علاج بتایا ہے ' اور سورہ کہف بالخصوص عیسائیت کے فتنہ پر ہے ۔ تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے غلبۂ عیسائیت ہی کو فتنۂ دجال قرار دیا ہے " صفحہ ۱۲ ۔

اگر مولوی صاحب اس دلیل کو ترتیب دیکر اپنے سامنے رکھ لیتے تو ان کو خود معلوم ہوجاتا کہ

ہی کے نسبت ممنوع ہیں۔

دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ دجال ایک فرد کا نام نہیں ہے بلکہ ایک قوم کا نام ہے۔ دلیل یہ لکھی ہے کہ

"یہ پیشین گوئیاں نبی کریم علیہ السلام کے کشوف (؟) ہیں اور کشف یا رویا میں جب ایک قوم دکھائی جائے گی تو ایک فرد واحد ہی کے طور پر دکھائی جائیگی" صفحہ ۱۷۔

سوال یہ ہے کہ "ایک فرد واحد" کس طور پر دکھایا جائے گا؟ مولوی صاحب نے خود ابن صیاد کے ذکر میں نقل کیا ہے کہ حضرت جابر صحابی نے قسم کھا کر کہا کہ وہ دجال ہے۔ نیز خود آنحضرتؐ بھی جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے اس کے دجال ہونے کا گمان رکھتے تھے۔ کیا وہ "ایک فرد واحد" تھا یا ایک قوم؟

اس کے علاوہ یہ بھی حدیث میں ہے کہ "میری امت میں تیس۳۰ دجال نکلینگے"۔ کیا وہ "ایک فرد واحد" ہوں گے یا ایک ایک قوم؟

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت عیسیٰؑ کا کام صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صلیب کو توڑیگا اور خنزیر کو قتل کرے گا۔ یہاں قتل دجال کا نام تک نہیں" صفحہ ۱۴۔

پھر آگے لکھتے ہیں:۔

"آنے والے مسیح کے کارناموں میں قتل دجال کا نام تک نہ لینا اس بات کی قطعی اور کھلی شہادت ہے کہ فتنۂ دجال اور غلبۂ صلیب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں" صفحہ ۱۴۔

دعویٰ، دلیل اور نتیجہ کی مطابقت کی منطقی بحث کو جانے دیجیے کیونکہ مولوی صاحب اس سے کبھی سروکار نہیں رکھتے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جن حدیثوں میں کسر صلیب اور قتل خنزیر کا ذکر ہے ان میں پہلے تصریح کے ساتھ قتل دجال کا بھی ذکر ہے جس کا اس شد و مد سے مولوی صاحب نے بار بار انکار کیا ہے۔ مجھے ان احادیث کے نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ آخر میں خود مولوی صاحب ممدوح ہی کے قلم سے یہ پردہ اس طرح فاش ہوتا ہے:۔

"بعض قلوب میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ مسیح موعود وہی شخص ہو سکتا ہے جو دجال کو قتل کرے اور حضرت مرزا صاحب نے دجال کو قتل نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ احادیث میں مسیح موعود کے دجال کو قتل کرنے کا ذکر آتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ قتل دجال سے مراد کیا ہے۔" صفحہ ۵۱۔

قتل دجال کی اگر پہلے ہی تاویل کر دیتے اور یہ نہ لکھتے کہ "آنے والے مسیح کے کارناموں میں قتل دجال کا نام تک نہیں ہے" تو کیا حرج تھا۔

ذوالقرنین بعض لوگوں نے سکندر کو کہا ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ ان کے نزدیک ذوالقرنین دارائے اول ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ... علما ...
کیونکہ دارا کا سد بنانا کسی طرح ثابت نہیں۔ اس با...
جس نے ملک یمن کے ذوالقرنین کے سفر مغرب و...
دابۃ الارض جس کا ذکر قرآن کریم میں اس ...

"جب ان کے اوپر عذاب کا فیصلہ ہو چلے ... جاندار نکالیں گے جو لوگوں سے یہ کہے گا کہ وہ اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔"
(پ ۲۰ رکوع ۲)۔

مولوی صاحب نے اس سے عیسائی علماء کو مراد لیا ہے۔ لکھتے ہیں
"اقوام یورپ کے تین مختلف حصوں کا تین ناموں کے تحت میں ذکر کیا ہے۔ دجال ان کے پادری ہیں۔ یاجوج ماجوج انکا وہ گروہ ہے جس کے ہاتھ میں ملکی طاقت ہے اور دابۃ الارض ان کے وہ علماء ہیں جو مادہ پرستی میں منہمک ہیں۔" صفحہ ۶۴۔

لیکن مرزا صاحب نے دابۃ الارض خود علماء اسلام ہی کو قرار دیا ہے جو زمینی باتوں پر گرے ہوئے ہیں۔ اس لئے مولوی صاحب کو اس تحقیق کے سامنے بھی سر جھکانا تھا۔ لکھتے ہیں:
"کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ یہ آج ہمارے علماء کی ہو بہو تصویر ہے۔ اگر ایسے لوگوں کو دابۃ الارض کہا گیا ہو تو کیا بعید ہے۔" صفحہ ۶۶۔

لیکن کیا علماء اسلام کی آج ہو بہو تصویر یہ ہے؟ یہ تو یہی ان کی ذہنیت ایک ہزار سال سے ..... کے لئے تیار ہوں لیکن اس کو چھوڑئے اور یہ دیکھئے کہ قرآن میں دابۃ الارض کا خروج مشروط ہے کہ اس وقت ہوگا جب عذاب یا قیامت کا فیصلہ ہو چکے گا۔ لیکن بقول مولوی محمد علی صاحب علماء مغرب اور بقول مرزا صاحب علماء اسلام جو دوسرے انسانوں کی طرح ماں کے شکم ہی سے پیدا ہوئے ہیں زمین سے نکالے جا چکے ہیں اور کہتے پھرتے ہیں کہ لوگ آیات الٰہی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ دابۃ میں تنوین وحدت کی ہے جس کے معنی ہوئے ایک جاندار۔ مگر مولوی محمد علی صاحب کے لئے یہ آسان ہے کہ وہ "ایک فرد واحد" کو ایک قوم بنا لیں۔

آخر میں مغرب سے طلوع شمس کی یہ تاویل کی ہے کہ جماعت احمدیہ نے ممالک مغربیہ میں تبلیغی مرکز قائم کر دیا ہے جہاں سے آفتاب اسلام "ضیا باریاں" کر رہا ہے۔ مگر اس صورت میں تو طلوع آفتاب مشرق یعنی پنجاب ہی سے ماننا پڑے گا جس کی ایک کرن مغرب میں پہونچ گئی ہے نہ کہ مغرب سے۔

خاتمہ پر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ پیشین گوئیاں جو روایات میں بیان کی گئی ہیں ان کی نسبت خود ائمہ حدیث نے اپنا اطمینان ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ملاحم میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں۔ ایسی حالت میں ان کی اس قدر بے بنیاد تاویلوں میں پڑنا اہل علم و دین کے شایان شان نہیں۔ بے شک قرآن میں جو امور مذکور ہوئے ہیں ان پر مفید اور دلچسپ بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسی بحث جس کی بنیاد علم و عقل پر ہو نہ کہ فرقہ وارانہ خیالات پر۔

مثنوی یاد اسلام | مصنفہ شاہ ممتاز علی صاحب آہ ایٹھوی۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ تقطیع خورد۔ حجم پانچ جزو قیمت فی نسخہ ۱۰/ ملنے کا پتہ: مولوی محمد ساجد صاحب محلہ مغلپورہ شہر فیض آباد۔

شاہ صاحب موصوف نے اس مثنوی میں اللہ کے صفات۔ رسول اللہ کے حالات طیبہ اور بزرگان دین کے بعض تاریخی واقعات نہایت عقیدت کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ ملحدوں، دہریوں اور بے دینوں کے اعتراضات کے جوابات بھی دئے ہیں اور موجودہ مسلمانوں کی دین سے بیزاری اور افرنجیت کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔

وہ ایک کہنہ مشق شاعر اور حضرت منشی امیر احمد مرحوم مینائی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اسلئے

[illegible] کی شاعری ٹکسالی ہے مگر غزل گوئی اور واقعات منظوم کرنے میں بڑا فرق ہے چنانچہ اس مثنوی میں انکے شبدیز قلم نے وہ دلکش جولانیاں نہیں دکھائیں جو غزلوں میں ہیں مگر پھر بھی پختہ کلامی کا جوہر ہر جگہ عیاں ہے۔

پانصد وزر نادر | مصنفہ مولوی محمد حسین خاں صاحب بی۔ اے (علیگ) سابق رئیس تدریسات افغانستان۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ متوسط۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۰۰ صفحے۔ قیمت فی نسخہ ۸؍۔

ملنے کا پتہ: سید حمید خاں۔ بستی نو جالندھر۔

اس کتاب میں قدیم اولیاء کرام اور بزرگان اسلام کے اقوال سے پانسو نصیحتیں جو دین اور دنیا دونوں میں کارآمد ہو سکتی ہیں اور انسان کی عقل و معرفت [illegible] کر کے لکھی گئی ہیں۔ غازی نادر خاں بادشاہ افغانستان [illegible] رکھا گیا ہے۔ انتخاب عقل و فہم کے ساتھ کیا گیا ہے اور بڑے اور جدید و قدیم تعلیم یافتہ سب کے لیے مفید۔

جواہرات اسلام | مصنفہ چمپت رائے صاحب جین۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ تقطیع خورد حجم ۱۵۲ صفحے۔ قیمت فی نسخہ ۸؍۔ ملنے کا پتہ: ہیرا لال پنا لال۔ دریبہ کلاں۔ دہلی۔

اس رسالہ کے مصنف مسٹر چمپت رائے دہلی کے ایک معزز بیرسٹر ہیں۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کے حقائق کی زیادہ تر مولانا روم کی مثنوی سے تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور بہت سے اہم مسائل کو بیان کیا ہے۔

تناسخ کو بھی انھوں نے اسلامی تعلیمات میں سے سمجھا ہے اور اس کے اوپر مثنوی کے بعض اشعار سے سند پیش کی ہے۔ لیکن دراصل یہ غلط فہمی ہے۔ اسلام نے تناسخ ارواح یعنی آواگون کی تعلیم نہیں دی ہے۔ خود مولانا روم نے بھی تخلیق کے مدارج دکھائے ہیں نہ کہ گناہوں یا نیکیوں کے عوض میں بار بار پیدائش کے یعنی جو اشعار سند میں پیش کئے گئے ہیں ان میں ارتقائے تخلیق ہے نہ کہ مسئلہ تناسخ۔ اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے نہ کہ مثنوی پر۔ کاش ایسی بے تعصب اور

صفات سلامیتیں قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں تو اسلامی حقائق کو زیادہ صحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

تناسخ | مصنفہ ڈاکٹر بشارت احمد صاحب احمدی۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ حجم چار جزو۔ قیمت فی نسخہ ۲ر۔ ملنے کا پتہ: منیجر صاحب دار الکتب اسلامیہ۔ احمدیہ بلڈنگس لاہور۔

ڈاکٹر صاحب نے اس رسالہ میں ایک سوال کے جواب پر تناسخ کے متعلق تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ اعتقاد زمانہ لاعلمی کا ایک غلط نظریہ ہے۔ اس مسئلہ کی تردید میں اگرچہ پہلے بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر یہ رسالہ سب سے زیادہ واضح، مبیّن اور مدلل ہے۔ ان کے دلائل کا خلاصہ تین امور ہیں۔ اول یہ کہ ہر ایک آدمی جانتا ہے کہ میں اس سے قبل اس دنیا میں کبھی نہیں آیا۔ دوم یہ کہ مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعے سے انسان کو جو علم ملا ہے یعنی سائنس اس نے ارتقا کو مان کر تناسخ کی جڑ کاٹ دی ہے۔ سوم یہ کہ خود خالق کائنات نے بنی نوع انسان کو آج تک جو علم الہام کے ذریعے سے دیا ان میں یہ بتا کر کہ مرنے کے بعد انسان اس دنیا میں واپس نہیں آتا تناسخ کی تردید کر دی۔

ساری کتاب ان تین اصولی دلائل کی تشریح اور توضیح ہے اور اس خوبی کے ساتھ ہے کہ علم اور عقل کی روشنی میں ان کا جواب ناممکن ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس رسالہ کو چار مختلف لکچروں میں تقسیم کیا ہے جس کی وجہ سے مضامین کا جابجا تکرار ہو گیا ہے۔ اگر مسلسل ایک مضمون لکھتے تو یہ عیب نہ واقع ہوتا۔ مگر تاہم اپنے موضوع پر بے مثل رسالہ ہے۔

پیامِ عمل | جزیرہ مورشیس میں مولانا حکیم عبدالمدرشید نواب کی مدد سے ۱۹۲۶ء سے ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہے جس میں مسلمان بچوں کو انگریزی نصاب کے ساتھ اردو اور دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس رسالہ میں اس مدرسہ کی ضروریات دکھا کر اس کی امداد کی تحریک کی گئی ہے۔ دستخط کنندگان میں کارکنان و ممبران مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی و دیگر مسلمانان مورشیس ہیں۔

لا وبذریعہ غلیب صاحب کہ سبھا رہ دفتر ایف حیدرآباد دکن ارسال کی جاسکتی ہے۔

انارکلی | مصنفہ سید امتیاز علی تاج، دارالاشاعت پنجاب لاہور، تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶، حجم ۲۶۰ صفحے۔

اردو پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جسے یہ ڈراما دیکھ کر خوشی نہ ہوئی ہو۔ موضوع، پس منظر ڈراما کے مخصوص اوصاف، ہر اعتبار سے یہ تصنیف قابلِ قدر ہے اور ہمیں امید ہے ہندوستانی ڈراما اور تھیٹر کے شائقین کی عام بدمذاقی رفع کرنے میں یہ بہت مدد دے گا۔ اس میں حقیقت نگاری بھی ہے اور تصویر کی رنگینی بھی، جذبات کا تلاطم بھی اور ایک اچھی کہانی کی ترتیب بھی۔ مصنف نے مغل بادشاہوں کے حرم سرا کی فضا اور طرزِ معاشرت کا نقشہ بہت صحت اور نکتہ رسی کے ساتھ
لئے اس سے زیادہ موزوں پس منظر نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈ
موز میں نہیں معلوم ہوتے، بلکہ باغ اور چمن، دریا کے کنار
جیسے کہ مغل واقعی تھے، ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ محلوں میں
اپنی زندگی کو آراستہ کرنا جانتے ہیں، اور وہ آرائش اور نفاست جو ہمارے تصور میں بسیرا کا ان کی روزمرہ زندگی کی ایک معمولی حقیقت ہے۔ مغل حرم سرا کے پرستان میں عشق کی داستانیں کوئی نرالی بات نہ ہوں گی، مگر انارکلی کا عشق کوئی معمولی جذبہ نہیں ہے۔ اس کا تیز شعلہ اس طرح بھڑک اٹھتا ہے کہ محل اور باغ سب جگمگانے لگتے ہیں، اور کبھی کبھی اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ جلا کر چھوڑے گا، مگر شعلے کی چمک دم بھر کی ہے، وہ کچھ جلاتا نہیں، اپنی رونق دکھا کر بجھ جاتا ہے اور محل اور باغ شرمندہ ہو کر شام کے سے اندھیرے میں اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔

وہ جذبہ جس کا انارکلی ایک مجسمہ ہے ہر شاعر، داستان گو اور افسانہ نویس کا تختۂ مشق رہا ہے اور نہ صرف ہمارے ادب میں بلکہ تمام دنیا میں عشق سے زیادہ فرسودہ کوئی مضمون نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جو رنگا رنگی اس جذبے میں ہے، جو اثر اس کا ہر دل پر ہوتا ہے اور جو مختلف شکلیں یہ ہر طبیعت اور مذاق کے ساتھ اختیار کرتا ہے اس میں بہت سی جدت پیدا کر دیتی ہیں اور ہر عاشق کی طرح عشق کا ہر مصور بھی خود بخود ایک موجد ہو جاتا ہے۔ لیکن انارکلی کے عشق کی تصویر میں اصلیت کم اور رنگینی زیادہ نظر آتی ہے جیسے ہمارے شاعر اپنے جذبۂ عشق کی شدت ظاہر کرنے کے لئے بیخودی اور محویت کی انتہا تک پہنچ جانے کا دعویٰ کرتے ہیں، ویسے ہی انارکلی

[illegible] ایسے رنگ میں دکھایا گیا ہے جو شاید ہی کسی انسان میں نظر آتا ہو۔ انسانی جذبات کے ہزاروں محرک ہوتے ہیں اور عشق کے جذبے کی ایک محرک کسی دوسری ذات میں محو ہو جانے کی آرزو بھی ہو جاتی ہے لیکن عشق کو محض محو ہو جانے کی خواہش ظاہر کرنا اور کسی انسان کو خالص عشق کا مجسمہ بنانا مبالغہ ہے۔ ممکن ہے یہ بعض لوگوں کو پسند آتا ہو، مگر جو لوگ انسانی سیرت کو اصلی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں انھیں یہ بے جا رنگ آمیزی معلوم ہوگی۔

اکبر کا طرزِ عمل بھی نفسیات کی رو سے ایک معمہ سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ مصنف نے عموماً اسے اپنے سیاسی منصوبوں میں ڈوبا ہوا دکھایا ہے، اور حرم سرا کی رنگیلی زندگی محض ایک دلچسپی ہے جس سے اس کے تھکے ماندے دماغ کو کسی قدر تفریح ہو جاتی ہے۔ سلیم کو اس سے جو شکایت ہے وہ بجا ہے، لیکن وہ صرف محل کی کنیزوں اور حرم سرا کی دلچسپیوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اکبر کو شکایت سلیم کی فطرت سے ہونا چاہیے، اس کی استعداد کی کمی اور اس کے شوق کی گمراہی سے۔ محض انارکلی کی ایک گستاخی پر وہ اس قدر بگڑ جاتا ہے، حالانکہ ایسی حرکت حرم سرا میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی، جب مرد اور عورتیں سب شراب کے عادی تھے اور خود جہاں پناہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح میخواری کی داد دیا کرتے تھے۔ سلیم کا انارکلی کو آزاد کرنے کی کوشش کرنا خصوصاً ایسے بھولے پن سے اسے بھی سزا کا سبب بنانا دشوار ہے۔ اگر باپ بیٹے میں رقابت ہوتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ اکبر کا غصہ انارکلی کو تباہ کر دیتا لیکن رقابت کا ڈراما میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر اکبر مطلق العنانی میں مست ہوتا اور اسے خواہ مخواہ اپنی طاقت استعمال کرنے کا شوق ہوتا تب بھی ہم سمجھ سکتے کہ اس نے انارکلی کو ایسی سزائیں دیں کیونکہ طاقت کے ناجائز استعمال کی ہزاروں مثالیں تاریخ میں اور ہمارے زمانے میں ملتی ہیں، لیکن اکبر کو انارکلی میں ایک نہایت روشن ضمیر، عاقل و دانا، مدبر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، اور وہ وحشیانہ طرزِ عمل جو اس نے سلیم اور انارکلی کو جدا کرنے کے واسطے اختیار کیا اس کی سیرت کے بالکل خلاف ہوتا ہے۔

مصنف نے دیباچے میں بیان کر دیا ہے کہ انارکلی کا قصہ بے بنیاد ہے، مگر ڈراما میں حقیقت نگاری کا ایسا رنگ ہے کہ ڈراما کے پڑھنے والے کو یقین ہونے لگتا ہے کہ قصہ ضرور سچا ہوگا۔ ہم انشا پردازوں کو کسی طرح پابند کرنا نہیں چاہتے، لیکن انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم جن لوگوں کی برائیاں بیان کریں ان کی بھلی باتوں کو بھی یاد کرتے رہیں۔ ہماری موجودہ غلامی اور بے مائگی ہمارے پیش روؤں کی گمراہی اور ان کی سیرت کی خامیاں واضح کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ کچھ ان باتوں کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے جو ہمارے پیش روؤں کو اس وقت مصروف رکھتی تھی جب شراب اور عیش کی طلب ان کو دنیا سے غافل نہیں کر دیتی تھی۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

پردیس میں ہندوستانیوں کا حال یوں تو ہر ملک اور ہر دیس کے لوگوں کو اپنے وطن اور اپنے گھر سے محبت
ہوتی ہے لیکن ہندوستان کی قناعت پسند آبادی کو اپنے گھر ار
محبت اور تعلق تھا کہ دیس کو چھوڑ کر پردیس جانا برا اور
رفتہ ایسے سیاسی اور معاشی اسباب پیدا ہوتے گئے کہ انہ
ملکوں کو آباد کرنے کے لئے ہندوستان میں بھرتی شروع کی۔
سے معاہدے کے کاغذ پر انگوٹھا لگوایا گیا اور سمجھا بجھا کر سمندر پار بھیج دیا گیا چنانچہ اس وقت دنیا کے
مختلف حصوں میں پردیسی ہندوستانیوں کی مردم شماری ۲۶ ½ لاکھ ہے جس میں سے تقریباً ۲۵ ½
لاکھ برطانوی نوآبادیات میں بس گئے اور باقی ایک لاکھ غیر برطانوی علاقوں میں ہیں جسکی تفصیل حسب
ذیل ہے :-

برطانوی نوآبادیات		
	۱ - جزیرہ سیلون (لنکا)	۹ لاکھ ۵۹ ہزار
	۲ - ملایا	۷ لاکھ
	۳ - ماریشس	۲ لاکھ ۸۱ ہزار
	۴ - جنوبی افریقہ	۱ لاکھ ۶۰ ہزار
	۵ - ٹرینی ڈاڈ	۱ لاکھ ۳۰ ہزار
	۶ - جزائر فیجی	۶۹ ہزار
	۷ - دیگر	۲ ½ لاکھ
	میزان	۲۵ ½ لاکھ
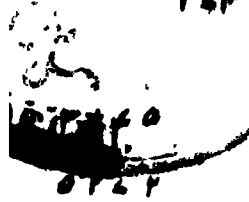
۱۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ	۵ [illegible]
۲۔ مڈگاسکر	۵۲۴۲
۳۔ جزائر الشرق	۵۰ ہزار
۴۔ سرینم	۳۴ ہزار
میزان	تقریباً ایک لاکھ

ابتدا از صرف مزدور پیشہ اور زراعت پیشہ طبقہ کے لوگ باہر گئے۔ لیکن اس کے بعد پھر گویا دروازہ کھل گیا اور تاجر، دستکار، منشی، وکیل، ڈاکٹر غرض ہر پیشے کے لوگ بہتر مواقع کی تلاش میں باہر جانے لگے، لیکن بدقسمتی سے اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگوں میں بیرون ملک جانے کا شوق اس زمانہ میں پیدا ہوا جب یورپ کے گورے آدمی ایشیا کے "سیاہ فام انسانوں" کو انتہائی ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، چنانچہ جہاں جہاں ہندوستانیوں کا گزر ہوا ہر جگہ وہی آسمان وہی زمین، وہی پابندیاں، امتیازات اور تعصبات۔ قدرتاً شکایات پیدا ہوئیں اور اس لئے اور بھی زیادہ کہ ۲۶ لاکھ

میں سے ۲۰ لاکھ ہندوستانی [illegible] سلطنت میں آباد کئے گئے تھے جہاں "آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا"؛
لیکن پردیس میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے، نہ حکومت ہند نے اپنی رعایا کی پردیس میں کوئی فکر کی اور نہ برطانوی
پارلمنٹ نے کبھی توجہ کی۔ مقامی طور پر کچھ تو ہندوستانیوں کی اپنی سعی و کوشش سے اور کچھ تنگ نظر فرنگیوں
کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کی وجہ سے اکثر نوآبادیات میں حالات روبہ اصلاح ہونے لگے اور اب کم از کم برطانوی
گوئنا، ٹرینی ڈاڈ، جمائیکا، سیلون اور ماریشس میں ہندوستانیوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ لیکن
بعض دیگر نوآبادیات میں ہندوستانیوں کی حالت بہت پریشان کن ہے اور ان کے ساتھ ہر طرح کی
زیادتیاں کی جاتی ہیں تاکہ وہ کسی طرح اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں مثلاً ایک شہر یا صوبے سے دوسرے
شہر یا صوبے میں سکونت نہیں تبدیل کر سکتے، زمینات اور مکانات نہیں خرید سکتے، کئی کئی نسلوں سے
وہاں آباد ہیں مگر حقوق شہریت نہیں ملتے، حق تجارت بہت مشکل
دوسری جگہ دوکان نہیں لگا سکتے، مقررہ محلوں کے علاوہ
میں صرف انہیں درجوں میں سفر کر سکتے ہیں جو ان کے لئے
مزدوری وغیرہ کے لئے، جو قوانین حکومت نے بنائے ہیں
میں تعلیم نہیں حاصل کر سکتے وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک ان شکایات کا تعلق ہے جنوبی افریقہ کی حکومت متحدہ کا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ
سب سے زیادہ معاندانہ ہے، جنگ سے قبل مہاتما گاندھی نے کئی سال تک وہاں قیام کرکے ہندوستانیوں
کی ان شکایات کو دور کرنے کی سعی و کوشش کی اور بالآخر مجبور ہو کر حکومت متحدہ کے خلاف ستیہ گرہ کی
جنگ شروع کی جس کا اختتام ۱۹۱۴ء میں "گاندھی اسمٹس" سمجھوتہ پر ہوا۔ جنگ عظیم کے زمانے میں ۱۹۱۷ء
اور ۱۹۱۸ء کی "امپیریل وار کانفرنس" میں یہ مسئلہ کئی مرتبہ زیر بحث آیا اور مناسب قرارداد بھی منظور کی گئی
مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ۱۹۲۱، ۲۴، ۲۵ء میں حکومت متحدہ جنوبی افریقہ نے کئی مسودات قانون اپنی پارلیمنٹ
میں پیش کئے جس کا مقصد صریحاً ہندوستانیوں کی تجارت اور کاروبار کا تباہ کرنا تھا۔ حالات بہت نازک
ہوتے جا رہے تھے اس لئے مئی ۱۹۲۶ء میں حکومت ہند نے سر جارج پیڈیسن کی سرکردگی میں ایک وفد
حکومت متحدہ سے گفت و شنید کے لئے جنوبی افریقہ بھیجا اور یہ طے پایا کہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں دونوں حکومتوں

کہ ایک کانفرنس افریقہ میں منعقد ہو اور اس کانفرنس سے قبل جنوبی افریقہ کا ایک وفد ہندوستان آکر یہاں کے حالات کا بچشم خود معائنہ کرے۔ چنانچہ کانفرنس ہوئی اور گفت و شنید کے بعد ایک سمجھوتہ ہوا کہ حکومت جنوبی افریقہ مغربی طرز زندگی اختیار کرنے پر ہر جائز طریقے سے اصرار کر سکتی ہے اور جو ہندوستانی ایسا کرنا چاہیں گے ان کی اس معاملہ میں امداد کرنا بھی دونوں حکومتوں کا فرض ہے اور جو لوگ افریقہ چھوڑنا چاہیں گے ان کو دوسرے ملکوں میں آباد کرنے کے لئے ہر قسم کی امداد دونوں حکومتوں کی طرف سے دی جائے گی۔ تین سال کی مسلسل غیر حاضری کے بعد واپسی کا حق نہ ہوگا لیکن اگر اس سے قبل واپس آنا چاہیں تو جو رقم حکومت نے ان پر صرف کی ہے وہ ادا کرنا پڑے گی، جو مسودات پارلیمنٹ میں ہندوستانیوں کے متعلق پیش کئے گئے ہیں ان پر مزید کارروائی نہ کی جائے گی۔ حکومت ہند اپنا ایک ایجنٹ معاملات کی نگرانی اور دونوں حکومتوں کے خوشگوار تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے مقرر کرے گی۔

جون ۱۹۲۷ء میں سمجھوتے کے مطابق مسٹر شاستری حکومت ہند کی طرف سے افریقہ میں ایجنٹ مقرر کئے گئے اور ان کے دوران قیام میں حالات قابل اطمینان رہے لیکن موصوف کو قبل از وقت استعفیٰ دینا پڑا۔ ان کے بعد مسٹر کرڈی ایجنٹ مقرر ہو گئے۔ مسٹر کرڈی کو بھی علالت کی وجہ سے رخصت لے کر دسمبر ۱۹۲۹ء میں ہندوستان واپس آنا پڑا، اور آپ کی غیر موجودگی میں حکومت متحدہ نے فرنگیوں کی درخواست پر یہ فیصلہ کیا کہ ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کی جائداد غیر منقولہ کی ملکیت اور قبضہ وغیرہ کے متعلق قواعد و ضوابط پر نظر ثانی کی جائے۔ اس فیصلے سے ہندوستانیوں کو قدرتاً اندیشہ پیدا ہوا۔ حکومت ہند نے کوشش کی کہ یہ معاملہ کچھ عرصے کے لئے ملتوی ہو جائے مگر حکومت متحدہ نے کسی طرح منظور نہ کیا۔ مسئلہ تحقیقاتی کمیٹی سے گزر کر پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہو گیا لیکن بالآخر حکومت ہند کے اصرار سے پارلیمنٹ کے دوسرے اجلاس کے لئے ملتوی کر دیا گیا اور یہ طے پایا کہ ۱۹۲۷ء کے سمجھوتے کے مطابق حکومت ہند اور حکومت متحدہ کے نمائندوں کی ایک کانفرنس پھر منعقد ہو اور از سر نو تمام مسائل پر غور کیا جائے چنانچہ اس سال جنوری اور فروری کے مہینے میں کانفرنس ہوئی۔ ہندوستان کی طرف سے سر فضل حسین، مسٹر شاستری، مسٹر نیڈو اور مسٹر باجپئی بھیجے گئے۔ حسب ذیل مختلف فیہ مسائل تھے جن پر بالآخر سمجھوتہ ہو گیا:-

(۱) جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو بالخصوص ہندوستان واپس بھیجنے کے متعلق
جو سمجھوتہ ۱۹۲۷ء میں ہوا تھا وہ قابل عمل ہے۔ اول تو ۸۰ فی صدی ہندوستانی
افریقہ میں اور ہندوستان اب ان کے لئے ایک اجنبی ملک ہے، وہاں کی آب و
ہوا ان کے موافق نہیں اس لئے وہ ہندوستان واپس جانا نہیں چاہتے۔ اس کے
علاوہ خود ہندوستان میں کثرت آبادی کی وجہ سے مزید دشواریاں ہیں لہذا ایک
کمیٹی مقرر کی جائے جو دنیا کے دوسرے غیر آباد علاقوں میں تحقیق حالات کرے اور
اگر آب و ہوا مناسب ہو تو افریقی ہندوستانیوں کو وہاں آباد کرنے کی کوشش
کی جائے۔ اس کمیٹی میں افریقہ انڈین کانگریس کا بھی ایک نمائندہ ہوگا۔

(۲) مغربی طرز زندگی کو اختیار کرانے کے لئے
کا جو وعدہ حکومت متحدہ نے ۱۹۲۷ء کے سمجھوتے
اور اس پر عمل بھی کرے۔

(۳) ٹرانسوال میں حقیت اراضی کے متعلق جو مسودہ قانون ایوان پارلیمنٹ میں پیش
تھا اس پر بحث کرنے کے لئے جنوبی افریقہ کے نمائندے تیار نہ تھے وہاں کی فرنگی
آبادی کو اس پر سخت اعتراض تھا کہ جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ کے معاملات میں
حکومت ہند کو اس طرح دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لئے یہ طے پایا کہ
افریقی نمائندے ڈاکٹر ملان ہندوستانی نمائندوں کے خیالات مجلس منتخبہ کے سامنے
پیش کردیں اور کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ خود مجوزہ مسودہ میں ضروری ترمیمات
کردیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واضح کردیا گیا کہ کانفرنس کے سمجھوتے کا دار و مدار
اسی پر ہے کہ اس خاص مسئلہ میں ہندوستانی نمائندوں کی تجاویز کو مسترد نہ کیا جائے۔
اس مسئلہ پر سب سے زیادہ اختلافات تھے لیکن بالآخر اس پر بھی سمجھوتہ ہوگیا جو بحالات
موجودہ کافی سمجھا جاتا ہے۔
حکومت ہند کا ایک نمائندہ آئندہ بھی بحیثیت ایجنٹ کے جنوبی افریقہ میں رہے گا۔ مسٹر ریڈی کی
میعاد ختم ہوگئی ہے لیکن ان کے جانشین کا تقرر ابھی تک عمل میں نہیں آیا ہے۔

اس بغاوت کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی ہے لیکن جنوبی افریقہ کے ترکیوں کو یہ خطرہ اندیشہ ہے کہ پچھلے سمجھوتوں کی طرح سے یہ سمجھوتہ بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے گا۔ ہندوستان میں ناقابلِ معافی ذات اور مذہب کے اختلافات پر فرنگیوں کو ہنسی آتی ہے لیکن خود ان کی بدترین ذہنیت اور نسل و رنگ کے تعصب کا جو حال ہے وہ آج بھی جنوبی افریقہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستانیوں کو برطانوی پارلیمنٹ سے بجا طور پر شکایت ہے کہ ہندوستان میں تو بات بات پر صوبے کے گورنر سے بیکر ملک معظم تک سب اپنے "تصدیق" اور تردید کے اختیارات استعمال کرتے ہیں لیکن گو یہ سب اختیارات دیگر نوآبادیات کے متعلق بھی پارلیمنٹ اور ملک معظم کو حاصل ہیں لیکن آج تک کبھی ان کا استعمال ہندوستانیوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے نہیں کیا گیا حالانکہ امپیریل کانفرنس کی قرارداد کے صریحاً خلاف ہندوستانیوں کے ساتھ طرح طرح کی قانونی اور غیر قانونی زیادتیاں کی جاتی ہیں۔

اسلامی ممالک

حکومت فلسطین | ۱۹۳۱ء کی روئیداد مردم شماری کی رو سے فلسطین میں مسلم اور غیر مسلم آبادی کے شمارہ اعداد یہ ہیں:-

مسلمان	۷۵۹۹۵۲
یہود	۱۷۵۰۰۶
عیسائی	۹۰۶۰۷

۱۹۲۲ء کی نسبت یہود کی تعداد اب دگنی ہوگئی ہے (یعنی ۸۳۷۹۴ سے ۱۷۵۰۰۶) لیکن یہودیوں کے لئے یہ امر کچھ بہت زیادہ قابل اطمینان نہیں اس لئے کہ گزشتہ ۹ سال میں مسلمانوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا ہے وہ یہود کی کل تعداد کے تقریباً برابر ہے (یہود کی کل تعداد ۱۷۵۰۰۶ ہے۔ ۱۹۲۲ء میں مسلمانوں کی تعداد ۵۹۰۸۹۰ تھی اور اب ۷۵۹۹۵۲ ہے۔ گویا ان کی تعداد میں ۱۶۹۰۶۲ کا اضافہ ہوا ہے)۔ لہٰذا محض آبادی کے مسئلے میں مسلمانوں کو یہود سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ فلسطین کی کل آبادی ۱۰۳۵۱۵۴ ہے جس میں سے صرف بیت المقدس میں ۹۰۵۲۶

[illegible] تحریک فلسطین کو یہود کا "قومی وطن" بنانے میں
[illegible] مسلمانان فلسطین اپنے ہمت و استقلال کی بدولت برطانوی شہنشاہیت
[illegible] تمام [illegible] بازیوں کا خاتمہ کر دیں گے۔

اس سلسلے میں ایک تازہ خبر یہ آئی ہے کہ عرب رہنماؤں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ فلسطین کو
دو حصوں پر تقسیم کر دیا جائے اور ان میں سے ایک میں مسلمانوں اور دوسرے میں یہود کو حق خود اختیاری
حاصل ہو۔ پھر ان دونوں حصوں کو ملا کر ایک متحدہ ریاست قائم کی جائے [illegible] یہود دونوں اس
میں شامل ہوں اور اگر اس تجویز پر کامیابی کے ساتھ عمل [illegible]
ے جو عراق کو حاصل ہے انجمن اقوام میں شرکت حاصل کر
کہ یہود کا ایک فرقہ اس تجویز کا سخت مخالف ہے۔ اس نے
کیا ہے کہ حکومت برطانیہ نے موجودہ شہنشاہی کے لیے یہودی [illegible]
کیوں کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ طرفداران صیہونیت جو تمام فلسطین پر تغلب حاصل کرنے کی آرزو رکھتے
ہیں اس امر پر کیونکر آمادہ ہو سکتے ہیں کہ ان کے خانہ ساز "وطن" کا ایک حصہ صیہونی دستبرد سے
آزاد ہو جائے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ فلسطین برطانوی انتداب کی بجائے براہ راست انجمن اقوام کے زیر حکومت
آ جائے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں نو لاکھ آبادی میں سات لاکھ کے مقابلے پر زبردستی ڈیڑھ لاکھ یہودی
ٹھونس دیے گئے ہوں مٹھی بھر اجنبیوں کی خاطر ملک کے اصلی باشندوں کو حق ملکیت سے محروم کرنے
کی تجویز پیش کرنا مغربی دستور و سیاست و فتنہ ہائے رعایات و حقوق کے ماتحت ہی ممکن
ہے۔ البتہ یہ خیال کہ سیاسیین مصر و ہندوستان تجزیہ فلسطین کی حمایت کر رہے ہیں سراسر لغو ہے مصریوں
کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن مسلمانان ہندوستان جن کی ہر جماعت آزادی مقامات
مقدسہ کا حلف اٹھا چکی ہے کیوں کر گوارا کر سکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی تجویز پر صاد کریں جو فلسطین کے حقیقی
استقلال اور حریت کے منافی ہو۔

ممالک اسلامی کی مالی حالت | اس وقت دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جو مالی دشواریوں میں

چونکہ ہر ممالک اسلامیہ کی معاشی حالت پہلے ہی کچھ اچھی نہیں تھی اور جہاں آقایان مغرب کی حرص غصب و
اجارہ داری کی بدولت آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ پیدا ہوتا رہتا ہے دنیا کی عام اقتصادی کشمکش کی وجہ
شدت کے ساتھ پریشان ہیں۔ ہم نے جا بجا سے ان صفحات میں بار بار ان کوششوں کی طرف
اشارہ کیا جو دول مغرب میں سے کسی نہ کسی کی جانب سے ایران، ترکی، عرب، افغانستان — باقی
ممالک کا نام لینا بیکار ہے — میں معاشی جبر و تغلب کا کوئی نہ کوئی ذریعہ پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔

چونکہ یہ امر مسلم ہے کہ جس طرح ہندوستان کا ہر مسلمان اپنے پڑوس کے بنیے کا دست نگر ہے اسی طرح
ہر ممالک اسلامی کسی نہ کسی مغربی بنیے کے شرمندۂ احسان۔ لہذا جب کبھی ان بنیوں کے معاملات کوئی
اچھی یا بری صورت اختیار کرتے ہیں تو اس کا اثر دول اسلامی پر ضرور پڑتا ہے۔ اس وقت دنیا کا سارا
معاشی نظام اہل مغرب کے ہاتھوں میں ہے۔ بنک ان کے ہیں، اندوختے ان کے پاس ہیں، چاندی
اور سونے کے وہ مالک ہیں، معیار طلائی کی پابندی یا اس سے آزادی ان کے اختیار میں ہے، دنیا کے ہر ملک
کا سکہ ان کے سکوں سے وابستہ ہے۔ ان کی حالت اچھی ہوتی ہے تو تجارت، کاروبار، لین دین،
صنعت و حرفت سب کی حالت اچھی ہوتی ہے لیکن آج کل یہ لوگ خود اپنی پریشانیوں میں مبتلا
ہیں۔ تاوان، قرضہ، تخفیف میزانیے کا عدم تعاون، مقاطعہ، بے روزگاری یہ اور اس قسم کے مسائل
ہیں جنہوں نے ان کی راہ میں طرح طرح کی دقتیں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس سے دنیا کی معاشی حالت پر
جو خراب اثر پڑا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ممالک اسلامیہ کی معاشی حالت ہمیشہ سے پست چلی آتی تھی۔
اب اس میں اس عام کساد بازاری کا جس سے دنیا کا کوئی حصہ خالی نہیں، اور اضافہ ہوا۔ ممالک اسلام
کو بھی دنیا کی تمام حکومتوں کی طرح اپنے میزانیوں کو درست کرنا ہے۔ اس کے لئے آمدنی کے جدید وسائل
اور محاصل کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ ان کو بین الاقوامی ذمہ داریاں پوری کرنا ہیں، اپنے ملک
کی معاشی ترقی کے لئے صنعت و حرفت کو فروغ دینا ہے اور یہ سب قرض لئے بغیر ناممکن ہے لیکن قرضہ
کس سے لیا جائے، آج کل کی دنیا میں سیاست اور معیشت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دنیا کی کوئی
قوم بغیر کسی سیاسی غرض کے کسی دوسری قوم کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار نہیں۔ خوش قسمتی سے ممالک اسلام
اپنی ذمہ داریوں سے بے خبر نہیں۔ انھوں نے اس باب میں جو ذرائع عمل اختیار کئے ہیں ان کا اندازہ
ذیل کی سطور سے ہو سکتا ہے۔

جمہوریہ ترکیہ :۔ ہم نے جامعہ کے کسی گزشتہ پرچے میں عرض کیا تھا کہ حکومت انگورہ روسی تجارت
اور روسی مصنوعات کی درآمد کو روکنے کے لئے اس پر خاص پابندیاں عائد کر رہی ہے۔ حکومت ہر دو ماہ
کے لئے درآمد کی تعداد مقرر کر دیتی ہے۔ اس تدبیر سے خاطر خواہ نتائج مترتب ہوئے ہیں۔ روسی مصنوعات
کی آمد پہلے کی نسبت بہت کم ہو گئی ہے اور تین سو روسی افسر جو اپنے بال بچوں سمیت ترکی میں مقیم تھے
اب واپس جا رہے ہیں۔

ایران :۔ ایران اور روس کے تجارتی تعلقات کے متعلق ہم نے جامعہ کی کسی پچھلی اشاعت میں
ایک طویل شذرہ سپرد قلم کیا تھا۔ اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ دولت ایران نے خارجی تجارت کے
تباہ کن اثرات کو روکنے کے لئے یہ قانون بنا دیا ہے کہ بجز سرکار ...
مال ایران میں نہیں آسکتا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ...
عمل نہیں کر سکی۔ امریکہ کو اس پابندی سے آزاد کر دیا گیا ...
مقابلے میں ۱۰ فیصدی کی کمی ہو گئی ہے لیکن اگر قیمت کا خیال ...
پہنچ جاتا ہے۔

مصر :۔ مصر کی حالت ایران کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ سال نو کا مصری میزانیہ اگرچہ ۱۰ کی بجائے
اٹھارہ کروڑ اسٹرلنگ پر قائم ہوا ہے لیکن حکومت کے پاس ۱۵ کروڑ اسٹرلنگ بطور زر محفوظ موجود ہے۔
روئی کی برآمد کی مقدار بھی سال گزشتہ کی نسبت تیس فی صدی بڑھ گئی ہے۔

عراق :۔ نوری پاشا وزیر اعظم کے اس اعلان کے مطابق جو عراق کے تیل کی برآمد کے متعلق تھا
اور جس کا تذکرہ جامعہ کے پچھلے نمبر میں آچکا ہے حکومت عراق اور ایک انگریزی کمپنی کے درمیان ایک
معاہدہ مرتب ہوا ہے اور اس کے ماتحت جو رعایت حکومت برطانیہ کو دی گئی ہے اس میں بین الاقوامی مفاد کا بھی
خیال رکھا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جرمنی، اٹلی اور فرانس اس معاہدے سے بے تعلق نہیں ہوں گے۔ کمپنی
کو ۷۵ برس تک تیل کی برآمد کا اجارہ حاصل ہوگا اور اس کے لئے دریائے دجلہ کے مغربی کنارے دو سو
مربع میل کا رقبہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔

عرب :۔ حکومت نجد و حجاز کے متعلق ایک عرصے سے یہ خبر مشہور تھی کہ سلطان ابن سعود دولت
برطانیہ سے کچھ روپیہ قرض لینا چاہتے ہیں جس کے عوض میں انگریزوں کو حجاز میں خاص مراعات حاصل

کچھ کہہ سکتے ہیں جو انگریزی سیاست کے مخالف ہیں اس لئے مسلمان جو عالم اسلامی وغیرہ سے ہمدردی رکھتے ہیں ۔ حکومت ہے کہ حکومت نجد نے اس خبر کی تردید کردی ہے لیکن جو اسلامی سلطنت کی طرف سے شائع ہوا ہے اس کا آخری حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا مطلب ہے کہ حکومت نجد بجائے کسی مغربی قوم کے کسی دولتمند مسلمان سے قرض لینے کی خواہشمند ہے۔ اگر جلالۃ الملک کی حکومت واقعی سنجیدگی کے ساتھ اس تجویز پر غور کر رہی ہے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جلالۃ الملک [illegible] سوا تمام دنیا کو جاہل سمجھتے ہیں اور یہ کوئی بہت اچھی بات نہیں ہے اس لئے کہ اول تو ہماری دانست میں ایسے مسلمانوں کا وجود عنقا ہے جو کسی حکومت کو قرض دے سکیں اور اگر ہو بھی تو ان کی یہ کاروائی بین الاقوامی ذمہ داریوں سے خالی نہیں ہو سکتی ۔ اگر اس قسم کا کوئی مسلمان واقعی دنیا میں موجود ہو تو اس کے انکشاف کا سہرا ہز میجسٹی عبدالعزیز ابن سعود سلطان نجد و ملحقاتہا کے سر ہوگا اور اس کے لئے مسلمانان عالم جلالت مآب کو جس قدر بھی مبارکباد دیں کم ہے۔

وزارت معارف افغانستان کی تعلیمی روئیداد | جریدۂ اصلاح کی تازہ اشاعتوں سے معلوم ہوا ہے کہ شروع ماہ جولائی میں مدارس کابل کے تقسیم انعامات کی رسم نہایت دھوم دھام سے منائی گئی۔ اس موقع پر خود اعلیٰحضرت شہریار غازی بنفس نفیس تشریف رکھتے تھے اور ممدوح کے علاوہ وزیر معارف اور دوسرے اعیان و عمائد مملکت بھی موجود تھے ۔ اول والی بال کا میچ ہوا (مکتب امانی اور امانیہ کے درمیان) پھر تلاوت قرآن کے بعد آقائے محمد کبیر خان مہتمم مکتب حبیبیہ نے اعلیٰحضرت کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا جس کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:-

هزار شکر که از طالع نکو فرجام — مشرفیم بدربار شاه با اکرام
شهی که گشت ز تدبیر ناجیٔ ملت — ز سیل حادثهٔ انقلاب فتنه خرام
رهی اوست که احیائے ملک و ملت شد — زفرض اوست همین احتشام عوام
همین زمین قدوم مبارکش از سر — گسسته رشتهٔ تامین خلق یافت نظام
اگرچه ره بترقی از وست جمله امور — نموده سوئے معارف وے توجهٔ تام
بماست فرض که دانیم قدر این نعمت — ز روئے صدق نمائیم شکر این انعام

وزیر معارف کی رپورٹ کے بعد اعلیحضرت نے انعامات تقسیم کئے اور موقعہ کی مناسبت سے
بعض بیش بہا ایک تقریر فرمائی۔

وزیر معارف کی روئیداد کا ملخص یہ ہے کہ سال گزشتہ حکومت افغانستان نے تین لاکھ روپیہ
اشاعت تعلیم پر صرف کیا۔ دارالامان کی اراضی اور باغات سے جو آمدنی حاصل ہوئی ہے وہ سب تعلیم کے
لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اس کے علاوہ ہے۔ تعلیمی حالت باعتبار معلمین و متعلمین دن بدن رو بہ اصلاح
ہے طلبا کی تعداد بڑھ گئی ہے اور بہتر معلموں کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ انقلاب کے زمانے میں
جو عمارات منہدم ہو گئی تھیں ان کی از سر نو مرمت کرائی گئی ہے۔ بعض مدارس میں اضافہ ہوا ہے اور
حتی الوسع ان کی تزئین و آرائش کی کوشش کی گئی ہے۔ سامان تعلیم کے علاوہ نصاب میں شعبہ ہائے
نجاری و معماری کو بڑھا دیا گیا ہے۔ مکتب زراعت ا
قطغن، بدخشاں، ہرات، مزار شریف اور سمت مشرقی میں
سمت مشرقی میں ایک اور مدرسہ نجم المدارس کے نام سے
بے معلموں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ بوائے اسکاؤٹس یعنی کشافاں
ہو رہی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے مدارس کے علاوہ تمام مساجد میں تعلیم کا انتظام ہے۔ وزارت معارف نے
صیغۂ تالیف و اشاعت سے بھی غفلت نہیں برتی۔ صیغۂ مذکور نے اس وقت تک ۴۲ کتابیں شائع کی
ہیں۔ بیرونی ممالک میں جو افغان طلبا مختلف مضامین مثلاً زراعت، مہندسی، تعمیرات، ریڈیو، تار برقی،
طب، دنداں سازی، آبرسانی، عسکریات وغیرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کی تعداد ۰۴ ہے۔

اعلیحضرت شہریار غازی نے اس روئیداد پر اطمینان کا اظہار کیا لیکن وزارت معارف کو ہدایت
کی کہ ابھی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے اسے اپنی مساعی میں اور زیادہ اجتہاد اور سرگرمی سے کام لینا
پڑیگا۔ جلالت مآب نے یہ بھی فرمایا کہ ان کا تعلیمی نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ افغان طلبا مذہب
کے پابند اور خدمت ملک و ملت کی آرزو رکھتے ہوں۔

ممالک غیر

برطانیہ — ناظرین کو معلوم ہے کہ برطانیہ نے ستمبر گذشتہ میں پونڈ اور سونے کا تعلق توڑا، پھر دسمبر سے اکثر اشیاء کی درآمد پر تامینی محصول لگائے۔ لیکن ان دونوں غیر معمولی معاشی کارروائیوں کے جو نتائج نظری اعتبار سے رونما ہونے چاہیے تھے وہ ہنوز وضاحت کے ساتھ ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ ان دونوں باتوں کا نتیجہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ انگلستان میں درآمد اشیاء میں معتدبہ کمی ہو، برآمد اشیاء خوب بڑھے اور ملک میں قیمتیں بڑھیں اور تجارت کی کساد بازاری دور ہو۔ لیکن واقعی صورت حال نے اس نظری نقشہ کا پورا پورا ساتھ نہیں دیا۔ ستمبر میں پونڈ کو سونے سے جدا کرنے کا نتیجہ یہ تو ہوا کہ پونڈ کی قدر میں باعتبار زر کوئی ایک تہائی کی کمی ہو گئی لیکن تھوک فروشی کی قیمتیں ستمبر میں اگر ۹۹ تھیں تو ستمبر میں ۱۰۶ تک بڑھیں اور دسمبر میں پھر کچھ گھٹ کر ۱۰۶ سے کم ہو گئیں۔ اپریل میں ۹۶ سے گھٹ کر ۹۶ رہ گئیں۔ قیمتوں میں بھی جتنی امید تھی اتنا اضافہ نہیں ہوا۔ تجارت پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ سنہ ۱۹۳۱ء کے پہلے نو مہینوں میں انگلستان کی اوسط ماہوار درآمد ۶۹ ملین پونڈ تھی، اور پونڈ کے سونے سے جدا ہونے کے بعد آخری تین مہینوں میں ۷۶ ملین پونڈ۔ البتہ جنوری میں تامینی محصول لگنے کے بعد یکایک درآمد میں کوئی ۲۴ ملین پونڈ کی کمی ہوئی۔ لیکن ایک تو جنوری سنہ ۳۱ء میں بھی کوئی ۱۵ ملین پونڈ کی کمی ہوئی تھی، دوسرے محاصل درآمد کی خبر پا کر لوگوں نے جلد جلد مال نکالیا تھا اس لئے جنوری سنہ ۳۲ء میں آنے والا مال دراصل نومبر اور دسمبر میں انگلستان پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ اعداد کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۴ ملین میں سے صرف ۵ ملین کی کمی ان اشیاء کی درآمد میں ہوئی ہے جن پر تامینی محصول لگایا گیا ہے باقی کمی دوسری چیزوں کی ہے۔ ستمبر کے بعد کی برآمد کے اعداد سے بھی متوقع نتائج کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ اعداد یہ ہیں:۔

سنہ	اکتوبر	نومبر	دسمبر	جنوری
برآمد سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء (ملین پونڈ)	۵۴٫۱	۵۰٫۱	۴۳٫۷	۴۳٫۷
برآمد سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء (ملین پونڈ)	۳۸٫۱	۳۶٫۸	۳۷٫۷	۳۶٫۴

یہ نتائج ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ انگلستان کی مالی حالت کے جلد درست ہوجانے کی توقع کیجاسکے کہ اسی غرض کے لیے "متحدہ" "قومی حکومت" قائم کی گئی تھی۔ اور جب پونڈ کو سونے سے جدا کرکے اور آزاد تجارت کی روایتی راہ کو چھوڑ کر بھی یہ اہم مقصد حاصل نہ ہوا تو غالباً اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ "قومی حکومت" اپنی موجودہ شکل میں زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے چنانچہ حال ہی میں پارلیمنٹ کی ایک جگہ پر مزدور جماعت کے ایک رکن کا انتخاب پتہ دیتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر بدلنے والا ہے۔

موجودہ وزارت قومی میں اشتراک عمل کے امکانات زیادہ دن تک چلتے نظر نہیں آتے۔ خود وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ کی حالت بہت قابل رحم ہے۔ یہ نام کو وزیر اعظم ہیں لیکن پہلے دن سے کنزرویٹو جماعت ان کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کر رہی ہے مثلاً جنوری میں ...
کہ اس رفاقت میں لیبر پارٹی کو چھوڑا تھا ... اٹارنی جنرل
انھیں عام انتخاب میں شکست ہوگئی تھی۔ عام دستور کے ...
ایسی جگہ خالی کردینی چاہیے تھی جس پر ان کا انتخاب یقینی ہو ...
کنزرویٹو طامس انس کپ کو اٹارنی جنرل بنایا گیا اور ان کی جو جگہ خالی ہوئی اس پر بھی ایک کنزرویٹو ... سر فرینک مری مین بھیجے گئے۔ پھر تاہینی محاصل کے قانون کے بارے میں بہت کچھ اختلافات رہے اور وزارت برطانوی کی متحدہ ذمہ داری کا مسلک سپرد طاق نسیاں کیا گیا۔ اور برطانوی وزرا نے برطانوی وزارت کے پیش کردہ قانون کے خلاف پارلیمنٹ میں تقریریں کیں۔ ہندوستان اور آئرستان کے مسائل کے متعلق بھی اس قدر مختلف الخیال جماعتوں کا باہمی تعاون زیادہ قرین قیاس نہیں ہے۔

جب وزارت کے باہمی تعاون کا یہ حال ہو اور ان کی تدابیر قوم کی مالی حالت کو بہتر بنانے میں واضح نتائج پیدا نہ کرسکیں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر آئندہ ۶ مہینے کے اندر اندر موجودہ وزارت ٹوٹے اور حکومت کی تشکیل نو کے مسئلہ سے انگلستان کے مدبر دوچار ہوں۔

<u>آئرستان</u> | ڈی ویلرا کے انتخاب پر پچھلی اشاعت میں کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اس انتخاب عام سے پہلے آئرستانی ڈیل (آئرستانی پارلیمنٹ) میں نشستوں کی تقسیم یوں تھی کہ ۶۵ کاسگریو وزیر اعظم کی پارٹی کے اراکین تھے اور ان کی حمایت میں ۱۲ غیر جانبدار، ۶ کسان، اور ۲ غیر جانبدار مزدور جماعت کے اراکین تھے کل ۸۵۔

[illegible] ۸۰ فیانا فیل یعنی ملی میلر کی جماعت کے رکن تھے، ۱۰ مزدور اور ایک غیر جانبدار کل ۹۰۔
[illegible] فیانا فیل کے ۴۲ آدمی ہیں اس کی حمایت میں ۸ مزدور کل ۵۰۔
[illegible] جماعت میں ۴۸ کوسگریو کی جماعت کے لوگ ہیں اور ۱۰ غیر جانبدار کل ۵۳۔

نئی مجلس کی اکثریت کا دارومدار مزدور جماعت کے اراکین پر ہے اور مزدور اپنی اس اہمیت کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ مزدور جماعت اور فیانا فیل کے معاشی پروگرام میں بہت کچھ ہم آہنگی ہے لیکن شاید خالص سیاسی یا جذباتی معاملات میں مزدور آخر وقت تک ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوں۔

جرمنی | مارچ کے جائزہ میں اس خیال کا یقین کے ساتھ اظہار کیا گیا تھا کہ گو فان ہنڈنبرگ پہلے انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن دوسرے انتخاب میں ان کا منتخب ہونا یقینی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس موقع پر بجائے پانچ امیدواروں کے صرف تین امیدوار میدان میں تھے۔ ہٹلر قومی اشتراکیوں اور بعض دوسرے قوم پرست گروہوں کی طرف سے، تھیلمان اصلی اشتراکیوں (کمیونسٹوں) کی طرف سے، اور فان ہنڈنبرگ تمام دوسری جماعتوں کی جانب سے۔ منتخب فان ہنڈنبرگ ہوئے اور اس طرح کہ انہیں منتخب کرنے والوں کی تعداد دوسرے دونوں امیدواروں کی مجموعی رائیوں سے زیادہ تھی۔ جرمنی کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے فان ہنڈنبرگ کے لئے یہ بڑی کامیابی تھی۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہٹلر گو منتخب نہ ہو سکا مگر کامیابی اسے بھی بڑی حاصل ہوئی۔ فان ہنڈنبرگ جیسی شخصیت کے مقابلہ میں ایک کروڑ تیس لاکھ رائیں حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ قومی اشتراکیت کی تحریک روز بروز ترقی کر رہی ہے اور اگر آج نہیں تو کچھ دنوں بعد اس جماعت کا برسر اقتدار آنا لازمی امر ہے۔

اس دعوے کی تائید مجالس قانون ساز کے ان انتخابات سے بھی ہوتی ہے جو ابھی اسی مہینے جرمنی کی پانچ ریاستوں میں منعقد ہوئے۔ ان ریاستوں میں پرشا کو قدرۃً بہت اہمیت حاصل ہے۔ جرمن قول کے مطابق جو پرشا پر حکومت کرتا ہے وہی جرمنی کا اصلی حاکم ہوتا ہے۔ اب تک اس ریاست میں اعتدال پسند اشتراکی بعض دوسری جماعتوں کی مدد سے برسر اقتدار تھے مگر نئے انتخابات نے صورت حال بالکل بدل دی ہے۔ جہاں اب تک ہٹلر کے مؤیدین کی تعداد ۹ تھی اب ۱۶۰ سے بھی اوپر پہنچ گئی ہے۔ گو تمام دوسری جماعتوں کی مجموعی تعداد اس سے زیادہ ہے پھر بھی اس کا امکان ہے کہ قومی اشتراکی بعض

صرف اسی صورت سے ممکن ہے کہ وہ پیش ان کے ہم خیال ہیں حکومت قائم کرسکیں ۔ اگر انتہا پسند اشتراکیوں نے اپنے تمام وعدوں کے خلاف اعتدال پسندوں کا ساتھ دیا تب تو بیشک پرشا میں موجودہ حکومت قائم رہ سکتی ہے ورنہ اور کوئی صورت نہیں ۔

اگر اس وقت پرشا میں قومی اشتراکی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر پرشا اور مرکزی حکومت میں پیچیدگیوں کا پیدا ہونا لازمی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر جرمنی کے وزیراعظم ہر بیونگ کو مجبوراً مرکزی مجلس قانون ساز کے بھی نئے انتخابات کرانا پڑیں ۔ نئے انتخابات کے یقینی طور پر معنی ہوں گے قومی اشتراکیوں کی کامیابی ۔ اور قومی اشتراکیوں کی کامیابی کے معنی ہوں گے ایک طرف فرانس اور دوسرے ممالک سے ناچاقی اور دوسری طرف اندرون ملک میں نظام جمہوری کی تخریب ۔ مگر یہ صرف اس صورت میں ہے جب یہ جماعت اپنے وعدے

آج قومی اشتراکی کر رہے ہیں ان کا پورا کرنا قدرتی ناممکنات

جماعت کا رسوا ہونا ضروری ہے اور اس کی رسوائی کے

جرمنی کی جو موجودہ حالت ہے اس میں قدرتی طور پر انتہا پسند

اشتراکی یا پھر کمیونسٹ !

چین و جاپان | جیسا کہ پچھلے مہینہ لکھا جا چکا ہے جاپان نے شنگھائی کے علاقہ میں تو انجمن اقوام کی قرارداد کے مطابق جنگی کارروائیاں بند کرنے کا فیصلہ کر دیا لیکن منچوریا پر اپنے اثر میں ذرا سی کمی بھی اسے گوارا نہیں ۔ جاپان نے ایک خودمختار منچوری حکومت کا اعلان کرا دیا ہے اور معزول شاہ چین کو جس کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں صدر جمہوریہ بنا کر خود اس ملک پر حکمراں ہے ۔

امریکہ اور دول یورپ اس صورت حال کو پسند نہیں کرتے مگر جاپان انہیں کی سنت پر تو چل رہا ہے اس لئے ناپسندیدگی کے اظہار میں زور کہاں سے آئے ؟ چین کی تقسیم کا منصوبہ جاپان سے پہلے دول یورپ نے بنایا تھا ۔ کبھی مراعات معاشی کی شکل میں ، کبھی دور افتادہ صوبوں مثلاً تبت اور منگولیا پر تفوق کی صورت میں ، کہیں ٹھیکوں کے نام سے ، کہیں حلقہائے اثر کے روپ میں ۔ متعلق کی بات تھی کہ جاپان کو اس تقسیم میں روس کے وارث کی حیثیت سے حصہ ملا اور منچوریا کو جاپان کی

[illegible] وی بنانے کا منصوبہ دراصل جاپان کو اسی تقسیم کے پروگرام کے ایک حصہ کی تکمیل ہے۔

امریکہ اس کی سخت مخالفت کر رہا ہے اگرچہ سنہ ۱۹۰۳ء میں کولمبیا سے پناما کی بغاوت میں ریاستہائے متحدہ کا جو رویہ رہا تھا اسے جاپان بطور نظیر پیش کرتا ہے۔ انگریز اس نظیر کو وزنی بتلاتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ تبت کے متعلق انگریزوں کے جو منصوبے ہیں وہ اس باب میں ان کے لئے زیادہ وزنی ہوں گے!

روس نے بھی منچوریا کی نئی حکومت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اگرچہ چینی مشرقی ریلوے کے چینی صدر مو کو جب جاپانیوں نے اس لئے نکال دیا کہ اس نے نئی حکومت کے احکام نہ مانے تو روس نے اسکی برطرفی کو منظور کرلیا۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ فوجی نقل و حرکت کے سلسلہ میں روس کو احتجاج کا موقع ملا مگر وہ خاموش رہا۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ روس کو منچوریا میں جاپان کا اس درجہ تسلط نہیں بھاتا۔ شروع مارچ میں روسی حکومت کے سرکاری اخبار نے دو دستاویزیں شائع کیں جن کے متعلق خیال ہے کہ ممتاز جاپانی سپہ سالاروں نے تیار کی تھیں اور جن میں روسی علاقہ پر حملہ آور ہونے کے منصوبوں کی تفصیل ہے۔ اس اخبار نے پھر ایک افتتاحیہ لکھا کہ روس ہر چند کہ غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے لیکن اگر اس کے خلاف یہ منصوبے بنائے گئے تو لڑنے پر بھی آمادہ ہے۔ یہ مضمون تمام روس میں لاسلکی کے ذریعہ پھیلایا گیا اور تمام روسی اخباروں نے اسے شائع کیا۔ اس کے بعد سے منچوری سرحد کے قریب روسی فوجیں جمع ہو رہی ہیں اور چونکہ "مشرق بعید کی ریلوے" کے سلسلہ میں روس کے اغراض جاپان سے ٹکراتے ہیں اور ادھر جاپان کا فوجی دستہ ولاڈی واسٹک پر دانت ہے اس لئے ممکن ہے کچھ عرصہ بعد مخالفت کے یہ شرارے جنگ کی شکل میں ظاہر ہوں۔

شذرات

اردو اکادمی کا جلسہ جو پچھلے مہینے ملتوی ہو گیا تھا ۹ اپریل کو منعقد ہوا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دو جلسے ہوئے پہلا ۵ بجے شام سے ۹ بجے تک دوسرا ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک۔ حاضرین کی تعداد اس مرتبہ پچھلے دو جلسوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ باہر سے بھی پہلے سے زیادہ لوگ آئے تھے اور دہلی کے اہلِ ذوق بھی بہت کثرت سے موجود تھے۔

پہلے جلسے میں مولانا اسلم جیراجپوری نے "[illegible]"
سے ایک دلچسپ مقالہ پڑھا جس کا نصف حصہ اس [illegible]
جلسے کی صدارت مولانا محمد سورتی صاحب کرنے والے [illegible]
لے جانا پڑا۔ حسن اتفاق سے ان کے مایۂ ناز شاگرد ڈاکٹر [illegible]
علوم اسلامی کی ڈگری لے کر آئے ہیں موجود تھے اور وہی جناب شیخ ا[illegible] صدر بنائے گئے۔ فاضل مقرر کی تقریر ختم ہونے کے بعد جناب صدر نے ایک مختصر سی تقریر میں موضوع کلام پر مزید روشنی ڈالی اور جلسہ دونوں حضرات کے شکریے پر ختم ہوا۔

پہلے جلسے کے بعد کسی قدر وقفے سے دوسرا جلسہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ "ہندوستانی یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم اجتماعی اور انفرادی دونوں پہلوؤں سے صحیح نشو و نما میں مدد دینے کے بجائے اس میں رکاوٹ ڈالتی ہے"۔
اجتماعی حیثیت سے یونیورسٹی کا فرض یہ ہے کہ قومی تمدن اور قومی روایات کو محفوظ رکھے، ان میں زمانے کے رنگ اور ضرورت کے مطابق تجدید اور اصلاح کرے، تخلیقی قوت سے کام لے کر ان کی حدود کو وسعت دے اور یہ سارا خزانہ آیندہ نسلوں کے سپرد کر دے۔ مگر ہماری یونیورسٹیاں قومی تمدن اور قومی روایات کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتیں۔ اور اگر کرتی بھی ہیں تو اسے حفاظت کے لائق نہیں بلکہ مٹا دینے

سکے اِلا کے تھیں۔ انھوں نے مذہب کو جو ہر قوم خصوصاً ہندوستانی قوم کی زندگی اور تعلیم کا مرکز ہونا چاہیے اپنے مدارس سے خارج کر دیا ہے اور اس کی طرف سے ایسی بے حسی پیدا کر دی ہے جو لامذہبی سے بھی بدتر ہے۔ انھوں نے ملکی زبانوں اور ان کے ادب کو اپنی محفل میں بار نہیں دیا اور اگر دیا بھی تو اسی ذلت اور تحقیر کے ساتھ جتنی اونچی ذات والے اچھوتوں کی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ہاں کے علوم و فنون کو کبھی نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا بلکہ محض مغربی علوم کو پڑھنے اور پڑھانے کے قابل سمجھا اور وہ بھی اجتہادانہ نظر سے نہیں بلکہ محض نقلی اور تقلیدی طور پر۔ علمی تحقیق درکنار ان سے اتنا بھی تو نہ ہو سکا کہ جدید علوم کو اپنے ملک کی زبانوں میں منتقل کر دیتیں تاکہ لوگ عام طور پر ان سے فائدہ اٹھا سکتے۔ سیاسی آزادی اور معاشرتی اور معاشی اصلاح کی کوششوں میں رہنمائی کرنا ایک طرف انھوں نے ہمیشہ ارباب حکومت کے اشارے سے ان کوششوں کی مخالفت کی اور انھیں بے جا اور مضر ثابت کرنے کے لیے منطق کے گلے پر چھری پھیری۔

انفرادی پہلو سے دیکھیے تو یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں کے کل قوائے ذہنی کی تربیت کر سکے خصوصاً ان میں تعمیری تنقید اور آزادی فکر کا ملکہ پیدا کر سکے، ان کے ذوق جمال کی صحیح تربیت کر سکے اور ان کے آئینۂ اخلاق کو علم کی صیقل سے چمکائے۔ ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ عموماً ان صفات سے خود ہی عاری ہوتے ہیں تا بہ دیگراں چہ رسد۔ تعمیری تنقید اور آزادی فکر کا یہ حال ہے کہ شاید ہی آج تک کسی یونیورسٹی کے پروفیسر نے کوئی کتاب لکھی ہو جس میں کسی علمی مسئلے میں مغربی علما سے مدلل طور پر اختلاف کرنے یا اپنی طرف سے کوئی رائے پیش کرنے کی جرأت کی ہو۔ ذوق جمال کی کیفیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اکثر حضرات کے کمرے ادنیٰ بازاری تصویروں سے آراستہ ہوتے ہیں یا ہو سکے آرٹ کا منہ چڑاتے ہیں۔ اب رہا اخلاق تو وہ مذہب کے ساتھ ہی علم و فضل کے ان دربار سے رخصت کر دیا گیا ہے اور ان کی خالص علمی فضا میں اس غیر علمی چیز کے لیے کہیں گنجائش نہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان حضرات کی تعلیم سے نوجوانوں کے انفرادی قوائے ذہنی کی نشو و نما پر کیا اثر پڑے گا۔

مجھ کی تقریر ختم ہونے پر خواجہ غلام السیدین صاحب تجویز کی تمہید کے لیے کھڑے ہوئے آپ نے فرمایا کہ بات کی تردید کے مختلف پہلو اور مختلف صورتیں ہے۔ مجھے جناب مجیب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم ناقص ہے اور اصلاح کی محتاج ہے۔ اس کی خرابیاں مجھے غالباً جناب

جس [illegible] اسی کی مثل کو میں بھی موصوف کی طرح ضروری سمجھتا ہوں مگر یہ مجھے تسلیم نہیں
کہ [illegible] ملک و قوم کے لئے مضر ہے۔ اس حد تک میں اس تجویز کا مخالف ہوں۔ مجموعی
[illegible] کسی چیز کے حسن و قبح یا فائدے اور ضرر کے اندازے کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ معیار کمال پر پرکھی
جائے اور جب وہ اس پر پوری نہ اترے تو کھوٹی سمجھ کر کھیر رد کر دی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی
دیکھنا چاہیے کہ زمانے کے لحاظ سے، امکانی صورتوں کے لحاظ سے، دوسری چیزوں کے مقابلے میں
اس چیز کی قدر و قیمت کیا ہے بعد پھر یہ کہ اس کے فوائد زیادہ ہیں یا نقصانات۔ موجودہ تعلیم جس زمانے
میں شروع ہوئی وہ ہمارے ملک کے لئے انتہائی تنزل کا زمانہ تھا۔ ہماری پستی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور
ایک بیرونی قوم ہم پر حاکم ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں جو مشرقی تعلیم رائج تھی [illegible] کا مجموعہ حقیقت [illegible]
ہو نہ اسی سے ثابت تھا کہ اس نے ہمیں ان دنوں کو پہنچایا
مایوسی کا غلبہ تھا کہ ہمارے قدیم تہذیب و تمدن کے جو عناصر
سنبھال کر رکھنے کا کسی کو حوصلہ نہ تھا۔ ادھر باہر سے جدید مغر[illegible]
سارے مشرق کو تہ آب کر دے گا۔ ایسی صورت میں کچھ تو حاکم قوم کی [illegible]
خواہش سے یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم کی بنیاد پڑی جس کا مرکز مغربی علوم کی تعلیم قرار دی گئی۔ ظاہر ہے
کہ یہ بہترین صورت نہیں تھی مگر مشکل یہ ہے کہ سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں تھی۔ اس وقت
سوال کشتی کے طوفان سے بچ کر پار لگنے کا نہیں تھا بلکہ محض اتنا تھا کہ کسی طرح وہ پانی پر قائم رہے۔
اب زمانہ بدلا ہے۔ ہمارے دل تنزل کے احساس اور ترقی کی آرزو سے بے چین ہیں۔ اگر سچ پوچھیے
تو اسی ناقص تعلیم کا طفیل ہے۔ سقراط جہل کے احساس کو علم کا پہلا زینہ سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک
تعلیم کا سب سے اہم مقصد یہی تھا کہ یہ احساس پیدا کیا جائے۔ یہ محض شاعری نہیں بلکہ گہرا فلسفیانہ نکتہ
ہے۔ تنزل کا احساس تبھی ممکن ہے جب ترقی کا نصب العین نظر کے سامنے ہو۔ موجودہ تعلیم میں لاکھ
خرابیاں ہوں مگر یہ بڑی خوبی ہے کہ اس نے خود اپنی خرابیوں کا احساس ہمارے دل میں پیدا کر دیا ہے۔
زندہ قوموں کے علوم اور ان کی زندگی کے مطالعے نے خواہ وہ کتنا ہی محدود ہو ہمارے دلوں میں زندگی
کا حوصلہ پھر سے ابھارا ہے اور یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اب رہی ہمارے مذہب و اخلاق اور ہماری قدیم
معاشرت کی بربادی اس کی ذمہ داری موجودہ تعلیم پر نہیں بلکہ اس گھن پر ہے جو ہماری زندگی کو پہلے

بلکہ ان کو شاہراہ پر لانے میں موجودہ تعلیم حائل نہیں ہوتی بلکہ مدد دیتی ہے۔
خواجہ صاحب کی پر مغز تقریر کے بعد ڈاکٹر سید احمد صاحب بریلوی، سید تجمل حسین صاحب، مولوی محمد الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر عبد العلیم صاحب احراری سب نے تجویز کی تائید میں دلچسپ تقریریں کیں خصوصاً سید تجمل حسین صاحب نے اپنے ظریفانہ چٹکلوں سے محفل کو کشت زعفران بنا دیا۔ افسوس ہے کہ خواجہ صاحب کو ہمارے مجمع میں کوئی تائید کرنے والا نہ ملا۔ اس اثنا میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ناسازی مزاج کے باعث تشریف لے گئے تھے اور یوں بھی چونکہ مخالف کی تقریر کے بعد کل تقریریں انکی تائید میں ہوئی تھیں اس لیے جواب کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی اس لئے جناب صدر نے معزز مقرروں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جلسہ برخاست کر دیا۔ عام اصول کے خلاف لوگوں سے تجویز کے متعلق رائیں نہیں لی گئیں کیونکہ اکادمی نے اپنے مباحثوں کا مقصد کسی کی فتح اور کسی کی شکست قرار نہیں دیا ہے بلکہ یہ کہ زیر بحث مسئلے کے ہر پہلو پر نظر ڈالی جائے اور سامعین کو بطور خود اس پر غور کرنے کی تحریک ہو۔

مباحثے کے دوران میں اور اس کے بعد اکثر حاضرین نے اس قدر جوش اور انہماک ظاہر کیا کہ اب اکادمی کے کارکنوں کا ارادہ ہے کہ ممکن ہو تو سال میں دو تین جلسے اس قسم کے منعقد کیا کریں۔ اگر اکادمی کے اراکین میں سے کوئی صاحب آیندہ اگست کے بعد آخر ستمبر یا اکتوبر میں کسی مسئلے پر کوئی تجویز پیش کر کے مباحثے کا آغاز کرنا چاہتے ہوں تو براہ کرم ناظم اکادمی کو اپنے نام نامی سے اور اپنی تجویز سے مطلع فرمائیں۔

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی۔

جلد ۱۸ — بابتہ ماہ مئی ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ "جامعہ" قرولباغ دہلی سے شائع کیا۔

مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر

انتظام

ملوک قدیم کے زمانہ میں مصر کی جو انتظامی حالت تھی اس کا کچھ حال نہیں معلوم ہو سکا بجز اس کے کہ وہاں زمین کی ملکیت کا دستور تھا اور زیادہ تر زمینیں کاہنوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے قبضہ میں تھیں جو کاشتکاروں اور فلاحوں سے پیداوار کا ایک بڑا حصہ لیتے تھے۔ عمالقہ کے عہد میں جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے وزیر ہوئے اور فرعون ابوفیس نے ان کے لئے اپنی کرسی سے صرف چار انگل چھوٹی کرسی بنوائی اور اس پر ان کو بٹھا کر ملک کے سیاہ وسفید کا پورا اختیار دیدیا تو انھوں نے قحط کے سات سالوں میں زمینداروں کے ہاتھوں سے جملہ زمینیں خرید لیں۔ پھر ان کو بقدر مناسب اس شرط پر جوتنے کے لئے دیدیں کہ پیداوار کا پانچواں حصہ حکومت لیا کرے گی۔

غالباً اسی عہد سے ملک مصر کی اراضی سرکاری قرار پاگئی اور بادشاہ اور رعایا کے درمیان سے زمینداروں کا طبقہ اٹھ گیا بجز ان امراء کے جن کو سلاطین کسی خدمت یا خوشنودی کے صلہ میں کوئی قطعۂ زمین انعام یا جاگیر میں دیدیں۔

چونکہ مصر کی سرزمین نہایت زرخیز ہے اس لئے وہاں کی خوشحالی کے ذکر سے تاریخیں بھری پڑی ہیں لیکن میلاد مسیح سے تیس سال قبل جب سے رومیوں نے وہاں قبضہ کیا وہ اس کی پیداوار کا ایک اچھا حصہ اپنے ملک کو لیجانے لگے۔ انھوں نے مصریوں کو حکومت میں بھی کوئی حصہ نہیں دیا اور ان کی ہر چیز، باغ، مویشی، اثاث البیت یہاں تک کہ راستہ سے گزرنے والوں اور قبرستان میں جانے والے مردوں سب پر محصول لگا دیا۔ ان وجوہ سے مصری محتاج اور مفلوک ہوگئے اور ان کی ساری علمی اور تاریخی شان جاتی رہی۔

عمرو بن عاص نے جب مصر کا انتظام کرنا شروع کیا تو سب سے پہلے باشندوں کی دلجمعی کی طرف توجہ فرمائی۔ ان کو ان کی جان ومال، اولاد، آبرو، دولت اور تجارت ہر چیز کی حفاظت کا پورا اطمینان

دلایا۔ مذہب اور رسوم میں آزادی بخشی۔ ظالمانہ قوانین اور ناجائز محصول موقوف کئے۔ خراج کی تشخیص اور تحصیل کے لیے خود واقف کار اور معتبر قبطیوں کو مقرر کیا اور جا بجا عدالتیں قائم کر دیں۔

ملک مصر کی کیفیت کے متعلق انھوں نے دربار خلافت میں ایک تحریر بھیجی تھی جو اب تک اہل ادب میں مشہور ہے۔ فرانسیسی ادیب موسیو اوکتاف اوزاں نے تو اس کو بلاغت کا ایک حیرت انگیز نمونہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ معمورۂ عالم کے جملہ مدارس میں اس کو پڑھانا چاہیے تاکہ طلبا کو اشیا کی حقیقت بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہو۔ گبن اور ٹیلر نے بھی اپنی اپنی تاریخوں میں اس کے ترجمے درج کئے ہیں۔ ہم اس کو اردو میں نقل کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ترجمہ میں وہ لطافت جو اصل میں ہے نہیں دکھائی جا سکتی صرف مضمون کا اظہار ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

مصر کی زمین سیر حاصل اور بارور درختوں سے ڈھ...
عرض دس روز کی مسافت ہے۔ اس کے بیچ میں ...
فرخ فرجام اور روانی شام مبارک انجام ہے۔ اس کے فیضان میں ...
ہو جاتی ہے اور کبھی کمی۔ جس وقت چڑھتا ہے اور اس کی موجیں سر اٹھاتی ہیں اس وقت تمام چشمے اور نہریں لبالب ہو جاتی ہیں اور باشندوں کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے آنے کے لیے بجز کشتی کے کوئی سبیل نہیں رہتی۔ پھر جب اس کا جوش پورا ہو چکتا ہے تو پلٹا کھاتا ہے اور تیزی کے ساتھ اتر کر اپنی حد پر آجاتا ہے۔ اس وقت کاشتکار اس کے ساحلوں کے فراز اور دامنوں کے نشیب میں نکل پڑتے ہیں۔ دانے بوتے ہیں اور خرمن کے آرزومند ہوتے ہیں۔

جب دانے جمے اور کھیتیاں اگیں اور نیچے زمین کی نمی اور اوپر بارش کی تری سے پرورش پاکر انھیں نشو و نما اور بالیدگی ہوئی تو ہرے بھرے کھیت لہلہانے لگتے ہیں اور زمین کی دولت اس کے شکم سے اس کی پشت پر آجاتی ہے۔

امیر المومنین! میں اس زمین کا کیا حال لکھوں۔ ابھی گوہر سپید ہے، ابھی عنبر سیاہ اور ابھی

زمرد سبز۔ یہ قدرت الٰہی کے کرشمے ہیں جس نے اس میں ایسی صلاحیت رکھدی اور باشندوں کی معیشت کے لئے اس کو ایسا بنا دیا۔

حضرت عمرؓ اس کو پڑھ کر شگفتہ ہوئے اور فرمایا کہ ابن عاص نے تو گویا مصر کی سرزمین میری آنکھوں کے سامنے رکھدی۔

فراعنہ کے عہد سے مصر میں چار سالہ بندوبست کا دستور تھا۔ وہ چند سالوں کی پیداوار کا اوسط نکال کر تشخیص لگان کیا کرتے تھے اور نقد وجنس دونوں میں وصول کرتے تھے۔ رومی اپنے عہد میں خراج کے علاوہ فوج کے لئے غلہ بھی وصول کرنے لگے۔

لیکن مصر ایک ایسا ملک ہے جس کی زراعت کا دارومدار نیل کے فیضان پر ہے اور اس کے مدارج میں ہر سال تفاوت رہتا ہے جس سے پیداوار میں بہت فرق پڑجاتا ہے۔ چند سالوں کی پیداوار کو دیکھ کر ممکن ہے کہ حکومت کوئی اوسط متعین کرے مگر نادان کاشتکار تو اپنے مصارف کو اس اوسط کے مطابق سالوار نہیں تقسیم کرسکتا۔ اس لئے وہاں ہر سال آب نیل کی کمی یا زیادتی کے مطابق خراج کی تعیین قرین انصاف ہے۔ اسی بنا پر عمرو بن عاص نے خلیفہ کو لکھا کہ:۔

> مصر کی زراعت کا انحصار نیل کے فیضان پر ہے۔ میں نے اچھی طرح تحقیق کرلیا ہے کہ اس کا چڑھاؤ جب ۱۴ ذراع تک پہونچ جاتا ہے تو خشک سالی نہیں رہتی اور ۱۶ ذراع میں سارا ملک سیراب ہوجاتا ہے اور اس قدر پیداوار ہوتی ہے کہ دوسرے سال کے لئے بھی کافی ہوسکے۔ نیچے اور اوپر کی دو حدیں جو خوفناک ہیں وہ ۱۲ اور ۱۸ ہیں۔ ۱۲ میں قحط رہتا ہے اور ۱۸ میں طوفان سے فصلیں تباہ ہوجاتی ہیں۔

حضرت عمرؓ نے حکم بھیجا کہ پانی کا چڑھاؤ معلوم کرنے کے لئے مقیاس بنواؤ۔ چنانچہ انھوں نے حلوان میں مقیاس النیل بنایا جو آج تک قائم ہے۔ اس وقت سے مصر میں یہ قانون چلا آتا ہے کہ جب تک پانی ۱۶ درجہ پر نہ پہونچ جائے اس وقت تک عمال حکومت رعایا سے مالگزاری تحصیل کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ چنانچہ جس دن نیل کی طغیانی سولھویں درجہ پر پہونچتی ہے اس دن بہت بڑا میلہ وفاء النیل

کے نام سے لکھتا ہے۔ مقیاس پر قاضی القضاۃ بکر شہادتوں کے بعد اپنے دستخط اور مہر ثبت کرتا ہے جس کے بعد سلامی کی توپیں سر کی جاتی ہیں۔

اسی پیمانہ سے پیداوار کا اندازہ لگا کر تشخیص لگان کی جاتی ہے جس کے لئے ہر ہر پرگنہ سے آزمودہ کار فلاح بلائے جاتے اور فصل اور پیداوار کا اندازہ پوچھ کر ان ہی سے لگان کا تخمینہ لیا جاتا جس کے حساب سے تحصیل کی جاتی۔ جہاں کنیسے اور حمام ہوتے ان کے اخراجات نیز مسلمانوں کی ضیافت کے بے صرفے جو منزلوں میں متعین رکھے منہا کئے جاتے۔

کاشتکاروں کی شرح لگان کی مقدار سے پیشہ وروں سے بھی ان کی آمدنی پر خراج لیا جاتا۔ اس کے علاوہ اور جتنے محاصل تھے سب یک قلم موقوف کر دئے گئے۔

خود حضرت عمر نے بھی قبطی رؤسا کو بلا کر بندوبست اور ...
اور ان کے مطابق ہدایات بھیجیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
جو حضرت اسماعیل کی والدہ تھیں ۶ یوں کو مصریوں کے ساتھ حسن
بندوبست میں خصوصیت کے ساتھ وہاں نرمی برتی گئی اور شرح لگان کم سے کم رکھی گئی

مسلمانوں نے آنحضرت کے جدید رشتہ کا بھی لحاظ رکھا اور قریہ حفن کو جو ضلع انصنا میں ہے جہاں کی رہنے والی حضرت ماریہ قبطیہ سریہ رسول تھیں خراج سے بری کر دیا۔

اس سالانہ بندوبست کی وجہ سے ہر سال کی وصولی کی کوئی رقم متعین نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ عدم پیداوار کی وجہ سے کبھی کبھی بعض پرگنوں اور دیہاتوں کا خراج معاف کر دینا پڑتا تھا اس لئے رومیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی وصولی میں کمی ناگزیر تھی۔ چنانچہ سال اول میں تمام ملک مصر سے ایک کروڑ بیس لاکھ دینار وصول ہوئے۔

حضرت عمر کو معلوم تھا کہ مقوقس نے پچھلے سال دو کروڑ دینار وصول کئے تھے اس بنا پر انھوں نے عمرو بن عاص سے بازپرس کی لیکن جب خراج کی تشخیص اور نوعیت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو جواب واضح ہو جاتا ہے کیونکہ رومیوں کی ایک تو شرح لگان زیادہ تھی دوسرے انھوں نے بہت سے ناجائز ضرائب

رعایا پر لگا رکھے تھے اور عمرو بن عاص ان دونوں کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن باوجود اس نرمی کے زمانۂ مابعد میں کبھی اس قدر وصولی نہیں ہوئی۔ صرف خلیفہ ثالث کے عہد میں عبد اللہ بن سعد نے ایک سال دو کروڑ دینار وصول کئے تھے جس پر حضرت عثمان نے فخریہ عمرو بن عاص سے کہا کہ اونٹنی نے زیادہ دودھ دیا۔ بولے کہ ہاں لیکن اس کا بچہ بھوکا رہا۔

امیر معاویہ کے سلیقۂ انتظام میں کس کو شک ہے مگر ان کے عہد میں تحصیل ۹۰ لاکھ سے آگے نہ بڑھی اور ان کے بعد بنی امیہ نیز بنی عباس بھی چالیس بلکہ تیس لاکھ سالانہ وصول کرتے رہے۔ خلفاء فاطمیہ نے اپنے زمانہ میں بہ نسبت سابق کے شرح لگان دگنی کر دی تھی لیکن پھر بھی ۴۳ لاکھ سے زائد نہ وصول کر سکے۔

اس زمانہ میں اگرچہ ملک مصر کی سالانہ آمدنی ڈھائی کروڑ پاؤنڈ سے بھی زیادہ ہے مگر اس کا بڑا حصہ ریلوے، ڈاکخانہ اور آبکاری وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے۔ زمین کی مالگزاری ۶۰ لاکھ گنی سے زائد نہیں ہے۔

عمرو بن عاص نے مصر سے عرب کے ساتھ غلہ کی تجارت کے لئے ایک نہر دریائے نیل سے نکالکر بحیرۂ قلزم میں ملادی۔ مورخین کا بیان ہے کہ یہ قدیمی نہر تھی جس کو بادشاہ سیتی اول (خاندان ۱۹) نے کھدوانا شروع کیا تھا اور بادشاہ نکاؤ (خاندان ۲۶) نے اس کی تکمیل کی تھی۔ رومیوں کے عہد میں یہ بالکل خراب ہو گئی تھی مگر نشانات باقی تھے۔ عمرو بن عاص نے فسطاط کے کنارہ سے اسی نشان کے مطابق کھدوانا شروع کیا اور عین شمس اور وادی طیلات سے لاکر شہر قلزم کے متصل بحیرہ میں گرا دیا۔

یہ نہر ۶ مہینہ کے عرصہ میں ۲۳ھ میں حضرت عمر کے عہد میں تیار ہو گئی تھی۔ اسی وقت سے غلہ مصر سے عرب میں آنے لگا۔ عہد بنی امیہ میں والیوں کی غفلت سے اس کی مرمت نہ ہوئی اور جا بجا ریتا اٹ گیا یہاں تک کہ بالکل بند ہو گئی۔ اس کے نشانات کہیں کہیں باقی تھے مگر ۱۸۹۵ء میں مصری حکومت نے ان کو پاٹنے کا حکم دیکر ان کو مٹا دیا۔

عمرو بن عاص نے نہر سویز کھودنے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ چاہتے تھے کہ فرما کے متصل جہاں

بحیرہ روم اور بحیرۂ قلزم میں صرف ۷۰ میل کا فاصلہ رہجاتا ہے کاٹ کر دونوں کو ملادیں۔ مگر حضرت عمر نے روک دیا اور لکھا کہ رومی اس راستے سے عرب پر حملہ کرنے لگیں گے۔ اس وجہ سے باز رہے۔

حضرت عمرو بن عاص نے انتظام کا جو طریقہ مصر میں قائم کیا تھا زمانۂ مابعد میں بھی کم و بیش وہی چلا آیا۔ عہد عباسیہ اولیٰ میں البتہ والیوں کی جلد جلد تبدیلی کی وجہ سے ابتری رہی۔

شیخ سعدی نے گلستاں میں ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے کہ ہارون رشید نے کہا کہ اس ضد پر کہ فرعون نے ملک مصر کے گھمنڈ پر خدائی کا دعویٰ کیا تھا میں اپنے ادنیٰ ترین غلام کو وہاں کی حکومت دونگا۔ چنانچہ ایک حبشی کو جس کا نام خصیب تھا والی بناکر بھیجدیا۔ اس کی عقل کا یہ حال تھا کہ فلاحوں نے ایک بار آکر شکایت پیش کی کہ ہم نے روئی کی کاشت کی تھی وہ پانی کی کثرت سے ضائع ہوگئی تو اس نے کہا کہ تم کو اون بونا چاہئے تھا کہ خراب نہ ہوتا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعرانہ قصہ ہے۔ صورت یہ تھی
وزیر کے سپرد ہوتی تھی جو اپنی طرف سے ایک کارندہ وہاں
اس کے وزیر جعفر بن یحییٰ برمکی کے ہاتھ میں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے عہد میں
بن عبدالحمید مصر میں امیر خراج تھا لیکن نہ وہ حبشی تھا نہ احمق بلکہ مورخین لکھتے ہیں کہ نہایت متقی اور عاقل تھا جس سے اہل مصر خوش تھے اور جس کے نام پر آجتک وہاں ایک قصبہ منیۃ الخصیب آباد ہے۔

خوش قسمتی سے مصر کو تھوڑے تھوڑے زمانہ کے بعد اچھے اچھے مدبر اور منتظم ملتے گئے جس کی وجہ سے ہر خزاں کے بعد اس میں بہار آتی رہی۔ ان لوگوں کے نام اب تک اہل مصر عزت اور محبت کے ساتھ لیتے ہیں۔

عباسیہ کے عہد میں احمد بن طولون ان کا غلام مصر کا حاکم تھا۔ اس نے مرکز یعنی بغداد کی ابتری اور بدنظمی کی وجہ سے ۲۵۴ھ میں اپنی خودمختاری کا علم بلند کردیا اور اپنے حسن انتظام سے مصر کی حالت ایسی درست کی کہ رعایا خوشحال اور فارغ البال ہوگئی جس کی وجہ سے اس کی طاقت اس قدر بڑھگئی کہ دربار خلافت نے رومیوں کے مقابلہ کے لئے شام کی ولایت کا فرمان بھی اس کے نام لکھدیا۔

ابن طولون کو دو بار بڑے بڑے پرانے دفینے بھی ملے۔ ایک سے عالیشان جامع تیار کرائی جس کے نشانات اب تک باقی ہیں اور دوسرے سے ایک شفاخانہ تعمیر کرایا۔ غربا کے مفت معالجہ کے لئے اطبا ملازم رکھے اور عمارات اور دوکانیں بنوا کر اس کے خرچ کے لئے وقف کیں۔

اخشیدی خاندان کے آخر میں ان کا غلام کافور ۳۵۵ھ میں تخت مصر پر آگیا۔ یہ بھی منتظم اور مصلح تھا۔ عرب کا مشہور شاعر متنبی سیف الدولہ کا دربار چھوڑ کر اس کے پاس آگیا تھا اور اس کی مدح میں قصیدے لکھتا تھا۔ اس کے زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ مصر میں کسی واعظ نے اپنے وعظ میں کہا کہ دنیا کی خواری دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے کیسے لوگوں کو اس کا مالک بنا رکھا ہے بغداد میں معزالدولہ دیلمی ہے وہ لولا اور مصر میں کافور اخشیدی ہے وہ خصی۔

یہ بات کافور تک پہونچی ہنسا اور اس واعظ کو بلا کر کچھ رقم دیدی جس کے بعد وہ اپنے وعظوں میں کہا کرتا تھا کہ حسام کی اولاد میں سے تین ہی شخص کامل نکلے ایک لقمان حکیم، دوسرے حضرت بلال مؤذن رسول اللہ، تیسرے موالی کافور اخشیدی خلداللہ ملکہ وسلطنتہ۔

فاطمی خلفاء کے عہد میں حروب صلیبی اور نیز اندرونی خلفشاروں کی وجہ سے جب انتظام میں سخت ابتری پڑ گئی تھی مستنصر باللہ کے وزیر بدر جمالی متوفی ۴۸۷ھ نے اپنے حسن انتظام سے پھر مصر کی حالت سنبھالی اور تجارت اور زراعت کو فروغ دے کر ملک کو مالامال اور رعایا کو خوشحال کر دیا۔

اسی بدر جمالی کے بیٹے افضل امیر الجیوش نے عسقلان سے امام حسین علیہ السلام کے سر مبارک کا مشہد مصر میں منتقل کیا اور اس پر ایک جامع تعمیر کرائی۔

فاطمیہ کے انقراض کے بعد سلطان صلاح الدین کے عہد میں بھی مصر میں رفاہیت رہی لیکن یہ اس کے وزیر بہاء الدین اسدی کا کارنامہ تھا جس نے ایک طرف رعایا کو خوش رکھا اور دوسری طرف سلطان کو ورنہ صلاح الدین نے تو اپنی زندگی کا بڑا حصہ صلیبیوں کے مقابلہ میں گزارا۔ اس کو انتظام ملک کی فرصت کہاں تھی۔ اس نے صرف ایک قلعہ قاہرہ کے متصل اپنی سکونت کے لئے بنوایا تھا جو اس وقت موجود ہے اور مصر کے کل قلعوں سے زیادہ سنگین اور موقع کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے۔

ایوبی خاندان کے بعد مالیک بحری میں سے ملک ظاہر بیبرس بڑا مدبر اور شجاع گزرا ہے جس نے ملک کے انتظام کو بھی ٹھیک رکھا اور ایک طرف صلیبیوں اور دوسری طرف تاتاریوں کو نکالا۔

مالیک کے بعد جب ترکی پاشاؤں کی بدتدبیری سے مصر کا حال تباہ ہو رہا تھا اس وقت محمد علی پاشا نے اس کی حالت درست کی اور بالآخر اپنی دولت اور قوت اس قدر بڑھائی کہ باب عالی سے استقلال مصر کا نسلاً بعد نسل فرمان حاصل کر لیا۔ چنانچہ اب تک مصر کی حکومت اسی کے خاندان میں ہے۔ اُسی کے پوتے خدیو اسماعیل پاشا نے اپنی فضول خرچیوں کی بدولت قرضے لئے جن کی ضمانت کے لئے انگریزوں نے مالیہ میں مداخلت کی۔ احمد عربی پاشا نے اس بیرونی مداخلت کی مخالفت شروع کی جس کے اوپر ہنگامہ ہوا اور آخر کار انگریزی فوجوں نے ۱۸۸۲ء

وطنی جماعت نے مصطفےٰ کمال پاشا اور فرید بے وغیرہ کی قیادت

آج تک جاری ہے لیکن ابھی وہ دن قریب نہیں دکھائی د

مصر کی زمین زرخیز ہے۔ فراعنہ کی دولت اور ثروت

اور دفینوں سے بھی ملتی ہے جو زیر زمین اسے کبھی کبھی برآمد ہوتے ہیں۔ قارون جس کے خزانوں کی کثرت کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے مصر ہی کا ایک معمولی عہدہ دار تھا یعنی مہتمم جنگلات۔

اسلامی عہد میں بھی جب کبھی مصر کو استقلال نصیب ہو گیا اس کی وہی دولت اور ثروت عود کر آئی۔ چنانچہ ابن طولون کی خود مختاری کے بعد اس کے بیٹے خمارویہ کی دولت و ثروت اور شان و شوکت مصر کے کسی قدیم بادشاہ سے کم نہ تھی۔ اس کے محل کی دیواریں لاجورد محلول اور طلا اور مختلف قسم کی چوبی تصویروں سے آراستہ تھیں۔ دربار اس عظمت و جلال کا تھا کہ داخل ہونے والے کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ علاوہ دیگر سامان سطوت و جبروت کے زندہ شیر اور چیتے بھی اس کے اطراف میں بندھے ہوئے رکھے جاتے تھے۔

اس کی خوابگاہ بھی عجیب و غریب تھی۔ ایک حوض پارہ سے بھر کر اس کے دونوں کناروں پر چاندی کے کڑوں میں ریشم کی ڈوریاں باندھی گئی تھیں اور ان پر ایک چرمی گدا ہوا سے بھرا ہوا

ڈال دیا گیا تھا جس کے اوپر وہ سوتا تھا۔ سبب یہ تھا کہ اس کو کم خوابی کی شکایت تھی طبیب نے بتلایا کہ چپی سے نیند آجائے گی۔ اس نے کہا کہ میری طبیعت گوارا نہیں کر سکتی کہ میرے بدن پر کوئی ہاتھ رکھے۔ اس لئے یہ صورت اختیار کی گئی کیونکہ پارہ کی وجہ سے بستر برابر حرکت کرتا رہتا ہے جس سے نیند آجاتی تھی

اس نے اپنی بیٹی قطر الندیٰ کی شادی بغداد کے خلیفہ معتضد باللہ کے ساتھ کی تھی۔ اس کو جہیز میں اس قدر ساز و سامان دیا تھا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں۔ جوڑوں کی قیمت کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکے گا کہ ایک ہزار انار بند تھے جن کا صرفہ بارہ ہزار دینار تھا۔ رخصتی کے وقت مصر سے بغداد تک ہر ہر منزل پر اپنے محل کے مشابہ ایک ایک قصر تعمیر کرا کے آلات و فروش سے آراستہ کرا دیا تھا تاکہ مصر سے بغداد تک عروس اپنے باپ ہی کے گھر میں قیام کرتی ہوئی جائے۔ آغاز محرم ۲۸۲ھ میں اس کا داخلہ بغداد میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ہوا۔

اسی طرح فاطمیہ جن کی خلافت مصر میں تھی ان کی دولت و ثروت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ان کے ایک وزیر امیر الجیوش نے مرنے کے وقت جس قدر دولت چھوڑی تھی اس میں علاوہ بے شمار ساز و سامان کے ابن خلکان کے قول کے مطابق ساٹھ کروڑ دینار نقد تھے اور پانچ سو صندوق خاص اس کے پہننے کے کپڑوں سے بھرے ہوئے تھے۔

آخری خلیفہ فاطمی عاضد باللہ کے قصر پر اس کی وفات کے بعد جب سلطان صلاح الدین نے قبضہ کیا ہے تو اس کے امتعہ و اموال کی فہرست سے تاریخ کے صفحات تنگ نظر آتے ہیں۔ زر و جواہر کے علاوہ تقریباً دو لاکھ کتابیں تھیں جن میں سے بہت سی آج جرمنی میں موجود ہیں۔

اگر خدیو اسمٰعیل نے اپنی فضول خرچیوں سے مصر کو قرضہ میں مبتلا نہ کیا ہوتا تو آج وہ عالم اسلامی کا ایک عظیم الشان خزانہ ہوتا۔

علوم

مصری تہذیب مورخوں کے نزدیک دنیا کی قدیم تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ان میں علوم و فنون کا ذوق آغاز عہد سے تھا۔ چنانچہ پہلے ہی خاندان کے ایک بادشاہ تتا نے طب کا ایک رسالہ

لکھا تھا۔ دوسرے خاندان کے بادشاہ استنس نے اس کی تکمیل کی۔ خاندان سوم کے بادشاہ نیکانے بھی طب کے کچھ نوشتے چھوڑے تھے جو پہلی صدی عیسوی تک رائج رہے۔ اس نے فن کتابت اور سنگ تراشی کو بھی ترقی دی تھی۔ خاندان چہارم کے بادشاہ اسکاف کو ہندسہ سے بہت ذوق تھا۔ اس نے آلات رصد بھی بنائے تھے۔

ان علوم کے علاوہ شعبدہ، کہانت اور سحر میں بھی مصری فائق تھے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ انیسویں خاندان کے عہد میں جس زمانہ میں کہ حضرت موسیٰؑ کی بعثت ہوئی سحر کا اس قدر چرچا تھا کہ سال میں ایک دن مقرر تھا جس میں جادوگروں کا جلوس نکلتا تھا۔ کوئی شیر پر سوار ہو کر چلتا، کوئی آتش فشاں اژدہے پر اور کوئی جلتے ہوئے شعلوں میں۔ شہر کے لوگ اس دن خوف سے اپنے دروازے بند رکھتے تھے اور کوٹھوں اور چھتوں پر سے تماشا دیکھتے تھے۔ ان جادوگروں کو کرچکے ہوں شاہی دربار میں اعزاز ملتا تھا اور جو ساتوں ستارہ ان کو فرعون اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا۔

چھبیسویں خاندان کے عہد میں جب مصر میں بڑے مدارس قائم ہوئے ان و ــ ــ ــ ہیأۃ اور نجوم کے علاوہ فلسفہ اور علم الاصنام کی بھی تعلیم ہونے لگی۔ یونانی قبضہ کے بعد سے تو اسکندریہ علوم کا مرکز ہو گیا تھا۔ ارسطو اسی شہر میں درس دیتا تھا۔

فنون تعمیر و سنگ تراشی و تمثال گری میں ان کو جو مہارت تھی اس کی شہادت ان کے آثار سے ملتی ہے۔

رومیوں نے اپنے زمانہ میں مصریوں کے قدیم علوم و فنون کی کتابیں جلا ڈالیں بعض عیسائی مورخوں نے دینی تعصب کی وجہ سے اس کا الزام مسلمانوں پر لگانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ عمرو بن عاص نے فتح کے بعد اسکندریہ کے عظیم الشان کتب خانہ کو خلیفہ اسلام کے حکم سے جلا دیا۔

لیکن دراصل یہ محض افترا اور بہتان ہے۔ مولانا شبلی مرحوم نے اسی عنوان سے ایک رسالہ

لکھکر اس الزام کی اچھی طرح تردید کردی ہے بلکہ ان سے پہلے ہی جس وقت یہ مسئلہ بساط بحث پر آیا اسی وقت خود یورپ کے محقق مورخوں شلاً گبن، بٹلر، سدیو اور گستاؤلی بان وغیرہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا اور اس کے تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کردیا۔

ڈاکٹر بٹلر لکھتا ہے کہ فتح اسلامی کے وقت اس کتب خانہ کا وجود ہی نہ تھا کیونکہ یہ پہلی بار قیصر جولیس کے حملہ میں ۴۸ق م میں جل چکا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ جو کتابیں جمع ہوئیں وہ اسقف تونیل کے حکم سے ۳۹۱ء میں جلادی گئیں۔

جب سے مصر میں مسلمان پہونچے اور وہاں کے قبیلے کے قبیلے اور خاندان کے خاندان اسلام میں داخل ہونے لگے اس وقت سے وہاں اسلامی علوم کا دور شروع ہوا۔ حضرت عمرو بن عاص کے ساتھ جو جماعت گئی تھی ان میں کم سے کم دو سو صحابۂ کرام تھے جن میں سے حضرت زبیر عشرہ مبشرہ میں سے ابوالدرداء، حاطب بن بلتعہ اور عبادہ بن صامت وغیرہ اہل بدر میں سے، کم سے کم ستر آدمی بیعت رضوان کے شرکاء میں سے نیز عبداللہ بن عمر اور حارث بن عباس وغیرہ سادات قریش اور ثوبان اور ابورافع خادمان رسول اللہ بھی تھے۔

ان حضرات میں سے اکثر ایسے تھے جن کے پاس لوگ جمع ہوتے اور قرآن کی آیات اور آنحضرتؐ کے حالات سنتے۔ اس طرح تفسیر اور حدیث کا سلسلہ رائج ہوگیا اور جا بجا اس کے حلقے قائم ہوگئے، ۹۲ھ میں جب خلیفہ ولید بن عبدالملک اموی کے حکم اور ابن یربوع فزاری کی کوشش سے مصر کا دفتر حکومت عربی میں منتقل ہوگیا اس وقت سے اہل مصر عربی زبان حاصل کرنے لگے اور اسلامی علوم بھی۔ دوسری صدی ہجری کے آخر میں وہاں لیث بن سعد جیسے امام ہوئے جن کو خلیفہ منصور عباسی نے مصر کی ولایت دینی چاہی مگر قبول نہ کی۔ امام شافعی بھی پہونچکر وہیں سکونت گزیں ہوگئے، اور زید بن ابی حبیب اور دیگر ائمہ نے شہرت پائی اور فسطاط اسلامی علوم کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

۳۵۸ھ میں جب فاطمیہ کے غلام اور مصر کے فاتح جوہر نے قاہرہ اور اس کے ساتھ جامع ازہر تعمیر کی تو اس میں علوم اسلامی کا درس شروع ہوا۔ زمانہ مابعد میں اس مدرسہ نے بہت ترقی کی سلاطین

دملوک مصر نے خصوصیت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی اور اس پر بڑے بڑے اوقاف کئے۔ چنانچہ آج تک یہ مدرسہ قائم ہے اور غالباً دنیا کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ اس کے طلباً کی تعداد کم وبیش پندرہ ہزار رہتی ہے جس میں ہر ملک اور ہر قوم کے مسلمان شامل رہتے ہیں۔ یہاں کی تعلیم قدیم اصول اور نصاب کے مطابق ہے لیکن مفتی محمد عبدہ مرحوم کی کوشش سے اصلاحات کا بھی اس میں دخل ہوگیا ہے جس سے امید ہے کہ یہ مدرسہ زمانہ کا ساتھ دے سکے گا۔

حاکم بامراللہ خلیفہ فاطمی نے پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں بغداد کے بیت الحکمۃ کے مقابلہ پر اپنے قصر کے ساتھ دارالحکمۃ تعمیر کرایا جس میں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ یہاں ہر شخص کو مطالعہ کے لیے کتابیں ملتی تھیں اور نقل لینے والوں کو سامان [illegible]

ایوبی خاندان کے عہد میں مدرسہ صلاحیہ سلطان [illegible]

مدرسہ صالحیہ ملک صالح نجم الدین کا خاص طور پر مشہور ہوا۔

اپنے زمانوں کے امام تھے اور کل اسلامی علوم پڑھائے جاتے

ان میں علوم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔

ممالیک کے عہد میں مدرسہ ظاہریہ ملک ظاہر بیبرس کا اور مدرسہ منصوریہ وناصریہ خاندان قلاؤون کے اسلام کے مشہور مدارس تھے۔

علماء مصر نہ صرف اپنی علمی قابلیت بلکہ تقوے اور عمل کے لحاظ سے بھی ممتاز تھے۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں علامہ اسکندرانی ابن دقیق العید اور عزالدین بن عبدالسلام جیسے لوگ ہم کو وہاں دکھائی دیتے ہیں جن کی نظیر سے دوسرے اسلامی ممالک اس وقت قاطبتہً خالی نظر آتے ہیں۔

شیخ عزالدین کا یہ واقعہ ذکر کے قابل ہے کہ ایوبی خاندان کے آخری زمانہ میں جبکہ وہ مصر کے قاضی تھے ملک صالح نے بہت سے غلام خریدے تھے جن کے ہاتھوں میں سلطنت کی نہ صرف وزارت اور سپہ سالاری بلکہ تقریباً جملہ مناصب وامارات تھیں۔ چنانچہ آخر میں وہی حکمران بھی ہوگئے۔ قاضی

عزالدین کے نزدیک کسی مقدمہ کی شہادت کے دوران میں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا کہ یہ ممالیک جن کو سلطان نے مسلمانوں کے بیت المال سے خرید کیا ہے آزاد نہیں کئے گئے ہیں۔ اسی وقت انھوں نے اعلان کرایا کہ ان کے جملہ خودمختارانہ تصرفات از قسم بیع وشرا و نکاح وطلاق وغیرہ بوجہ عدم حریت ناجائز ہیں اور ان کو حکم بھیجا کہ عدالت میں حاضر آئیں۔

ممالیک نے جب یہ سنا تو قیامت برپا ہوگئی۔ نائب السلطنت نے غضبناک ہوکر کہا کہ ہم روئے زمین کے ملوک ہیں قاضی کی کیا مجال ہے کہ ہمارے سامنے دم مار سکے۔ قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میں اپنے ہاتھ سے اس کی گردن مارونگا۔ یہ کہہ کر اپنے اعوان کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر چلا۔ سب کے سب غصہ میں بھرے ہوئے اور ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے۔ جب ان کے گھر کے پاس پہونچے تو قاضی مذکور کا لڑکا دیکھ کر سہما ہوا اندر بھاگا اور باپ کو اطلاع کی۔ انھوں نے بے پروائی سے کہا کہ تیرے باپ کا یہ رتبہ کہاں کہ اس کا خون راہ حق میں بہایا جائے۔ یہ کہتے ہوئے باہر نکل آئے۔ نائب السلطنت کی نگاہ جب ان کے اوپر پڑی تو جلال حق سے کانپنے لگا۔ تلوار ہاتھ سے گرگئی اور بولا کہ یا مولانا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ تم سب کو فروخت کروں گا۔ بولا کہ قیمت کون لے گا۔ کہا کہ میں اور اس کو بیت المال میں داخل کروں گا۔ چنانچہ یہی کیا۔

ساتویں صدی کے وسط میں زوال بغداد کے بعد جب سے مصر میں خلافت عباسی قائم ہوگئی اس وقت سے وہی اسلامی علوم وحضارۃ کا مرکز ہوگیا۔ اسی عہد میں علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن حجر اور جلال الدین سیوطی وغیرہ جیسے ائمہ وہاں ہوئے جن کی تصنیفیں آج تک مسلمانوں کا سرمایۂ افتخار ہیں۔

۹۲۳ھ میں سلاطین عثمانیہ اسلامی خلافت کو تو مصر سے روم میں لے گئے مگر علوم اسلامی کو وہیں چھوڑ گئے۔ چنانچہ ان کا مرکز آج تک بھی مصر ہی ہے اور اس کے علمی احسانات کا فیض دنیائے اسلام میں برابر جاری ہے۔

خدیوی خاندان کے عہد میں علوم حاضرہ یعنی طب، قانون، زراعت اور انجنیرنگ وغیرہ کے کالج بھی مصر میں قائم ہوگئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں مصری طلبا مغربی ممالک میں بھی جاکر تعلیم حاصل کرتے

ہیں۔ موجودہ سلطان مصر احمد فواد علم کے بہت بڑی مربی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاہزادگی ہی کے زمانہ میں دار العلوم قائم کیا تھا جو جامعہ مصریہ کے نام سے ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو گیا ہے۔

مذہب

اہل مصر کا قدیمی مذہب بت پرستی اور ستارہ پرستی تھا جس پر یونانیوں کے عہد تک وہ قائم رہے۔ حضرت عیسیٰ ؑ کے بعد جب عیسائیت کی اشاعت ہوئی تو ان میں سے بھی کچھ لوگوں نے اس کو اختیار کرنا شروع کیا مگر رومیوں نے جو اس وقت تک بت پرست تھے ان کو روکنے کی کوشش کی اور ان پر سختیاں کرنے لگے۔

۳۱۲ء میں قسطنطین اعظم نے اپنی تخت نشینی کے سال [illegible]
اور اسی کو سلطنت کا مذہب قرار دیا اس وقت مصریوں کو [illegible]
مذہب میں داخل ہوئے۔ ۳۸۰ء میں قیصر تھیوڈوسیس نے [illegible]
جاری کیا کہ سلطنت کے کل باشندے عیسائی بنا لئے جائیں۔
رہ گئے تھے ان کی عبادت گاہیں ڈھا دی گئیں اور ان پر وہ مظالم کئے گئے جو اس سے پہلے ان لوگوں پر بھی نہیں کئے گئے تھے جو عیسائی ہوتے تھے۔

اسی درمیان میں عیسائیوں میں تفرقہ واقع ہو گیا اور ان میں ملکی اور یعقوبی دو فریق ہو گئے۔ یعقوبیوں کا عقیدہ تھا کہ مسیح کی ذات الوہیت اور بشریت دونوں کا مجموعہ ہے اور ملکی کہتے تھے کہ ابن ازلی مولود اور غیر مخلوق ہے۔ وہی اس انسان کے ساتھ جو حضرت مریم کے بطن سے پیدا ہوا تھا متحد ہو کر مسیح ہو گیا۔

یہ اختلاف چونکہ نفس ذات مسیح کے متعلق تھا اس وجہ سے دونوں فریق میں سخت نزاع قائم ہوئی جس کے فیصلہ کے لئے قیصر نے پاپائے روم کے مشورہ سے مقام خلقدونیہ میں مسیحی علماء کا مجمع کیا۔ اس میں یہ طے پایا کہ یعقوبی عقیدہ غلط ہے اور جو کوئی اس کو اختیار کرے وہ واجب القتل ہے۔ اہل مصر تمام تر یعقوبی تھے اور رومی سب کے سب ملکی۔ اس وجہ سے رومیوں نے ان پر سختی شروع کی۔ مگر وہ مقابلہ کے

لے تیار ہو گئے۔ اور آخر بہت جھگڑوں کے بعد ایک یعقوبی بطریق کی کرسی انھوں نے قائم کرلی لیکن رومی حکام بوجہ مذہبی تعصب کے ان کے اوپر برابر ظلم و ستم کرتے رہے۔ اس وجہ سے اہل مصر نہ صرف قومی اور ملکی حیثیت سے بلکہ مذہبی لحاظ سے بھی رومیوں سے الگ اور بیزار تھے۔ اور ان کی زبان، رسم، لباس اور ہر چیز کو انھوں نے چھوڑ دیا تھا۔

سنہ ۶۱۰ء میں جب ہرقل قسطنطنیہ کے تخت پر بیٹھا تو اس کی غفلت اور عیش پرستی کو دیکھ کر ایرانیوں نے سنہ ۶۱۶ء میں چڑھائی کردی اور شام و فلسطین لیتے ہوئے مصر پر بڑھے۔ رومی سپہ سالار نکیتاس مقابلہ سے عاجز رہا اور مصر چھوڑ کر چلا گیا۔ ایرانی قابض ہو گئے۔ انھوں نے مصریوں کے مذہب میں دخل نہیں دیا جس کی وجہ سے ان کو اس مشرقی دولت کے سایہ میں امن نصیب ہوا اور انھوں نے اپنے پیشوا بنیامین کو مصر کے بطریق کی کرسی پر بٹھا دیا جس کی تمام ملک میں خوشی منائی گئی۔ لیکن یہ خوشی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی کیونکہ ہرقل نے خواب غفلت سے بیدار ہو کر سنہ ۶۲۲ء میں ایرانیوں پر حملہ کیا اور اپنے سارے علاقے ان سے واپس لے لئے، جس کی پیشین گوئی قرآن کریم میں کی گئی تھی کہ

غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبہم سیغلبون فی بضع سنین	رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے لیکن وہ مغلوب ہو جانے کے بعد چند سال میں غالب آجائیں گے۔

اب رومیوں نے جوش انتقام میں مصریوں پر بہت سختی شروع کی۔ بنیامین خوف سے بھاگ گیا مگر اس کا بھائی مینا گرفتار ہو گیا۔ رومیوں نے اس کو مجبور کیا کہ خلقدونی فیصلہ کو تسلیم کرے۔ اس نے انکار کیا۔ اس پر اس کے چہرہ کو مشعل سے یہاں تک جلایا کہ چربی ٹپکنے لگی مگر وہ اپنے قول پر قائم رہا۔ پھر اس کے دانت ایک ایک کر کے اکھاڑ ڈالے اس پر بھی وہ اپنے عقیدہ سے نہیں پھرا۔ اس کے بعد اس کو ریت کے تھیلے میں ڈال کر ساحل پر لے گئے، اور تین بار کہا کہ خلقدونی عقیدہ کو مان لے تو جان بخشی کر دی جائیگی۔ جب اس نے نہیں مانا تو سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ اہل مصر ان سختیوں سے نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح رومی یہاں سے نکل جائیں۔

ہرقل نے ایک قبطی شہزادہ مقوقس کو اپنے پاس رکھ کر تربیت دی تھی جو بخلاف اپنی قوم کے

ملی عقیدہ کا تھا۔ اسی کو مصریوں کی سیاست کے لئے مصر کا والی بنایا تھا لیکن وہ بھی کچھ دنوں کے بعد رومیوں
کے مظالم دیکھ کر درپردہ یعقوبی ہو گیا تھا اور اپنی قوم کی طرفداری کرنے لگا تھا جس کی وجہ سے اس میں اور
رومی ائمہ کشنر فیرس میں سخت مخالفت ہو گئی تھی۔ اسی درمیان میں اسلامی حملہ ہوا قبطیوں نے عرب کے
انصاف اور رواداری کو دیکھ کر ان کا ساتھ دیا اور لڑائیوں میں مدد پہونچائی۔ خود مقوقس نے بھی ان سے
مصالحت کر کے رومیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ فتح کے بعد عمرو بن عاص نے مصریوں کو مذہبی آزادی بخشی۔
ان کے عزیز ترین پیشوا بنیامین کو جو تیرہ سال سے وادی نطرون میں روپوش تھا بلا کر اسکندریہ کی
بطریق کی کرسی عطا فرمائی۔ اس کا شاندار استقبال کرایا اور کنیسہ کے متعلق اس نے جو جو درخواستیں کیں سب
سب منظور فرمائیں۔ ان کے اس برتاؤ سے تمام قبطیوں کے دلوں میں مسلمانوں بلکہ اسلام کی محبت پیدا ہوئی۔
اسقف یاسلی نے اپنی تقریر میں کہا کہ

دین سے خارج ستم پیشہ رومیوں کے جور و ظلم کے بعد

دیکھتا ہوں۔

اسقف ساویرس نے کہا کہ

آج کے دن ہماری بیڑیاں کٹ گئیں اور ہم آزاد ہو گئے۔

قبطیوں نے مسلمانوں کے تقوے، دیانت، راستبازی، عدل اور مساوات وغیرہ بے نظیر
اوصاف کو دیکھ کر اسلام کی طرف قدم بڑھایا اور قبیلے کے قبیلے اور خاندان کے خاندان مسلمان ہونے لگے۔
مقوقس کا خود اسلام لانا تو ثابت نہیں مگر اس کا ماموں زاد بھائی شطا نامی مسلمان ہو گیا۔ اس نے ہزاروں
قبطیوں کو مسلمان بنا کر ایک فوج مرتب کی اور اسلامی لشکر کے ساتھ جہاد کی فضیلت حاصل کرنے کے
لئے شریک ہو گیا تنیس کے معرکہ میں شہادت پائی۔ قبطیوں نے اس کو دمیاط کے باہر دفن کیا۔ اس
کی اس قدر عظمت اور محبت ان کے دلوں میں تھی کہ اس کی برسی منانے لگے چنانچہ آج تک ہر سال
پانچویں شعبان کو جو اس کی شہادت کا دن ہے اس کی قبر پر میلہ لگتا ہے۔
سنہ ۹۲ھ سے جب سے کہ مصر کا دفتر عربی زبان میں منتقل کر لیا گیا قبطیوں نے عربی زبان

اور علوم کی تحصیل شروع کی اور کثرت کے ساتھ اسلام لانے لگے ۔

اہل عرب نے ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی قائم کیے اور ان کو بالکل اپنے برابر رکھا اس اختلاط کی وجہ سے بہت تھوڑے عرصہ میں نہ صرف زبان و لباس بلکہ دین اور اخلاق کے لحاظ سے بھی وہ بالکل عرب ہو گئے ۔

اسلامی مذاہب کے لحاظ سے وہاں زیادہ تر مذہب شافعی پھیلا کیونکہ امام شافعی خود وہاں پہنچ گئے تھے۔ دیگر مذاہب کے علماء کے ذریعہ سے ان کے مذاہب بھی پہونچے ۔

خلافت فاطمیہ کے عہد میں اسماعیلیت کی اشاعت ہوئی۔ اس کے لیے ایک خاص مرکز انھوں نے قائم کیا تھا جس کے رئیس کا لقب داعی الدعاۃ تھا اور جس کا درجہ قاضی القضاۃ کے برابر سمجھا جاتا تھا اس میں طریق دعوت اور اسرار امامت کی تلقین کر کے مبلغین دوسرے ممالک میں بھیجے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ملیہ کی باطنی جماعت کا تعلق تھا جو بھنگ کے استعمال کی وجہ سے حشیشین کہے جاتے تھے اور عراق کی قرمطی جماعت کا بھی جس نے بغداد کی عباسی خلافت کو مضطرب کر رکھا تھا حسن بن صباح کوہ الموت کی بہشت کا شداد بھی اسی مرکز کا تعلیم یافتہ تھا ۔

یہ جماعتیں ایک عرصہ تک قائم رہیں۔ آخر میں ان کو ہلاکو نے اور باقی ماندہ کو ملک ظاہر بیبرس نے ساتویں صدی ہجری کے وسط میں فنا کیا۔ فاطمیہ نے اپنے عہد میں مصر میں چار مذاہب کے قاضی مقرر کئے تھے شافعی، مالکی، اسماعیلی اور اثنا عشری ۔

فاطمیہ کے بعد ایوبی عہد میں اسماعیلیت مٹ گئی اور پھر شافعی مذہب کو غلبہ ہو گیا اور اس کے قاضی مقرر ہونے لگے۔ اسی خاندان کے آخری تاجداروں میں ملک صالح نجم الدین کی کنیزک خاتون شجرۃ الدر تھی۔ اسی کے عہد سے مصری محمل یعنی غلاف کعبہ ہر سال مصر سے مکہ کو بھیجا جانے لگا جس کا سلسلہ برابر جاری تھا مگر ادھر پانچ سال سے بعض وجوہ سے بند ہو گیا ہے ۔

ملک ظاہر بیبرس متوفی ۶۷۶ھ نے اپنے عہد میں پھر چار قاضیوں کی رسم جاری کی۔ مگر یہ سنیوں کے چاروں فرقوں کے ہوتے تھے۔ غالباً اس کے عہد میں حرم مکہ میں چاروں مصلے بھی الگ

ملک قائم کئے گئے۔

ممالیک بحری نیز ممالیک چرکس نے اپنے اپنے زمانوں میں مصر میں بڑی بڑی مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں بلکہ مصر کی زیادہ تاریخی یادگاریں انھیں کے عہد کی ہیں۔ ان کے زمانہ میں درویشی اور فقیری کا زیادہ رواج ہوا۔

تصوف کا اثر بھی مصر میں کم نہ تھا بلکہ حضرت ذوالنون متوفی ۲۴۵ھ جن کو رسالہ قشیریہ میں اسلامی تصوف کا بانی کہا گیا ہے مصر ہی کے مقام اخمیم کے باشندے تھے۔ شیخ ابن فارض کے پُرمعرفت قصائد بھی مصر ہی کی برکات ہیں۔ وہاں کے صوفیہ کبار میں سے رفاعہ بن احمد اور سید احمد بدوی خصوصیت کے ساتھ شہرت رکھتے ہیں جن کے پیرو لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں آج [illegible] کے [illegible] حصہ [illegible] رفقہ [illegible] درویشوں کے تکیے اور زاوئے پائے جاتے ہیں خاصکر قاہرہ میں

عربوں کے اختلاط اور مساوات نے قبطیوں کو بہت [illegible] کہ وہ ہر لحاظ سے عرب ہوگئے اور ان کی نہ صرف دینی اور اخلاقی [illegible] عرب کی تھی۔ ان میں زیادہ تر انھیں علوم نے رواج پایا جو خالص عربی تھے یعنی تفسیر حدیث [illegible] ادب سیرۃ و تاریخ وغیرہ برخلاف عراقیوں کے علوم دخیلہ یعنی منطق و فلسفہ وغیرہ کی طرف انکا رجحان کم رہا۔

یونانیوں اور رومیوں کی صدیوں غلامی نے اہل مصر کے شجاعانہ جذبات کو تقریباً فنا کر دیا تھا مگر اسلام کی بدولت پھر وہ زندہ ہوگئے۔ چنانچہ ان لڑائیوں میں جو عہد اسلام میں پیش آئیں ان کی بہادری اور شجاعت، دوسری مسلمان قوم سے درجہ دوم پر نظر نہیں آتی۔

صلیبوں کو جن کے مقابلہ کی سوائے نورالدین زنگی شہید کے خلافت عباسیہ نے بھی کبھی جرأت نہیں کی آخر میں مصریوں ہی نے سرزمین مقدس سے نکالا۔ تاتاریوں نے مشرق سے لیکر مغرب تک اسلامی ممالک کو تاخت و تاراج کر ڈالا تھا مگر شام سے مصریوں ہی نے ان کا منہ پھیرا۔ بلکہ ۶۶۱ھ میں بغداد بھی ان سے واپس لیا۔ ۶۸۰ھ میں اباقا خاں پسر ہلاکو نے جب عراق عجم پر چڑھائی کی تو ملک ظاہر برس نے پہونچ کر ایسی ہزیمت دی کہ تقریباً ایک لاکھ نعشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر وہ بھاگا۔ اسی

طرح دوبارہ ۱۳۰۰ء میں جب وہ پھر اپنی پوری طاقت سے حملہ آور ہوا اس وقت ملک منصور قلاؤدن نے پہونچ کر ۲۶ رجب کو حمص کے متصل اس کو شکست دی جس کے بعد کبھی مصر کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ الغرض مصریوں نے ہر مقابلہ میں تقریباً وہی شجاعت اور سیاست دکھلائی جو عرب دکھلاتے تھے۔

صنعت

مصر کی قدیمی صنعت قصب بافی تھی۔ اسلامی عہد میں خاص کر فاطمیہ کے زمانہ میں اس کو خصوصیت کے ساتھ ترقی ہوئی اور قصب مصری دنیا بھر میں جانے لگا۔ دوسری صنعت سنگ تراشی تھی۔ نہ صرف ان کے پرانے بت بلکہ قدیمی عمارتیں وغیرہ بھی ایک قسم کی سنگ تراشی ہی کہی جاسکتی ہیں۔ بڑا ہرم جو تقریباً پندرہ ایکڑ زمین پر واقع ہے صرف ترشے ہوئے چوکور ۲۳ لاکھ پتھروں کا مجموعہ ہے اور کچھ نہیں۔ اسلامی زمانہ میں معابد، مساجد اور محلات وغیرہ کی بدولت مصر میں فن تعمیر آیا اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس میں ترقی ہوتی گئی۔ چنانچہ ممالیک کے عہد کی عمارتیں اپنی خوبیوں کے لحاظ سے فن تعمیر کا عمدہ نمونہ شمار کی گئی ہیں اور قلقشندی کے بیان کے مطابق ان کے کتبے دنیا کے جملہ عربی کتبوں سے خوشنما ہیں۔

مردم شماری

ہیروڈوٹس نے کہا ہے کہ مصر میں دو ہزار شہر ہیں۔ ڈیوڈورس نے وہاں کی آبادی ستر لاکھ لکھی ہے اور یوسیفوس یہودی نے اپنی کتاب آثار الاسرائیلین میں ۷۵ لاکھ۔ اسلامی عہد میں یہ تعداد بڑھ کر دو کروڑ تک پہونچ گئی تھی مگر خلفاء فاطمیہ اور خاصکر ممالیک کے زمانہ میں اندرونی فتنوں، صلیبی جنگوں، بلاؤں، وباؤں، قحطوں اور سب سے بڑھکر بدنظمیوں کی وجہ سے گھٹ کر صرف تین چار لاکھ رہ گئی۔ خدیوی عہد سے پھر ترقی پر ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء کی مردم شماری تقریباً ۱۲ ملین تھی جس میں سے صرف ایک ملین غیر مسلم ہیں اور باقی مسلمان۔ ان غیر مسلموں میں بڑی تعداد یونانیوں کی ہے جو عربی خوب بولتے اور لکھتے ہیں۔ زیادہ تر اہل دفاتر اور قانون پیشہ لوگ یہی ہیں۔ ان کے علاوہ انگریز، فرانسیسی، اطالین، جرمن اور ارمن وغیرہ ہیں۔ قدیم قبطی مصری جو یعقوبی فرقہ کے عیسائی ہیں اب آٹھ ہزار سے زیادہ نہیں ہیں۔

اناطول فرانس کا فلسفۂ زندگی

انسانی زندگی

حال میں میری نظر سے ایک کتاب گذری ہے جس میں مصنف صاحب نے، جو فلسفی بھی ہیں اور شاعر بھی، ہمارا تعارف ایک ایسی قوم سے کرایا ہے جو رنج، خوشی، ذوق، جستجو ان سب سے بالکل بری ہے، مگر اس خیالی دنیا سے نکل کر جب ہم اپنے چاروں طرف انسانوں کو زندگی [illegible]
دیکھتے ہیں تو ہمارے دل میں ان کی کتنی جگہ ہو جاتی ہے اور [illegible]
اطمینان ہوتا ہے! اس وقت ہم کو احساس ہوتا ہے کہ سچی
درد کی دوا پھوٹ بہنے والے درد آشنا درخت کے زخموں سے [illegible]
حاصل ہو سکتی ہے۔ اس خیالی دنیا کے باشندوں نے جذبات اور خواہشات کو فنا کر کے خوشی اور رنج، غم اور لطف، نیکی اور بدی، ذوق حسن بلکہ خود جوہر اخلاق ان سب کو بھی مٹا دیا ہے۔ وہ لوگ عقلمند ضرور ہیں مگر ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ کیا وقعت ہے اس کام کی جو بلا کوشش اور دقت کے ہو سکے! کیا وقعت ہے اس زندگی کی جو دراز ہو مگر جوش حیات سے خالی، جو پوری طرح سے بسر نہ کی جائے صرف کاٹی جائے؟

اس کتاب کے مطالعہ سے مجھے انسان کی موجودہ حالت بہت کچھ عزیز ہو گئی ہے، اس رنج و غم کی زندگی سے میں بہت کچھ مانوس ہو گیا ہوں، میرے دل میں اپنے ہم جنسوں کی قدر زیادہ ہو گئی ہے اور انسانی ہمدردی کا جذبہ پھر ابھر آیا ہے۔ اس کتاب میں ایک یہ بھی خوبی ہے کہ یہ ہم کو واقعات سے رغبت دلاتی ہے اور وہم و خیال سے خبردار کرتی ہے۔ ہمارے سامنے ایسے لوگوں کو پیش کر کے جو تمام برائیوں سے بری ہیں یہ ہم کو دکھاتی ہے کہ وہ "خوش قسمت" لوگ دراصل ہم سے کمتر ہیں اور اپنی حالت

کو ان کی حالت سے بدلنا اگر ممکن بھی ہو تب بھی ہماری انتہائی بیوقوفی ہوگی۔

وہ "خوش نصیب" لوگ بھی کس قدر بدنصیب ہیں جو جذبات کو رد کرکے "آرٹ" کو بھی کھو بیٹھے ہیں! بھلا ان میں کوئی شاعر کیونکر پیدا ہو سکتا ہے جبکہ وہ نہ تو رزمیہ شاعری سے لطف اٹھا سکتے ہیں جو محبت اور نفرت کے تلاطم خیز جذبات پر منحصر ہے نہ وہ ظریفانہ شاعری سے حظ حاصل کر سکتے ہیں جو انسان کی مضحکہ خیز خامیوں پر مبنی ہے، "ویدو" اور "فائدر"[1] دونوں ان بیچاروں کی سمجھ سے باہر اور ان کے خیال سے بالا ہیں۔

ان کی آنکھیں، ان کے کان دونوں اس شاعری سے محروم ہیں جو ہماری دنیا میں جنت کی خوبیاں پیدا کر دیتی ہے۔ ان میں ایک "ورجل"[2] بھی نہیں ہے پھر بھی ہم سمجھتے ہیں کہ ان کو خوشی حاصل ہے محض اس وجہ سے کہ وہ بجلی کی مدد سے زینوں کی زحمت برداشت کئے بغیر مکان کی ایک منزل سے دوسری منزل پر جا سکتے ہیں! حالانکہ سچ پوچھو تو دنیا کی خوشی میں تمام بہترین مشینوں کے مقابلہ میں ایک خوبصورت مصرعہ سے کہیں زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔

ترقی! بے پناہ ترقی! ان انجینئر لوگوں میں نہ تو جذبات ہوتے ہیں نہ شاعری نہ محبت۔ افسوس! وہ محبت کو کیا جانیں، وہ تو خوش اور مطمئن ہیں! محبت کی کلی طرف غم ہی کی فضا میں کھلتی ہے۔ ایک گرفتار محبت کی عرض حال ایک مصیبت زدہ کا نالہ نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک انگریزی شاعر درد محبت سے متاثر ہوکر کہتا ہے "اگر میری جگہ کوئی دیوتا ہوتا تو اس کا رنج سے کیا حال نہ ہوا ہوتا! ایک دیوتا میں نہ تو اتنی قوت برداشت ہے کہ تیرا دیا ہوا غم سہہ سکے نہ اس کی اہلیت ہے کہ تیرے قدموں پر اپنی جان نثار کر سکے۔"

ہم کو چاہئے کہ ہم رنج و غم سے صلح کر لیں اور یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جہاں تک ہماری عقل کی

---

[1] دو یونانی عورتیں جن کی دردناک زندگی کی روایتیں مشہور ہیں۔ دونوں جذبات کے تلاطم کا مجسمہ تھیں اور دونوں کی زندگی کا خاتمہ خودکشی ہی پر ہوا۔

[2] لاطینی زبان کا سب سے بڑا شاعر جس کو انگریزی میں ورجل (Virgil) کہتے ہیں۔

ہوچکا ہے کہ کوئی خوشی بھی اس خوشی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی جو ہم کو اس زندگی میں حاصل ہے۔ یہی زندگی جو لطیف
بھی بے انتہا ہے اور تلخ بھی بے انتہا، جس میں اچھائی بھی بے حساب ہے اور برائی بھی بے حساب، جو بلند
سے بلند خیالات سے معمور بھی ہے اور سخت سے سخت حادثات سے گرانبار بھی ہے، یہی دنیا جو تمام چیزوں،
تمام باتوں کو اپنے دامن میں لیے ہے اور جو تمام اضداد کو ہم آہنگ کرتی ہے، یہی ہمارا باغ ہے جس کی ہم
جس قدر بھی سیوا کریں کم ہے۔

اتفاقات | جن لوگوں نے بڑے بڑے کام کرنے کا ذوق اور سلیقہ پایا ہے وہ جانتے ہیں کہ حکمی تدبیریں
بھی الٹی ہو جاتی ہیں اور اس لیے وہ ہمیشہ اتفاقات کا خیال رکھتے ہیں۔ جنگ اور تجارت دونوں فن یہی سکھاتے
ہیں کہ کبھی تمام موافق حالات کے جمع ہو لینے کا انتظار نہ کرنا چاہیے۔
پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

فلسفۂ زندگی | زندگی کو اچھا یا برا کہنا ایک فضول اور مہمل بات
اچھی بھی ہے اور بری بھی کیونکہ اچھائی اور برائی یہ دونوں خیالات ہم
ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی پر لطف بھی ہے، پر درد بھی ہے، دل آویز بھی ہے، دل دوز بھی ہے، شیریں
بھی ہے اور تلخ بھی ہے، غرضیکہ ایک معجون مرکب ہے جس میں سب ہی کچھ ہے۔ اگر مثال دی جائے
تو کہا جا سکتا ہے ہمارے کرشن[1] کی رنگا رنگ پوشاک کی طرح ہے، کسی کو وہ سرخ نظر آتی ہے کوئی
اسے نیلی بتاتا ہے اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ ٹھیک کہتا ہے کیونکہ جہاں اس میں اور رنگ ہیں وہ سرخ
بھی ہے اور نیلی بھی ہے۔ یہ حقیقت کا ایک ایسا نکتہ ہے کہ جس کے سمجھنے سے ہم سب ایک ہو سکتے ہیں
یہاں تک کہ فلسفیوں میں بھی جو ایک دوسرے کو نوچتے پھاڑتے رہتے ہیں اتفاق ہو سکتا ہے مگر ہماری
فطرت ایسی ہے کہ ہم دوسروں سے زبردستی یہ چاہتے ہیں کہ ان کے خیالات اور جذبات بھی ہمارے
ہی جیسے ہوں، ہم اس کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ہم مغموم ہوں اور ہمارا ہمسایہ خوشیاں منائے۔

---

[1] ایک پرانے اور مشہور سوانگ کا مسخرہ جس کی پوشاک کئی مختلف رنگ کے کپڑوں کی بنی ہوتی ہے۔

شیطان کا رحم و کرم | برائی کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو اچھائی بھی نہ ہوتی۔ اچھائی کا وجود بھی برائی کے وجود پر مبنی ہے۔ اگر خوف نہ ہو تو بہادری ایک بے معنی خیال ہے، اگر مصیبت اور غم نہ ہوں تو ترحم اور ہمدردی کا ہونا بھی ممکن نہیں، جس دنیا میں خوشی ہی خوشی ہو وہاں خدمت اور ایثار کے کیا معنی! جب تک بدی نہ ہو نیکی ایک مہمل لفظ ہے، بغیر نفرت کے محبت ناممکن ہے، خوبصورتی کا خیال بدصورتی کے خیال سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ محض برائی کا صدقہ ہے کہ دنیا رہنے کے قابل ہے، غم ہی کی بدولت زندگی قابل برداشت ہے۔ لہٰذا شیطان کو بجائے برا بھلا کہنے کے ہم کو اس کا احسان ماننا چاہئے اور اس کی صناعی اور دانشمندی کی داد دینا چاہئے۔ کم از کم آدھی دنیا تو اسی کی کاریگری ہے اور اس آدھی اور دوسری آدھی کا اس طرح گوشت اور ناخن کا ساتھ ہے کہ اگر ایک کو چھیڑا تو دوسری کو صدمہ پہونچنا لازمی ہے۔ ہر بدی کے ساتھ کوئی نہ کوئی نیکی لگی ہوئی ہے اور بغیر اس نیکی کو مٹائے بدی کو فنا کرنا ممکن نہیں۔

کچھ عرصہ ہوا میں دیہات کے ایک میلے میں گیا اور وہاں کٹھ پتلیوں کا تماشا دیکھنے لگا۔ حضرت انتھونی[1] کی نقل ہو رہی تھی۔ یہ وہ تماشا ہے جس کے فلسفہ کے سامنے شیکسپیر کے تمام المیے اور ہمارے ڈنیری صاحب کے تمام ڈرامے سب ہیچ ہیں۔ خدا اور شیطان دونوں کے رحم و کرم کو کس قدر واضح طور پر کھا دکھایا ہے!

جب پردہ اٹھا تو تماشا گاہ (اسٹیج) پر ایک بھیانک ریگستان نظر آیا مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ

---

[1] یہ تیسری صدی عیسوی کے آخر اور چوتھی کے شروع میں ایک بہت بڑے عیسائی ولی گزرے ہیں۔ یہ مصر کے باشندے تھے اور برسوں افریقہ کے ریگستانوں میں خدا کی عبادت میں مشغول رہے۔ وہاں ان کی سخت سے سخت آزمایش ہوئی۔ شیطان طرح طرح کے بھیس بدل کر آتا تھا اور کبھی ان کو ورغلاتا تھا، کبھی لالچ دلاتا تھا کبھی ناقابل برداشت زدوکوب بھی کرتا تھا مگر حضرت انتھونی ایمان کے راستے سے نہ ہٹے اور امتحان میں پورے اترے۔

فرشتوں اور شیطانوں سے بھر گیا۔ کچھ تو ان فرشتوں اور شیطانوں کے تماشاگاہ پر باری باری آنے سے اور کچھ کٹھ پتلیوں کی چال ڈھال سے یہ شروع ہی سے خیال ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کے حکم سے ہو رہا ہے یا یوں کہئے قسمت کا لکھا پورا ہو رہا ہے۔ پھر بھی جب حضرت آنتھونی نے حمد اور دعا ختم کی اور سجدے سے سر اٹھایا۔ ان کی پیشانی بے شمار سجدوں سے اونٹ کی پیٹھ کی طرح سخت اور گھٹے دار ہوگئی تھی اور ان کی آنسو بھری آنکھوں کے سامنے ملکۂ سبا اپنے سنہرے لباس میں ناز و انداز سے ہنستی اور دونوں ہاتھ پھیلائے دکھائی دی تو ہمارے بدن میں سنسنی پڑ گئی اور ہمارا دل اس اندیشہ سے دھڑکنے لگا کہ کہیں حضرت آنتھونی ملکۂ سبا کے جال میں پھنس نہ جائیں۔ اسی طرح ان کی باقی آزمائشوں اور مصیبتوں کو بھی ہم اپنا دل تھامے دیکھتے رہے۔

حضرت آنتھونی کے ساتھ ہماری پرجوش ہمدردی،
آپ کو دیکھتے تھے۔ جب ان کی فتح ہوئی تو وہ ہماری فتح تھی
اس جدوجہد میں جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری

القصہ حضرت آنتھونی جو اتنے بڑے ولی ہیں تو محض اس وجہ سے کہ وہ ملکہ سبا کے جال میں نہ پھنسے اور آزمائش میں پورے اترے اگر ہم اتنا مانتے ہیں تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شیطان نے ملکۂ سبا کو حضرت آنتھونی کے پاس بھیج کر وہ کام کیا جس کے بغیر وہ ولی ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

اس طرح کٹھ پتلیوں نے میرے اس یقین کو کامل کر دیا کہ دنیا میں اچھائی سے پہلے برائی کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ شیطان ہی وہ ستون ہے جس کے سہارے دنیا کی ساری اخلاقی خوبیاں قائم ہیں۔

__الفاظ کا جادو__ | میرے سامنے یہ کتاب ہے اور مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ جس طرح قدرت ہم کو اپنی موزونیت کے نادر نمونوں میں طرح طرح کی شکلوں اور رنگوں سے فرحت بخشتی ہے اسی طرح چند لفظوں میں جو کسی زبان سے مانگ لئے جائیں اسی قوت سے کہ وہ ہمارے دل و دماغ میں سرور پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ چند اشارے ہمارے دماغ میں الہامی تصویریں کھینچ دیتے ہیں۔ اسی کو میں

معجزہ کرتا ہوں۔ ایک خوبصورت شعر ہماری روح کے راگ بھرے تاروں کو چھیڑنے میں اس مضراب کا کام کرتا ہے جو کسی استاد کی انگلی میں ہو۔ شاعر ہمارے گوشِ دل کو اپنے خیالات نہیں ہمارے ہی خیالات کے گیت سناتا ہے۔ جب وہ اپنی محبوبہ کا ذکر کرتا ہے تو ہمارے دلوں میں ہمارے اپنے وصل اور ہجر کے قصے تازہ ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو دراصل روح کا جگانے والا کہنا چاہئے۔ جب ہم اس کے مطلب کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں تو ہم خود شاعر ہو جاتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک میں ہمارے تمام شاعروں کا ایک نمونہ موجود ہے۔ اول نمونوں سے کوئی بھی واقف نہیں ہے اور جب ہم میں احساس نہ رہے گا تو یہ نمونے بھی سب ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے۔

بھلا یہ ممکن تھا کہ اگر یہ شاعر وہی باتیں نہ کہتے جو ہمارے دل میں ہیں تو ہم کو ان کے کلام سے اس قدر رغبت ہوتی؟ ہرگز نہیں یہ محض خام خیالی ہے۔ بلند سے بلند خیالات کا شاعر بھی اصل میں خود بیں اور خود پرست ہے۔ اس میں خودی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور کچھ بھی نہیں۔ ہر شاعر نے اپنے کلام میں اپنی ہی تصویر کھینچی ہے اور ہم اس میں صرف اپنی تصویر دیکھتے ہیں۔ شاعر محبت کی راہ دکھاتا ہے اور ہمیں اس منزل میں سہارا دیتا ہے۔ بس اتنا ہی شاعروں سے فائدہ ہے یہی ان کا کام ہے اور یہ ان کی بیاری خود پسندی کو تسکین دینے کے لئے بھی کافی ہے۔ ان کے اشعار کی تعریف کرنا اسی قدر فضول ہے جس قدر عورت کی تعریف کرنا۔ جن شعروں کا اثر دل سب سے زیادہ قبول کرے گا وہی سب سے زیادہ خوبصورت ہوں گے۔ رہا لوگوں سے یہ قبول کرانا کہ ہماری پسند لاجواب ہے یہ توخدائی فوجداروں کا کام ہے نہ کسی سمجھدار آدمی کا۔

ادبُ الجاحظ

عنوان بالا سے ابھی حال میں ایک کتاب مصر سے شائع ہوئی ہے کتاب صوری و معنوی
ہر اعتبار سے نہایت دیدہ زیب و دلپذیر ہے۔ فاضل مؤلف کا نام "حسن السندوبی" ہے۔
سندوبی صاحب مصر کے اہل انشاء میں ایک مرتبۂ خاص کے مالک ہیں۔ تلاش و جستجو، جرح و
تنقید اور روایت و درایت کا نہایت خوبی سے امتزاج کیا ہے اور چہ لطف یہ ہے کہ رنگینیٔ
عبارت اور حسن بیان بھی اس کتاب کی خصوصیت خاصہ ہے۔

اصل کتاب ڈھائی سو صفحات کو محیط ہے، میں نے
کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں یعنی کوئی اہم با
اتنے نہ ہوں کہ گراں گزریں۔

قبل اس کے کہ اصل موضوع شروع کروں، یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے
مولینا سورتی صاحب مدظلہ سے محض مطالعہ کی غرض سے لایا تھا۔ کتاب کے پڑھنے کے بعد
میری بھی یہی رائے ہوئی کہ اس کے ضروری حصص کا ترجمہ کر دوں اور مولینا موصوف نے بھی
یہی ارشاد فرمایا۔ اس لئے مولینا سورتی صاحب کا شکریہ واجب ہے کہ ان کی عنایت و شفقت سے
یہ کتاب میرے پاس اتنے دنوں رہی کہ میں اس کے ضروری مباحث اردو میں منتقل کر سکا۔

رئیس احمد جعفری ندوی

اصل و نسب سلسلۂ نسب، ابو عثمان عمرو بن بحر بن محبوب بن فزارۃ، لیثی، کنعانی ہے، بعض ارباب سیر کا خیال ہے کہ فزارہ ابو القلمس عمرو بن قلع الفقمی کا غلام تھا۔ قلمس کی اصابت رائے اور نفوذ و اثر کا ہر شخص معترف تھا۔ یہ جس مہینہ کو چاہتا تھا حلال کر دیتا تھا، جس مہینہ کو چاہتا تھا حرام[1] کر دیتا تھا۔ یہ خصوصیت و اقتدار

[1] دیکھو صفحہ ۴۲۰۔

اس کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ قائم رہی، عرب میں اس شان کا نہ کوئی پیدا ہوا، اور نہ کسی میں یہ جرأت تھی کہ اس کی کسی رائے کی مخالفت کر سکتا۔

اس متقدر خاندان میں جاحظ نے اپنے ایام نشو و نما پورے کئے، اور نہ صرف اس نے بلکہ اس کے آباو اجداد نے بھی یہیں پرورش پائی۔ یموت بن المزرع کہتا ہے کہ فزارہ ایک سیاہ رو آدمی تھا اور عمر بن قلع کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔

یہاں سے جاحظ کی عربیت اور نسل کے متعلق ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جاحظ عربی سامی نسل سے تھا یا قرب و جوار کی وجہ سے افریقی عناصر عربی عناصر میں ممزوج ہو گئے؟ یا اس کے آباو اجداد میں سے کوئی غلام تھا یا اس کی نسل غلامی کی کدورتوں اور آلائشوں سے پاک تھی؟ اور وہ اچھا خاصا "حر" پیدا ہوا تھا؟

میرا جواب تو یہ ہے کہ سیاہ رنگ ہونا تو عربی الاصل ہونے کے خلاف کوئی معقول دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ یہ رنگ عربوں میں پایا جاتا تھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس رنگ پر فخر بھی کیا جاتا تھا۔ بہت سے ایسے لوگ تھے جو اسے پسند کرتے تھے، محبوب رکھتے تھے اور دوسرے رنگوں پر اسے ترجیح دیتے تھے، لہذا جاحظ کے جداعلیٰ کا سیاہ رنگ ہونا اس کی "عجمیت" کی دلیل کیوں کر ہو سکتا ہے؟

رہی غلامی تو ماہرین انساب و اخبار، و رواۃ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ اس کے آباو اجداد میں کوئی بھی غلام رہا ہے؟ اسی طرح یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ اس کے اسلاف میں سے کوئی شخص کبھی اسیر کیا گیا ہو۔

فزارہ کو آل فقیم کا "مولیٰ" کہتے ہیں، تو لفظ "ولا" حریت کی نفی کب کرتا ہے؟ یہ لفظ تو محب، صدیق، نصیر، غلام، آزاد سب پر منطبق ہوتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے معنوں میں

(حاشیہ صفحہ ۴۱۶) اصطلاح میں اسے "نسی" کہتے ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے "انما النسئی زیادۃ فی الکفر یضل بہ الذین کفروا یحلونہ عاما و یحرمونہ عاما" ۱۲۔

استعمال ہوتا ہے، ایک صحیح النسب قبیلہ دوسرے قبیلہ کا ہمیشہ "مولیٰ" رہا کرتا تھا۔

اب خود جاحظ کو لیجئے۔ اس کی کتابوں اور روایتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عربیت میں اسے بہت غلو تھا، کسی قوم کو عرب سے افضل و اعلیٰ وہ تسلیم ہی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اس قدر اپنے اس خیال میں متعصب تھا کہ انسانیت کی ہر فضیلت، بزرگی اور اولیت کا سہرا وہ عرب ہی کے سر رکھتا تھا۔

اس کے باوجود محققین نے اعتراف کیا ہے کہ جاحظ خالص النسب عرب تھا۔ ابوالقاسم بلخی اور ابن حزم کہتے ہیں کہ وہ عرب تھا، عرب خاندان سے تھا اور عرب کے ایسے گھرانہ میں پرورش پائی کہ مجد و شرف اس کے رگ ریشہ میں پیوست ہو گیا۔

لقب | لقب جاحظ تھا، اس لیے کہ وہ بہت ہی بدشکل تھا، اس کی آنکھیں [illegible]

علم و فضل کے آگے یہ عیب کوئی اہمیت نہیں رکھتا، [illegible]

سے بھی زیادہ بدشکل و بدقوارہ تھے مثلاً شیخ الفلاسفہ سقراط [illegible]

اور ہونٹ موٹے موٹے تھے، جاحظ تو بہرحال سقراط سے کم تھا [illegible]

"عمرو" کوئی نہیں لیتا، نہ اس کی کنیت "ابوعثمان" سے کوئی یاد کرتا ہے، [illegible]

جہاں تک جاحظ کا تعلق ہے وہ اس لقب (جاحظ) کو بہت ناپسند کرتا تھا اور جو کوئی اسے اس لقب سے پکارتا تھا تو وہ برا مانتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ لوگ اس کا اصلی نام لیا کریں۔ وہ اپنے اصلی نام "عمرو" سے اتنا خوش تھا کہ کہا کرتا تھا کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں یہ نام بہادروں کے لئے، بادشاہوں کے لئے، سرداروں کے لئے، رئیسوں کے لئے مخصوص رہا مثلاً عمرو بن سعید الاکبر، عمرو بن العاص، عمرو بن معدیکرب وغیرہ۔

وہ کہا کرتا تھا "لوگ مجھے 'عمرو بن بحر' کیوں نہیں کہتے؟ یہ کیا ہے جس کو دیکھئے وہ اسی مہمل لقب جاحظ سے یاد کر رہا ہے۔"

بات بھی یہی ہے کہ جب کوئی لقب آدمی کے کسی عیب کو ظاہر کرتا ہو تو برا معلوم ہی ہوتا ہے اگر جاحظ کو یہ معلوم ہوتا کہ اس کا یہ لقب بڑے بڑے لوگوں کے لئے باعث شرف و مجد ہوگا بلکہ معیار

فضیلت قرار دیدیا جائے گا تو شاید وہ خوش ہوتا بلکہ بعض مرتبہ تو یہ خطاب دوسروں کے لئے خصومت کا سبب بھی بن جاتا تھا، اور ویسے ایک مستقل فضیلت تو تھی ہی۔ ابوحیان توحیدی ابن عمیہ سے اس لئے برسر پرخاش تھے کہ "جاحظ ثانی" وہ بھی کہلاتے تھے حالانکہ وہ صرف اپنے تئیں اس خطاب جلیل کا حقدار سمجھتے تھے، محمود بن عزیز جیسا فاضل اجل "جاحظ ثانی" کے شرف کا مالک تھا، ابومحمد الحسین بن علا کے متعلق ابن ندیم کہتا ہے کہ "وہ جاحظ کے مسلک کے پیرو تھے"۔ ابوالقاسم آمدی جیسے شخص کے متعلق ابن ندیم ان کے مصنفات کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے "وہ جاحظ کے ہم مذہب تھے"۔

مولد و منشا جاحظ کے مولد کے بارے میں مورخین اور رواۃ میں اختلاف ہے، بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اسکی ولادت ۱۵۹ھ میں ہوئی، بعض کچھ اور کہتے ہیں، لیکن صحیح تر روایت خود جاحظ کی ہے جسے یاقوت نے اپنی "معجم" میں نقل کیا ہے کہ جاحظ کہتا تھا "میں ابونواس سے ایک سال بڑا ہوں۔ میں ۱۵۰ھ کے اوائل میں کتم عدم سے عالم وجود میں آیا، اور وہ اواخر میں،........" خود جاحظ کی اس "نص" کے بعد شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

ابن خلکان کی روایت حد درجہ تعجب خیز ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں خطیب بغدادی کی "تاریخ بغداد" سے یہ قول نقل کیا ہے کہ "ابونواس کی پیدائش ۱۳۶ھ میں ہوئی لیکن اس قول کی اہمیت جاحظ کے اس قول سے زائل ہو جاتی ہے جس میں اس نے اپنی اور ابونواس کی عمر بیان کی ہے۔

جاحظ بصرہ میں پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں بصرہ و کوفہ یہی دو شہر تھے جو تہذیب و تمدن، علوم و فنون، اور لغت و ادب کے مرکز تھے۔ بغداد اس وقت تک عہد طفولیت میں تھا۔ اس کی عمرانیت و حضارت ابھی اس درجہ تک نہیں پہونچی تھی، اگرچہ عمران و تمدن کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

جاحظ کی نشو و نما بصرہ ہی میں ہوئی اور وہیں سے اس کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ بحث و استقرا، اور علماء عصر سے استفادہ کی خاطر وہ بصرہ چھوڑ کے اس زمانے کے دوسرے اسلامی ممالک کی طرف گیا جہاں سے وہ کامیاب و کامران واپس ہوتا تھا، جب اس کی عمر پچاس سے متجاوز ہو گئی تو اس نے بغداد کا رخ کیا، اور اسی کو اپنا مستقل مستقر بنا لیا۔ بغداد جب وہ پہونچا تو

مامون الرشید کا عہد سعادت تھا، اس وقت تک بغداد ترقی و سرفرازی کی ساری منزلیں طے کر چکا تھا۔
بغداد میں اس کا داخلہ ۲۰۴ھ میں ہوا، جب اس کے قیام کی شہرت ہوئی تو علماء و فضلاء کی ایک جماعت
کی جماعت مشتاق زیارت ہو کر آئی اور طالبان علم کا تو دریا امنڈ آیا، ہر صنف اور ہر جنس کے طلبہ موجود تھے،
نسل و قوم کا کوئی امتیاز ہی نہیں تھا، جاحظ کہتا ہے "فزار میرے پاس علم کلام حاصل کرنے کے لئے آیا،
لیکن اس کو اس فن سے کوئی مناسبت نہیں تھی"۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ جاحظ کو علم حدیث سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ
علوم حدیث میں بھی وہ کمال حاصل کر چکا تھا اور مسند درس کی زینت بن چکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات
ہے جب وہ بصرہ میں تھا اور ابھی بغداد نہیں گیا تھا۔ خطیب بغدادی
ہیں کہ جن لوگوں نے جاحظ سے حدیث کی سند لی ہے ان
داؤد کہتے ہیں "میں بصرہ میں تھا تو ایک بار جاحظ کے ہاں گیا
روشن دان سے جھانکا اور پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا: ب
کہا تم نے مجھے "حشویہ"[۲] سے گفتگو کرتے کبھی دیکھا ہے؟ میں نے کہا میں ابوداؤد کا بیٹا ہوں۔ کہا "اخاہ"
آؤ۔ یہ کہہ کر وہ نیچے اتر آیا اور پوچھا کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا مجھ سے کوئی حدیث بیان کیجئے۔ کہا لکھو،
عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی طنفسۃ[۳]" خطیب نے سلیمان بن اشعث سے ایک روایت
کی ہے کہ میں جاحظ کے ہاں گیا اور کہا کوئی حدیث بیان کیجئے۔ کہا لکھو "عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اقیمت الصلوۃ فلا صلاۃ الا المکتوبۃ[۴]"۔ یہاں ایک غلط فہمی رفع ہو جانا چاہیے۔
یعنی جاحظ ہر محدث کی "حشو" سے نہیں تعریف کرتا تھا۔ یہ خیال اس کا انھیں لوگوں کے متعلق تھا جو

---

[۱] ابوداؤد کا جاحظ سے ملاقی ہونا مشتبہ ہے (مترجم)

[۲] مہمل، برے لوگ۔ [۳] قالین، دری

[۴] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اقامت ہو جائے تو فرض کے علاوہ اور نماز نہ پڑھنا چاہیے۔

لوگ کھونے گھوڑے میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

عہدِ جاحظ کے اسالیبِ تعلیم | قبل اس کے کہ ہم اس امر پر گفتگو کریں کہ جاحظ کی تعلیم کیوں کر ہوئی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے اسلوبِ تعلیم کا ایک مختصر سا خاکہ بھی آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

غور و فکر اور بحث و استقراء کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم و تعلم کا دستور یہ تھا کہ پہلے بچہ ابتدائی طور پر لکھنا پڑھنا سیکھتا تھا، پھر کچھ صرف و نحو کی تعلیم ہوتی تھی، پھر کچھ تھوڑا سا حساب سکھایا جاتا تھا، پھر قرآن مجید پورے طور سے قرأت وغیرہ کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا، اس کے بعد بچے کو کسی داستان گو کے سپرد کر دیتے تھے جو بادشاہوں کی جنگ و فتح کے قصے سناتا تھا، بہادروں کے حالات بتاتا تھا، شہ سواروں اور سپہ سالاروں کی کہانیاں سناتا تھا، اصحابِ جنگ و جدل کی سیرت بیان کرتا تھا، اور یہ سب وہ اس طرح کرتا تھا کہ عبرت و موعظت کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے پاتا تھا، یہ باتیں پورے طور سے بچے کے دل میں گھر کر جاتی تھیں، اسی سلسلہ میں عابدوں اور زاہدوں، خلوت نشینوں اور بزرگوں کے حالات بھی بیان کرتا جاتا تھا، ان متفرق معلومات پر عبور حاصل کر لینے کے بعد مساجد عامہ کے حلقہائے درس میں شریک ہوتا تھا، فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد محدث کے حلقہ کا رخ کرتا تھا، پھر اہلِ لغۃ کی مجلس میں جاتا تھا، وہاں سے ماہرینِ انساب کے درس میں شریک ہوتا تھا، وہاں سے ماہرینِ اخبار و آثار کے پاس حاضر ہوتا تھا، پھر منطقی کی مجلس میں، وہاں سے فلسفی کے دربار میں، پھر محفلِ ادب میں، وہاں سے مہندس کے "معمل" میں، پھر مفسر کے ہاں زانوئے شاگردی تہ ہوتا تھا، وہاں سے اصولی و متکلم کی جماعت میں، پھر محفلِ روایت میں، اور وہاں سے شاعر کے مجلۂ فکر و ذکر میں، پھر انشا پردازوں کے دفتر میں، اور وہاں سے منجمین کے رصد خانوں میں، پھر کسی اسطرلابی کے حضور میں، اور وہاں سے کسی جغرافی کے سامنے، پھر بزمِ موسیقی کے کسی "استاد" کے دولت خانہ پر، وہاں سے کسی ساز و چنگ کے مرشد کے پاس، پھر کسی دف و نے بجانے والے کے گھر پر۔ یہ تھا اس عہد کے اسلوبِ تعلیم کا ایک مختصر خاکہ جس سے لڑکے اور لڑکیاں دونوں کو بقدرِ استعداد حصہ ملتا تھا۔

جب طالبِ علم اپنے علم و فن میں استحکام حاصل کر لیتا تھا تو اسے اپنے "شیخ الجامعہ" کی

طرف سے سند ملتی تھی۔ اس کے بعد اسے حق حاصل ہو جاتا تھا کہ وہ مسند درس و تدریس کو سنبھال لے، لیکن بہت سے ان اسناد پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے بعد بھی بادیہ گردی کرتے تھے۔ بڑے بڑے شیوخ و علماء سے ملاقات کرتے تھے، استفادہ کرتے تھے، مجلس مناظرہ منعقد کرتے تھے۔

اسی نظام و دستور کے مطابق جاحظ نے بصرہ اور کوفہ کے اکابر علماء سے تعلیم حاصل کی۔ جن لوگوں سے اس نے تعلیم حاصل کی، ان میں سے چند کے اسماء گرامی آپ بھی سن لیجیے، مثلاً ابوعبیدۃ معمر بن مثنیٰ، اصمعی، ابوزید انصاری، اخفش اور ابواسحٰق نظام سے اس نے علوم کلام و مذہب اعتزال کی تعلیم حاصل کی۔

اس نے اپنے شیوخ سے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ توکیا ۔۔۔ ۔۔۔ جایا کرتا تھا، اور تازہ وارد اعراب بادیہ سے فصاحت و بلا[غت] ۔

اس مربد میں عرب تجارت اور اسباب تجارت ۔۔۔ آیا کرتے تھے۔ خطباء و شعرا، رواۃ و نساب، رجز خواں او[ر] ۔۔۔ متعلق ہوتے تھے سب ہی آتے تھے، اپنے نتائج افکار پیش کرتے تھے، داد فصاحت دیتے تھے، اور خراج تحسین لیتے تھے، یہ مربد گویا اسلام میں "سوق عکاظ" کا دوسرا نمونہ تھا۔

جاحظ نے علم حدیث بھی بہت سے ثقہ اور قابل استناد بزرگوں سے حاصل کیا تھا مثلاً قاضی ابویوسف شاگرد امام ابوحنیفہ (قاضی القضاۃ، چیف جسٹس، بغداد) یزید بن ہارون سری بن عبدویہ، حجاج بن محمد بن حماد بن سلمہ وغیرہ۔

جاحظ سے بھی بہتوں نے اس فن کو حاصل کیا مثلاً مبرد، یموت بن مزرع اور ابوبکر بن ابی داؤد[۲]

---

[۱] اعراب بادیہ کی فصاحت و بلاغت ہمیشہ معیار رہی، اب کہ دنیا اسقدر تہذیب و تمدن سے آشنا ہو چکی ہے اور زبان عربی بھی مختلف ادوار سے گزر چکی ہے، باایں ہمہ اب تک اعراب بادیہ کی عربی سند ہے۔ (مترجم)

[۲] ؟ (مترجم)

سجستانی وغیرہ۔

اسباب معاش اور عزت وجاہ

جاحظ کے ابتدائی ایام بہت تنگدستی اور فقر وفاقہ میں بسر ہوئے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ نہر سیحان پر مچھلی اور روٹی بیچا کرتا تھا، یہ روایت صحیح ہو یا نہ ہو بہرحال اس سے یہ تو ثابت ہی ہوتا ہے کہ ابتدائی ایام اس کے بہت عسرت وفلاکت میں گزرے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے اس کی سبکی ہوتی ہو جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے فضل وکمال کا ایک زمانہ قائل ہے، اس کی تصنیفات سارے عالم میں پھیلی ہوئی ہیں، جب وہ روشناس خلق ہوا تو ساری دنیا اس کی طرف امنڈ پڑی، اس کے اسباب معیشت وسیع ہو گئے اور وہ عیش وعشرت میں اپنی زندگی بسر کرنے لگا۔ اب تو حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ وزراء دولت اور عمائد سلطنت اس سے قرب رکھنے لگے مثلاً خاندان برامکہ کے افراد، آل طاہریہ کے اشخاص، فتح بن خاقان، ابراہیم بن عباس الصولی، محمد بن عبدالملک زیات، احمد بن ابی داؤد وغیرہ۔

میمون بن ہارون نے یہ دیکھ کر کہ اب تو اس کی خوب مزے میں بسر ہوتی ہے ایک بار اس سے دریافت کیا "کیا بصرہ میں تمہارے پاس کوئی جاگیر ہے؟"

جاحظ مسکرایا اور کہا "ہاں، میں ہوں، میری جاریہ ہے، ایک خادمہ ہے جو اس کی خدمت کرتی ہے، ایک نوکر ہے، ایک گدھا ہے، بس یہ ہے میری کل کائنات، ایک بار میں نے اپنی کتاب "الحیوان" محمد بن عبدالملک زیات کو ہدیۃً بھیجی تو اس نے مجھے پانچ ہزار دینار عطا کئے، "البیان والتبیین" احمد بن ابی داؤد کو میں نے عطیۃً بھیجی، اس نے بھی مجھے پانچ ہزار دینار بخشے، اسی طرح کتاب "الزرع والنخل" ابراہیم بن عباس الصولی کو میں نے بھیجی اس نے بھی مجھے پانچ ہزار دینار عنایت کئے، اب میں بصرہ میں ہوں، میری جاگیر میرے ساتھ ہے جو نہ تجدید کی محتاج ہے نہ اس کی کہ کھاد وغیرہ کی فکر کی جائے۔

جب کہ جاحظ کی مالی حالت اتنی مستحکم ہو گئی تھی تو پھر یہ امر باعث حیرت نہیں رہ جاتا کہ اس نے زمین کے چپہ چپہ کو علم سے لبریز کر دیا اور اپنے امثال واقران سے فضل وفہم میں بہ مدارج بڑھ گیا اور

ہر علم وفن پر متعدد تصانیف کا ایک ذخیرہ تیار کر دیا اس لئے کہ نعم وعطایا آدمی کو بے فکر کر دیتے ہیں اور وہ اپنی استعداد کے مطابق اپنے ذوق سے کام لیتا ہے۔

جاحظ کے بعض احباب واخوان اس کے پاس آئے اور پوچھا "کہو ابو عثمان کیا حال ہے؟" جاحظ نے جواب دیا "تمہارے سوال کے دو پہلو ہیں دونوں کا الگ الگ جواب سن لو۔ حال تو میرا یہ ہے کہ وزیر میری رائے پر عمل کرتا ہے، جو میں کہہ دیتا ہوں اس کو نافذ کرتا ہے، خلیفہ کے انعامات واکرامات کا ایک سلسلہ ہے کہ جاری ہے، پرندوں کا گوشت کھاتا ہوں، نرم وریشمی لباس پہنتا ہوں، اس طبرستانی گدے پر بیٹھتا ہوں اور دیکھو یہ تکیہ لگاتا ہوں اور اب چاہتا ہوں کہ خدا کسی طرح یوم عیش ومسرت لائے" ان میں سے ایک نے کہا "اب جس حال میں ہو [illegible] اور مسرت نہیں [illegible] جاحظ نے جواب دیا "عیش ومسرت تو جب حاصل ہوگی جب [illegible]

ان الفاظ میں گویا خود جاحظ نے اپنی موت [illegible] کی تمنا تو یا تو یہ اس کی حرص بے پایاں کا ایک ثبوت۔

اگر ایسی بات وہ سنجیدگی سے کہتا تو اس کا نتیجہ بھی نہایت تلخ ہوتا [illegible] بات کیوں کرتا۔ مزاح میں یہ بات اس کے منہ سے نکل گئی ہوگی

میر منشی | میر منشی کا منصب اسلامی ممالک میں نہایت اہم عہدہ تھا، حکومت عامہ کی سیاست اسی محور پر گردش کرتی تھی۔ اس منصب جلیل پر وہی مامور کیا جاتا تھا جو مختلف علوم وآداب میں دسترس رکھتا تھا جس کا شمار اصحاب سیاست وتدبیر میں ہوتا تھا اور جو اپنی دانش وبینش کی بنا پر عام طور سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔

مامون الرشید نے جاحظ کی فضیلت کی بنا پر اسے اس عہدہ پر مامور کر دیا۔ بعض لوگوں کو اس کی یہ سرافرازی وقدر افزائی گراں گزری۔ وہ لوگ طرح طرح کے حیلے سوچنے لگے اور مامون تک اس کی چغلی بھی پہنچنے لگی۔ یہ رنگ دیکھ کر تین ہی دن کے بعد جاحظ نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا جو منظور ہو گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جاحظ ان آزاد نگاروں میں تھا جو اپنا قلم آزاد رکھتے ہیں اور اصحاب دولت واقتدار، خلفا و ملوک اور وزرار و ارباب دولت سے مرعوب نہیں ہوتے یا ان لوگوں میں تھا جو اس قسم کے مناصب کو حصول عزت وجاہ کا ایک زینہ سمجھتے ہیں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا میلان آزاد نویسی ہی کی طرف تھا۔

علم و وسعت علم | جاحظ نے بہت سے علوم میں کمال حاصل کیا تھا، فلاسفۂ یونان، حکمار ہند، علمار فارس اور ادبار روما ن کی اکثر کتابیں اس نے مطالعہ کی تھیں، ان کے افکار و آرا پر اس نے غور کیا تھا، کسی علم و فن کی کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جو عربی میں ترجمہ ہوئی ہو اور جاحظ نے اس کا مطالعہ نہ کیا ہو۔

ابو ہفان کہتے ہیں "جاحظ سے زیادہ کتابوں کو محبوب رکھنے والا نہ میں نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ جو کتاب بھی اس کے ہاتھ پڑ گئی بس ختم کر کے دم لیا، یہ شوق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ کتب فروشوں سے رات رات بھر کے لئے ان کی دوکان کرایہ پر لیتا تھا اور رات بھر کتابیں دیکھا کرتا تھا۔ حافظہ بھی غضب کا تھا۔ بہت زیادہ وسیع الروایۃ، قوی الحجۃ اور تیز زبان تھا۔ اسے علم و فضل کی "انسائیکلو پیڈیا" کہنا چاہیے، دنیا کی کون ایسی چیز تھی جو اس کے احاطۂ معلومات سے خارج تھی؟

اس کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی جانتا تھا۔ اس دعوے کی کوئی ایسی مسکت دلیل نہیں ہے جو پورے طور سے اس کو ثابت کرتی ہو لیکن اسی کی عبارت و الفاظ سے ایسے قرائن ضرور ملتے ہیں جو اس رائے کے مؤید ہیں۔

ابو بکر احمد بن علی کا یہ قول جاحظ کی وسعت علم و کمال پر ایک مزید شاہد ہے وہ کہتا ہے:

> "جاحظ اصحاب نظام میں سے تھا۔ علم کلام میں وہ پورے طور سے ماہر تھا۔ علوم دین و دنیا میں بھی وہ بہت بڑا فاضل تھا۔ اس کی بہت سی مشہور کتابیں دین و مذہب کی حمایت میں ہیں، نیز آداب و اخلاق اور ظرافت و سنجیدگی سے متعلق بھی اس نے

بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ لوگ ان کتابوں کو پڑھتے ہیں اور اس کے فضل و کمال کے قائل ہوتے ہیں۔ جاحظ معتزلہ وغیر معتزلہ ہر جماعت میں نہایت عظمت و عزت کا مالک تھا۔ جو علمار اشخاص کے قدرشناس اور معاملہ فہم ہیں وہ اسے خوب جانتے ہیں۔"

جاحظ کی کتابیں دوسروں کے نام سے | جیسا کہ ہر عہد و ہر زمانہ میں ارباب قلم آفات فقر و فاقہ میں مبتلا ہوئے جاحظ بھی نہ بچ سکا۔ قدمار کے آثار کی عظمت گزشتہ لوگوں کا اعتبار لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا ہے بہ نسبت اپنے زمانہ کے چنانچہ مسعودی نے اپنی کتاب "التنبیہ والاشراف" میں روایت کی ہے کہ جاحظ باوجود اپنی جلالت قدر کے کہتا تھا۔

"میں نے بہت سی کتابیں تالیف کیں جو کثرت معانی [illegible]

لیکن میں نے لوگوں کی توجہ اس طرف نہیں دیکھی۔

تالیف کیں۔ کسی کو میں نے عبداللہ بن مقفع کی طرف نسبت

کی طرف یا ان کے علاوہ متقدمین میں سے کسی اور کی طرف

نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل جاتے تھے۔ ان کتابوں میں سوا اس کے کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے انھیں متقدمین کی طرف منسوب کیا تھا۔"

اس قول صریح سے ثابت ہوتا ہے کہ جاحظ نے اپنی بہت سی کتابوں کو ابن مقفع اور سہل بن ہارون وغیرہ کی طرف منسوب کیا۔

تعجب خیز یہ بات ہے کہ اس اعتراف صریح کے باوجود اب تک دس صدیاں گزر چکی ہیں لیکن کوئی ایسا مرد باخدا نہ ہوا جو ابن مقفع کی کتابوں کا مطالعہ کر کے جاحظ اور اس کے اسلوب کا فرق مدنظر رکھ کے کوئی تحقیق کرتا۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ابن مقفع کے اب آثار ہی کیا موجود ہیں۔ جس طرح جاحظ کی بہت سی کتابیں محو ہوگئیں سہل بن ہارون اور ابن مقفع کی کتابیں بھی نذر دور ایام ہوگئیں۔ جس طرح جاحظ نے اپنی بہت سی کتابیں دوسروں کی طرف غلط طور سے منسوب کردیں

اسی طرح دوسروں نے بھی اس کی طرف بہت سے مصنفات (شاید طلب منفعت کے خیال سے) منسوب کردئے، جیسے کتاب "الابل" اور کتاب "الہدایا" حسب تحقیق یاقوت (صاحب معجم) ایک مدت اس کی طرف منسوب ہیں "تنبیہ الملوک والمکائد" بھی اس کی طرف منسوب ہے جس کی جانب احمد زکی پاشا نے اشارہ بھی کیا ہے۔

"المحاسن والاضداد" کتاب "التاج" "الدلائل والاعتبار علی الخلق والتدبیر" بھی اس کی طرف غلط طور سے منسوب ہیں۔ جاحظ کا اسلوب نگارش تو ان میں پایا نہیں جاتا۔

جاحظ بنگاہ اعدا میں | ارباب علم و دانش کی ایک مخالف جماعت بھی ان کے قدر دانوں اور معتقد افراد کے ساتھ ساتھ ہمیشہ رہی ہے، جاحظ بھی اس خصوصیت سے مستثنیٰ نہیں تھا، اس کے بھی دشمن تھے، بد اندیش تھے اور یہ سب کے سب اس کے فضل و کمال کے منکر بھی تھے اور اسی طرح ذریعۂ اشاعت تھے جس طرح عقیدتمندوں اور دوستوں کی جماعت، اس کے خصوصیات و کمالات کی تبلیغ کیا کرتی تھی۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کے خصوم و اعدا نے اس پر جو ناروا الزامات لگائے ہیں وہ آپ کے سامنے پیش کردیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ واقعہ کیا ہے؛ سب سے پہلے ہم ابن قتیبہ کے مطاعن سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں، وہ کہتا ہے:۔

> "جاحظ کا شمار آخر متکلمین میں ہے۔ وہ ننگ متقدمین ہے۔ اس کا انداز عجیب و غریب ہے۔ وہ جب چاہتا ہے رائی کا پہاڑ بنا دیتا ہے اور جب چاہتا ہے پہاڑ کو رائی کر دکھاتا ہے۔ کبھی وہ کالوں کو گوروں پر بڑے شد و مد سے ترجیح دیتا ہے، کبھی وہ حامیان عثمانؓ کو روافض سے بہتر ثابت کرتا ہے اور کبھی وہ یزیدیوں کو عثمانیوں اور اہل سنت پر تفوق دیتا ہے، کبھی وہ حضرت علیؓ کی فضیلت بیان کرتا ہے اور کبھی ان کی تنقیص کرتا ہے۔ کبھی وہ ایک کتاب لکھتا ہے جس میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں پر اعتراضات ہوتے ہیں اور کبھی وہ احادیث رسول کے ساتھ تمسخر اور استہزا کرتا ہے جو "اہل علم سے پوشیدہ

نہیں مثلاً.......... حجر اسود کے متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ وہ تو سفید تھا مشرکین و کفار نے اسے اپنی سیاہ کاریوں سے سیاہ کر دیا تو چاہئے تھا کہ اسلام جب پھیلا اور لوگ مسلمان ہوئے تو پھر وہ سفید ہو جاتا۔ اسی طرح صحیفۂ رضاعت پر بھی وہ کہا کرتا تھا.... .... الخ "

اب آئیے ذرا ابن قتیبہ کے اس طعن کی حقیقت پر غور کریں حجر اسود کے متعلق ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ حجر اسود جنت کے پتھروں میں سے ایک پتھر تھا، وہ اولے کی طرح سفید تھا لیکن مشرکین و کفار کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا لیکن حضرت محمد بن الحنفیہ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے) فرماتے تھے کہ حجر اسود انہی عام پتھروں میں سے [illegible]
[illegible] ابن عباس کی طرف جو قول منسوب ہے اس کی ندرت کی [illegible]
ہو کر اسے سفید کیوں نہیں کر لیا؟

اب رضاعت کے مسئلہ کو لیجئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ [illegible]
"رضاعت کے متعلق وحی آئی، وہ ایک کاغذ میں میرے بستر کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت رکھی ہوئی تھی۔ جب آنحضرت نے انتقال فرمایا تو ہم اس میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں کسی قبیلہ کی ایک بکری آئی اور اسے کھا گئی" .... یہ عجیب بات ہے علماء احناف اس مسئلہ میں جاحظ کے ہم آہنگ ہیں۔ "جواہر مضیئہ" میں ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک تحریم رضاعت قلیل و کثیر دونوں سے ہوتی ہے اور امام شافعی کے ہاں پانچ رضعات کے بعد ہوتی ہے۔ ابو حنیفہ تو دلیل میں حدیث پیش کرتے ہیں " الرضاعة من المجاعة " لیکن شوافع کی دلیل کیا ہے؟ احناف کہتے ہیں کہ دلیل تھی تو شوافع کے پاس بھی لیکن اسے بکری کھا گئی!

جاحظ بلکہ تمام معتزلہ اس قسم کے خرافات و مہملات سے انکار کرتے ہیں اور واقعہ تو یہ ہے

---

[۱] یہ قول بھی مشتبہ ہے۔ (مترجم)۔

کہ ان کے دلائل بھی بڑے قوی ہیں۔ اس واقعہ کو وہ قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں " وانہ لکتاب عزیز، لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ " تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس جیسی عزیز و مستحکم چیز کو بکری کھا لیتی؟ فرض باطل ہو جاتا اور دلیل ساقط ہو جاتی؟ ویسے تو دنیا کی ہر شخصیت اسے نہ باطل کر سکتی نہ محو کر سکتی ہے لیکن ایک بکری کے قبضہ تصرف میں یہ چیز ہے؟ اور اگر ایسا تھا بھی تو قرآن کی اس آیت کی کیا تاویل ہوگی؟ " الیوم اکملت لکم دینکم "۔ یہ کہنے کے بعد خود خدا نے اسے بھیج دیا کہ وہ کھا لے؟ اور یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وحی کو بکری کے کھانے کے لئے چھوڑ دیا جائے اور اس کی حفاظت و صیانت کا کوئی انتظام نہ کیا جائے؟ اور پھر وہ آیت نازل ہی کیوں کی گئی اگر اسے معمول بہ نہیں بننا تھا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ جاحظ کے اعتزال کی بنا پر ابن قتیبہ کو اس سے پرخاش تھی اور حقد و تعصب کا یہ نہایت عجیب نمونہ ہے کہ ایک غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا جائے۔

رہی ابن قتیبہ کی یہ تنقیص کہ وہ ایک چیز بڑی شد و مد سے ثابت کرتا ہے اور اسی زور و شور سے اس کی تردید بھی کرتا ہے تو یہ تو گویا اس کی قوت بیان کا اعتراف ہے۔ اسے ابن قتیبہ نے کیوں کر فراموش کر دیا کہ یہ اعجاز بلاغت ہے جو خدا کی طرف سے صرف جاحظ ہی کے حصہ میں آیا تھا یا اسے بھی چھوڑئے۔ اس پر غور کیجئے کہ کیا دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز ہے جو معائب سے بری ہو؟ یا یکسر خیر ہو یا سراسر شر؟ ظاہر ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے دو پہلو نہ نکلتے ہوں، ایک حیثیت سے وہ سزاوار ستائش ہوتی ہے تو دوسرے اعتبار سے مستحق مذمت، اور یہ جاحظ کا کمال ہے کہ وہ جو چیز پیش کرتا ہے وہ اس قدر مجلا اور مشرح طور سے کہ دوسرا نہیں کر سکتا۔

ابو العباس ثعلب سے روایت کی جاتی ہے کہ ایک مجلس میں اس نے کہا " جاحظ کا ذکر چھوڑو، وہ تو غیر ثقہ ہے۔ شاید اسی قول کی بنیاد پر ابو منصور ازہری کا یہ قول بھی ہے کہ " جاحظ کو زبان و خطابت میں ملکہ حاصل تھا، علوم و فنون میں نہایت وسیع النظر تھا، لیکن اہل علم و معرفت

اس کی برائی کرتے ہیں اور اس کے صدق کو مشتبہ سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے اقوال سے جاحظ کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے جن پر نہ کوئی دلیل ہو نہ برہان۔

بات تو وہ قابل التفات ہوتی ہے جو دلائل و براہین سے محکم ہو۔

بدیع الزماں ہمدانی اپنے ایک مقامہ میں جاحظ کا ذکر بایں الفاظ کرتا ہے:۔

"جاحظ بلاغت کے دو پہلوؤں میں سے ایک میں خوشہ چینی کرتا ہے اور دوسرے میں ٹھہر جاتا ہے۔ بلیغ تو وہی کہلاتا ہے جس کی نثر و نظم کا پلہ برابر ہو اشعار سے اس کا کلام داغدار نہ ہو جاتا ہو۔ تو جاحظ کا کوئی عمدہ شعر تم میں سے کسی کو معلوم ہے؟ ہم نے کہا نہیں، تو کہا، اس کا کلام لاؤ، تمہیں معلوم ہوگا کہ اس کے کلام [illegible] قریب المفہوم ہے، استعارہ بھی شاذ و نادر ہیں، کلام [illegible] کلام وہ استعمال کرتا ہے۔ کیا تم میں سے کسی نے اس کے [illegible] پر بار ہو؟"

بدیع الزماں کے اس قول کو میں جاحظ کی حمایت میں سمجھتا ہوں مخالفت میں نہیں اس سے کہ یہ ایسے اوصاف ہیں جو ادبا میں بہت کم پائے جاتے ہیں لیکن جاحظ میں تھے۔

لغزش | جاحظ اپنی وسعت علم گہرائی فہم اور دانش و بینش کے باوجود کبھی کبھی ٹھوکر بھی کھا جاتا ہے اور دنیا میں کون ایسا ہے جس سے کوئی نہ کوئی کبھی نہ کبھی غلطی نہ ہوئی ہو۔ وہ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا، مثلاً مسعودی نے جغرافیہ میں اس کی ایک غلطی نکالی ہے کہ:۔

"سندھ میں مکردن نامی جو نہر ہے جاحظ اسے دریائے نیل کا ایک حصہ سمجھتا تھا اور دلیل اس پر یہ لاتا تھا کہ اس میں بھی گھڑیال ہیں جس طرح نیل میں ہیں۔ کم سے کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ گھڑیالوں کا وجود دلیل کیوں کر بن سکتا ہے؟ اس نے اپنی کتاب "امصار" میں لکھا ہے کہ اس نے نہ کبھی دریا کا سفر کیا، نہ وہ کوئی بڑا بھاری سیاح تھا، نہ راستوں سے واقف تھا، اس کی حالت تو اس شخص کی سی تھی جو رات کو جنگل سے اندھیرے میں لکڑیاں

جن رہا ہو ایسے ہی وہ بھی دوسروں کی کتابوں سے نقل کر دیتا ہے:

اس میں شبہہ نہیں کہ مسعودی کا اعتراض بجا ہے، علاوہ ازیں وہ اس فن میں مہارت تامہ بھی رکھتا تھا، لیکن اس لغزش سے جاحظ کا درجہ کم نہیں ہو جاتا اس لئے کہ علم و عمل کے میدان میں اس نے ایک جغرافی کی حیثیت سے قدم نہیں رکھا تھا۔

جاحظ نگاہ حق شناس میں ایک وہ شخص جو اس کی فضل و منزلت سے واقف ہو اس کے نزدیک تو جاحظ بلاشبہ عربی انشاپردازوں کا سردار، ادبا ء عرب کا شیخ، اور ارباب علم و بیان کا امام ہے، فصاحت و بلاغت کا ستون ہے، ارباب فلسفہ و حکمت اور اہل علم و ادب میں سے کوئی شاید ہی اس جیسے کمال تک پہونچا ہو۔ اس کے معارف کا درجہ تو یہاں تک بلند ہے کہ اسے ان لوگوں میں شمار کرنا چاہئے جن پر اسلام کو فخر ہے!

ابوحیان توحیدی نے ایک مستقل کتاب "تقریظ الجاحظ" کے نام سے لکھی ہے۔ ہمیں اس کتاب کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن یاقوت نے اس کتاب سے یہ عبارت نقل کی ہے:۔

> "ہم سے صابئین[1] کی ایک جماعت نے بیان کیا کہ ثابت بن قرہ[2] نے کہا کہ امت عربیہ میں تین ہستیاں بہت زیادہ قابل رشک گزری ہیں، ان میں سے پہلی ہستی تو عمر بن الخطاب کی ہے، .... دوسری ذات حسن بصری کی ہے ....[3] اور تیسری شخصیت ابوعثمان الجاحظ کی ہے جسے خطیب المسلمین، شیخ المتکلمین کہیے تو بجا ہے۔ وہ جب

---

[1] کافر

[2] پورا نام ابوالحسن ثابت بن قرہ ہے۔ مذہباً صابی تھا، طبیب و فیلسوف، صاحب فضل و کمال تھا، حکمت و ادب میں خاص دستگاہ رکھتا تھا۔ ۲۲۱ھ میں ولادت ہوئی اور ۲۸۸ھ میں بمقام بغداد انتقال ہوا۔

[3] صاحب کتاب نے اس مقام پر ان دونوں بزرگوں کے متعلق ثابت بن قرہ کی تفصیلی رائے نقل کر دی ہے، لیکن چونکہ اس کا اس موضوع سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا اس لئے اسے نظرانداز کر دیا گیا۔ (مترجم)

گفتگو کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سحبان[1] کی فصاحت و بلاغت کے کان آشنا ہو رہے ہیں۔ وہ اگر
مناظرہ کرتا ہے تو نظام کو مات کر دیتا ہے۔ اگر سنجیدگی سے کچھ کہتا ہے تو عامر بن عبد قیس سے
بھی بڑھ جاتا ہے اور اگر ہزل و مذاق پر اتر آتا ہے تو مزبد[2] سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ تو جاحظ
وہ تھا جس سے دل کو سرور اور روح کو تازگی حاصل ہوتی ہے۔ وہ شیخ العرب اور لسان العرب
تھا۔ اس کی کتابیں ایک ایسا باغ ہیں جو کلیوں سے لبریز ہوں اور اس کے رسائل ان کے
پھل؛ بڑے بڑے خلفا اس کی عظمت کے قدر شناس تھے اور امرا اس کی تعریف میں رطب اللسان؛
بادشاہ اسے اپنا ندیم بناتے تھے اور علماء اس سے کسب علم کرتے تھے؛ بڑے بڑے مغرور و متکبر
اس کے فضائل کو تسلیم کرتے تھے اور عامۂ خلائق اس کی محبت میں سرشار تھی۔ وہ زبان و قلم
دونوں کا مالک تھا، علم و ذہانت دونوں اس کے حصہ میں تھا؛
قابو حاصل تھا، نثر و نظم کا بھی وہ بادشاہ تھا اور فہم و ذکا۔۔۔
کی عمر اچھی خاصی ہوئی، اس کی حکمت سارے جہان میں ۔۔۔
کے نقش قدم پر چلنا باعث سعادت سمجھا، اس کے نام سے انتساب ۔
اور جنھوں نے اس کی پیروی کی وہ کامیاب ہوئے بلاشبہ اسے "حکمت" اور "فصل خطاب"
دونوں جوہر بخشے گئے تھے۔"

ابو حیان کہتا ہے یہ قول ایک صابی کا ہے جس کے دل میں اسلام کی ذرا بھی حرمت نہیں ہے
مسلمانوں کا کوئی احترام ہے، اس نے یہ تنقید کی ہے اور حق کو ایسی نظروں سے دیکھا ہے کہ ہوا و ہوس
کے جذبات دور کر دئے ہیں، ایسی عقل سے کام لیا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ تعصب کو فراموش

---

[1] سحبان وائل مشہور عربی خطیب۔
[2] فصاحت و بلاغت میں مرتبۂ خاص کا مالک تھا۔
[3] ابو اسحٰق مزبدؔ نوادرات و فکاہات میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

کر گیا ہے، ہم اپنے دوسرے اسلاف و اخلاف کے فضائل و محاسن سے ناواقف نہیں ہیں لیکن ہمیں اس شخص کی یہ بات پسند آئی کہ جو اگرچہ ہمارا ہم قوم و ہم زبان نہیں ہے اور جو شاید حضرت عمر بن الخطاب کے سوانح حیات پر پورا عبور بھی نہیں رکھتا، اور اسی طرح جاحظ کے علم و ادب پر پوری وسعت نظر بھی نہیں رکھتا، لیکن باایں ہمہ وہ ایسی بات کہتا ہے اور اس طرح رشک کرتا ہے اور جاحظ پر اپنے کلام کو ختم کرتا ہے، ایک عیب جو جاحظ میں معائب ہی معائب دیکھتا ہے لیکن وہ اس سے قطع نظر کر کے اس کی صفائی دیتا ہے۔

ابو حیان کہتا ہے میں نے ابو محمد الاندلسی[1] سے (جو سیرافی کی جماعت کے ایک رکن تھے) کہا، ہم ابو سعید سیرافی کی مجلس میں سرگرم تکلم تھے، کہ ایک اختلاف آن پڑا اور وہ اختلاف ہے جاحظ اور ابو حنیفہ[2] صاحب "النبات" کی فصاحت و بلاغت کے متعلق اور ہم سب تمہیں حکم بنانے پر راضی ہیں، اب کہو تمہاری کیا رائے ہے؟

محمد نے کہا، میں ان دونوں کی حمایت یا مخالفت میں کچھ کہنے کی اپنے اندر جرأت نہیں رکھتا، میں نے کہا، بہرحال کچھ تو کہئے۔

محمد نے جواب دیا، ابو محمد ندواۃ کے اعتبار سے زیادہ ہیں اور ابو عثمان (جاحظ) حلاوت کے لحاظ سے بڑھے ہوئے ہیں، ابو عثمان کے معانی دل پر اثر انداز ہوتے ہیں کانوں کو گراں نہیں

---

[1] پورا نام ابو محمد عبداللہ بن حمود الزبیدی الاندلسی، نحو، لغت اور شعر کے امام تھے۔ جاحظ کے کلام سے بہت دلچسپی رکھتے تھے یہاں تک کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جنت میں اس کے سارے اسباب تنعم کے بجائے اگر مجھے جاحظ کی کتابیں مل جائیں تو میں اس "تبادلہ" پر تیار ہوں۔ ابو سلیمان منطقی اور ابو سعید سیرافی کی جماعت کے ایک بہت ممتاز رکن تھے۔

[2] ابو حنیفہ احمد بن داؤد بن ونند الدینوری، مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ ایک کتاب نباتات پر لکھی اس میں بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ ۲۸۲ھ میں وفات پائی۔

گزرتے، ابوحنیفہ کے الفاظ بہت زیادہ شیریں ہوتے ہیں، اور اسالیب عرب کے بہت زیادہ آئینہ دار ہوتے ہیں۔

یاقوت کے قول کے مطابق ہنر شناسان علم کلام کی متفقہ رائے یہ ہے کہ دنیا میں بس تین متکلم گزرے ہیں، جاحظ، علی بن عبیدہ[1] اور ابوزید بلخی۔ ان میں سے جاحظ تو وہ ہے جس کے الفاظ معانی سے زیادہ ہوتے ہیں اور علی بن عبیدہ وہ ہے جس کے معانی الفاظ سے زیادہ ہوتے ہیں اور ابوزید وہ ہے جس کے لفظ و معنی دونوں کا توازن بالکل درست ہوتا ہے لیکن اس رائے کے باوجود خود یاقوت نے روایت کی ہے کہ ابوزید کو "جاحظ خراسان" کہا جاتا تھا۔ جاحظ کی جلالت شان و عظمت کے لئے یہ کافی ہے کہ ابوزید بلخی جیسا فخر روزگار اس کی طرف منسوب کیا جائے۔

ابوالفضل بن عمید ان لوگوں میں سے تھے جو ...
ہیں۔ اسی کے اسلوب و مذہب کے وہ عامل تھے۔ اگر ...
ہوتے، ان کا سینہ جاحظ کی عظمت و بزرگی سے بھرا ہوا ...
پاس آتا اور وہ اس کا امتحان لینا چاہتے کہ عقل و ذہانت میں کیسا ہے ...
اس کی رائے دریافت کرتے، اگر وہ بغداد کے خصوصیات و محاسن سے واقفیت کا ثبوت دیدیتا تو گویا یہ اس کے فضل و عقل کا مقدمہ ہوتا، پھر جاحظ کے متعلق پوچھتے۔ اگر دیکھتے کہ اس کے انداز گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جاحظ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، اس کی تصنیفات سے استفادہ کیا ہے، اس کے بحر علم و کلام سے جرعہ نوشی کی ہے تو اس کے متعلق فیصلہ کر دیتے کہ اس کی پیشانی پر علم و ادب کا نشان چمک رہا ہے۔ اور اگر دیکھتے کہ یہ شخص بغداد کی برائی کر رہا ہے،

---

[1] علی بن عبیدہ الریحانی نہایت ذکی و ذہین شخص تھا، مامون الرشید کے صاحب اعتماد لوگوں میں شمار ہوتا تھا، فصاحت و بلاغت میں بھی بڑا پایہ رکھتا تھا۔ حکماء کے طرز پر اس کی بہت سی کتابیں ہیں، بعض لوگوں نے اس پر زندقہ کا الزام بھی لگایا ہے لیکن یہ غلط ہے بلکہ معتزلہ کی جماعت کا ایک وقیع شخص تھا۔

جاحظ کے واجبات و معارف سے ناآشنا ہے تو پھر وہ چاہے جتنے محاسن رکھتا ہو سب بے کار۔

ابوالقاسم سیرانی بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے استاذ ابوالفضل بن العمید وزیر کے دولت خانہ پر حاضر تھے باتوں باتوں میں جاحظ کا ذکر نکل آیا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اس کی برائیاں بیان کرنا شروع کیں لیکن وزیر صاحب خاموش رہے۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے پوچھا تعجب ہے آپ اس آدمی کی باتوں پر خاموش رہے حالانکہ اور لوگوں سے آپ خوب بحث کرتے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا اس کے مقابلہ سے زیادہ بلیغ صورت یہ تھی کہ اسے اس کے جہل پر باقی رہنے دیا جاتا۔ اگر میں اسے روک کے دلائل پیش کرنے لگتا تو وہ جاحظ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا اور اے ابوالقاسم وہ آدمی بن جاتا، جاحظ کی کتابیں پہلے عقل سکھاتی ہیں پھر علم و ادب اور یہ میں چاہتا نہیں کہ وہ آدمی بنے!

ابن عمید کہتے ہیں تین علوم ایسے ہیں کہ تمام دنیا ان کے بارے میں تین آدمیوں کی "عیال" ہے:۔

فقہ میں امام ابوحنیفہ،
کلام میں ابوالہذیل العلاف[1]،
فصاحت و بلاغت میں ابوعثمان جاحظ۔

ابومحمد الحسن بن عمرو البخری کا ایک عجیب دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اندلس میں تھا۔ میں نے سنا کہ یہاں جاحظ کے ایک شاگرد ہیں جنھیں سلام بن یزید کہتے ہیں اور ابوخلف کنیت کرتے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا۔ وہ ایک مسن آدمی تھے۔ میں نے ان سے جاحظ کی ملاقات کا حال دریافت کیا اس لئے کہ جاحظ تو کبھی اندلس میں آیا نہیں تھا، انھوں نے کہا،

---

[1] ابوالہذیل العلاف بصری، ان کا شمار اکابر معتزلہ اور افاضل اہل کلام میں کیا جاتا ہے۔ صاحب علم و نظر بزرگ تھے منطق و فلسفہ وغیرہ میں متقدمین کی تمام کتابوں پر نہایت وسیع نظر رکھتے تھے۔

مشرق کے طلبہ ہمارے بادشاہوں کے ہاں اس لئے شرف و عزت کے مستحق سمجھے جاتے تھے کہ وہ جاحظ سے شرف ملاقات حاصل کر چکے ہیں۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں اس کی ایک کتاب "التربیع والتدویر" آئی، اس کے بعد ہی اس کی دوسری کتاب "البیان والتبیین" آئی، پھر تو میں نکل کھڑا ہوا اور کسی مانع کی پروا نہیں کی۔ جب بغداد پہونچا تو معلوم ہوا وہ بصرہ میں ہے۔ ادھر کا قصد کیا تو معلوم ہوا وہ بصرہ جا چکا۔ بصرہ جب پہونچا تو خیر اس کے سامنے حاضری کا موقع حاصل ہوا۔ جاحظ بیٹھا ہوا تھا اور اس کے اردگرد بے ریش و بروت بہیں لڑکے بیٹھے ہوئے تھے سوا اس کے کسی اور کی اس مجلس میں ڈاڑھی تھی ہی نہیں۔ اس منظر سے میں کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے پوچھا۔

تم میں سے ابو عثمان کون ہے؟

اس نے میری طرف گھور کے دیکھا اور کہا

"کہاں سے آئے ہو؟"

میں: "اندلس سے"

جاحظ: "احمقوں کی سرزمین، اچھا نام کیا ہے؟"

میں: "سلام"

جاحظ: "ایک کتے کا نام، ابن؟"

میں: "ابن یزید"

جاحظ: "بہت خوب، کنیت؟"

میں: "ابو خلف"

جاحظ: "سگ زبیدہ کی کنیت، تشریف کیوں لائے؟"

میں: "علم حاصل کرنے"

جاحظ: "تشریف لے جائیے، کامیابی مشکل ہے"

میں: "آپ نے انصاف نہیں کیا، میں طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر کے یہاں تک پہونچا

ہوں:

جاحظ: "تم نے میرے اردگرد میں لڑکے دیکھے، سوا میرے کسی کے ڈاڑھی نہیں تھی، پھر مجھے پہچاننے میں وقت کیا پیش آئی؟"

اُن تمام باتوں کے باوجود میں جاحظ کے ہاں بیس سال تک مقیم رہا۔

میرا خیال ہے کہ جاحظ نے سرزمین اندلس کے متعلق جو کچھ کہا وہ بالکل بجا اور درست ہے، عربوں کے دخول سے پیشتر اس میں مجد و شرف کا کوئی سامان نہیں تھا، نہ کوئی تمدن تھا، نہ تہذیب، لیکن عربوں نے جب اسے فتح کیا تو وہ اپنے ساتھ صرف فوج و سپاہ نہیں لے گئے بلکہ عقل وسیع، ذہن صافی، علوم صالح، حضارۂ نافعہ، ہمت مرداں کے خزانے بھی لے گئے، وہ اپنے ساتھ جراثیم حیات اور اصول عمرانیت بھی لے گئے۔ انھوں نے وہاں مدنیت قائم کی، حضارت قائم کی، انسانیت کے شرف و بزرگی کا راستہ کھول دیا، لیکن جب وہ عہد مسعود ختم ہو گیا ان کی قوت عزیمت ضعیف پڑتی گئی، ان کی ہمت دبتی گئی تا آنکہ سب کچھ ختم ہو گیا!

<u>تصنیفات کی شہرت</u> | عرب انشاپردازوں میں شاید کسی شخص کی کتابوں نے وہ شہرت دوام اور ہردلعزیزی نہیں حاصل کی جو جاحظ کی تصنیفات کو حاصل ہوئی۔ جب بھی وہ کوئی کتاب یا رسالہ لکھتا تھا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے تھے، اس کے نسخے ہاتھوں ہاتھ جاتے تھے، کوئی زبانی یاد کرتا تھا کوئی نقل کرتا تھا، غرض ایک دھوم مچ جاتی تھی۔

عالموں کی مجلسیں اور ادیبوں کی محفلیں جاحظ اور اس کی تصنیفات کے ذکر سے بھری رہتی تھیں۔ جہاں کسی شہر میں کوئی کتاب پہونچی بس اس کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ابو حیان توحیدی کہتے ہیں کہ ہم سے علی بن عیسیٰ[1] نحوی بیان کرتے تھے کہ میں نے اپنے شیخ

---

[1] ابوالحسن علی بن عیسیٰ بن عبداللہ الرمانی، اخشیدی اور وراق سے مشہور ہیں لیکن زیادہ تر "رمانی" ہی کہے جاتے ہیں۔ مختلف علوم و فنون میں دستگاہ رکھتے تھے، بہت بڑے متکلم تھے۔ ۲۷۶ھ میں ولادت ہوئی اور ۳۸۴ھ میں وفات۔

ابن خشید کو کہتے ہوئے سنا کہ

"جاحظ نے اپنی کتاب الحیوان میں اپنی تمام کتابوں کی فہرست لکھدی ہے، اس نے "الفرق بین النبی والمتنبی" اور "دلائل النبوۃ" کا "الفرق" کے ساتھ ذکر کیا ہے اور "الفرق" کا ذکر چوتھی جلد میں پھر کیا ہے۔ میں نے دونوں کتابیں دیکھنا چاہیں اور ان دونوں میں سے ایک ہی پر میں کامیاب ہو سکا یعنی "دلائل النبوۃ" پر جسے غلطی سے "الفرق" بھی کہتے ہیں۔ مجھے اپنی اس ناکامیابی پر افسوس ہوا۔ جب میں مصر سے مکہ میں داخل ہوا تو عرفات میں (جہاں دنیا بھر کے لوگ موجود تھے اور ایسا عجیب وغریب منظر تھا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا) میں نے پکارنا شروع کیا، خدا اس شخص پر رحم کرے جو "الفرق بین النبی والمتنبی للجاحظ" کا ... ہی اور کسی نے بھی اس کتاب کا اعتراف کیا، نہ پتہ بتایا۔ صرف یہ تھا کہ اپنے دل سے کہہ سکوں کہ میں جو کچھ کر سکتا تھا ...

یاقوت کہتا ہے ابو عثمان جاحظ کی فضیلت کو یہ کافی ہے ...

جو فلسفہ کا ایک بڑا مبصر، اور معتزلہ کا ایک نہایت گراں پایہ سردار تھا جاحظ کی کتابوں کو اس درجہ عزیز ومحبوب رکھتا تھا کہ عرفات و بیت الحرام میں ندا دیتا رہا۔

ایک مجلس میں ابو ہفان سے پوچھا گیا کہ تم جاحظ کی ہجو کیوں نہیں کرتے ؟ حالانکہ وہ تمھیں چھیڑنے سے باز نہیں آتا۔ اس نے جواب دیا، خدا کی قسم اگر جاحظ ایک معمولی سا رسالہ بھی لکھ دے تو اس کی شہرت چین تک پہونچے گی اور میں اگر ایک ہزار بیتیں بھی کہہ ڈالوں تو ہزار برس تک وہ یوں ہی رہیں گی۔

القاضی الفاضل[۵] جیسا شخص اقرار کرتا ہے کہ تمام انشا پردازان عہد جاحظ اس کی کتابوں سے نفع اٹھاتے تھے۔

---

[۵] ابو علی عبدالرحیم القاضی الفاضل، صلاح الدین ایوبی کا وزیر باتدبیر، جو اپنی اصابت رائے، سیاست دانی، فصاحت،

اہل بصرہ اہل کوفہ سے تفاخر کیا کرتے تھے' اور اسی طرح اہل کوفہ اہل بصرہ سے۔ خطیب بغدادی روایت کرتے ہیں کہ بصرہ کے لوگ کوفہ والوں سے ان کتابوں پر تفاخر کیا کرتے تھے کتاب الحیوان للجاحظ' کتاب سیبویہ' کتاب العین للخلیل۔

ابوالقاسم اسکافی کہا کرتے تھے کہ تین چیزیں ہیں جن کو میں بلاغت کا معیار سمجھتا ہوں (۱) قرآن مجید (۲) کلام جاحظ (۳) اور بحتری[1] کے اشعار۔

ابن درید[2] کے سامنے دنیا کی مسرت افزا چیزوں کا ذکر کیا گیا' انھوں نے کہا یہ چیزیں تو زیادہ سے زیادہ "فردوس نظر" ہوسکتی ہیں۔ وہ چیزیں کہاں ہیں جو دل کو طراوت بخشتی ہوں؟ لوگوں نے پوچھا وہ کیا؟ کہا جاحظ کی کتابیں' محدثین کے اشعار اور ابوالعین کے نوادر۔

ابو محمد اندلسی کہا کرتے تھے کہ جنت کے سارے سامان تنعم پر میں جاحظ کی کتابوں کو ترجیح دیتا ہوں۔

پایۂ تحقیق و شوق سفر | جاحظ ادب میں فرد فرید تھا' نہ صرف ادب میں بلکہ تمام علوم و فنون میں وہ یکساں مہارت رکھتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو مسائل علیہ سے دلچسپی لیتے ہیں اور اہل بحث و نظر کی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ اس نے نسابین کی اس بڑی غلط فہمی کو رفع کیا جسے انھوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے نہ معلوم کیا سے کیا کر دیا تھا مثلاً زبیر بن بکار سے روایت کی جاتی ہے کہ ان کا خیال یہ تھا کہ ام نضر بن کنانہ ابن خزیمہ کا نام برۃ بنت مر بن اد بن طابخہ تھا اور کنانہ نے اپنے باپ خزیمہ کی وفات کے بعد ان سے نکاح کر لیا تب نضر کی پیدائش ہوئی (جیسی کہ عرب جاہلیت میں عادت

(بقیہ صفحہ ۴۴۸) بلاغت' ذکاوت اور بہت سے ممتاز خصائص میں مشہور نام ہے۔ ولادت ۵۲۹ھ ہجری میں بمقام عسقلان ہوئی اور وفات ۵۹۶ھ میں بمقام قاہرہ ہوئی۔

[1] ابوعبادۃ الولید بن عبید البحتری مشہور شاعر تھے' ولادت ۲۰۶ھ وفات ۲۸۴ھ۔

[2] ابوبکر محمد الحسن بن درید الازدی فن لغت و ادب کے امام' ۳۲۱ھ میں بمقام بغداد فوت ہوئے۔

تھی کہ سوتیلا لڑکا اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنی ماں سے نکاح کر لیا کرتا تھا۔ لیکن جاحظ نے اس افترا کے تاروپود بکھیر کے رکھ دئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان سے کنانہ کی کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی نہ از قبیل ذکر نہ اناث۔ لیکن ان کی بھتیجی برہ بن مر بن اد بن طابخہ تھیں جن کی کنانہ بن خزیمہ سے شادی ہوئی تھی، اور ان سے نضر پیدا ہوئے تھے، یہ صرف دو ناموں کا ایک ہونا ہے، اس سے اتنی غلط فہمی پھیلی ......
یہی وہ صحیح مسلک ہے جس پر اہل علم و اہل نسب کا اتفاق ہے۔ جاحظ کہتا ہے کہ اس کے علاوہ جو شخص عقیدہ قائم کرے کفر کا مرتکب ہوگا...... میرا تو یہ خیال ہے کہ جاحظ اپنے اس کارنامہ کی بنا پر یوم آخرت میں ماجور ہوگا۔

تحقیق علمی ہی کے خیال سے اس نے متعدد شہروں میں سفر کیا، وہ مصر بھی گیا، اور وہاں ایک عرصۂ دراز تک مقیم رہا اور اپنے تجربات کی آزمائش کرتا رہا۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ جلال الدین سیوطی نے

اہل علم کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مصر کا سفر اختیار کیا

کہ وہ معتزلی تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ مختصر نمونہ اس باب میں کافی ہے

فن ترجمہ اور جاحظ | گزشتہ صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ عربی میں کسی غیر زبان کی کوئی ایسی کتاب منتقل نہیں ہوئی (عام اس سے کہ وہ کسی علم و فن سے تعلق رکھتی ہو) جسے جاحظ نے پورے طور سے ضبط بلکہ بقول بعض "ہضم" نہ کر لیا ہو، اگرچہ اس زمانہ میں نہ پریس کی یہ عالمگیر ترقیاں تھیں نہ سہولتیں۔ کتابوں تک پہونچنے کا ذریعہ سفر تھا یا خود نقل کرتا تھا یا کتب فروشوں کے سامنے دست سوال دراز کرتا تھا۔

جن کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا اور وہ گرہیں جو شروح و حواشی، تعلیقات و تفاسیر و تاویلات میں بعض اہل بحث و نظر مثلاً فارابی، ابن سینا، ابن رشد اور غزالی نے سقراط و افلاطون، بقراط و ارسطو، جالینوس و فیثاغورث وغیرہ کی کتابوں میں پیدا کر دی تھیں اور علما و مفکرین حیران تھے کہ کیا صورت نکلے کہ اطمینان حاصل ہو۔ جاحظ نے اس دشوار گزار راہ میں بھی رہنمائی کی اور ان گرہوں

کی گرہ کشائی کی۔

قبل اس کے کہ آپ کے سامنے جاحظ کی رائے پیش کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے اسلوب نقل اور طریق ترجمہ کا ایک مختصر سا نقشہ پیش کر دیا جائے۔

اس زمانہ میں نقل و ترجمہ کی دو صورتیں تھیں۔

ایک تو وہ طریقہ تھا جسے یوحنا ابن بطریق اور ابن ناعمہ الحمصی کا طریقہ سمجھنا چاہیے یعنی لفظ بہ لفظ رکھنا، جس لفظ کو یونانی یا کسی اور زبان میں دیکھا اسی کا عربی میں مترادف تلاش کیا اور اسے اس کی جگہ پر رکھ دیا یہاں تک کہ ساری کتاب کا ترجمہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صد درجہ مہمل ہے اس لئے کہ مترجم پوری زبان عربی پر مہارت تو رکھ نہیں سکتا تھا کہ ہر غیر زبان کے لفظ کے مقابلہ میں بالکل ویسا ہی وسیع المفہوم لفظ عربی سے تلاش کر کے اس کی جگہ پر رکھ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کتاب نہ عربی ہی ہوتی تھی اور نہ عجمی۔ اس طریق ترجمہ سے بہت نقصان پہونچا اور یونانی، فارسی، ہندی، سریانی اور لاطینی کے بہت سے کلمات اسی طرح رہ گئے، مخصوص ترکیبیں دوسری زبان کی ویسی مخصوص ترکیبیں نہ حاصل کر سکیں، مجازات و استعارات کے استعمال میں بھی یہی صورت رہی۔

دوسرا طریقہ حنین[1] بن اسحٰق اور عباس بن سعید جوہری[2] کا ہے وہ یہ کہ ترجمہ کرنے والا پورا جملہ پڑھ لیتا ہے، اپنے ذہن میں اس کے معنی مقرر کر لیتا ہے، پھر اسے ایسے عربی جملہ میں منتقل کرتا ہے کہ پورا پورا مفہوم ادا ہو جاتا ہے خواہ الفاظ ہم آہنگی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔ ظاہر ہے یہ اصول بہت زیادہ کامیاب ہے، اسی لئے لوگوں کا خیال ہے کہ حنین بن اسحٰق کی کتابیں جو طب، منطق، طبیعیات،

---

[1] ابو زید حنین بن اسحٰق عبادی، علوم اوائل کے ماہر تھے، طبیب تھے، بہت سی قدیم کتابوں کو عربی میں منتقل کیا ہے یونانی، سریانی اور لاطینی خوب جانتے تھے۔ بعض خلفا کتاب کے برابر سونا تلوا کر دیا کرتے تھے۔ سنہ ۲۶۰ھ میں وفات ہوئی۔

[2] العباس بن سعید الجوہری بہت بڑے فلکی اور منجم تھے، ارصاد اور اس کے آلات میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ انکی زیج مشہور ہے، اکابر ہندسین و حساب میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔

اور الٰہیات سے متعلق ہیں وہ کسی قسم کی تہذیب و اصلاح کی محتاج نہیں ہیں، ہاں علوم ریاضی میں ان کی جو کتابیں ہیں وہ بلاشبہ نظر ثانی کی محتاج ہیں اس لئے کہ اس فن میں انھیں پورا پورا عبور نہیں حاصل تھا — اس زمانہ کا یہ دستور تھا نقل و ترجمہ کا۔

اب حسب وعدہ ہم جاحظ کا "قول فیصل" اس باب میں پیش کرتے ہیں، وہ کہتا ہے:۔

"مترجم ان مفاہیم کو ہرگز ادا نہیں کر سکتا جن کا حکیم نے لحاظ رکھا ہے، نہ ان نکتوں اور حقائق کو سمجھ سکتا ہے جو کتاب میں بیان کئے گئے ہیں، جب تک وہ خود اس علم یا فن میں جس کا وہ ترجمہ کر رہا ہے اصل مصنف کی سی استعداد نہ رکھتا ہو۔ مترجم کے لئے یہ ضروری ہے کہ جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اس میں اپنی مادری زبان کی سی مہارت رکھتا ہو۔

ہمارا یہ قول تو کتب ہندسہ، تنجیم، حساب اور موسیقی

میں ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔"

یہ ہیں جاحظ کے خیالات نقل و ترجمہ کے بار...

کا راستہ روشن تر کر دیا ہے۔

(باقی)

عربی سیادت کے خلاف عجمی تحریکیں

(گذشتہ سے پیوستہ)

عبداللہ بن میمون

بہرحال یہ اسمٰعیلی جماعت باوجود اپنی تمام کوششوں کے ایک عرصہ تک کامیاب نہ ہوسکی تھی۔ عبداللہ بن میمون ایک مجوسی سردار ان کو ایسا مل گیا۔ جس کی کوششوں نے چند روز کے اندر ہی اندر وہ کام کیا۔ جسکو اس کی ہم مشرب جماعت صدیوں میں بھی نہ کرسکی تھی۔ اس کے مبلغین نے عباسی خلفاء کو اس درجہ پریشان کیا۔ کہ بار بار کی جنگ پر بھی ان کی ایک مختصر سی جماعت کو یہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ بلکہ اس کے برعکس حمدان قرمط بانی مذہب قرامطہ اور اس کے ساتھیوں نے بحرین اور شام کے علاقے پر قابض ہوکر عرصہ تک حکومت کی۔ عام مورخین کے بیان کے مطابق عبداللہ کا پرپوتا ابوسعید مغرب اور مصر کی خلافت فاطمی کا بانی ہوا۔ اور پھر اپنی خفیہ سازش کی بنا پر تمام ممالک اسلامیہ کو غارت اور تباہ کیا۔ مذہبی عقائد میں تشکیک کے عقیدے کو رواج دیکر کے مسلمانوں کو گمراہ سے بے راہ کیا۔ اور اس بارہ میں مذہب معتزلہ وغیرہ کے رواج نے جو اس سے بہت پہلے رائج ہوچکے تھے بڑی امداد بہم پہونچائی۔ عبداللہ بڑا ہی ذہین اور مختلف طبیعتوں کے مختلف رجحانات کو پرکھنے کی خاص لیاقت رکھتا تھا۔

عہ دولت فاطمیہ جو ۲۹۷ھ سے ۵۶۷ھ تک افریقہ اور مصر میں رہی۔ عام مورخین کا خیال ہے کہ اس کا بانی ابوسعید عبداللہ بن میمون کا پوتا تھا۔ اس نے اپنے کو امام اسمٰعیل کی اولاد بتایا۔ چنانچہ سب سے پہلے فاس کے متصل کتامہ میں ابومحمد عبداللہ کے نام سے مہدویت کا اعلان کیا ادارسہ اور اغالبہ کی جماعتوں نے اس کا ساتھ دیا۔ ان کی استعانت اور مدد سے رفتہ رفتہ وہاں اس نے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا بالآخر ۲۹۶ھ میں قیروان کو بھی جو افریقہ کا مرکز تھا۔ فتح کرلیا۔ اور جب قوت کافی ہوچکی تھی اپنی خلافت کا باقاعدہ اعلان کردیا لیکن ابن خلدون اور مقریزی کا خیال ہے کہ عبیدی خلفاء کا عبداللہ کی طرف انتساب کرنا سخت غلطی ہے۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ قادر باللہ نے فاطمی خلفاء کی بڑھی ہوئی طاقت اور اپنے مرعوب

بقیہ صفحہ ۴۴۲

"مذہب اسمٰعیلیہ کی اشاعت عبد اللہ بن میمون کے ذریعہ عمل میں آئی یہ انسانی فطرت کو پرکھنے اور مذہبی اعتقادات کو مختلف طبائع کے موافق بنانے میں عباسیوں کے فرقہ سیوی کے بانی سے کہیں بڑھ چڑھ کر استعداد رکھتا تھا۔ نویں صدی عیسوی میں اس شخص نے اسمٰعیلیہ فرقہ میں نئی روح پھونکی۔"

عبد اللہ بن میمون کی ذہانت اور استعداد کا خاکہ جن لفظوں میں ڈسی گوبیے اور ڈوزی نے کھینچا ہے۔ اس سے بہتر تصویر لفظوں میں نہیں کھینچی جا سکتی۔ لکھتے ہیں

"عرب اور اسلام کی دشمنی نے عبد اللہ بن میمون کو ایک ایسے ارادہ پر مائل کیا کہ جس کے طور طریق میں ذہانت، جرأت، یقین اور جوش حیرت انگیز ... کو ایک لڑی میں پرونا، مذہب کو بار سمجھنے والی جماعت میں مجتمع کر دینا۔ مؤمنوں سے کفر اور الحاد کی تخم ریزی کی حکومت مٹانے کا آلہ بنانا۔ غرض کہ ایک ایسی جماعت ... متحد اور سرفروشانہ جذبہ رکھتی ہو۔ اور جو کیسی ہی سخت وقت کیوں نہ ہو۔ سردار کے حکم کے خلاف کرنا گناہ عظیم سمجھتی ہو اور یہ اس لئے کہ وقت پر اس کو یا اس کے خاندان والوں کو تخت و حکومت دلوا سکے۔ یہ ہوس کیسی ہی خراب کیوں نہ ہی لیکن اس نے نہایت ہوشیاری اور علم النفس کی گہری واقفیت اور علمیت کے ساتھ پوری کر لی۔"

طریق دعوت، یہ تمام اسباب تو تھے ہی لیکن عبد اللہ کی کامیابی کا اصل راز در اصل اُس کے طریقہ دعوت میں مضمر تھا۔ جن جن طریقوں سے اس نے لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا وہ حیرت انگیز

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۶۔ ہو کر بغداد میں بڑے بڑے علماء کی زبان سے باقاعدہ یہ کہلایا۔ کہ یہ لوگ فاطمہ کی اولاد سے نہیں ہیں بلکہ عبد اللہ بن میمون کے خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ یہ اس لئے کہ عام مسلمانوں کی نظروں میں ان کا وقار اس طرح کہ کہ گھٹا دیا جائے۔ امیر علی مرحوم نے ان مورخین کے علاوہ ابو الفداء کی تائید سے موخر الذکر قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ صفحہ ۳۴۲ اسپرٹ آف اسلام۔ ع۱۵ The preaching of Islam

ہیں۔ اس نے اپنے داعیوں کو تاجروں کے بھیس میں ملک کے دور دراز حصوں میں روانہ کیا جہاں وہ بظاہر ایک پیشہ ور جماعت ہوئی لیکن ہر وقت تبلیغ و دعوت کے موقع کی متلاشی رہی۔ یہ داعی جن اصولوں کے ماتحت تبلیغ کر رہے تھے۔ اس کا ایک خاکہ ذیل کی سطروں میں کھینچا جاتا ہے۔

جاہلوں میں جب پہونچتے تو ان کو طرح طرح کے شعبدے دکھاتے یہ لوگ اس کو ان کی کرامت پر محمول کرتے۔ اور معجزہ سمجھتے۔ مذہب کے سخت پابند لوگوں میں جاتے تو بزرگی اور تقدس کی مجسم تصویر بن جاتے۔ ایسے لوگوں میں جب پہونچتے، جو مذہبی عقائد میں جہان بین کے قائل ہوتے۔ تو عام عقائد کے عجیب عجیب معنی بتاتے۔ مذہب سے برگشتہ لوگوں میں جاتے تو مذہب کی پابندیوں سے آزاد ہوکر تمام برائیاں جائز کر دی جاتیں۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد کو امام مہدی، یہودیوں کو مسیح اور عیسائیوں کو فارقلیط کا منتظر پاکر ان کے آنے کی بشارت دیتے۔ لیکن اس بشارت میں یہ عقیدہ بھی شامل کرتے کہ حقیقی نجات حضرت علی رضی اللہ ہی آکر دلائیں گے۔

اسی کو محقق ڈچ ڈی گوتج نے یوں لکھا ہے۔

عبد اللہ نے حصول مقصد کے لئے مختلف طریقہ اختیار کئے۔ جو حقیقۃً کوئی عمدہ طریقہ نہ تھا۔ انسانی کمزوریوں پر حملہ کا کوئی طریقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔ پابند مذہب اور نیک دل لوگوں کے سامنے زہد و تقویٰ۔ عیاش اور اوباش لوگوں کے سامنے ہر قسم کی ہوسناکی جائز کی گئی۔ بلند تخیل والوں کے لئے فلسفہ کا ڈھونگ، جوشیلے انسانوں کے لئے باطنیت اور رہبانیت اور عوام کو حیرت اور تشکیک میں ڈالا گیا۔ بالآخر یہود کے لئے ایک مسیح موعود، عیسائیوں کے لئے ایک فارقلیط اور مسلمانوں کے لئے ایک مہدی مہیا کیا گیا۔

تعلیمات اور اس کے مختلف مدارج !! ان تمام طریقوں میں سے جس طریقہ سے بھی کوئی

Preaching of Islam ۱؎

اس جماعت کا رکن بننا چاہتا تو اس کو پہلا سبق یہ دیا جاتا کہ شریعت کے جتنے احکام ہیں۔ اس کے دو رُخ ہیں ایک اس کا ظاہر اور دوسرا اس کا باطن اور اسرار صرف انہیں لوگوں پر منکشف ہوتے ہیں جو امام وقت کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ اس بات کے ذہن نشین کرانے کے بعد اس کو اپنی جماعت میں داخل کرتے اور سب سے پہلے درجہ پر اس سے اطاعت کا حلف اٹھوایا جاتا۔ اور دوسرے درجہ پر یہ بتایا جاتا کہ پہلے ائمہ اور معلمین نے اسلام کو غلط سمجھا ہے اسلئے وہ لوگ ظاہری احکام کے پابند تھے۔ خدا ظاہری عمل پر خوش نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ امام سے باطنی احکام کو سیکھ کر عمل نہ کرے۔ تیسرے درجہ پر یہ بتایا جاتا کہ امام صرف سات ہیں۔ اور دوسرے شیعی فرقے غلطی پر ہیں۔ چوتھے درجہ پر یہ تعلیم د...
خاتم النبیین نہ تھے۔ بلکہ اسمٰعیل بن جعفر ہیں۔ پانچویں در...
ہیں اور یہ عبادات اور ارشادات محض اس زمانہ کے لئے
حج، زکوٰۃ وغیرہ کو ترک کرنے کی تعلیم دیتے۔ ساتویں دور میں یہ...
تعلیم دیکر عقیدۂ توحید سے باز رکھتے۔ آٹھویں درجہ پر ان کی تمام تعلیمات پر عمل درآمد کرانے کی پوری پوری کوشش کراتے اور آخری نویں درجہ پر پہونچکر رہے سہے اسلامی اثرات کا خاتمہ کر دیا جاتا۔

عقائد: اس[2] سے تقریباً یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ان کا عقیدہ کیا تھا۔ وہ توحید کے قائل نہ تھے۔ بلکہ ان کے نزدیک پیدائش عالم کے دو خالق ہیں، خالق اول اور خالق ثانی، خالق اول خدا ہے جس نے نفس اول کو پیدا کیا اور پھر نفس اول نے عالم کو، یہ عقیدہ مجوسیوں اور ثنویوں کے عقیدہ سے مشابہ ہے۔ یہ دونوں فرقہ بجائے اول اور ثانی کے خالق عالم نور اور ظلمت کو بتاتے ہیں۔ عقیدۂ رسالت کے متعلق وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانتے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ابتدائے عالم سے اس وقت تک صرف سات پیغمبر ہوئے۔ حضرت آدمؑ، نوحؑ، ابراہیم

---

[1] صفحہ ۵۰، [2] Ensyclopaedia، دبستان المذاہب، الملل والنحل، رسالہ نصیریہ، ابن تیمیہ۔

موسیٰ، عیسیٰ، محمدؐ، اسمٰعیل بن جعفر، صلی اللہ علیہم السلام۔ یہ انبیا ناطق تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا رفیق یا امام صامت ہوتا تھا۔ جو ناطق امام کا جانشین ہوتا، امام صامت کا کام صرف امام ناطق کی تعلیمات کی تبلیغ تھا۔ آنحضرت محمد صلعم کے امام صامت حضرت علیؓ اور اسمٰعیل بن جعفر الصادق کے امام صامت امام محمدؑ تھے۔ اِس عقیدہ کی بنا پر یہ صاف ہوگیا کہ آنحضرت خاتم الانبیاء نہ تھے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور نہ صرف یہی بلکہ جملہ احکامات صرف آنحضرت کے زمانہ تک محدود تھے، سزا و جزا، ہر شخص کے اعمال کی اسی دنیا میں مل جانے کے قایل نبیذ کا پینا تو حرام لیکن شراب حلال، جنابت میں بجائے غسل کے وضو کرتے۔ نماز کے لئے ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ دو روز روزے بھی رکھے جاتے تھے۔ ایک مہرجان کے دِن دوسرے نوروز کے دن۔ کسی چیز کی حرمت اور حلت کے متعلق کبھی ایک چیز کو موقع و محل کے لحاظ سے حلال کر دیتے تو دوسری طرف، دوسری جگہ وہی چیز حرام ہو جاتی حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں یعنی کہیں کہیں حرمت و حلت کا خیال نماز، و روزہ کی جدید شکلیں جو اختیار کی گئی تھیں۔ وہ محض اس لئے کہ لوگ ان کو اسلام سے خارج نہ سمجھیں۔ صرف یہ جانیں کہ اِن کے نزدیک اسلام کی تاویل اس طرح پر ہے۔

بحرین میں حکومت

عام مورخین کا بیان ہے کہ عبداللہ بن میمون کا ایک تشدد پسند مبلغ حمدان قرمط[1] جو کوفہ کا ایک معمولی کاشتکار تھا۔ بحرین میں ۲۸۱ھ میں ظاہر ہوا۔ اس نے وہاں زہد و تقشف

[1] قرمط کہے جانے کی وجہ یہ تھی کہ قرمط کے لغوی معنی فاصلہ بین القدمین کے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خود یہ شخص اسمیں مبتلا تھا جسکی بنا پر اس لقب سے مشہور ہوا لیکن بعض مورخین نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ قرامطہ اصل کرامیتہ کی بگڑی ہوئی تصویر ہے جس کے معنی سرخ آنکھوں والوں کے ہیں۔ اور چونکہ اُس کی آنکھیں سرخ رہا کرتی تھیں اس لئے اس نام سے مشہور رہا۔ اس کے علاوہ دوسرے اور بھی مناسبات پیش کئے ہیں۔

کا اظہار کیا، کچھ اِس اثر سے اور زیادہ تر سحر وجادو کی بدولت عوام اور جاہل طبقہ میں اپنی شخصیت کو منوایا۔ اور پھر امام مہدی کا فرستادہ بتاکر ان کو اپنی جماعت میں کثرت سے شامل کیا یہ شخص شام اور بحرین کے علاقہ میں امام اسمٰعیل کے لئے دعوت وتبلیغ کرتا اور طرح طرح کی امیدیں دلاکر ورغلاتا اِس معاملہ میں یہ اپنے مقتدا عبداللہ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا ہاں البتہ اپنے پیروؤں سے عدم تشدد کے معاملہ میں مخالف تھا۔ وہ دن دہاڑے اپنی جماعت کے ماوراء لوگوں کو لوٹنے اور غارت کرنے کی پالیسی کا قائل تھا چنانچہ اُس نے اسی اصول پر کام شروع کیا۔ اسکی دعوت کا دار ومدار دو شخصوں پر تھا۔ ایک اُن میں سے فرج بن یحییٰ تھا جسکا لقب ذکرویہ تھا۔ اور دوسرا ابوسعید جنابی، اول الذکر سواد کوفہ اور بعد ازاں شام ۲۹۱ھ ... مذہب کی اشاعت کی، باوجود کوشش دولت کی بناپر قائم نہ کرسکا بہت ... بصرہ اور کوفہ پر لیکن کامیابی نہ ہوسکی بہت سے مارے گئے جماعت مختلف اطرافِ عالم میں منتشر ہوگئی۔

ثانی الذکر ابوسعید جنابی نے بحرین میں دعوت کی ابتدا کی۔ اور ایک عرصہ تک لیکن اور اس کے خاندان والوں نے حکومت کی، چنانچہ وہاں دعوت وتبلیغ کرکے مہدی کے نام پر ایک چھوٹا سا فوجی دستہ تیار کیا۔ اس دستہ سے سب سے پہلے ۳۰۳ھ میں بصرہ پر حملہ کیا، والی بصرہ کو شکست دیکر قبضہ کیا۔ اور پھر اسی سلسلہ میں ہجر پر قابض ہوگیا۔ اس فتح کے بعد ابوطاہر کو جو ابوسعید کا جائز وارث تھا، مالک تخت بناکر واپس آیا اور دوسرے مقامات پر دعوت وتبلیغ کرتا پھر رہا تھا کہ اسی اثنا میں اکثر تبہ ابوطاہر کے ہاتھ سے بصرہ نکل گیا۔ اور عرصہ تک محروم حکومت رہا۔ لیکن دوبارہ ۳۱۱ھ میں ابوطاہر نے بصرہ پر حملہ کیا۔ بازاروں کو لوٹا، بیشمار جانوروں کو قتل کیا۔ جامع مسجد کو مسمار اور ویران کیا۔ اور پھر دوسرے سال ۳۱۲ھ میں حاجیوں کے قافلے لوٹے۔

ھ۱ یہ سب واقعات ابن اثیر، ابن خلدون اور ابوالفدا سے لئے گئے ہیں۔

بچوں اور عورتوں کو قید کیا۔ مال و اسباب چھینا، اور بہت کم لوگ اس قافلہ کے ایسے تھے جو بچ سکے۔

اس شخص کے جور و ظلم کی انتہا یہ نہ تھی بلکہ ۳۱۴ھ میں کوفہ کی تباہی اور قبضہ اور پھر ۳۱۶ھ میں عمان پر قبضہ کے بعد ۳۱۷ھ میں مکہ پر فوج کشی کی، بیشمار حاجیوں کو قتل کیا کل اہل مکہ کے گھر بار اور مال و اسباب کو لوٹا خانہ کعبہ کے میزاب اور دروازوں کو اکھیڑ ڈالا۔ غلاف کعبہ کو چیر پھاڑ کر تقسیم کیا گیا۔ اور پھر حجر اسود کو اکھاڑ کر اپنے ساتھ بحرین لے گئے۔ بحرین میں حجر اسود لے جانے کی غرض یہ تھی کہ حج بجائے مکہ کے بحرین میں ہو جیسا کہ ان کے اس اعلان سے جو مکہ سے واپسی کے وقت کیا ظاہر ہوتا ہے، ایک عرصہ تک خلیفہ وقت اور رعایا کو قتل و غارت سے پریشان کر کے ۳۱ برس کی حکومت کے بعد اس دنیا سے کوچ کیا۔ ابو طاہر کے بعد احمد ابو منصور اور پھر ابو منصور کا بیٹا ابو علی حسن بن احمد سریر آرا ہوئے، ابو منصور، ابو طاہر کا بھائی تھا وہ ابو منصور کے لڑکوں کو تخت سے محروم کر کے خود حکمراں بن گیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان دونوں خاندانوں میں کشمکش پیدا ہو گئی۔ اور پھر یہ کشمکش ایک عرصہ تک جاری رہی، آپس کی نااتفاقی کے باعث کچھ عرصہ کے بعد ۳۶۴ھ میں حکومت ابو منصور کی اولاد میں رہ سکی، اور نہ طاہریوں میں، اکیاسی برس تک یہ خاندان بحرین کا حکمراں کہلایا۔

واقعات کی اس کھتونی میں اوپر کہیں ذکرویہ کے قتل کا ذکر کیا جا چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے۔ کہ اس کے ساتھ کے لوگ ادھر ادھر ممالک اسلامیہ کے ہر ہر گوشہ میں پھیل گئے تھے۔ ان لوگوں میں اپنے سردار کے مقتول ہو جانے کے بعد اتنی جرأت تو باقی نہ رہی تھی کہ کھلے بندوں مقابلہ کر سکتے۔ البتہ ایسا ضرور ہوا کہ چھپ چھپ کر اپنے خیالات و عقائد کی تبلیغ کرتے۔ اور موقع پا کر مناسب مقام پر چھاپے

مارتے، اور اسی مناسبت سے سب سے پہلے اہل عراق نے انکو باطنیہ کے لقب سے پکارا۔ اور پھر ان کو اسماعیلیہ بھی کہا گیا، اور سب سے آخر میں ان کا ایک اور تیسرا نام رکھا گیا۔ اور وہ نزاریہ ہے۔ اور یہ اس لئے کہ مستنصر علوی کے زمانہ خلافت میں اس کے بیٹے نزار نے بیعت نہ کرنے پر اسماعیلیہ کے ہوا خواہوں کو قتل و تہ تیغ کیا اور حسن بن صباح جس کا تذکرہ ابھی آئیگا۔ نزار کے بعد ائمہ کی امامت سے مصر میں انکار کیا بہرحال ان کا فتنہ و فساد ملکشاہ کے زمانہ حکومت میں جبکہ وہ اور سلجوقی اسلامی ممالک پر حکمرانی کر رہے تھے بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس وقت کے سلاطین اس قدر بھی طاقت نہ رکھتے تھے کہ ان کے فتنہ و فساد کو فرو کر سکتے۔ اس ...
دھاوا کرتے۔ اور فتنہ و فساد کا بازار گرم کرتے، تدریجاً
اس قابل ہو گئے کہ اپنی قوت کی نمائش کر سکتے تو بہت سے
ہو گئے۔ سب سے پہلے قاین کے پاس ایک قلعہ تھا، جہاں پر ان دنوں ... ایک شخص حاکم تھا۔ وہاں گئے اور اس کو اپنا مرکزی مقام بنایا اور یہیں سے دن رات ان قافلوں کو جو ادھر سے گذرتے اور قرب و جوار کی آبادی کو لوٹتے، انہیں دنوں کا ایک واقعہ ہے کہ ایک بہت بڑا قافلہ کرمان سے روانہ ہوا۔ جو قاین کا عازم تھا، ان لوگوں نے اس پر چھاپہ مارا، سب کو قتل کیا ایک ترکمانی شخص اتفاقاً بچ گیا تھا، جس نے قاین پہنچکر اس غمناک حادثے کی اطلاع دی یہ واقعہ محض اس لئے لکھا گیا ہے کہ قارئین اُن کی سخت دلی کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ اس واقعہ کے تھوڑے دن بعد قلعہ اصفہان پر قبضہ کیا۔ پھر قلعہ الموت پر، یہ ایک پرانا قلعہ تھا جو کوہ البرز کے سلسلہ میں رودبار کے اُس حصہ میں جسے طالقان کہتے ہیں۔ قزوین سے رشت کو جانے والی سڑک پر واقع تھا یہ پیچ در پیچ گھاٹیوں میں ایسا گھرا ہوا تھا۔ کہ بمشکل کوئی وہاں پہنچ سکتا حسن بن صباح نامی اس جماعت کے ایک مشہور سردار نے چالاکی، اور ہوشیاری سے اس پر قبضہ کیا

اور اس کو اپنی تبلیغ اور دعوت کا مرکز بنایا۔ یہ شخص نہایت چالاک اور فطرۃً بہت ذہین تھا چالاکی اور عیاری کی بدولت کچھ دنوں کے بعد حکمراں کہلایا اور ایسا حکمراں کہ جس کے نام سے تمام سلاطین تھراتے جس سلطان، وزیر کو جس عالم وفاضل کو چاہا۔ اپنے جانثار سپاہیوں کے ذریعہ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جو جو طریقہ اپنی فتحمندی اور برتری کے اختیار کئے وہ حیرت انگیز اور بلاشبہ یکتا و بےمثل تھے ذیل میں مختصر طور پر اس شخص کے حالات اور کارناموں کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

حسن بن صباح

یہ شخص چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں اضلاع خراسان کے ایک شہر طوس میں پیدا ہوا باپ ایک مفلوک الحال اور تنگ دست آدمی تھا۔ تعلیم وتربیت کے خیال سے اسنے اپنے بیٹے حسن کو امام موفق الدین کے حلقہ درس میں بٹھایا۔ عام مورخین کی روایت ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں حسن کی[1] اپنے دو ساتھیوں عمر خیام اور قیام الدین (جو بعد میں نظام الملک طوسی کے نام سے مشہور و معروف ہوا) عہد ہوا تھا کہ جو شخص ہم میں سے کبھی بلند درجہ پر سرفراز ہو وہ اپنے بقیہ دو ساتھیوں کی امداد کرے زمانہ نے قیام الدین کو ملکشاہ سلجوقی کا چہیتا وزیر بنایا حسن کو خبر ہوئی تو تکمیل معاہدہ کی امید میں گیا۔ اور ایک معزز عہدہ پر سرفراز ہوا۔ حسن چالاک اور حوصلہ مند بچپن ہی سے تھا اس لئے یہ اس تاک میں رہنے لگا کہ نظام الملک سے کسی نہ کسی طرح اپنی ذہانت اور ہوشیاری تسلیم کرائے چنانچہ ایک دن موقعہ مل گیا۔ اور وہ واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ نے قیام الدین نظام الملک سے کہا۔ کہ جو دفتری نظام ہماری سلطنت کا ہے اس سے محاصل اور خرچ کے صحیح صحیح

---

[1] مولوی محمد مسلم صاحب نے اپنے ایک مضمون حسن بن صباح میں جو نزمہ ایک مستشرق کی تائید کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ یہ معاہدہ قرین قیاس نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تینوں ہمعصر نہ تھے۔ نظام الملک بیس برس حسن سے بڑا تھا۔ البتہ عمر خیام اور حسن بن صباح قریب قریب ہم سن تھے۔

معلوم کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ کوئی صورت ایسی نکالو کہ یہ دشواری جاتی رہے۔ وزیر موصوف نے اس کام کی اہمیت کو سمجھ کر کافی مہلت چاہی۔ حسن جو موقع پر موجود تھا۔ بول اٹھا کہ اتنی مہلت اس حقیر کام کے لئے زیادہ ہے اس کو چالیس روز میں میں کر سکتا ہوں۔ بادشاہ خوش ہو کر یہ کام حسن کے سپرد کیا لیکن حسن ناکامیاب رہا اور دربار سے نکالا گیا۔ حسن یہاں سے نکل کر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا کہ اتفاقاً اس کی ایک ایرانی داعی سے ملاقات ہوگئی یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک طرف باطنیہ کے داعی اطراف ملک میں خفیہ خفیہ اپنے مقصد کے حاصل کرنیکی کوششیں کر رہے تھے اور دوسری طرف اسی اصول پر عبیدی خلفاء کے ایلچی بھی عباسی خلفاء کے خلاف مسلمانوں کو اکسا رہے تھے حسن داعی

مصر گیا۔ وہاں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ کچھ د

سے جو عبیدی خلفاء کی طرف سے ہوئی امراء اور سر

اس لئے مجبوراً اس کو یہاں سے ہٹنا پڑا۔ یہاں سے رو

کہ طوفان نے جہاز کو آگھیرا بچنے کی کوئی امید نہ تھی حسن نے جہاز کے دوسرے مسافروں سے کہا کہ میرے نزدیک تو کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہم نہ ڈوبینگے، اتفاق کی بات کہ جہاز ڈوبتے ڈوبتے بچ گیا۔ لوگ اس کی اس پیشین گوئی پر آ آکر اس کے ہاتھ چومتے۔ اور اپنی انتہائی عقیدت کا اظہار کرتے۔ بعض مورخین کا خیال ہے اور سچ ہے کہ یہ حسن کی چالاکی اور دانائی تھی وہ سمجھتا تھا کہ اگر جہاز ڈوب گیا تو کوئی تکذیب کرنے والا نہ رہیگا اور اگر بچ گیا تو مقصد حاصل ہے بہر حال یہ جہاز سواحل شام سے آلگا۔ یہاں سے اتر کر ایشیا کوچک اور ایران کے تمام بڑے چھوٹے مقام کی سہ سالہ سیر اور دعوت و تبلیغ کے بعد قلعہ الموت جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے قابض ہوا۔ ملکشاہ سلجوق نے اپنے ہاتھ سے قلعہ کو جاتے دیکھ کر حملہ کیا۔ کوئی باقاعدہ فوج حسن کی ایسی تو تھی نہیں کہ اس کو اس کے مقابل لاتا۔ ترکیب یہ کی اور خوب تھی کہ ایک لڑکے کو فریادی بنا کر نظام الملک کے پاس بھیجا

اس نے جب اپنے معاملہ میں نظام الملک کو مشغول بنالیا تو یکایک خلاف وہم وگمان حملہ کردیا۔ اور یہ اس قدر جلد ہوا کہ نظام الملک کو خبر بھی نہ ہوئی کہ پیٹ میں خنجر پہنچ چکا تھا وزیر موصوف کی موت کے بعد فوج بنالی گئی۔ یہ حربہ ایسا کاری تھا کہ آئندہ سے حسن نے اپنی کامیابی کے لئے یہ طریقہ بہت پسند کیا چنانچہ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ اس نے ایک جانباز جماعت فدائیوں کی تیار کی اس کو جانباز بنانے میں جو جو طریقہ استعمال کئے گئے اسی سے اس کی دماغی بلندی، رفعت تخیل، اور پھر عیاری اور چالاکی کا کافی اندازہ ہوسکتا ہے، اول تو اپنے زہد و تقشف سچائی اور ایمانداری کا سکہ ان لوگوں پر جو اس کے ہمرکاب تھے جمایا گیا۔ کہا گیا ہے کہ اس اثر کو ان پر ڈالنے کے لئے وہ قلعہ کی بلند جگہ پر چڑھ گیا۔ تو برسوں نیچے نہیں اترا، ساتھی یہ سمجھ رہے تھے کہ شیخ یاد الہٰی میں مصروف رہتے ہیں یہ وہیں سے تمام احکامات مذہبی شکل میں نافذ کرتا۔ سخت سے سخت احکامات کے نافذ کرنے میں عزیز تر اقربا کا لحاظ نہ کرتا۔ چنانچہ شراب پینا کبھی جرم قرار دیا تو اپنے ایک بیٹے کو جس نے اس جرم کا ارتکاب کیا فوراً قتل کا حکم صادر کرکے اس کا خاتمہ کیا۔ اسی طرح ایک فدائی کا واقعہ ہے کہ اس کے ایک دوسرے بیٹے نے اسے جان سے مار ڈالا تھا حسن کے قتل کے حکم سے وہ بھی نہ بچ سکا حسن کی زاہدانہ زندگی اور تعزیرات کی خوف کے علاوہ جو چیز فدائیوں کو اپنی پیاری جان تک قربان کرنے سے باز نہ رکھ سکتی وہ اس کی خود ساختہ بہشت تھی،

حسن کی بہشت! اس نے الموت کے اردگرد سرسبز اور شاداب کہسار میں جنت بنائی دلفریب وادیوں اور جانفزا مرغزاروں میں چاندی سونے کے خوبصورت محل تعمیر کرائے بیش بہا جواہرات لعل و زمرد سے اس کی پچیکاری کی گئی عمدہ عمدہ آرائش اور زیبائش کی چیزوں سے محل آراستہ کیا گیا۔ ہر طرف باغ لگائے گئے، حور اور غلمان کے تخیل نے خوبصورت اور نازک لڑکوں اور لڑکیوں سے اس کو آباد کیا گیا۔ دودھ اور شہد کی نہریں بہائی گئیں۔ بعض نہریں ایسی بھی تھیں کہ جن میں عمدہ اور سبک کشتیاں چلائی گئیں

الغرض تمام عیش ونشاط کی چیزیں فراہم کی گئیں۔ اس بہشت کے بنانے میں اپنے انتہائی تخیل سے کام لیا جس فدائی کو اس کی ایک دفعہ سیر کرادی گئی اسکی یہ مجال نہ تھی کہ شیخ کے حکم کی خلاف ورزی کر سکے۔ بہشت میں پہونچانے کی جو صورت تھی وہ یہ تھی کہ ایک نشیلا پتہ جس کو عربی میں حشیش[1] کہتے تھے فدائی کو اس کا شربت پلایا جاتا وہ پیتے ہی بیہوش ہوجاتا آنکھ جب کھلتی تو وہ اپنے کو کسی نازک نازنین کی گود میں پاتا۔ اس حسین وجمیل منظر سے وہ ایسا متاثر ہوتا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی وہاں سے باہر آنے کے تخیل ہی سے اس کو بیچینی اور تکلیف محسوس کرتا۔ اس کو یقین کامل ہوتا کہ وہ اسی بہشت میں ہے جس کا خدا نے اپنے نیک بندوں سے وعدہ کیا ہے لیکن کہ پھر اسی شربت سے بے ہوش کرکے باہر پہونچا دیا جاتا کہ حقیقتاً تم اس مادی اور ناپاک جسم سے بہشت میں نہیں رہ سکتے۔ تاوقتیکہ تم اس کو پاک وصاف نہ کرلو اور یہ صرف امام کی پوری پوری پیروی کرو یہی وہ فدائی تھے کہ جو بہشت کی طمع میں اطراف ملک میں پھیلائے گئے۔ جس نے ذرہ برابر ان کی مخالفت کی اس کی قضا اس کے سر پر پہونچی سینکڑوں علماء وفضلاء ان کے شکار ہوئے۔ علماء تو علماء خلفاء بھی ان کی تلوار بے نیام سے نہ بچ سکے، خلیفہ مسترشد اور خلیفہ راشد انہیں کے ہاتھوں شہید ہوئے یہ فدائی کھلے بندوں مقابلہ نہ کرتے۔ بلکہ جس کسی سربر آوردہ اشخاص کو مارنا مقصود ہوتا اس کی خدمت میں آہستہ آہستہ اپنا رسوخ اور اقتدار بڑھاتے خواہ خدمت کرکے یا اور دوسرے طریقوں سے، مدتوں ساتھ رہتے سہتے۔ جب کبھی اچھا موقعہ مل جاتا تو اس سے فائدہ اٹھاتے، فدائیوں کے علاوہ عقیدت مندوں کے دو طبقہ اور تھے۔ جو ان سے کم مرتبہ پر تھے۔ ایک داعیوں کا جو باطنیت کی خفیہ تبلیغ کرتے پھرتے اور دوسرا رفیقوں کا جو

---

[1] اسی مناسبت سے حسن کے ساتھیوں کو حشاشین کہا گیا ہے۔

مشیر کی حیثیت رکھتے اور مجتہد کہلاتے ۔ لبعضوں نے ان کے پانچ طبقہ بتائے ہیں
سب سے بڑا افسر شیخ الجبل کہلاتا۔ اس کے ماتحت تین داعی القربان ہوتے جو تین
صوبوں کے افسر ہوتے اس کے بعد داعیوں کی جماعت ہوتی جو تمام خفیہ اصولوں
سے واقف ہوتے ۔ اور اس مقصد کے مبلغ ہوتے چوتھے رفقا کی جماعت ہوتی ۔
پانچویں فدائیوں کی ۔

حسن نے ان ان طریقوں سے پنتیس سال تک قلعہ الموت اور اس کے اردگرد
بہت سے دوسرے قلعوں پر فرماں روائی کی ۔ یہ قلعے خراسان سے شروع ہوکر
حسار کے کنارے کنارے اذربیجان تک اور پھر یہاں سے جنوب کی طرف عراق اور خجستان
تک اور اسی طرح سواحل روم تک ۔ ہزار ہا میل تک کوہستان ہی کوہستان میں چلے
گئے تھے ۔

حسن کے انتقال کے بعد کیا بزرگ جو اس کا خاص معتمد تھا ۔ تخت نشین ہوا ، اس سے
پیشتر فدائیوں کے سلسلہ میں خلیفہ مسترشد اور ارشد کی شہادت کا جو واقعہ بیان
کیا گیا ہے ۔ وہ اس کے زمانے میں وقوع میں آیا تھا ۔ اس کے زمانے میں شام کی باطنی
جماعت تو مٹی لباتی تھی ۔ لیکن ایرانی کچھ کمزور پڑ گئے تھے ۔ تیسرا تاجور ان کا محمد اول تھا ۔
باطنیوں کے خیال کے مطابق یہ ان کا کوئی قابل حکمراں نہ تھا ۔ اس سے زیادہ اس کے
بیٹے حسن کی طرف ان کی توجہ تھی چنانچہ محمد کے بعد یہ جانشین بنایا گیا ۔ ۱۱۶۴ء کا واقعہ
ہے کہ اس نے امام مہدی کا ایک خط پیش کیا ۔ جس میں امام موصوف کی طرف سے
عوام الناس سے یہ مطالبہ تھا ۔ کہ حسن کی فرمانبرداری کریں اس لئے کہ یہ سچا اور ایماندار
داعی ہے ۔ اس خط کو سنا کر حسن نے اعلان کیا ۔ کہ اسلام کے وہ بعض ظاہری اصول
جو کبھی ہمارے پیشرؤں نے بھی ضروری قرار دئے تھے سب ختم ہوگئے ۔ خوب عیش

عـ۱ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۔

کرو اور خوشیاں مناؤ۔ اس سلسلہ میں اس نے امام خلیفتہ اللہ ہونے کا دعویٰ کیا وہ کہتا تھا کہ میں محمد کا بیٹا نہیں بلکہ نزار خلیفہ، مصر کا بیٹا ہوں لیکن ابھی اس دعویٰ کا اعلان ہی ہوا تھا کہ اس کے سالے نے اس کو قتل کرا دیا، اس کے بعد محمد ثانی جانشین ہوا جو چھیالیس ۴۶ سال تک حکمراں رہا۔ باپ کے قاتل او۔ اس کے تمام خاندان کو تباہ کرایا اور اس نے اتابک سلطان نورالدین اور پھر صلاح الدین سے جنگیں کیں۔ صلاح الدین پر اکثر و بیشتر فدائیوں نے وار کیا۔ لیکن ... یہی ایک ایسی شخصیت تھی جو ان کے ہاتھوں سے بچ سکی۔ سلطان صلاح الدین ...

پڑ والا تھا۔ اٹھا لیا اس لئے پھر ان باطنیوں نے ...
... رازی سے متعلق بہت مشہور ہے۔ بیان کیا گیا ہے ...
متعلق یہ شبہ ہوا کہ اگر باطنیوں کی تائید نہیں تو ...
صفائی کی خاطر ایک دن منبر پر باطنیوں کو بہت سخت سست ... امام حسن الجبل الموت کو جب اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو اس نے ایک فدائی کو بھیجا یہ ایک طالب علم کے بھیس میں سات مہینہ تک وہاں رہا آخر کار ایک دن موقع پا کر امام کے سینہ پر سوار ہو گیا اور خنجر نکالا امام کی عاجزی سے وہ اتر تو پڑا لیکن اس نے کہا کہ ہمارے امام کا بس اسی قدر حکم تھا۔ ورنہ آپ کی عاجزی اور منت کوئی اثر ہمارے قلب پر نہ ڈال سکتی، اس وقت شامی شاخ داعی سنان کے زمانہ میں صلیبیوں سے مل گئی تھی صلیبی جماعت نے بھی ان کو بعض لوگوں کے قتل کا آلہ کار بنایا تھا۔ اس کو اس کے بیٹے جلال الدین حسن ثالث نے زہر دیدیا تھا اور خود جانشین ہوا اس عہد میں کوئی واقعہ قتل اور خونریزی کا پیش نہیں آیا غالباً اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ بہت جلد قتل کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ اس کے بیٹے محمد ثالث کو بٹھایا گیا۔ اس نے جب تمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو نو برس کا بچہ تھا۔ باپ کا طریقہ چھوڑ حسن بن صباح کے طریقہ کو

پھر سے رائج کیا ۱۲۵۵ء میں تیس سال حکومت کے بعد یہ بھی اپنے بیٹے رکن الدین کے ہاتھ مارا گیا۔ یہ ان کا آخری حکمران تھا۔ حکومت کا دوسرا ہی سال تھا کہ ہلاکو نے ایران کے کوہستانی علاقہ پر چڑھائی کی الموت اور تمام اردگرد کے قلعات پر قبضہ کیا۔ رکن الدین کو گرفتار کیا۔ مگر اس کی خواہش کے مطابق لنگوخاں (ہلاکو کے باپ) کے ہاں بھیجدیا گیا۔ لیکن راستہ میں دغابازی کی اور وہیں قتل کردیا گیا۔ اس کے ساتھ تقریباً بارہ ہزار حشاشین (باطنین) قتل کئے گئے۔ اور اس طرح ایران میں ان کی قوت کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ شامی شاخ اس کے بعد کچھ عرصہ تک تھی کہ بیبرس سلطان مصر نے ختم کرڈالا۔ اس کے بعد بھی چھوٹی چھوٹی جماعتیں باقی رہیں۔ جو آج تک موجود سمجھی جاتی ہیں۔ انسے ملتے جلتے خیالات اب بھی شمالی شام و ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ رئیف کے لوگوں کے متعلق بھی یہی یقین کیا جاتا ہے۔ آئندہ سلسلہ میں انشاء اللہ یہ بتانے کی کوشش کیجائیگی کہ ہندوستان میں اس قسم کی جماعت کا کیونکر نشو نما ہوا اور انہوں نے یہاں کے خیالات وعقائد پر کیا اثر ڈالا۔
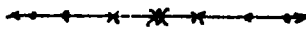
اپنا دُکھڑا کسے سناؤں ؟

شام کا جھٹپٹا۔ گیلی برف کے بڑے بڑے گالے بازار کے لیمپوں کے جو ابھی جلائے گئے ہیں
ارد گرد دھیمی رفتار سے گھوم رہے ہیں، چھتوں پر، گھوڑوں کی پیٹھ پر، بانہوں پر، ٹوپیوں پر،
برف کی باریک نرم تہ جمی ہوئی ہے، گاڑی بان ایونا۔ بھوت کی طرح سفید ...
بے حرکت گٹھری بنا بیٹھا ہے۔ اس سے زیادہ جھکنا انسان کی
ہے، کہ اگر برف کے تودے کے تودے اس پر آ پڑیں، تو
اُس کی سوکھی سہمی گھوڑی بھی سفید اور ساکت ہے۔ اُس کے
ی سیدھی ٹانگوں کو دیکھ کر اُس پر ٹکے کی مٹھائی کے گھوڑے کا شبہ ہوتا ہے۔ شاید ...
ڈوبی ہوئی ہے، جس غریب کو ہل بکھیرے ان مٹیالے مناظر سے جو اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے
ہیں، زبردستی چھڑا کر اس جنجال میں پھنسا دیا جائے۔ جہاں ڈراؤنی روشنیاں، غُل غپاڑا،
لوگوں کی لگاتار ان تھک دوڑ دھوپ ہو، وہ سوچ میں کیسے نہ پڑے؟

ایونا اور اس کی گھوڑی کو ایک جگہ سے ہلے بہت دیر ہو گئی تھی، دوپہر سے پہلے نکلے تھے
اور اب تک ایک سواری نہیں ملی، شہر پر شام کی تاریکی چھا رہی ہے، بازار کے لیمپوں کی دھندلی
روشنی تیز ہو رہی ہے۔ اور سڑک کا شور شغب بڑھ رہا ہے۔

وائی برگ اسکایا کے لئے گاڑی! ایونا کے کان میں آواز آتی ہے، گاڑی!

ایونا چونک پڑتا ہے اور اپنی برف سے ڈھکی ہوئی پلکوں میں سے ایک افسر کو دیکھتا ہے جو بڑا فوجی کوٹ پہنے کھڑا ہے۔

وائی برگ اسکایا کو! افسر پھر کہتا ہے۔ سو رہے ہو؟ وائی رگ اسکایا کو!

افسر کی بات سمجھ کر ایونا باگ کو جھٹکا دیتا ہے، برف کے ٹکڑے گھوڑی کی پیٹھ اور پھوں

پرے ہوا میں اڑتے ہیں، افسر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے، گاڑی بان گھوڑی کو للکارتا ہے، بطخ کی طرح گردن آگے کو نکالتا ہے، اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، اور گو اس کی ضرورت نہیں ہے، مگر عادت کے مطابق چابک چٹخاتا ہے، گھوڑی گردن آگے کو نکالتی ہے، اپنی بانس کی سی ٹانگیں سکیڑتی ہے، اور با دلِ ناخواستہ چلنے لگتی ہے،

تاریکی کے انبار میں سی جو اس کے سامنے اِدھر سے اُدھر گردش کر رہا ہے۔ ایونا کے کان میں چیخوں کی آواز آتی ہے: "شیطان، کہاں گھسا چلا آتا ہے؟ کدھر چلا پڑتا ہے؟ دائیں کو چل!

تمہیں چلانا نہیں آتا! دائیں کو چلاؤ"، افسر بگڑ کر کہتا ہے۔

ایک کوچوان جو کسی کی ذاتی گاڑی چلا رہا ہے، اُسے جھڑکتا ہے۔ سڑک پار کرتے ہوئے ایک راہ گیر کے شانے گھوڑی کی ناک سے رگڑ کھاتے ہیں۔ وہ اُس کی طرف غصے کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اپنی آستین جھٹکتا ہے۔ ایونا بکس پر اس طرح پہلو بدلتا ہے۔ جیسے کانٹوں پر ہے۔ کہنیاں ہلاتا ہے، اور چاروں طرف مبہوت ہو کر کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے، کہ کہاں ہوں، اور جہاں ہوں، وہاں کیوں ہوں،

"یہ سب لوگ کتنے بدمعاش ہیں!" افسر از راہ تمسخر کہتا ہے، "پوری کوشش کرتے ہیں۔ کہ تمہارے راستے میں حائل ہوں، یا گھوڑی کے پاؤں سے کچلے جائیں، ضرور جان بوجھ کر یہ شرارت کرتے ہیں!

ایونا اپنی سواری کی طرف دیکھتا ہے، اور اپنے ہونٹ ہلاتا ہے... بظاہر کچھ کہنا چاہتا ہے، مگر سوائے سوں سوں کے منہ سے کچھ نہیں نکلتا۔

"کیا کہا؟" افسر پوچھتا ہے۔

ایونا کھسیانا ہو کر مسکراتا ہے۔ اور گلے پر زور ڈال کر روکھی آواز سے بمشکل یہ لفظ ادا کرتا ہے: "میرا لڑکا... میرا لڑکا اِس ہفتہ گذر گیا حضور!"

ہُوں! کیا شکایت تھی؟

ایونا پوری طرح سواری کی طرف پلٹ کر کہتا ہے:

'خدا جانے! بخار ہو گا. تین دن ہسپتال میں پڑا رہا، اس کے بعد گذر گیا. جو خدا کی مرضی'
'شیطان! مڑ کر دیکھ!' اندھیرے سے آواز آتی ہے، 'کتے، باؤلا ہو گیا ہے؟ آنکھیں کھول کر دیکھ کدھر چلا جا رہا ہے!'

چلے چلو! چلے چلو! افسر کہتا ہے۔ اس رفتار سے کل تک بھی نہیں پہنچ سکتے، تیز چلو!
گاڑی بان پھر گردن آگے کو نکالتا ہے، اپنی جگہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے. بیابک گھماتا ہے، کئی بار
پھر کر افسر کی طرف دیکھتا ہے، افسر نے آنکھیں میچ لی ہیں...
وائی برگ اسکایا پر سواری کو اتار کر ایونا ایک قہوہ خ
اور پھر سکڑ کر بکس پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک گھنٹہ گزرتا ہے، پھر دو
تین نوجوان، دو کشیدہ قامت، اور دبلے پتلے، ایک پستہ قد اور کبڑا، ایک دوسرے پر فقرے کستے، اپنے برساتی جوتے پہنے، کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اس طرف آتے ہیں،
'گاڑی بان! پولس کے پل کو چلو!' کبڑا بھونڈی آواز سے چلاتا ہے، 'تینوں کے... بیس کوپک!'
ایونا باگ کھینچتا ہے، اور گھوڑی کو للکارتا ہے، اصل کرایہ بیس کوپک سے زیادہ ہوتا ہے مگر اسے اس کا خیال نہیں، ایک روبل ہو یا پانچ کوپک، اس کی پرواہ نہیں، بس سواری مل جائے
تینوں آدمی ایک دوسرے کو دھکیلتے، بدزبانی کرتے، گاڑی کی طرف آتے ہیں، اور تینوں یہ کوشش کرتے ہیں، کہ ایک ساتھ بیٹھ جائیں، تصفیہ طلب سوال یہ ہے، کون سے دو بیٹھیں، اور کون کھڑا رہے؟ لمبے چوڑے بحث مباحثے، تو تو میں میں، گالی گلوج کے بعد یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کبڑا کھڑا رہے، کیونکہ وہ سب سے مختصر ہے،
'چلو!' کبڑا کھڑا ہو کر کہتا ہے، ایونا کی پیٹھ پر اس کا سانس محسوس ہوتا ہے 'فروٹ ہو جاؤ! دوست تمہاری ٹوپی عجیب و غریب ہے، اس سے روی ٹوپی سارے پیٹر برگ میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گی'

ہی ہی! ہی ہی! ایونا ہنستا ہے، بس گذارے کے لائق ہی،

'خیر، جناب گذارے کے لائق۔ ذرا تیز چلیے! تمام راستے اسی چال سے چلوگے؟ کیوں؟
دوں تان کر ایک چپاخا؟

'میرا سر پھٹا جاتا ہے'، کشیدہ قامت نوجوانوں میں سے ایک کہتا ہے، "دُکماسوف کے ہاں کل
واسکا اور میں مل کر برانڈی کی چار بوتلیں اڑا گئے'۔

'سمجھ میں نہیں آتا تم اتنی بکواس کیوں کرتے ہو؟' دوسرا کشیدہ قامت نوجوان خفا
ہو کر کہتا ہے، وحشیوں کی طرح جھوٹ بکتے ہو!

'اپنی جان کی قسم، سچ کہتا ہوں!

'یہ ایسا ہی ہے، جیسے یہ کہنا کہ جوں کھانستی ہے!

ہی ہی! ایونا ہنستا ہے، صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں!

'مردود!' کبڑا غصے میں آکر چیختا ہے، چلاتا ہے، ملعون، نہیں! گاڑی یوں چلائی جاتی
ہے؟ چلانے کا یہ طریقہ ہے؟ لگا ایک چابک۔ کم بخت کی چابک سے خبر لے۔

ایونا کو اپنے پیچھے کبڑے کے ہلنے جلنے اور کانپتی ہوئی آواز کا احساس ہوتا ہے، وہ سنتا ہے
کہ مجھے گالیاں دی جا رہی ہیں، لوگوں کو دیکھتا ہے، اور تنہائی کا بوجھ اُس کے دل پر سے ہلکا ہو جاتا
ہے، کبڑا اُسے برا بھلا کہتا ہے، یہاں تک کہ اپنے چلبلے اور گرم گرم فقروں سے اُس کے گلے میں
پھندا پڑ جاتا ہے، اور کھانسی اُس کی زبان بند کر دیتی ہے۔ اُس کے کشیدہ قامت رفیق ندائزدا
پترووناایک عورت کا ذکر چھیڑتے ہیں، ایونا اُن کی طرف دیکھتا ہے، تھوڑی دیر انتظار کر کے، جب
وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے ہیں، تو پھر مڑ کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

'اس ہفتے... میرا... لڑکا گذر گیا!'

'سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے' کبڑا ٹھنڈا سانس کھینچتا ہے، اور کھانس کر ہونٹ پونچھتا ہے
'خیر، تیز چلاؤ، تیز۔ یارو مجھ سے یہ چیونٹی کی چال نہیں دیکھی جاتی! نہ معلوم کب پہنچائے گا؟

ذرا اِس کی ہمت بڑھاؤ... لگا دُگون پر ایک ہاتھ!'

'ملون، سُنتا ہے! مزا چکھا دوں گا، تم لوگوں کا لحاظ کرنے سے پیدل چلنا اچھا

بُتّنے سنتا ہے؟ یا جو کچھ ہم لوگ کہہ رہے ہیں، تیری جوتی کی نوک سے!'

ایونا کی پیٹھ پر تھپڑ پڑتا ہے، جس کا تڑاخا اُسے چوٹ سے زیادہ سنائی دیتا ہے۔

'ہی ہی! وہ ہنستا ہے۔ صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں، خدا! آپ صاحبان کو سلامت

رکھے!'

'گاڑی بان تمہاری شادی ہو چکی ہے؟' ایک کشیدہ قامت پوچھتا ہے۔

'میری؟ ہی ہی! صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں۔ اب گیا...

ہو ہو ہو! یعنی قبر! ذرا سوچو، میرا بیٹا چل بسا، اور میں

موت اٹکل پچو زنجیر کھٹکھٹاتی ہے۔ میرے پاس آنے کے بجا۔

ایونا مڑکر انہیں اپنے بیٹے کی موت کا حال سُناتا ہے، مگر یہاں

کہتا ہے شکر ہے منزل مقصود پر آ پہنچے۔ اپنے بیس کوپک لے کر ایونا دیر تک اُن اوباشوں کی

طرف دیکھتا رہتا ہے، وہ ایک اندھیرے پھاٹک میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے

ہیں، ایونا کے لئے پھر وہی تنہائی وہی ہُو کا عالم چھا جاتا ہے، جو صدمہ گھڑی بھر کو ہلکا ہو گیا

تھا وہ پھر اُبھر آتا ہے۔ اور اس کے دِل پر انتہائی شدت سے ٹوٹتا ہے؛ اُس کی نظروں سے

غم و اندوہ ٹپکتا ہے، وہ بےچین نگاہوں سے سڑک کے دونوں طرف لوگوں کی ریل پیل پر نظریں

ڈالتا ہے، کیا اِس ہزاروں کے مجمعے میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں، جو اُس کی دُکھ بھری

کتھا سُنے؟ لوگ اُس سے، اُس کے غم سے غافل گزرے چلے جاتے ہیں... اس کا غم بے انتہا

سخت، اندازے سے باہر ہے، اگر اُس کا دِل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کا غم اُس سے

پھوٹ بہے، تو وہ تمام دنیا میں سیلاب کی طرح پھیل جائے، پھر بھی وہ کسی کو نظر نہیں آتا

اُس نے ایک ایسے حقیر خول میں چھپنے کو جگہ نکالی ہے کہ دِن کے وقت چراغ لے کر ڈھونڈو

تب بھی نہ دکھائی دے۔۔۔

ایونا کی نظر ایک دربان پر پڑتی ہے، جس کے ہاتھ میں ایک پلندہ ہے، وہ اس سے بات چیت کرنے کی ٹھانتا ہے،

'بھئی، کیا وقت ہوگا؟'

'دس بجا چاہتے ہیں۔۔۔ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ آگے بڑھو!'

ایونا چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے، اتنا جھکتا ہے کہ دوہرا ہو جاتا ہے، اور اپنے غم میں ڈوب جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ لوگوں سے کسی قسم کی امید رکھنا بے فائدہ ہے۔ پانچ منٹ نہیں گذرتے کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ سر اس طرح ہلاتا ہے جیسے سخت درد میں مبتلا ہے، اور باگ کھینچتا ہے۔۔۔ اب اس سے تکلیف نہیں سہی جاتی۔

'واپس اصطبل کو!' اپنے دل میں کہتا ہے:' اصطبل کو!'

گھوڑی اس کے خیالات کو تاڑ کر دلکی چلنے لگتی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ایونا ایک غلیظ بڑے آتش دان کے پاس بیٹھا ہے، آتش دان پر، فرش پر، بینچوں پر لوگ پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ ہوا بو میں بسی ہوئی اور کثیف ہے، ایونا سونے والوں کی طرف آتا ہے۔ اپنا بدن کھجاتا ہے، اور افسوس کرتا ہے، کہ ناحق اتنے سویرے گھر واپس آیا

' مزدوری سے دانے کے دام بھی نہیں نکلیں گے!' سوچتا ہے 'یہی وجہ ہے کہ میں اتنا غمگین ہوں جو اپنا کام ٹھکانے سے کرتا ہے۔۔ جسے پیٹ بھر کھانے کو میسر ہے، جس کے گھوڑے کو پیٹ بھر دانا ملتا ہے، وہ ہمیشہ چین سے رہتا ہے۔۔۔'

ایک کونے میں سے ایک نوعمر گاڑی بان اٹھتا ہے، کچھ سوتے کچھ جاگتے کھنکھارتا ہے۔ اور پانی کی بالٹی کا رخ کرتا ہے،

'کچھ پیو گے؟' ایونا پوچھتا ہے'

' معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے'

'خدا اس لائے!... بھئی، دیکھو میرا بیٹا گذر گیا.... سنتے ہو؟ اس ہفتے اسپتال
میں... عجیب معاملہ ہے..'

ایونا دیکھتا ہے کہ اُس کے لفظوں کا کیا اثر ہوا، مگر کچھ نظر نہیں آتا، نوجوان اپنا منہ لپیٹ
کر سو جاتا ہے، بڈھا آہ بھرتا ہے اور اپنا بدن کھجاتا ہے۔ جس طرح نوجوان کو پانی کی پیاس تھی
اسی طرح وہ بات چیت کا پیاسا ہے، اس کے لڑکے کو مرے عنقریب ہفتہ بھر ہو جائے گا،
اور اب تک اُسے کسی سے کھُل کر باتیں کرنے کا موقعہ نہیں ملا، وہ اس بارے میں ٹھکانے
سے جی بھر کر باتیں کرنی چاہتا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتا ہے، کہ میرا بیٹا کس طرح بیمار پڑا، اُس
نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں، مرتے دم کیا کہا، کیونکر مرا...
سنائے، اور بتائے کہ کیونکر اپنے لڑکے کے کپڑے لینے
انیسا دیہات میں رہتی ہے... وہ چاہتا ہے کہ اُس
بہت کچھ کہنا سننا ہے، جس سے وہ باتیں کرے اُسے چاہیے کہ...
اظہار کرے، اور اُس کے سوگ میں شریک ہو... اگر عورتیں بات کرنے کو مل جائیں تو
اور بھی اچھا ہو، گو وہ بے وقوف ہوتی ہیں، اور بات شروع نہیں ہوتی کہ بسورنے لگتی
ہیں'

'چلیں، گھوڑی کو ایک نظر دیکھ آئیں،' ایونا سوچتا ہے، سونے کے لئے بہت وقت
پڑا ہے... نیند کہیں نہیں گئی...'

کوٹ پہن کر گھوڑی کے تھان میں داخل ہوتا ہے، اسے دانے چارے، موسم کا
خیال آتا ہے... تنہائی میں وہ اپنے لڑکے کا خیال نہیں کر سکتا... کسی اور سے اس کا ذکر
کر سکتا ہے... مگر اُس کا خیال کرنا اور تصور باندھنا یہ اذیت اُس کی برداشت سے باہر
ہے...

'دانہ چبا رہی ہو؟' اپنی گھوڑی کی روشن آنکھیں دیکھ کر پوچھتا ہے، 'اچھا جگالی کئے

جاؤ، کٹ جاؤ ... دانے کے لئے کافی مزدوری نہیں ملی تو تم ہی، گھاس کھا کر گذارہ کر لیں گے،... ہاں ... میری عمر اب گاڑی چلانے کی نہیں رہی، اب میرا نہیں، میرے لڑکے کا کام سنبھالنے کا وقت تھا... وہ پورا گاڑی بان تھا... اسے کچھ دن اور جینا تھا.......

ایونا تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جاتا ہے، پھر کہتا ہے:

بیٹی یہ بات ہے،... کزما ایونچ چل بسا... مجھ سے رخصت ہو گیا، بلا وجہ، اچانک جان دے دی... اچھا یوں سمجھو کہ تمہارا ایک بچھیرا ہے، اور تم اس ننھے سے بچھیرے کی ماں ہو... اور یکایک وہ بچھیرا مر جائے... تو تمہیں اس کا رنج ہوگا کہ نہیں؟

گھوڑی منہ چلاتی ہے، سنتی ہے، اور اپنے مالک کے ہاتھوں پر سانس لیتی ہے، ایونا کا دل بھر آتا ہے، اور وہ اس کے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے،

(از چیخوف مترجمہ خواجہ منظور حسین صاحب)

تنقید و تبصرہ

کتب

یورپ میں دکھنی مخطوطات | مولفہ سید نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ تقطیع ۲۶ x ۲۰ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ضخامت ۱۲ ۲ صفحات قیمت غیر مجلد فی نسخہ للعہ مجلد صہ مولف سے تلجا گوڑہ ترپ بازار حیدرآباد دکن کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں ان دکھنی قلمی نسخوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جو انگلستان۔ اسکاٹ لینڈ اور پیرس کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ دکھنی مصنفیں کے حالات اور ان کے کلام کے نمونوں کے ساتھ متفرق اردو اور فارسی نسخوں

جن کتابوں اور مصنفوں کی نسبت اس کتاب

زبان کے قدیم ترین کارنامے اور اساتذہ ہیں جن سے

اردو زبان کی تاریخ میں یہ کتاب نہایت اہم ہے۔ اور

کی دوسری کتابوں کی طرح اردو زبان کی تنقیدی و تحقیقی کارناموں میں ایک بےنظیر کارنامہ ہے۔ کیونکہ جب تک اس سے مدد نہ لی جائیگی۔ کوئی تاریخ اردو زبان کی مکمل نہ ہوسکیگی۔

قانون وقف علی الاولاد | مصنفہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب حنیفی ایڈوکیٹ میرٹھ حجم ۵۲ صفحہ تقطیع ۲۶ x ۲۰ لکھائی چھپائی کاغذ معمولی۔ قیمت فی نسخہ ۸ مولف سے مل سکتی ہے۔

یہ قانون جو مسلمانوں کی جائدادوں کی حفاظت کے لئے وضع ہوا ہے۔ اور ان کے لئے بیحد مفید ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک عام طور پر اہل اسلام اس سے غافل ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے اس کو صاف اور سلیس اردو زبان میں لکھدیا ہے تاکہ مسلمان اس کو دیکھیں۔ اور اس سے نفع اٹھاسکیں۔ ہر صاحب جائداد مسلم کو چاہیئے کہ

اس کا مطالعہ کرے اور اس پر عمل درآمد کرکے اپنی ملکیت کو اپنی اولاد کے لئے محفوظ کر جائے

ریحان حمید | دیوان فارسی جناب مولوی حمید الزماں صاحب حمید شاہجہاں پوری تقطیع ۲۲×۲۰ حجم پانچ جزو۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ درجہ کا۔ قیمت درج نہیں مطبع آگرہ اخبار سے شائع ہوا۔

مولوی حمید الزماں صاحب کو فارسی زبان سے ذوق ہے۔ اور وہ اکثر غزلیں یا قطعات لکھتے ہیں۔ کبھی کبھی اردو میں بھی زمزمہ سنجی کرتے ہیں۔ اب انہوں نے اپنے کلام کا ایک مختصر مجموعہ مذکورہ بالا نام سے شائع کیا ہے۔ جس میں بڑا حصہ فارسی کلام کا ہے۔ اور آخر میں اردو غزلیں ہیں۔ کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان کو زبان پر قدرت ہے۔ بیان صاف ہے۔ اکثر اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ نمونتاً دو چار اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

تا سر بہ پائے آن بت گلرو نہادہ ایم ... کونین را گرفتہ بیک سو نہادہ ایم
واعظ بناز بر سر منبر لقبیل و قال ... ما سر بطاق گوشۂ ابرو نہادہ ایم

زغرور حسن دلی سر خود فراز کردن ... بہ کرشمہ از دو چشمت در فتنہ باز کردن
چہ خوش است جان جاناں بہ تسبم کہ گوئی ... بنشیں ہمی پسندم گلہ را دراز کردن

اردو کا نمونہ یہ ہے۔

سنا تھا غیر کے ہمراہ آپ آتے تھے ... یہ سنکے دل میں میری پیچ و تاب آتے تھے
عدو کے ساتھ یہیں آنے سے مدعا یہ تھا ... ہمارے دل کو دکھانے جناب آتے تھے

گلزار عثمانی | مولوی عبد القوی صاحب فانی ایم۔ اے (علیگ) معلم شعبہ فارسی و اردو لکھنو یونیورسٹی نے شہزادگان آصف جاہی کی تقریب کدخدائی پر فارسی قصائد بطور تہنیت کے

پیش کئے۔ نیز چند قصیدے ہزاگز الٹیڈ ہائی نس اعلیٰ حضرت نظام کی مدح میں بھی اس مجموعہ میں ہیں۔

یہ قصائد لسانی اور شاعرانہ دونوں خوبیوں کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے قصائد میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ مصنف نے اپنی زبان دانی کی قدرت کا تماشا دکھایا ہے کہ خاقانی سے لیکر قاآنی تک کے رنگ میں قصائد لکھے ہیں۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجہ۔ حجم ۸۴ صفحات۔

سوارِاج دین و دنیا | مصنفہ محمد شرف الدین گندی ... حیدرآباد دکن۔ تقطیع خورد۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اد...

آج جب کہ دنیا سواراج کے لئے میدان عمل ...
سے مقابلہ کر رہی ہے۔ مولوی محمد شرف الدین صاحب نے دین ...
اس چھوٹے سے رسالہ میں چند اخلاقی سبق لکھدئے ہیں۔ ممدوح کا قول یہ ہے کہ ان کے بار بار پڑھنے اور اُن پر عمل کرنے سے دونوں جہان کا سواراج مل سکتا ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے نصیحتیں اچھی منتخب کی ہیں۔ لیکن اس امر کی طرف خیال نہ فرمایا کہ حکمت اور ہے اور حکومت اور۔

بارش اور قرآن | مصنفہ طبیب علی عبدالرسول شاکر۔ تقطیع خورد۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی حجم تین جزو۔ ملنے کا پتہ نسیم سحر آنس۔ راجہ سنگر اسٹریٹ جبلپور۔ قیمت فی نسخہ ۴ر

یہ ایک مضمون ہے جس کو مصنف نے کسی رسالہ میں شائع کرایا تھا۔ پھر اس کو الگ چھاپا ہے۔ اس میں بارش کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ تبلایا گیا ہے۔ اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور موجودہ علم طبیعی کی اس کے ساتھ مطابقت دکھائی ہے۔ قرآن کی آیتوں سے یہ تبایا ہے کہ بادل کیونکر بنتے ہیں۔ اور انکی کتنی قسمیں ہوتی ہیں۔ پھر بارش کیونکر ہوتی ہے اور کتنے اقسام پر منقسم ہے نیز اس سے دنیا کو کیا کیا فائدے پہنچتے ہیں اور کن کن آیات ربانی پر استدلال ہوتا ہے

یہ رسالہ [illegible] غور و فکر اور دقت و کاوش کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں اور ہماری آرزو ہے کہ ایسی قسم کے علمی رسائل قرآن کریم سے لکھے جائیں۔ طیب علی صاحب کے آغاز کار سے ہمارے دل میں امید پیدا ہو گئی ہے۔ کہ آئندہ وہ اور ان کو دیکھ کر دوسرے طلباء قرآن اس منزل میں قدم رکھیں گے۔

انہوں نے جس خوبی سے اس رسالہ کو لکھا ہے۔ اور جس طرح اس مضمون کے متعلق آیات قرآن کا استیعاب کیا ہے۔ وہ بہت قابل داد ہے۔

مشاہدات | داؤدی بوہرہ اوقاف کے چشم دید حالات۔ نوشتہ جناب سیماب اکبرآبادی
تقطیع خورد۔ حجم چار جزو۔ قیمت فی نسخہ ۴ر
ملنے کا پتہ نسیم سحر آفس سنگر اسٹریٹ۔ جبلپور

اس رسالہ میں جناب سیماب صاحب نے بطور خود داؤدی بوہرہ اوقاف کے حالات کی تفتیش کی۔ ان کی کیفیت دیکھی۔ اور جو کچھ دیکھا۔ اس کو لکھ کر شائع کر دیا۔ انکی تحقیقات کا نتیجہ ان کے الفاظ میں یہ ہے۔ کہ داؤدی بوہرہ اوقاف کی حالت بالکل قابل اطمینان ہے انتظامات نہایت قابل اور تجربہ کار ہاتھوں میں ہیں۔ اور اوقاف کی نگرانی اور ان کی آمدنی کا جمع خرچ نہایت احتیاط سے ہوتا ہے۔

رسائل۔

مورخ | یہ رسالہ چھوٹی تقطیع پر ۴۴ صفحہ ماہوار کا مولوی سید علی اظہر صاحب عابدی کی ادارت فیض آباد سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ جس کا پہلا نمبر اپریل ۱۹۳۲ء کا تنقید کیلئے موصول ہوا ہے قیمت سالانہ ۴ر ہے۔

اس رسالہ کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یعنی خدمت تاریخ۔ چنانچہ زیر تنقید رسالہ میں تاریخی ہی مضامین ہیں۔ لیکن لکھائی چھپائی نہایت ردی اور کاغذ اس سے زیادہ مضامین بھی معمولی ہیں۔ کاش آئندہ نمبروں میں اس کی صوری و معنوی دونوں حیثیتوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

چین اور منچوریا | شنگھائی کے علاقہ میں جنگ بند ہوگئی اور بظاہر جمعیۃ اقوام کی ثالثی نے دنیا کو ایک حادثۂ عظیم سے بچا لیا۔ اگرچہ سمجھوتہ ہونے سے پہلے جو حالات پیدا ہوئے ان سب سے اس کا اظہار ہوتا تھا کہ طرفین کے دل صاف نہیں۔ چین اپنی بے بسی کی وجہ سے ایک کڑوا گھونٹ پی رہا ہے اور جاپان
کے ہٹانے کے جاتا ہے کہ منچوریا پر تو اس کا تسلط ہو ہی گیا۔ قدم قدم
ادھر منچوریا میں صورت حال کچھ اچھی نہیں۔ جاپان اور روس میں کشیدگی
چین کے دونوں سیاسی مرکزوں لویانگ اور نانکنگ کو مطلع کر دیا ہے۔
پیام بھیج دیا گیا ہے کہ اب چین ہماری طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ ... منچوریا کی جانب سے
طرف سے بھی ایک پیام جمعیۃ اقوام کو ملا ہے کہ "منچوریا کی نام نہاد خود مختار حکومت تمام و کمال جاپانی اثر میں ہے اور
اس کے کارکن آزاد اور خود مختار نہیں ہیں"۔ جدید دستور اساسی کا اعلان ہوگیا ہے جس کی رو سے تمام طاقت ڈکٹیٹر
کے ہاتھ میں ہے جسے قوم کے سامنے جواب دہ بتلایا گیا ہے۔ وزارت اس ڈکٹیٹر کے زیر فرمان ہے۔ ڈکٹیٹر اپنی
مشیر جماعت کی رائے سے تمام ایسے قوانین بھی منظور کر سکتا ہے جسے جماعت قانون ساز مسترد کر چکی ہو! پہلا جلسہ
جولائی میں ہونے والا ہے!

لیکن دستور کے اعلان نے ملک میں بدامنی کم نہیں کی کچھ بڑھا ہی دی ہے۔ ہر طرف اس نئی حکومت کی شدت سے مخالفت ہو رہی ہے اور یہ جاپانی بندوقوں کے زور پر اپنے کو قائم کئے ہوئے ہے دیکھنا ہے تا کجے!
روسی سرحد پر بھی برابر کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ جاری ہے۔ روسی وزیر خارجہ کاراخان اور جاپانی سفیر ہیروتا میں خاصی گرم گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن روس اپنے کو بہت روکے ہوئے ہے اس لئے کہ ڈر ہے کہ اس کی مخالفت میں فرانس اور انگلستان جاپان سے مل کر اسے سخت نقصان پہنچا دیں گے۔

جاپان | خود جاپان میں اس مہینہ میں وزیر اعظم انوکائی کے قتل کا حادثہ اندرونی حالات کی پیچیدگی کا مظہر ہے۔ یوں بھی یہ قتل ایک اہم واقعہ ہوتا لیکن موجودہ حالات میں اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہے کہ اس سے جاپان میں آئینی حکومت کے مستقبل کا مسئلہ وابستہ معلوم ہوتا ہے اور دوسری قوموں کے لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی جاپانی وزارت جو معاہدہ کرے وہ قابل اعتماد بھی سمجھا جا سکتا ہے یا نہیں۔ جاپان میں آئینی حکومت کے قیام کو کوئی ۴۰ سال ہوتے ہیں اس لئے یہ توقع بے جا نہیں کہ جاپانی قوم اس طرز حکومت کی عادی ہو چکی ہوگی لیکن حال میں جو صورتیں پیدا ہوئی ہیں وہ اس توقع میں شبہ کا عنصر شامل کر دیتی ہیں۔ ایک طرف سیاسیین کی کمزوری ہے اور خود غرضی دوسری طرف فوجی جماعت کا غرور ہے اور بے صبری۔ اور اندیشہ ہے اس کشاکش میں جاپان کا نظام حکومت درہم برہم نہ ہو جائے۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جب واکت سکی کی وزارت ختم ہوئی تو گویا اکثریت کی حکومت کو ایک ضرب کاری لگی۔ اس لئے کہ ملک کے سیاسی طرز عمل میں تبدیلی پیدا ہو۔ منچوریا پر حملہ کے معاملہ میں بھی فوجی گروہ نے بہت کچھ اپنی مرضی پر کام کیا۔ شنگھائی کا معرکہ جس میں بحری و بری افواج کی بڑی تعداد ملک سے باہر بھیجی گئی وہ جب شروع ہوا ہے تو اس سے پہلے اس کا ذکر بھی جاپانی پارلیمنٹ میں نہ ہوا تھا! جب مصارف کی منظوری کا مسئلہ پارلیمنٹ کے سامنے آیا تو ہر رکن نظر تخیل سے اپنی پیشانی کے سامنے ایک پھریرا اور دیکھتا تھا اور ظاہر ہے کہ کم لوگ اس حال میں آزادی سے رائے دے سکتے ہیں۔ چنانچہ مصارف منظور کر دئے گئے۔ ایوان خاص کے ایک معزز رکن ڈاکٹر نی توبے نے کہیں کہہ دیا تھا کہ "یہ فوجی جتھے اور اشتراکی جماعتیں قوم کو تباہ کئے ڈالتی ہیں" تو انھیں سخت بیماری کی حالت میں ہسپتال سے نکال کر معافی منگوائی گئی۔ سب کو معلوم تھا کہ سابقہ وزیر مال انوئیے اور بیرن تاکوماوان کے قاتلوں کو پستول مشہور بحری کمانڈر فوجی نے دئے تھے جو خود بعد کو شنگھائی کے معرکہ میں کام آیا۔ غرض چار طرف "وطن دوست" جماعتوں کا دور دورہ ہے جو قوم کی اصلاح بالجبر کے درپے ہیں اور جن کا کام یہ فہرستیں بنانا ہے کہ کس کس ممتاز شخص کو جلد سے جلد گولی کا نشانہ بنایا جائے تاکہ قوم ترقی کرے! ان فہرستوں میں جاپان کے تقریباً سب مشہور مدبر شامل ہیں!

جاپان میں یہ چیز بالکل نئی ہے۔ جاپانی سیاسی جماعتیں پہلے بھی لڑتی تھیں لیکن جب کوئی فیصلہ ہو جاتا تھا تو شاہی منظوری اسے مقدس بنا دیتی تھی اور ہر جاپانی اسے اپنا فیصلہ جانتا تھا۔ اور یہ چیز جاپانیوں کے لئے بہ حیثیت قوم بڑی قوت کا باعث تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کی گوناگوں مشکلات کے بارے اس

روایت کو ختم کر دیا ہے۔ اور وزیر اعظم انوکائی کا قتل اس کے خاتمہ کا اعلان ہے۔ اس خاتمہ کی ذمہ داری
اشتراکی اور فوجی جماعتوں کے سر پر ہے۔ اشتراکیوں کو تو حکومت دبا لیتی تھی، مگر فوجی اور بحری حلقوں میں بیداری
کی اس کمی کا علاج حکومت کے پاس کیا ہے؟ سیاست میں فوج کا طرفدار ہونا اور فوجی قائدوں کا سیاسی
جتھوں سے وابستہ ہو جانا پہلے بھی سلطنتوں کو تباہ کر چکا ہے۔ سلطنت روما یوں ہی ہوا۔ چین کی قوت اسی
سے منتشر ہوئی، کیا جاپانی سپاہی بھی قوم کے خادم ہونے کی جگہ اس کا آقا بننے کی ہوس میں جاپانی عظمت
کے اختتام کا آغاز کر رہا ہے!

فرانس اپنا سالانہ میزانیہ منظور کرنے کے بعد فرانسیسی پارلیمنٹ
کی توجہ تمام تر عام انتخابات کی جانب ہو گئی تھی۔ انتخابات پہلی ا
یں انتخاب کا طریقہ یہ ہے کہ ملک کو انتخابی حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا۔
پہلے انتخاب میں اس شخص کو منتخب شدہ سمجھتے ہیں جو اپنے دوسرے
حاصل کی ہوں۔ جن حلقوں میں کوئی شخص اتنی رائیں نہیں پاتا وہاں پھر انتخاب ہوتا ہے ... اکثریت
انتخاب کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔

انتخاب سے پہلے فروری میں ایوان عام (چیمبر) میں طریقۂ انتخاب میں ترمیم کی تجویز منظور ہوئی تھی
جس کی رو سے دوسرا انتخاب غیر ضروری قرار دیا گیا اور عورتوں کو حق انتخاب دینے کی تجویز تھی۔ دیکھیں عجیب
بات ہے کہ دنیا کی سب سے قدیم جمہوریت میں آج تک عورتوں کو رائے دینے کا حق نہیں ہے! لیکن
ایوان خاص (سینٹ) نے تقریباً بیک آواز اسے مسترد کر دیا۔ جب یہ تجویز دوبارہ چیمبر میں آئی (۷ مارچ کو)
تو عام انتخابات سر پر آ چکے تھے اس لئے چیمبر نے اپنے فروری والے فیصلہ کو واپس لے لیا۔

دوسرا انتخاب ۸ مئی کو ہونے والا تھا اور ۶ مئی کو ایک پاگل روسی ڈاکٹر نے صدر جمہوریہ، موسیو
دومے، کو کئی گولیوں کا نشانہ بنایا اور وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ روس میں ذہنی کام کرنے والوں
کے ساتھ عموماً اور موجودہ نظام حکومت کے مخالفوں کے ساتھ خصوصاً جو بدسلوکی روا رکھی جاتی ہے اس نے
ان گنتی روسیوں کو پردیس میں ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ پاگل ڈاکٹر بھی انھیں مہاجرین میں سے ہے
جن کے ساتھ فرانس نے حتی الوسع اچھا سلوک کیا ہے! مگر یہ اپنے دل کی بے چینی کو کیا کرتا، اپنے ملک کی

سیاسی حالت جس نے گھر چھٹایا اس کے بدلنے سے بدل نہ سکتی تھی، ناکامی پر غصہ تھا، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی طرح ساری فرانسیسی قوم کو بھی غصہ کیوں نہیں اور وہ اس کی خاطر روس پر حملہ آور کیوں نہیں ہو جاتی، چنانچہ اس کے نزدیک وہ بھی اسی قدر نفرت کی مستحق قرار پائی تھی جتنی کہ روس کی موجودہ حکومت۔ بس کیا تھا، موقع ملا اور اس نے اس حکومت کے صدر کو قتل کر دیا۔ اس پر نہ تعجب ضروری ہے نہ اس سے نفرت کہ جنون کی منطق ہی جدا ہے!

اس واقعہ نے یوں تو چند روز کے لئے فرانس کو ماتم کدہ بنا دیا لیکن انتخابات پر اس کا ذرا اثر نہ پڑا۔ اس لئے کہ قاتل پردیسی تھا اور ملک کی کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ سینٹ کے صدر موسیو لوبرون جو اعتدال پسند سیاسی ہیں اور اپنی اصابت رائے کے لئے بہت مشہور ہیں، صدر جمہوریہ منتخب ہو گئے۔

عام انتخابات میں پچھلے ایوان عام کی مخالف جماعتوں کو زیادہ کامیابی ہوئی۔ پچھلے ایوان میں قدامت پسند جماعتوں کی اکثریت تھی۔ اس مرتبہ Radical Socialist اور اشتراکی جماعتوں کے نمائندے بڑھ گئے ہیں۔ مخالف جماعتوں کے پاس انتخاب کے معرکہ میں یہ حربے تھے کہ موجودہ حکومت پر ملک کے معاشی مصائب کی ذمہ داری ہے، بجٹ کی تمام دشواریاں انھیں نے پیدا کیں، بعض بنکوں کو بچانے کے لئے بہت بڑی بڑی رقمیں صرف کی گئیں، بہت سے شخصی کاروبار کرنے والوں کو خطیر رقمیں دی گئیں اور جنوبی مشرقی یورپ کی دیوالیہ قوموں پر نہ جانے کتنا کچھ صرف کیا گیا، تخفیف اسلحہ کی تجاویز کی حمایت حکومت نے دل سے نہیں کی۔ اور بریاں نے دول یورپ میں باہمی تعاون اور اتحاد کی جو کوششیں کی تھیں انھیں بھی حکومت نے اچھی طرح پنپنے نہ دیا۔

جنوب مشرقی یورپ کا معاشی اتحاد | قوم پرستی کی تنگ تعبیر نے یورپ کی معاشی زندگی کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کی تدبیریں برابر سوچی جا رہی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا جرمنی اور آسٹریا میں اتحاد معاشی کی تجویز نہایت زور سے اٹھی تھی لیکن فرانس کے سیاسی دباؤ نے اسے روبراہ نہ آنے دیا۔ اب ساحل ڈنیوب والی ریاستوں میں اتحاد معاشی کی تجویز پیش ہے۔ اس تجویز کا آغاز تو انگلستان میں کوئی تین مہینے پہلے ہوا تھا، مگر اسے فوراً فرانس نے اپنا لیا۔ فرانس اور انگلستان کی طرف سے تجویز یہ تھی کہ چکوسلوواکیا، آسٹریا، ہنگری، رومانیا اور یوگوسلاویا اپنے آپس کے محاصل درآمد میں ۱۰ فی صدی کی کمی کر دیں، دوسرے ممالک کو جو مخصوص جدا جدا حقوق حاصل

ہیں وہ ان سے دست کش ہو جائیں اور ان کے مال پر جو درآمد کے محاصل لگا رکھے ہیں ان میں اب مزید اضافہ نہ کریں۔ ان ممالک کی زرعی پیداوار پر جو محاصل درآمد دوسرے ممالک میں ہیں ان میں کمی کر دی جائے اور فوری ضروریات کے لئے ان ممالک کو کوئی ۱۰ کروڑ روپیہ کا قرضہ دیا جائے۔ اور اس قرض کے ضامن انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی ہوں۔ جرمن اور اطالوی نمائندوں نے اس تدبیر کو مطلق پسند نہ کیا کہ ان کے نزدیک اس سے ڈینیوبی ممالک کی بھی کچھ مدد نہ ہو سکے گی اور خود ان کے ملکوں کو غیر ضروری معاشی مشکلات میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ یہ دونوں قومیں اس تجویز کی زیادہ حامی اس لئے بھی نہیں کہ یہ صاف طور پر ان مشرقی ممالک میں فرانسیسی اثر کو مستحکم کرنے کی ایک اور تدبیر ہے جس پر عمل اس لیے آسان ہوگا کہ ان کا بیشتر حصہ اکثر مالی اعتبار سے پہلے ہی سے فرانس کے دست نگر ہیں۔ فرانس اور اٹلی کے علاوہ پولینڈ کے اتحاد یات بھی اس تجویز کی کم و بیش مخالفت ہی کر رہے ہیں اور اس پر تو ...
قائم ہی ہو تو اس میں پولینڈ کی شرکت ضروری ہے۔

غرض فرانس کی خود غرضی اور دوسری دول کی رقا
مگر صورت حال ایسی ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکالنا لازمی ہے ... اس سے ...
ریاستوں کو ادا کرنی پڑی ہے اس کا بوجھ اب اٹھائے نہیں اٹھتا۔ جنگ سے پہلے آسٹریا ہنگری کی سلطنت اگرچہ نسلی اور لسانی اعتبار سے مختلف اور متضاد عناصر سے مرکب تھی اور اس لئے سیاسی رقابتوں کا جولانگاہ تھی مگر معاشی خوشحالی کی ضامن بھی تھی۔ سلطنت کے زراعتی اور صنعتی علاقوں میں خوب تبادلۂ اجناس ہوتا تھا اور اندرونی تجارت ہی خوشحالی قائم رکھنے کے لئے کافی تھی۔ اب جو نئی ریاستیں بنیں وہ سب اپنی سیاسی آزادی کے ساتھ معاشی خود مختاری کی بھی خواہاں ہیں۔ قوم پرستی کا بھوت سب کے سر پر سوار ہے اور یہ زرخیز اور خاصا ترقی یافتہ صنعتی علاقہ فلاکت و افلاس سے دوچار ہے۔ آسٹریا اور چیکوسلوواکیا کی صنعتی پیداوار ہنگری میں نہیں جا سکتی اور ہنگری کا غلہ آسٹریا میں نہیں آ سکتا اور یہ ملک جو پہلے آپس میں خوب لین دین کرتے تھے اب بس یورپ کے دوسرے ممالک سے تجارت پر مجبور رہیں اور یہ تجارت اتنی نہیں کہ ان کے مال کی نکاسی ہو سکے۔

ہر چند کہ اس وقت اس اتحاد معاشی کی تجویز ملتوی ہو گئی ہے لیکن یقین ہے کہ معاشی دشواریاں پھر مسئلہ کو سامنے لائیں گی، اور شاید اتحاد یورپ کا وہ خواب جو چند مغربی مفکرین نے سیاست کے ہنگاموں

سے وجود کیا تھا اور جب برطانیہ نے اپنا کر ذمہ دار سیاست کا جزو بنا دیا ان منصوبوں میں اپنی تعبیر پائے اور یورپ تنگ نظر قوم پرستی کے نقصانات سے تنگ آکر اپنے نظام سیاسی و معاشی میں ترمیم کی طرف متوجہ ہو۔

اسلامی ممالک

افغانستان انگریزوں کی نظر میں | ایک انگریز نامہ نگار لکھتا ہے:۔

"تاجدار افغانستان کی یہ کوشش ہے کہ وہ شاہ معزول کی قائم کردہ بنیادوں پر ایک مضبوط عمارت تیار کریں۔ افغانستان میں درانی حکومت کی ابتدا ہوئے کم و بیش ایک صدی گزر چکی ہے۔ اسی اثنا میں اکثر خونریزیاں ہوتی رہیں چنانچہ ابھی تک ملک میں انقلاب سنہ ۱۹۲۹ء کے آثار باقی ہیں۔

بایں ہمہ اگر افغانستان کو دنیا میں عزت کی زندگی بسر کرنا ہے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ موجودہ صورت حالات کو یکسر بدل ڈالے۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک جاہل اور غیر متمدن قوم اعلیٰ درجے کی مہذب اور تعلیمیافتہ قوموں کے درمیان آزادانہ حیثیت اختیار کر سکے۔ افغانستان کی آبادی شاید ایک کروڑ ہوگی۔ جنوب اور مشرق میں پٹھان اور افغان بستے ہیں، وسط میں تاتاری اور ہزارا قبائل، مغرب میں ایک قلیل آبادی ایرانیوں کی ہے اور شمال میں حدود روس تک تاجیک ازبک اور مختلف ترکی عناصر آباد ہیں۔ ان لوگوں میں اتحاد و اتفاق کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے۔ ہزارا قبائل اور درانی پشتہا پشت سے ایک دوسرے کے دشمن چلے آتے ہیں۔ ترکی عناصر کسی خارجی دباؤ یا اثر کو پسند نہیں کرتے اور تاجیک جو نسبتاً زیادہ امن پسند ہیں افغانوں کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

اس وقت افغانستان میں ستر ہزار قواعد داں سپاہی ہیں لیکن ان کی جنگی صلاحیات کم و بیش مختلف ہیں۔ اگر نظم و انضباط پر زور دیا جائے تو پٹھان نہایت اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ محکمۂ پولیس اگرچہ ایک ایسے افسر کی زیر نگرانی ہے جو اسکاٹ لینڈ یارڈ کا تربیت یافتہ ہے لیکن

اس حملہ کا اثر زیادہ تر شہروں تک محدود ہے۔ دیہات میں
لوگوں کے تعلقات آپس میں خوشگوار ہیں اور نقص امن کے احتمالات بہت کم۔

اگر افغانستان میں آبپاشی کا معقول انتظام ہو جائے تو زرعی پیداوار میں بہت کافی اضافہ
ہو سکتا ہے۔ قندھار کے قرب وجوار میں اعلیٰ درجہ کا گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ حکومت کی طرف سے
گیہوں اور پھلوں کی کاشت کے لئے اکثر اضلاع میں "مزرعے" یعنی ایگریکلچر فارم بنا دیے گئے
ہیں۔ مصر اور امریکہ سے کپاس کا بیج حاصل کیا گیا ہے اونی مصنوعات
ملک کے محتاج نہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ کپاس کی کاشت سے
سے سوتی کپڑے منگوانے کی ضرورت باقی رہے۔
شروع کر دیے ہیں لیکن ان کی نسل کشی کے لئے
افغانستان میں پالتو جانور کچھ بہت اچھی قسم کے نہیں۔

اس وقت افغانستان میں کپاس، تمباکو، تیل کے
ہوتی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ ایکڑ پر آبپاشی کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے
یا کچھ نہریں ہیں۔ ہزارا قبائل زمین دوز نالوں کی تیاری میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ یہی
حال ان ایرانیوں کا ہے جو وادی ہلمند اور قندھار میں آباد ہیں۔ افغان زیادہ تر خانہ بدوش
ہیں۔ ان کے ایک تہائی حصے کا مستقل قیام کسی علاقے میں نہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر وسائل
آبپاشی کو وسعت دی جا سکے تو بہ نسبت اس وقت کے تین حصے زائد زمین کاشت کے
قابل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ تاجدار افغانستان آبپاشی کی ایک بہت بڑی اسکیم پر غور کر رہے ہیں۔

افغان کاشتکار وہی پرانا ہل استعمال کرتا ہے جو ابدالاباد سے اس کے ملک میں رائج
ہے۔ اس کا کام کھالوں کا بیچنا اور کپاس، نمک اور کپڑا خریدنا ہے۔ قرض کی ضرورت ہو تو
اس کے لئے کسی سنی مسلمان، شیعہ ایرانی، ارمنی عیسائی، یہودی یا ہندو کے ہاں پہنچتا ہے۔
قحط سالی سے اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچتا۔ اول تو افغانستان میں قحط سالی ہوتی بہت کم
ہے اور ہو بھی تو خانہ بدوش قبائل کو اس سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ ٹیکسوں کو اس نے کبھی
پسند نہیں کیا۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ حکومت صرف پیداوار کے ½ یا ⅓ حصے کی مستحق ہے۔

افغانوں پر جدید خیالات کا مطلق اثر نہیں۔ صرف دو ایک شہر ہیں جن میں سینما موجود ہیں۔ ریڈیو بھی صرف اہل شہر تک محدود ہے۔ سوائے قرآن خوانی کے تقریباً تمام آبادی ان پڑھ ہے۔ عام عورتیں اگرچہ بے نقاب رہتی ہیں لیکن ان کا مردوں سے مطلق میل جول نہیں۔ دیہات میں اخبار کبھی نہیں پہنچتے اور اول تو شہروں میں بھی اخبارات کا وجود کس گنتی میں ہے۔ یونہی کبھی دیہات میں شہر کی کوئی خبر پہونچ جاتی ہے۔ دیہاتیوں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مجلس ملی کے لئے اپنا نمائندہ چن لیں۔ تعلیم سے ان کو کوئی رغبت نہیں۔ مدارس سے صرف تاجر یا زمیندار فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اہل دیہات صرف اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب ملا ان سے یہ کہتے ہیں کہ مذہب خطرے میں ہے مثلاً امان اللہ خاں نے فرنگی ٹوپی کیوں پہنی یا قادیانیوں کو سنگسار کردیا گیا تو بہت اچھا کیا۔

اہل دیہات کا مطمح نظر صرف اس وقت بدل سکتا ہے جب ملک میں ہر طرف ریلیں اور سڑکیں پھیل جائیں۔ فضائی آمد و رفت عام ہو جائے۔ ہر طرف امن و امان قائم ہو۔ لوگ قانون کا احترام کریں۔ حکومت باقاعدہ اور منظم ہو لیکن اس کے لئے ٹیکسوں میں اضافہ کرنا ناگزیر ہوگا اور ٹیکس افغانستان میں نہایت ناپسند کئے جاتے ہیں۔ افغانستان کی حکومت کوئی پھولوں کی سیج نہیں۔ تاجدار افغانستان کا راستہ مشکلات سے پر ہے لیکن اعلیحضرت نادر شاہ غازی ایک نہایت ہی محتاط اور مدبر حاکم ہیں اور وہ جو قدم اُٹھاتے ہیں سوچ سمجھ کر اُٹھاتے ہیں۔

اتحاد عراق و ایران | پچھلے مہینے شاہ فیصل ایران تشریف لے گئے جہاں ان کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا گیا۔ طہران میں دعوتوں اور استقبالوں کی بھرمار تھی۔ شاہ فیصل قم کی زیارت کرتے ہوئے سلطان آباد آئے اور وہاں سے ہر مئی کو محمرہ پہنچے البتہ نوری پاشا براہ راست اسی روز بغداد پہنچ گئے۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا تھا شاہ عراق کا مقصود اس سفر سے یہ تھا کہ دولت ایران و عراق میں دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ عراق اور ایران کی ایک دوسرے سے کشیدگی کی بڑی وجہ کردی قبائل کی نقل و حرکت تھی جو بین الاقوامی ذمہ داریوں کا خیال کئے بغیر اپنی آزادی اور سرکشی کی دھن میں عراق سے ایران اور ایران سے عراق کی سرحد میں چلے آتے تھے۔ اس صورت حالات میں اگرچہ

کوئی معتدبہ تغیر نہیں ہوا لیکن بایں ہمہ سیاسی حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ ایران و عراق کے تمام باہمی اختلافات دور ہو گئے ہیں اور عنقریب دونوں ہمسایہ ممالک کے درمیان دوستانہ معاہدہ قائم ہو جائیگا۔ اس کے لئے جس قسم کی گفت و شنید کی ضرورت ہے اس کے لئے بغداد میں ایرانی اور عراقی نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوگی۔ عراق میں اس معاہدہ کو غیر معمولی اہمیت دی جا رہی ہے اس لئے کہ جبتک عراق کے خارجی معاملات صلح و آشتی سے طے نہیں ہو جاتے اس کا مجلس اقوام میں داخل ہونا دشوار ہے۔ چنانچہ عراق کے برطانوی ہائی کمشنر جنیوا روانہ ہو چکے ہیں تاکہ خاتمۂ انتداب کے لئے جو شرائط پیش کیجا رہی ہیں ان پر غور و خوض کریں۔ عراق اور شام کی سرحد کے تصفیے کے لئے جو کمیشن بٹھایا گیا تھا اس کی صدارت کرنل اسٹلین کے سپرد کی گئی ہے۔ صدر مذکور سوئستان کے نہایت سرگرمی سے انجام دے رہے ہیں۔

عراق کا تذکرہ ان صفحات میں اس کثرت سے

کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ابتک

کے باہمی تعلقات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل ان لوگوں کے خیالات کی تفسیری سود و ہے جنکو یہ پر اعتماد ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ جن کے نزدیک عراق کی ترقی مجلس اقوام اور انگریز یاسین کے ساتھ اشتراک و تعاون پر موقوف ہے۔ ہمیں اس مسلک پر کوئی خاص اعتراض نہیں اس لئے کہ اہل عراق اپنے مصالح کو ہم سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن ہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ امت عربیہ کی تقسیم و تفریق کا جو سلسلہ مجلس اقوام نے مشرق قریبہ میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام سے شروع کیا ہے وہ اسلام کے دینی اور تمدنی مصالح سے قطع نظر کرتے ہوئے عربوں کے سیاسی اور معاشی مفاد کے لئے بھی کسی طرح موزوں نہیں اور غالباً اسی لئے قرب و جوار کے اسلامی ممالک نے ان ریاستوں کو کسی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ جب تک ان ریاستوں میں غیر قوموں کا ہاتھ رہے گا اس کا کوئی نہ کوئی ناخوشگوار اور غیر پسندیدہ اثر ہمسایہ ممالک پر ضرور پڑے گا ثانیاً عرب اقوام کی یہ جبری تفریق ان کے باہمی اتفاق و اتحاد میں بہت بری طرح سے حائل ہے۔ محض سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تب بھی اس امر کا اقرار کرنا پڑے گا کہ ایسے علاقے پر جس کے معاشی اور سیاسی مصالح تقریباً یکساں ہیں ایک کی بجائے پانچ چھ حکومتوں کا خرچ ڈالنا دور اندیشی سے بعید ہے۔ علاوہ ازیں عراق کی حقیقی آزادی صرف اس

وقت ممکن ہے جب اس کے اقتصادی معاملات خود اس کے ہاتھ میں ہوں، سیاسیات میں اسکا طرز عمل اس کی مرضی کا پابند ہو لیکن یہ مجلس اقوام کی شرائط اور اس کی پابندیاں، یہ اقلیتوں کے حقوق و مراعات، یہ تیل کے ٹھیکے، یہ بین الاقوامی ذمہ داریاں اور یہ برطانیہ کے فضائی مستقر جب تک یہ چیزیں موجود ہیں عراق کو آزادی کا درجہ کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟ ارباب بصیرت اسکے متعلق کیا کہتے ہیں؟

حوادث فلسطین | فلسطین میں یہودیوں اور عربوں کے درمیان ایک نیا قضیہ رونما ہوا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عرب ان تمام زمینوں پر قابض ہو رہے ہیں جو یہودیوں نے ان سے خریدی تھیں۔ عربوں کا عذر یہ ہے کہ ان زمینوں کی فروخت میں بہت سے قانونی سقم باقی رہ گئے ہیں علاوہ ازیں عرب کاشتکاروں کو ان کو موروثی زمینوں سے زبردستی الگ کر دیا گیا تھا۔ اس پر فلسطین کے یہودی نہایت خفا ہیں اور ان کے نزدیک یہ ساری کارروائی صیہونی تحریک کو شکست دینے کے لئے کی جارہی ہے۔ یہودی نمایندوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عیسائیوں کے قبضے میں بہت سی زمین بالکل بے کار پڑی ہے لیکن مسلمان اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

جب یہ قضیہ عدالت عالیہ میں پیش ہوا تو جسٹس میکڈانل نے اس کے متعلق یہ فیصلہ دیا کہ اس قسم کے تمام مقدمات میں ملکیت زمین کے دعویدار مدعی اور اس زمین کے اصلی مالک مدعا علیہ تصور کئے جائیں گے۔ جسٹس میکڈانل کے اس فیصلے سے یہودی نہایت خفا ہیں۔

۱۳ مارچ ۱۹۳۲ء کو فیلیڈلفیا میں امریکہ کی صیہونی جمعیت کا ایک اجتماع ہوا جس میں صیہونی جمعیت عالم سے درخواست کی گئی کہ وہ حکومت برطانیہ کو اس بات پر مجبور کرے کہ حکومت فلسطین یہودی ایجنسی سے اشتراک عمل کرے اور یہودی تارکین وطن کو وادی اردن میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے۔ مندوبین فیلیڈلفیا نے کہا کہ ہم اپنے اس عزم کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کرتے ہیں کہ ہم اپنے عرب ہمسایوں سے ہر بات میں اشتراک و تعاون کریں گے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت فلسطین نے متوسط درجے کے یہودیوں کو مثلاً تاجروں دستکاروں اور کاشتکاروں کو فلسطین میں آباد ہونے کے لئے بہت سی سہولتیں دیدی ہیں اور اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ فلسطین میں آتے وقت ان کے پاس صرف ڈھائی ہزار ڈالر کی رقم موجود ہوتی

چاہیئے۔ عراق و فلسطین کے باشندے اس بات پر بھی سخت ناراض ہیں کہ جنگی اور محصول کے قوانین میں ان دونوں ممالک کو "خارجی" ممالک کا درجہ دیا گیا ہے حالانکہ ان دونوں ممالک میں انگریزوں کی معاشی مدوش کو دیکھتے ہوئے ان کا "خارجی" قرار دیا جانا سراسر ستم ظریفی ہے۔

عباس حلمی پاشا جنہوں نے حال ہی میں شام، فلسطین اور ترکی کا سفر کیا تھا اور جن کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ وہ تخت شام کے آرزومند ہیں اب تخت فلسطین و ماوراء اردن کے حصول کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اتحاد فلسطین و ماوراء اردن کے بعد ممکن ہے اس میں جزیرہ نمائے کنعان کا اضافہ بھی کر دیا جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومت مصر خدیو معزول کی ان سرگرمیوں سے کچھ بہت زیادہ خوش نہیں اور صدقی پاشا کے سفر فلسطین کا ایک مقصد [illegible] موصوف کی کوششوں کو بارآور نہ ہونے دیں۔

ہندوستان

وفاقی مجلس مالیات کی رپورٹ | گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس کے بعد ہندوستان میں وفاقی حکومت کے قائم کرنے کی غرض سے متعدد مجالس کا تقرر اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ وہ اس طرز کی حکومت کے لئے یہاں کے حالات پر مختلف پہلوؤں سے غور و تحقیق کے بعد رپورٹ پیش کریں تاکہ انھی کی روشنی میں اس جدید حکومت کی داغ بیل ڈالی جائے چنانچہ ایک مجلس یہاں کی مالیاتی حالت کی تحقیقات کے لئے لارڈ پ..ی کی صدارت میں مقرر کی گئی تھی جس نے مہینوں کی محنت و کوشش کے بعد اب اپنی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس مجلس کے دوسرے ارکین میں سر لوئی کیرشا، سر اکبر حیدری، کرنل ہاسکر، مسٹر رابنسن اور مسٹر سندرم تھے۔

مجلس مذکور نے اپنی سفارشات اس تمہید کے ساتھ پیش کی ہیں کہ موجودہ معاشی حالات کی خرابی زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہے گی اور بہت جلد تجارتی حالات اپنے اصلی رنگ پر آجائیں گے اور اشیاء کا نرخ اگر بالکل بدستور سابق نہ ہو جائے گا، پھر بھی موجودہ شرح سے کہیں زیادہ بڑھ جائے گا۔ اس بنا پر وفاقی حکومت کی آمد و خرچ کا آئندہ جو نقشہ ہوگا وہ مطابق ذیل ہوگا:-

آمدنی		خرچ	
محاصل	۵۰۳۰ ۰۰ ۰۰۰	سود	۱۱۲۵ ۰۰ ۰۰۰
نمک	۵۵۵ ۰۰ ۰۰۰	ضائع شدہ	۶۵۰ ۰۰ ۰۰۰
افیون	۵۰ ۰۰ ۰۰۰	فوج	۴۷۰۰ ۰۰ ۰۰۰
ریلوے	۵۰۰ ۰۰ ۰۰۰	سرحدی حفاظت	۱۷۰ ۰۰ ۰۰۰
ٹکسال	۳۸۰ ۰۰ ۰۰۰	انتظامات ملکی	۶۸۵ ۰۰ ۰۰۰
متفرق	۱۹۶ ۰۰ ۰۰۰	پنشنیں	۲۶۵ ۰۰ ۰۰۰
صوبوں سے امداد	۷۴ ۰۰ ۰۰۰	صوبہ سرحد	۱۰۰ ۰۰ ۰۰۰
انکم ٹیکس	۱۷۲۰ ۰۰ ۰۰۰	انتظامی امور	۱۶۰ ۰۰ ۰۰۰
		صوبجات ماتحت چیف کمشنر	۱۵۵ ۰۰ ۰۰۰
کل میزان	۸۴۶۰ ۰۰ ۰۰۰	کل میزان	۸۰۱۰ ۰۰ ۰۰۰

اس حساب سے کل بچت وفاقی حکومت کے خزانہ میں ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ کی ہوگی۔

اب اس کے بعد دوسرا کام مجلس مذکور کا یہ تھا کہ وہ صوبوں کی مالیاتی حالت کا اندازہ کرے اور اس غرض سے اس نے سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء تک کے جو میزانیے تھے، ان پر قیاس کرکے ہر صوبہ کی مالیاتی حیثیت کا جو نقشہ تیار کیا ہے، وہ حسب ذیل ہے۔ ثبت کی علامت (+) سے بچت اور منفی کی علامت (-) سے خسارہ مراد ہے۔

نام صوبہ	رقم
۱۔ مدراس	- ۲۰ لاکھ
۲۔ بمبئی	- ۶۵ ″
۳۔ بنگال	- ۲ کروڑ
۴۔ صوبہ متحدہ	+ ۲۵ لاکھ
۵۔ پنجاب	+ ۳۰ ″
۶۔ بہار و اڑیسہ	- ۷۰ ″

نام صوبہ	رقم
۹۔ صوبہ متوسط	۱۰ - لاکھ
۱۰۔ آسام	۴۵ - "

صوبوں کے اس مالیاتی نقشہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وفاقی حکومت کی شرکت میں انھیں ابتداءً سخت مشکلات کا سامنا ہوگا اور اگر انھوں نے اس عرصہ میں اپنے نقصانات کو پورا کرنے کی کوشش نہ کی تو ان کی صوبجاتی خودمختاری بہت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ لیکن بعض حالات کی بنا پر یہ توقع ہوتی ہے کہ اگر انھوں نے بعض مدات خرچ میں تخفیف سے کام لیا یا آمدنی کے نئے ذرائع نکالنے کی فکر کی تو ان کی مشکلات بہت حد تک رفع ہو جائیں گی مثلاً بمبئی سے صوبہ سندھ کے علیحدہ ہو جانے کی صو [illegible]

[illegible] ...لاکھ کے درمیان بچت ہوگی، اسی طرح صوبہ بہار و اڑیسہ بھی

تخفیف کرنے کے بعد اپنی اس کمی کو پورا کرلے گا جیسا کہ ۹۳۲

اس کے علاوہ مجلس مذکور نے صوبوں کے لئے کچھ

ایک تمباکو، دیاسلائی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں پر محصول کے اضافہ کی [illegible]

کے متعلق بھی تصفیے کئے ہیں کہ کون کون سے قرضے وفاقی حکومت ادا کرے گی اور کون کون سے صوبوں کے ذمہ رہیں گے۔ پھر وفاقی حکومت اور صوبجاتی حکومتوں کے درمیان تعلقات کیسے رہیں گے جن کا دارومدار زیادہ تر تین مسائل پر ہے۔ (۱) ریاستوں کے ساتھ سمجھوتہ (۲) سندھ کی علیحدگی اور (۳) وفاقی نظام حکومت کے قیام سے مزید اخراجات کی صورت۔ اول الذکر ہر دو مسائل کے متعلق تو علیحدہ علیحدہ مجلسیں مقرر کی گئی ہیں لیکن موخرالذکر کے لئے مجلس مذکور نے صاف طور پر یہ سفارش کی ہے کہ آیندہ نظام حکومت کے قیام میں بہت کم سے کم اخراجات ہونے چاہئیں۔ ہندوستان جیسے ایک زراعتی ملک کے لئے موجودہ نظام حکومت خود ایک بہت بڑا گراں قیمت نظام ہے۔ انتظامات ملکی سے متعلق جتنی مدات ہیں، ان کے اخراجات میں زیادہ سے زیادہ کمی کرنی چاہیئے۔

سب سے آخر میں مجلس مذکور نے محصول لگانے کے اختیارات سے بحث کی ہے، جس کا اختیار صرف وفاقی حکومت کے ہاتھ میں رکھا ہے اور اس کی تین صورتیں تجویز کی ہیں۔ (۱) وہ ذرائع جو وفاقی حکومت کے ساتھ مخصوص ہوں گے مثلاً معدنیات، جنگلات، ریلوے، ڈاک اور تار وغیرہ وغیرہ (۲) محصول آبکاری،

مثلاً منشیات و مسکرات کی اشیاء اور نمک وغیرہ (۳) وہ محصول جن سے صوبوں کو فائدہ پہونچتا ہو۔ صوبوں کو صرف آخری صورت میں محصول لگانے کا اختیار دیا گیا ہے اور وہ بھی وفاقی حکومت کی اجازت سے۔ اسی طرح قرضے لینے کے متعلق بھی صوبوں کو اختیار ہے لیکن مرکزی حکومت کی اطلاع اور اجازت سے۔

یہ جو کچھ ہے کاغذ کے صفحات پر ہے لیکن اس پر عمل درآمد کب سے ہوتا ہے اور عمل کی صورت میں کیا کیا مشکلات پیش آئیں گی اس کے لئے ابھی ہندوستان کو اور انتظار کرنا ہے۔

گلینسی کمیشن اور برادران وطن کا احتجاج تقریباً ایک سال ہوتا ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر کی مسلمان رعایا اپنے والی سے اپنے جائز اور ناقابل انکار حقوق کا مطالبہ کر رہی ہے اور اس سلسلہ میں اس نے ہر وہ قربانی کی ہے جو ایک آزادی پسند جماعت کر سکتی ہے' اگرچہ اس آزادی کی قیمت زیادہ تر ریاست کے حدود سے باہر برطانوی علاقہ میں ادا کی گئی ہے اور آج مجلس احرار کے کوئی تیس پینتیس ہزار ارکان جیل کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ اس تمام مظاہرے اور شورش کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی طرف سے مسٹر گلینسی کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر ہوا جو ان کی شکایات کی تحقیقات کر کے ایک رپورٹ پیش کرے اور پھر اس رپورٹ کی سفارشات پر حکومت کشمیر عمل درآمد کرے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کمیشن نے اپنا کام ختم کیا اور رپورٹ شائع ہوئی جس میں ریاست کے قوانین میں کچھ عام اصلاحات کے ساتھ مسلمانوں کو بعض حقوق بھی دے گئے ہیں' مثلاً عام اصلاحات کے سلسلہ میں جیل کے قوانین میں یہ ترمیم کی گئی ہے کہ قیدیوں کی اب سے دو قسمیں ہوں گی' ایک معمولی جو عام جرائم کے مرتکب ہوں گے اور جن کے ساتھ کوئی رعایت نہ ہوگی۔ اور دوسرے خاص' جن کے لباس و طعام اور دوسرے معاملات میں عام قیدیوں کے مقابلہ میں کچھ رعایتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں' مثلاً انہیں جیل کا عام کپڑا اور کھانا نہیں ملے گا بلکہ ان کے لئے اس کا مخصوص انتظام ہوگا' وہ ہتکڑیوں سے بجز حالات خاص کے مستثنےٰ ہوں گے۔

اسی طرح ریاست کے قانون مطابع میں بھی کچھ ترمیم کی گئی ہے اور اس کے ذریعے سے حکومت کے اختیارات میں اضافہ اور اظہار رائے و خیال کی آزادی میں بہت کمی کر دی گئی ہے۔ پہلے کوئی شخص پریس قائم کرنا چاہتا تو اس کے لئے صرف ۵۰۰ کی ضمانت داخل کرنی اور مہاراجہ سے اجازت لینی کافی تھی۔ اب ایک ہزار کی ضمانت لی جائے گی اور اجازت کے تمام اختیارات وزیراعظم کو حاصل ہوں گے۔ نفرت کے جذبات پھیلانے' کسی کو کسی کے قتل پر آمادہ کرنے اور اسی قسم کے دوسرے ارتکاب جرم پر وہ ضمانت فوراً ضبط کر لی جائے گی اور

پھر وہی ضمانت ایک ہزار سے دس ہزار کے درمیان لی جائے گی۔

لیکن ان سب سے زیادہ اہم اور ضروری کمیشن کی وہ سفارشات ہیں جو اس نے یہاں کے سواد اعظم حصہ آبادی کے متعلق کی ہیں اور ان کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے اس میں سب سے بڑی چیز ایک انتخابی مجلس کی بنیاد ہے، جو کل ۷۵ ارکان پر مشتمل ہوگی۔ ان ارکین کا تناسب سر دست یہ ہوگا۔ مسلمان ۲۳، ہندو ۷، سکھ ۱، وزرا اور عمال کے نمائندے ۱۹، غیر سرکاری نامزد ارکان ۵۔ اور اس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں، تعلیمی وظیفوں اور دوسرے معاملات میں مسلمانوں کی تعداد کو کچھ بڑھا دیا گیا ہے تو اب بھی ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں کم ہے۔

بہرحال، اس رپورٹ کا شائع ہونا تھا کہ برادران وطن

ہنگاموں کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ ڈاکٹر مونجے نے جو مسلمانوں

کے صدر بھی ہیں فوراً ایک تار دیا کہ کمیشن کی سفارشات پر عمل

نہ مہاسبھا کے نمائندوں سے ملاقات نہ کر لی جائے، سکھوں نے

ہیں، ۷۵ میں سے سکھوں کو صرف ایک نشست دی گئی ہے، حالانکہ انھیں اس سے زیادہ بھی ملنا چاہیے۔ ریاست کشمیر کے ہندو پنڈتوں کی جماعت نے جو ریاست کے اندر سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور اثر و اقتدار رکھنے والی جماعت ہے، شورش اور ہنگامے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا اور ہر کشمیری پنڈت کی زبان سے یہ شور و پکار کی آواز اُٹھنے لگی کہ ہم نمک خواران سلطنت قدیم سے حکومت کے دامن سے وابستہ چلے آتے ہیں مسلمانوں کو ملازمتوں کے اندر مزید حقوق دینے سے ہم کاسہ لیسان سلطنت کا کوئی اور ذریعۂ معاش نہ رہے گا اور ایک طویل درخواست گورنر کشمیر کی خدمت میں پیش کی گئی، جس میں مسلمانوں کے ساتھ مراعات کے پہلو بہ پہلو اپنے حقوق کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے۔ ان تنگ دل انسانوں سے کوئی پوچھے کہ آج جن سفارشات کو تم مراعات سے موسوم کر رہے ہو اور جن کی بنا پر تم اس قدر انگاروں پر لوٹ رہے ہو وہ دیکھو تو سہی کہ مراعات ہیں یا ان کے معمولی حقوق ہیں۔ یہ حقیقت میں تمہارے لئے اب تک مراعات کا درجہ رکھتی تھیں اس لئے کہ تم اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ فائدہ اُٹھا رہے تھے اور دوسروں کو ان سے مستفید ہونے کا موقع نہیں دیتے تھے۔

ریاست جموں اور کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی کوئی ۷۹ فی صدی ہے لیکن سرکاری ملازمتوں

یہاں ان کا تناسب صفر کے برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تعلیم میں بہت پیچھے ہیں اور کشمیری پنڈت جو تعلیم سے بہرہ ور ہیں قدرتاً تمام سرکاری عہدوں اور ملازمتوں پر حاوی ہیں۔ مسلمانوں کے تعلیم میں پیچھے رہنے کے اسباب میں ایک بڑا سبب ان کا اقتصادی افلاس ہے۔ وہ زیادہ تر کاشتکار ہونے کی وجہ سے اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم ہی دلا سکیں اور بچپن ہی سے اپنے خوش شکل بچے اور بچیوں کو شالی (چاول)، کے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے بھیجتے ہیں تاکہ وہ شام کی روٹی کا بندوبست کر سکیں۔ بعض قصبات اور شہروں میں جو صناع اور کاریگر ہیں وہ اپنے افلاس اور غربت سے تنگ آ کر تھوڑی تھوڑی اجرتوں پر دولتمند آڑھتیوں کا کام کرتے ہیں جو تمام تر کشمیری پنڈت اور باہر کے تاجر ہوتے ہیں۔ یہ اسباب ہیں جو دیہاتی و قصباتی ہر دو قسم کی مسلمان آبادی کو تعلیم حاصل کرنے اور پھر اس کی وجہ سے زندگی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے کی راہ میں حائل ہیں اور ان کا اپنا وطن "کشمیر بہشت نظیر" حقیقت میں ان کے لئے ان غاصبان حقوق کے ہاتھوں "دوزخ نشان" بن گیا ہے جس سے اگر گلینسی کمیشن یا اور کوئی دوسرا ذریعہ نکالنے میں کچھ امداد کر سکے تو انسانی ہمدردی اور غیرت کا تقاضا یہ نہیں کہ کوئی جماعت اس پر اس درجہ آتش بر اندام ہو اور یوں ہنگامہ اور شورش سے مستحقوں کو اپنے حقوق سے فائدہ نہ اٹھانے دے!

شذرات

ہمیں بہت افسوس ہے کہ مارچ کا پرچہ ایک ہفتے کی اور اپریل کا پرچہ دس دن کی دیر سے شائع ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جامعہ کے مستقل کاتب علیل ہوگئے ہیں اور رخصت پر چلے گئے ہیں۔ اس لئے پرچہ لکھوانے کا عارضی انتظام کرنا پڑا جسمیں کتابت بھی خاطرخواہ نہیں ہوتی اور اشاعت بھی وقت پر نہیں ہو پاتی۔ بہرحال یہ پرچہ انشاءاللہ قارئین کرام کے پاس وقت پر پہنچ جائیگا۔ اور امید ہے کہ یکم جون سے کاتب جامعہ بھی واپس آجائینگے

اردو اکادمی کے کارکنوں کا ارادہ تھا کہ ...

جلسہ اور منعقد ہو جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اس ...

ستمبر سے پھر لکچروں کا سلسلہ شروع کر دیا جائیگا۔ اور ختم سال ... ...

مباحثہ ہو سکے گا۔

اس بار کئی سال کے بعد جامعہ کے وفود روانہ کئے گئے ہیں ایک وفد پروفیسر محمد مجیب صاحب کی سرکردگی میں لنکا، اور مالدیپ کے قصد سے گیا ہے دوسرا وفد علی احمد صاحب اور ان کے رفقا برما گئے ہیں۔ اور تیسرا جو سعید انصاری صاحب اور بعض اور اساتذۂ جامعہ پر مشتمل ہے۔ بنگلور اور ملابار جا رہا ہے۔ گو چندہ جمع کرنے کے لحاظ سے یہ زمانہ وفد کے لئے کچھ موزوں نہیں ہے لیکن اول تو جامعہ ملیہ کے وفود کا مقصد محض چندہ نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر قومی تعلیم کے مقاصد کی تبلیغ و اشاعت مدنظر ہوتی ہے۔ دوسرے جن لوگوں سے جامعہ ملیہ کو مالی امداد ملتی ہے۔ وہ باوجود مفلسی کے

آنا گیلا ہونے سے نہیں ڈرتے۔ اس لئے ہمیں پورا یقین ہے۔ کہ یہ وفد کامیاب واپس آئیں گے۔ دور اندیش محبان قوم جانتے ہیں کہ معاشی مشکلات کی وجہ سے چاہے اور سب کام رُک جائیں مگر بچوں کی تعلیم کبھی نہیں رُکنا چاہیئے۔ اور جامعہ کے مویدین کا حلقہ انہیں دور اندیش حضرات تک محدود ہے۔

پنجاب کے دفتر اطلاع عامہ نے صوبے کی تعلیمی رپوٹ بابتہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے اس حصے کے متعلق جس میں لڑکیوں کی تعلیم کا ذکر ہے۔ ایک بیان شائع کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سالِ پیوستہ لڑکیوں کی تعلیم پر ۲۵۱۵۱۲۰ روپیہ صرف ہوا لڑکیاں کے مدارس کی تعداد میں ۹۳۴ کا اور طالبات کی تعداد میں ۱۵۵۶ کا اضافہ ہوا۔ اِس اضافے کے بعد طالبات کی مجموعی تعداد میں ۴۰۴۳۰۸ تک پہنچ گئی۔ چار نئے ثانوی مدارس کھلنے کے بعد اب لڑکیوں کے ثانوی مدارس ۷۲ ہیں۔ جن میں سے ۲۰ ہائی سکول ہیں۔ کل ۱۵۲ لڑکیوں نے امسال میٹرکلیوشین کا امتحان دیا۔ جن میں سے ۱۱۷ کامیاب ہوئیں۔ کالجوں میں بھی لڑکیوں کی تعداد بڑھی ہے اور ۳۴۸ لڑکیوں نے معلمات کی حیثیت سے تربیت پائی۔ جن میں سات نے ٹریننگ کالج سے سند حاصل کی۔

ان اعداد پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ گو ابھی تک پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے کہیں کم ہے۔ مگر پھر بھی بڑی خوشی کی بات ہے۔ کہ اِس میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً معلمات کا شمار بڑھنا اس بات کی علامت ہے کہ تعلیم نسواں برسر ترقی ہو رہی ہے۔ خواہ اس کی رفتار کتنی ہی سست کیوں نہ ہو۔ افسوس ہے کہ اس رپوٹ میں طالبات کی تقسیم مذہب کے لحاظ سے نہیں کی گئی ہے

اس لئے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں مسلمان لڑکیاں کتنی ہیں۔ مگر جہاں تک ہمیں اپنے طور پر معلوم ہوا ہے ان کی تعداد مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے۔ یہ حال پنجاب میں ہے۔ جہاں لوگ لڑکیوں کی تعلیم کے اتنی سختی سے مخالف نہیں۔ جتنے دوسرے صوبوں میں ہیں۔

آج کل تعلیم نسواں کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے بجد اہم ہو گیا ہے۔ عورتوں کے جاہل رہنے سے جو معاشی، معاشرتی جسمانی [illegible]
کے علاوہ اب یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ یہ چیز [illegible]
لئے مہلک ثابت ہو گی۔ ہندوستان میں نیابتی [illegible]
مگر اب بہت جلد وہ زمانہ آرہا ہے کہ واقعی ملک کا [illegible]
ہوگا۔ اور یہ کونسلیں جو اب تک اسکولوں کے دار المطالعہ سے زیادہ [illegible]
رکھتیں، امور سلطنت کے مرکز بن جائیں گی۔ اس وقت ساری ہندوستانی قوم کو خصوصاً ملت اسلامی کو اس کی ضرورت پڑے گی کہ ان کے زیادہ سے زیادہ افراد سیاسی حقوق کو سمجھ سکیں اور ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ظاہر ہے کہ اگر پوری صنف نسواں جو تعداد میں کل آبادی کے نصف کی برابر ہے۔ جاہل رہے تو سیاسی قوت کے لحاظ سے مسلمانوں کی جماعت آدھی رہ جائیگی۔ شاید لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ جداگانہ انتخاب کی بدولت کونسلوں میں مسلمان ممبروں کی ایک مقررہ تعداد پہنچ جائیگی۔ خواہ ووٹ دینے والوں کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ مگر یہ محض دھوکہ ہے۔ جداگانہ انتخاب زیادہ دن تک رہنے والی چیز نہیں۔ اس کے بڑے سے بڑے حامی بھی یہ تسلیم کرتے ہیں، کہ یہ محض وقتی مصلحت پر مبنی ہے۔ کچھ دن کے بعد نہ اس کی ضرورت رہے گی۔ اور نہ اس کا امکان رہے گا۔ اس کے علاوہ جماعت کی سیاسی قوت محض کونسل کے ممبروں کی تعداد پر موقوف نہیں

ہوتی بلکہ سیاسی احساس اور قابلیت جو اس کے افراد میں ہو۔ جس جماعت میں لوگ
جاہل ہوں ۔ اور بہت کم افراد اتنی ذہنی روشنی رکھتے ہوں کہ ملکی مسائل کو سمجھ
سکیں وہ جماعت ہمیشہ دوسرے لوگوں کے سیاسی خیالات سے متاثر رہتی ہے اور
اس کے نمائندے اس کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس
کی سیاسی آزادی معدوم ہو جاتی ہے۔ اور وہ غیروں کے اشارے پر چلتی ہے
خواہ کونسلوں میں اس کے ممبروں کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اس لئے تمام
ہندوستان خصوصاً پنجاب والوں کو جو سیاسی تحفظات پر سب سے زیادہ زور
دیتے ہیں تعلیم نسواں کی ترقی میں دل و جان سے کوشش کرنا چاہئے۔

جامعہ ملیہ کے بہت سے قدر دان کچھ دن سے جناب شیخ الجامعہ سے اصرار کر
رہے ہیں۔ کہ جامعہ میں تعلیم نسواں کا شعبہ جلد سے جلد کھلنا چاہئے۔ ہمیں معلوم ہے
کہ موصوف اور ان کے رفقاء اس قومی ضرورت کا پوری طرح احساس رکھتے ہیں
لیکن افسوس ہے کہ جامعہ کی موجودہ مالی حالت ہرگز اجازت نہیں دیتی۔ کہ وہ ایک نئی
ذمہ داری اور وہ بھی اتنی بڑی اپنے سر لے لے ۔ ان مخلص کرم فرماؤں کو یہ معلوم
نہیں کہ جامعہ ملیہ موجودہ حالت میں اپنے اخراجات کس طرح پورے کرتی ہے۔ بلکہ
یوں کہنا چاہئے کہ بغیر اخراجات پورا کئے کیوں کر گذر کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں ایک
نیا کام شروع کر دینا خودکشی کے برابر ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد موجودہ کام کا باقی رہنا
ناممکن ہو جائے گا۔ ہاں اگر چند خدا کے بندے جو قوم کا درد دل میں رکھتے ہیں اس
کیلئے تھوڑا سا سرمایہ جمع کرلیں تو جامعہ ملیہ بڑی خوشی سے یہ بوجھ اٹھانے کو
تیار ہو جائے گی۔

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۸ | بابتہ ماہ جون ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی۔ اے آکسن پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرولباغ سے شائع کیا)

ایران جدید

ا نیا قانون ازدواج

اس وقت جب کہ ہندوستان میں مسلمان سارد ایکٹ کے خلاف احتجاج میں مشغول ہیں ہمارے

لئے یہ مطالعہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہوگا کہ ہمارے پڑوس کے ملک

اس مسئلہ کو کس قدر سمجھداری اور دانشمندی کے ساتھ سلجھانے کی کو

ضمیمہ قانون اساسی ۱۹۰۷ء کی دفعہ ۱۷ کے مطابق تمام

کیا گیا تھا اور دیوانی مقدمات محکمہ عدلیہ کے سپرد تھے لیکن ان دونوں

یہ نہیں قائم کئے گئے تھے اور یہ خیال تھا کہ شخصی قانون کے متعلق تمام معاملات اول الذکر محکمے کے ذریعے طے ہوا کریں گے اس کے علاوہ اس زمانے میں شریعت اور دیوانی قانون میں کوئی فرق بھی نہ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں رضا شاہ کے (جو اس وقت سالار سپاہ تھے) برسر اقتدار ہونے کے بعد ایران میں قانون سازی کا دور شروع ہوا اور اس وقت ایران میں قوانین وضوابط کے مجموعوں کی تعداد دس سے بھی زیادہ ہے محکمہ شرعیہ اس وقت بھی موجود ہے مگر اس کا عدم وجود برابر ہے لیکن اس موضوع پر میں دوسرے مضمون میں بحث کروں گا اس جگہ صرف اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ ۱۹۲۶ء سے اس وقت تک محکمہ شرعیہ کے اختیارات پر تین حملے کئے جا چکے ہیں، سب سے پہلے یہ کیا گیا کہ کوئی مقدمہ براہ راست نہ ان کے یہاں دائر کیا جائے اور نہ اس پر کوئی کارروائی کی جائے وہ صرف انھیں مقدمات پر غور کر سکتے ہیں جو محکمہ عدلیہ کی طرف سے ان کے پاس بھیجے جائیں اور محکمہ شرعیہ کے لئے یہ بھی لازم کیا گیا کہ ہر مقدمہ کے متعلق اپنی سفارشات سے محکمہ عدلیہ کو مطلع کر دیا کریں۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ محکمہ عدلیہ سوا ان مقدمات کے جو نکاح طلاق کے متعلق یا امین ومربی مقرر کرنے کے متعلق ہوں اور کوئی مقدمہ محکمہ شرعیہ کے پاس نہ بھیجیں۔ جن مقدمات

میں کوئی غیر فریق شہادت نہیں پیش کرسکتے تھے ان میں حلف لینے کا کام محکمہ شرعیہ کے متعلق تھا، بالآخر تیسری کارروائی یہ کی گئی کہ جنوری ۱۹۳۲ء کے ایک قانون کے مطابق بقیہ اختیارات بھی محکمہ شرعیہ سے چھین لئے گئے اور محکمہ عدلیہ کو ہدایت کی گئی کہ آئندہ کوئی مقدمہ محکمہ شرعیہ میں نہ بھیجیں الا یہ کہ آئندہ کسی خاص قانون کے ذریعے ان کو دوبارہ کوئی حکم دیا جائے، یہ قانون ابھی تک مجلس نے منظور نہیں کیا ہے اور اس وقت محکمہ شرعیہ چین کررہا ہے اس کے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ محکمہ شرعیہ کا حلقہ وہی ہے جو عدلیہ کی عدالت ابتدائی کا ہے یعنی ایران کا ایک ضلع یا ولایت کا ایک مجتہد میر عدالت ہوتا ہے اور حکومت ہی اس کو مقرر کرتی ہے۔ اگر اس کے پاس کام بہت زیادہ ہوجائے (جس کی شاید ہی کبھی نوبت آتی ہو) تو ایک مددگار بھی اس کو دے دیا جاتا ہے۔ یہ شخص ترقی کا باقاعدہ مستحق نہیں ہوتا لیکن حکومت اگر اس کے کام سے مطمئن ہو تو اس کی تنخواہ میں بقدر پانچویں حصے کے اضافہ کرسکتی ہے۔ ایک طرف محکمہ شرعیہ کے اختیارات سلب ہوجانے کی وجہ سے وہ مجبوراً بے کاری کی زندگی گذار رہا ہے اور دوسری طرف یہی اختیارات محکمہ عدلیہ کو حاصل ہوگئے ہیں۔

جدید قانون ازدواج عمومی سے شریعت کے تسلیم کردہ رسم ورواج میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی اور اگر کوئی فرق ہے تو اس قانون کے مطابق نکاح کا معاملہ دیوانی قانون کے متعلق کردیا گیا ہے قوانین کی تاویل اور تشریح کا اختیار محکمہ عدلیہ کو دیا گیا ہے اور قوانین میں ترمیم کرنے کا حق مجلس کو تفویض کیا گیا ہے۔ عہد سابق کے فتاوی کی بنا پر کوئی نظیریں اب تسلیم نہیں کی جاتی ہیں صرف دیوان عالی تمیز (یعنی ایران کے ہائی کورٹ) کے فیصلوں کا حوالہ پیش کرنے کی اجازت ہے غرض اس وقت جہاں تک نکاح کا تعلق ہے دیوانی قانون ایران میں رائج ہے اور اس قانون کا عملدرآمد ہر ایرانی باشندے پر یکساں ہے خواہ وہ مسلمان ہو خواہ پارسی یا یہودی۔ نکاح کا ثبوت ایک عدالتی رجسٹر کے ذریعہ سے دینا پڑتا ہے اور بس یہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ فریقین کو پورا پورا موقع دیا گیا ہے کہ آپس کے سمجھوتے سے اپنے اپنے حقوق اور فرائض جس طرح چاہیں مقرر کرلیں اور چونکہ ہر فرقے کے لوگ بہت سی رسومات کے پابند ہوتے ہیں اس لئے قانون دیوانی نے اس کا سب سے بہتر حل یہ نکالا ہے کہ ان رسوم کو جہاں تک

عدالت کا تعلق ہے بالکل نظر انداز کر دے اب یہ رسوم محض اختیاری ہیں اور کسی ایرانی کے لئے ان کی پابندی لازمی نہیں ہے۔ ایران کے اکثر جدید قوانین کی طرح قانون ازدواج بھی مجلس کی طرف سے نہیں نافذ کیا گیا ہے بلکہ اس کا نفاذ ایک عدالتی کمیشن کے ذریعہ کیا گیا ہے جو مجلس کے اٹھارہ اراکین پر مشتمل ہے اور ہر چھٹے مہینہ اس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ مجلس نے اس معاملہ میں قانون سازی کے جملہ اختیارات اس کمیشن کو تفویض کر دئے ہیں اس قانون کی دفعات اچھی طرح غور کرنے کے قابل ہیں۔

دفعہ ۱۔ جن اضلاع میں وزیر عدالت نے ضروری دفاتر [illegible]
اعلان بھی کر دیا ہے۔ وہاں قواعد وضوابط کے مطابق [illegible]
اگر کسی ضلع میں دفاتر قائم نہیں کئے گئے ہیں تو [illegible]
جو دفتر سب سے زیادہ قریب ہے وہاں جاکر نکاح یا طلاق کی رجسٹری [illegible]
کرے گا تو وہ تنبیہاً کم سے کم ایک ماہ اور زیادہ سے زیادہ چھ ماہ تک کی سزائے قید کا مستحق ہوگا۔

دفعہ ۲۔ اگر وزارت عدلیہ کے قواعد وضوابط کے مطابق نکاح وطلاق کی رجسٹری کرائی جائے تو ایک "سند رسمی" دی جائے گی ورنہ "سند عادی" دولت (حکومت)، رجسٹری کی کوئی فیس وصول نہ کرے گی۔

ان دفعات کے مطابق نکاح وطلاق کا جواز رجسٹری پر موقوف نہیں ہے حالانکہ اگر شوہر نکاح وطلاق کی رجسٹری نہ کرائے تو وہ چھ ماہ تک کی سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ رجسٹری اگر قواعد وضوابط کے مطابق ہو تو وہ بجائے خود کافی ہے خواہ فریقین اپنے اپنے مذہبی احکام اور شریعت کے مطابق کچھ رواسم کا اس میں اضافہ کرلیں۔

دفعہ ۳۔ اس شخص سے نکاح ممنوع ہے جو شادی کی عمر کو نہیں پہنچا ہے جو کوئی ایسے شخص سے شادی کرے گا جو جسمانی حیثیت سے شادی کے لائق نہیں ہے اس کو تنبیہاً ایک سال تک

سے کر تین سال تک سزائے قید دی جا سکتی ہے نیز دو سو تومان سے لے کر دو ہزار تومان تک جرمانہ بھی اس پر کیا جا سکتا ہے۔ اس دفعہ کے ماتحت تمام مقدمات خاص عدالتوں کے سامنے پیش کئے جائیں گے جو وزارت عدلیہ کے قواعد و ضوابط کے مطابق قائم ہوں گی۔" غیر رجسٹری شدہ نکاحوں کی طرح یہاں بھی نکاح کے جواز سے انکار نہیں ہے لیکن نابالغوں کے نکاح کو ایک مجرمانہ قصور قرار دیا گیا ہے جو سزا اس کے لئے تجویز کی گئی ہے وہ اس کو روکنے کے لئے کافی معلوم ہوتی ہے، ایران کے قوانین اس معاملے میں فرانس کی تقلید کرتے ہیں کہ کم سے کم سزا مقرر کردی جائے جس میں کمی کرنے کی اجازت عدالتوں کو نہیں دی جاتی ہے نکاح کے لئے کوئی عمر قانوناً مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ وزارت عدلیہ کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے، اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ جو عمر عوام الناس قبول کرنے کو تیار رہوں وہ وزارت کی طرف سے مقرر کی جائے گی اور جوں جوں رائے عامہ تبدیل ہو عمر میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیا جائے محکمہ شرعیہ کو ان معاملات میں دخل نہیں ہو سکتا۔

مندرجہ بالا دفعات کے علاوہ نکاح کو خالصتہً ایک معاہدے کی شکل دیدی گئی ہے اور دیگر معاہدوں کی شرائط کی طرح نکاح کی شرط بھی فریقین کے درمیان عقد کے وقت طے کی جا سکتی ہیں،

دفعہ ۴۔ فریقین کو اختیار ہوگا کہ عقد سے قبل جو شرائط چاہیں مقرر کرلیں بشرطیکہ ان شرائط سے ازدواجی تعلقات کی نفی نہ ہوتی ہو مثلاً نکاح نامہ میں یہ شرط رکھی جا سکتی ہے کہ اگر شوہر ایک معینہ مدت کے لئے غائب ہو جائے اور اس کا کوئی پتہ معلوم نہ ہو یا وہ اپنی بیوی کا نان و نفقہ نہ دے یا اس کو قتل کرنے کی کوشش کرے یا اس قدر ظالمانہ برتاؤ کرے کہ ازدواجی تعلقات کا قائم رہنا ناممکن ہو جائے تو عورت کو یا اس کے وکیل کو حق ہوگا کہ عدالت میں یہ ثابت کرکے کہ نکاح نامہ کے کسی شرط کی خلاف ورزی کی گئی ہے طلاق کا دعویٰ کرے اس دفعہ کے ماتحت تمام مقدمات محکمہ ابتدائی کے سامنے ضابطہ دیوانی کے مطابق پیش کئے جائیں گے لیکن عدالت صوبہ یا دیوان عالی تمیز (ہائی کورٹ) میں مرافعہ کیا جا سکتا ہے شرائط نکاح

کے فسخ ہونے کے بعد فریقین میں سے کسی کی طرف سے چھ مہینہ کے اندر عقد صدارہ ہونا چاہئے
ہر ایرانی کی روایات اور مذہبی جذبات کا اس میں پورا لحاظ کیا گیا ہے عیسائیوں
کو صرف اپنی مذہبی ذمہ داریوں کا اندراج نکاح نامہ میں کرانا پڑتا ہے اور اس کے بعد وہ قانوناً بالکل
جائز تسلیم کر لیا جاتا ہے اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ مخالف بہ مقتضات عقل کی تاویل کم از کم بحالات موجودہ
محدود معنوں میں کی جاتی ہے۔ رومن کیتھلک فرقے کے لوگ جن کا اعتقاد ہے کہ نکاح کا رشتہ چونکہ
آسمان پر جوڑا جاتا ہے اس لئے زمین پر اس کو کوئی توڑ نہیں سکتا اگر [illegible] تو فریقین [illegible]
طلاق کے امکان کو بالکل محو کر سکتے ہیں اور شیعہ مسلمان بھی
کر سکتے ہیں کہ ایک مدت معینہ کے بعد نکاح کی ذمہ داریاں
عام طور پر صیغہ کہتے ہیں جدید قانون نے ممنوع نہیں [illegible]
ہے جو ہر ملت اور مذہب کے لئے موزوں ہے اور اس کے مطابق نکاح اور طلاق [illegible]
سرکاری عدالتوں کے سامنے پیش ہو سکتے ہیں نیز عورتیں جو اب تک یہ محسوس کرتی تھیں کہ مذہب یا
رسم و رواج زمانہ ان کو وہ حیثیت نہیں دیتا جو وہ چاہتی ہیں۔ اب نکاح نامہ میں اپنے لئے زیادہ بلند
مرتبہ حاصل کر سکتی ہیں مثلاً مسلمان شوہر کا یہ حق کہ جب جی میں آئے بلا کسی معقول وجہ اور عذر کے بیوی
کو طلاق دیدے نکاح نامہ کے ذریعہ چھینا جا سکتا ہے اور برعکس بیوی بھی جیسا کہ مذکورہ دفعہ کی
مثال سے واضح کر دیا گیا ہے اشوہر کی زبردستیوں سے بچائی جا سکتی ہے یا مجبوراً عدالت سے طلاق
حاصل کر سکتی ہے یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ متعدد مسائل کا فیصلہ عدالتوں کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے
مثلاً اگر کسی نکاح نامہ میں یہ درج ہے کہ کوئی شوہر اپنی پہلی بیوی کی زندگی میں دوسرا عقد نہیں کر سکتا
تو کیا اس شرط کی پابندی کی جائے گی یا کیا عیسائی یا بہائی جن کا مذہب تعدد ازدواج یا متعہ کی
اجازت نہیں دیتا جدید قانون کے مطابق نکاح نامے کے ذریعہ اس قسم کی عیاشیوں کے مجاز ہوں گے
یہ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کو مجلس کے قوانین یا عدالتی قوانین کے ذریعے طے کرنا پڑے گا اس
کے بعد ایران کا قانون ازدواج عمومی مکمل کہا جا سکے گا۔

اس کے بعد کی تین دفعات میں دھوکے اور غلط بیانی کے لئے سزا مقرر کی گئی ہے

دفعہ ۵۔ اگر کوئی فریق خواہ شوہر ہو یا بیوی غلط بیانی کرے اور عدالت اس نتیجے پر پہونچے کہ غلط بیانی نہ کی جاتی تو عقد نکاح نہ ہوا ہوتا تو ایسی صورت میں مجرم شوہر یا بیوی کو تنبیہاً سزائے قید دی جائے گی جو کم از کم چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ دو سال تک ہوگی۔

دفعہ ۶۔ ہر مرد کے لئے ضروری ہے کہ نکاح کے وقت اس عورت کو جس کے ساتھ شادی کر رہا ہے نیز نکاح کے رسوم ادا کرنے والے قاضی کو مطلع کردے کہ اس کے کوئی بیوی یا بیویاں پہلے سے ہیں یا نہیں اور اس واقعہ کو بالتصریح نکاح نامہ میں بھی ظاہر کردینا چاہئے جو شخص خود کو کنوارا بتا کر عورت کو دھوکا دے گا وہ اسی سزا کا مستحق ہوگا جو دفعہ ماسبق میں تجویز کی گئی ہے۔"

اس دفعہ سے بھی جواز عقد پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اگر کوئی امیر عورت دھوکے میں آکر کسی غریب سے شادی کرے یا کوئی تعلیم یافتہ عورت کسی مرد کی تیسری یا چوتھی بیوی بن جائے تو وہ پھر بھی اپنے آپ کو ایک عجیب مصیبت میں پاتی ہے اس کا نکاح قانوناً درست ہے اور اس کی اولاد ولد الحلال ہوتی ہے۔ بہر کیف اگر عورت چاہے تو شوہر کو جیل خانہ بھجوا کر اپنے دل کو تسکین دے سکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کرنا پسند بھی کرے گی خصوصاً اس صورت میں جب کہ عقد نکاح اور غلط بیانی کے انکشاف کے درمیان ایک کافی مدت گذر گئی ہو قانون نے یہ بات بالکل واضح کردی ہے کہ دھوکے اور غلط بیانی نابالغوں کی شادی کی طرح سے کوئی مجرمانہ فعل نہیں ہے اور اگر مظلوم فریق اس قصور کو معاف کردینا چاہتا ہے تو حکومت اس میں کوئی مداخلت نہ کرے گی۔

دفعہ ۷۔ ماسبق دو دفعات میں جو سزا تجویز کی گئی ہے اس کا حکم اس صورت میں نافذ کیا جائے گا جب کوئی مرد یا عورت جس کو دھوکہ دیا گیا ہے باقاعدہ مقدمہ دائر کرے اگر کوئی فریق عدالت کے فیصلے سے قبل مقدمہ واپس لے تو پھر کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

اس کے بعد کی دفعات میں شوہر اور بیوی کے فرائض کی تصریح کی گئی ہے لیکن ان کا عمل درآمد

سی وقت ہوتا ہے جب اس کے خلاف کوئی بات نکاح نامہ میں درج نہ ہو۔

دفعہ ۸۔ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے ساتھ مکلف بہ معاشرت ہیں۔

دفعہ ۹ شوہر کا فرض ہے کہ بیوی کو نان ونفقہ دے۔

دفعہ ۱۰۔ نان ونفقہ سے مراد مکان۔ لباس کھانا۔ اور اساس البیت ہے اگر کوئی شخص بیوی کے گذارے کا انتظام نہ کرے تو بیوی عدالت میں دعویٰ کرسکتی ہے اور عدالت شوہر کے حالات پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کرے گی کہ بیوی کو کیا گذارہ ملنا چاہیئے۔ شوہر کو حکم دیگی کہ اس کا انتظام کرے اگر عدالت کے حکم کی تعمیل نہ ہو تو عورت محکمہ عدلیہ کے ذریعہ محکمہ شرعیہ سے فسخ نکاح کے لئے درخواست کرسکتی ہے۔ یہ کارروائی اسی طرح
تصدیق کی کارروائی محکمہ شرعیہ کا حوالہ محض رسمی ہوتا ہے
علیحدگی یا طلاق کے حکم پر دستخط کر دیتے ہیں ان کو یہ اختیار نہیں
کردیا اس پر نظرثانی کریں چونکہ ایک سند یافتہ مجتہد کے فتوی سے اس طرح ایک بہت بڑی تر
کا ضمیر بالکل مطمئن ہو جائے گا۔ اس لئے محکمہ شرعیہ کے حوالہ کی ضرورت پڑی۔

دفعہ ۱۱۔ عورت کو خاوند کے ساتھ رہنا پڑے گا اگر نکاح نامہ میں اس کے خلاف کوئی بات درج نہیں ہے لیکن اگر بیوی یہ ثابت کردے کہ اس نے اپنے خاوند کا مکان اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ اس کا مال واسباب خطرہ میں تھا یا اس کو اندیشہ تھا کہ اس کے ساتھ ناقابل برداشت سختیاں کی جائیں گی تو پھر عدالت اس کو خاوند کے گھر جانے کا حکم نہ دے گی بلکہ شوہر کو حکم دیا جائے گا کہ جب تک اس کے طرز عمل کی وجہ سے بیوی کا اس کے گھر واپس جانا ممکن نہ ہوسکے اس وقت تک وہ اس کے گذارہ کا انتظام کرے۔

دفعہ ۱۲۔ بحالات مذکورہ (دفعہ سابق) جب تک خاوند اور بیوی کے مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو جائے بیوی ایسی جگہ قیام گزیں ہوگی جو فریقین کے باہمی سمجھوتے سے طے پائے اور اگر فریقین میں کوئی سمجھوتا نہ ہوسکے تو عدالت فریقین کے قریب ترین رشتہ داروں کا لحاظ

رکھ کر بیوی کے قیام کے لئے کوئی جگہ مقرر کرے گی اگر قریبی رشتہ دار نہ ہوں تو عدالت اپنی رائے کے مطابق عورت کے لئے کسی جگہ انتظام کرے گی جہاں وہ حفاظت سے رہ سکے"

شریعت اسلامی نے منکوحہ عورت کو اپنے مال و جائداد پر جو وسیع اور کامل اختیارات دئے ہیں ان کو برقرار رکھا گیا ہے نیز دیگر ملتوں کے لئے بھی ان کی توسیع کر دی گئی ہے بچے کی سرپرستی کے متعلق والدہ کے حقوق کی بھی تصریح کر دی گئی ہے :۔

دفعہ ۱۴۔ منکوحہ عورت جس طرح چاہے بلا خاوند کی اجازت کے اپنے مال اور جائداد پر تصرف کر سکتی ہے۔

دفعہ ۱۵۔ ماں اپنے بچے کی سرپرست سمجھی جائے گی۔ اگر لڑکا ہے تو پیدائش کے دو سال تک اور اگر لڑکی ہے تو پیدائش کے وقت سے سات سال کی عمر تک اس کے بعد سرپرستی کے فرائض باپ کے ذمہ ہوں گے۔

دفعہ ۱۶۔ اگر مدت سرپرستی کے اندر ماں اپنے پہلے شوہر کو طلاق دے کر دوسرے شخص سے نکاح کرے یا پاگل ہو جائے یا بچوں کی نگہداشت سے انکار کرے تو جس وقت تک مذکورہ وجوہ باقی رہیں گی سرپرستی کے فرائض والد کے ذمہ ہوں گے۔

اس دفعہ کے مطابق مطلقہ عورت کو بچوں کی سرپرستی کا حق رہتا ہے اور یہ حق صرف اسی وقت چھینا جاتا ہے جب بعد میں وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔

اسلامی شریعت ایک مسلمان مرد کو غیر مسلم عورت سے نکاح کرنے کی اجازت دیتی ہے لیکن ایک مسلم عورت کے نکاح کو کسی غیر مسلم مرد کے ساتھ ناجائز قرار دیتی ہے۔ شریعت اسلامی کی اس قدیم روایت کو برقرار رکھا گیا ہے لیکن بیرونی مردوں کے ساتھ ایرانی عورتوں کے نکاح پر خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم حکومت کو نگرانی کرنے کا اختیار دیا گیا ہے :۔

دفعہ ۱۷۔ مسلمان عورت کا نکاح غیر مسلم مرد کے ساتھ ممنوع ہے۔ بیرونی مرد کے ساتھ ایرانی عورت کے نکاح میں اگرچہ کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہے لیکن اس کے لئے خاص اجازت کی ضرورت ہے

اور حکومت خاص خاص مقامات پر دفاتر قائم کرے گی جو اس قسم کی درخواستوں پر غور کرکے ضروری اجازت دیا کریں گے اگر کوئی بیرونی شخص بلا اجازت کسی ایرانی عورت سے نکاح کرے گا تو اس کو تنبیہاً سزا دی جائے گی جو ایک سال سے تین سال تک ہو سکتی ہے۔

اسی سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ایران کا قانون تابعیت (ان تمام اشخاص کو ایرانی رعایا تسلیم کرتا ہے جو (۱) خواہ ایران میں پیدا ہوئے ہوں یا بیرون ملک میں لیکن ان کے والد ایرانی رعایا ہوں۔ (۲) وہ تمام اشخاص جو ایران میں پیدا ہوئے ہوں اور ان کے والدین میں سے کوئی ایرانی ہو۔

اکثر ایرانی شکایت کرتے ہیں کہ ان کی آبادی روز بروز وہاں کوئی مردم شماری نہیں کی گئی ہے اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ ہے پچیس برس سے کم عمر کی ایرانی لڑکیاں قدرت کی حسین ترین تعداد ابھی ایسی ہے جو تعلیم اور فنون لطیفہ سے مرصع ہو۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس وقت ... سے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ایرانی عورتوں کی شادی پر کچھ اعتراض نہیں کیا ہے۔

دفعہ ۱۸۔ اگر نکاح وطلاق کی رجسٹری دفعہ ا قانون ہذا کے مطابق ہو چکی ہے تو دفعہ ۴ و دفعہ ۵ کے مطابق پروانہ شہری پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔

دفعہ ۱۹۔ اس قانون میں اضافہ کے لئے ضروری قواعد وضوابط وزارت عدلیہ مرتب کرے گی

دفعہ ۲۰۔ اس قانون کا نفاذ یکم ماہ مہر مطابق ۲۴ ستمبر ۱۹۳۱ء سے ہوگا۔

قانون پروانہ شہریت کی دفعات چار اور پانچ (جو اب منسوخ ہو گئی ہیں) کے مطابق پہلے ہر شخص کو مجبور کیا جاتا تھا کہ سب سے قریب والے پولیس کے تھانہ کو نکاح اور طلاق کے وقوعہ کی اطلاع دے لیکن چونکہ اب ان دونوں واقعات کی باقاعدہ رجسٹری وزارت عدلیہ کے دفتر میں ہوتی ہے اس لئے پولیس کو اطلاع اب ضروری نہیں ہے ہر ایرانی رعایا کو پروانہ شہریت رکھنا پڑتا ہے جس میں زندگی کے چار واقعات یعنی پیدائش۔ عقد۔ طلاق اور موت کا اندراج ہوتا ہے۔ نکاح کے متعلق حسب ذیل

خانے اس میں ہوتے ہیں۔

	بیوی یا بیویاں		قسم نکاح		تاریخ عقد			دفتر اور رجسٹر کا نمبر		
	نام	پدر یا شوہر	دائم	منقطع	سنہ	ماہ	تاریخ	دفتر نمبر	محکمہ	رجسٹری نمبر
۱										
۲										
۳										
۴										
۵										
۶										

آپ دیکھیں گے کہ مطبوعہ فارم میں صرف چھ بیویوں کے لئے گنجائش رکھی گئی ہے خواہ ساتھ ساتھ نکاح میں آئیں یا یکے بعد دیگرے اور دائمہ ہوں یا منقطع لیکن اگر حالات اس قسم کے پیدا ہو جائیں کہ اور زائد بیویوں کے اندراجات کی ضرورت پڑے تو ایک نیا فارم ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو بازار مناکحت میں اپنی مردانگی کا نمایاں ثبوت دیتے ہیں۔ ایران کے قانون ازدواج میں جو چیز نمایاں طور پر کسی شخص کو نظر آتی ہے وہ اس کی قدامت پسندی ہے تعدد ازدواج اور متعہ کو جو ایران کی معاشرتی زندگی کی سب سے بڑی لعنتیں ہیں مسدود نہیں کیا گیا ہے۔ ہندوستانی مسلمان اور ایرانی مسلمان دونوں کو شرعاً ازدواج کی اجازت ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایران میں اس کا زیادہ رواج ہے۔ ہندوستان کی بہ نسبت وہاں کی رائے عامہ اس کی اجازت زیادہ فراخدلی سے دیتی ہے۔ طلاق کا بھی یہی حال ہے۔ متعہ صیغہ یا ازدواج منقطعہ کا رواج بدقسمتی سے صرف ایران میں ہے لیکن چونکہ ایرانی ہندوستانیوں کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ اور ترقی پذیر اور نسبتاً مذہبی جوش اور تعصب کم رکھتے ہیں اس لئے تعدد ازدواج یا متعہ کی ممانعت ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ایرانی مصلحین اس معاملہ میں احتیاط کرتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ تیز رفتاری سے کوئی اصلاحی قدم نہ اٹھایا جائے نیز قابل عمل باتوں میں

اور ناقابل عمل باتوں میں وہ امتیاز بھی کر سکتے ہیں۔ جو تبدیلیاں گذشتہ دس سال کے اندر ہوئی ہیں
وہ ہر چند انقلاب آفریں ہیں لیکن رائے عامہ نے کسی تبدیلی کی کوئی مخالفت اب تک نہیں کی ہے
جس وقت حالات اجازت دیں گے قانون ازدواج میں فوراً ترمیم کی جائے گی، اور اس اثنا میں
یہ حکومت کا وزارت عدلیہ کا جس کے صدر ایران کے مقنن اعظم آغا علی اکبر خاں داور ہیں ایسا فرض
ہے کہ ملک کی رائے عامہ کو مقصد سے قریب تر کرنے کی کوشش کریں۔

مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط
قاضی عبدالغفار صاحب کے نام

چھندواڑہ

۹ جولائی سنہ ۱۹۱۶ء

برادرم السلام علیکم۔

نہیں تمھارا خیال غلط ہے۔ کہ ہم دونوں نے تمھیں بھلا دیا۔ واقعی بات یہ ہے کہ جب تمھیں خط لکھنے کو قلم اٹھاتا ہوں۔ ایک دفتر مضامین کا سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ اگر خط انگریزی میں لکھا جاتا تو چنداں دشواری نہ تھی۔ اردو میں لکھنے کو دل چاہتا ہے اور جو مشکلات اردو خط کے متعلق پیشتر تھیں ان میں ہرگز کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ بہرحال آموں کا شکریہ یوں بھی واجب تھا مگر جس کثرت سے روزانہ پارسلیں آموں کی پہونچ رہی ہیں اس کے حساب سے تو شکریہ میں ایک کارڈ ہی جانا چاہیے تھا ورنہ لفافوں کے ٹکٹ دیوالہ نکال دیں گے مگر تمھاری محبت اس سے بہت زیادہ کی مستحق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جو شخص جواب نہ دے یا دیر سے جواب دیا کرے اسے بالتواتر خط لکھنا کس قدر گراں ہوتا ہے۔ مگر جیل اور اس زمانہ کی مصیبتیں ہیں ان ہی سے اسے بھی سمجھو اور ہماری خاموشی کی پرواہ نہ کرو بلکہ خط برابر لکھتے رہا کرو اس سلسلہ میں آپ کے جوڑے والے جناب سے بھی کچھ عرض کرنا ہے جس طرح ہندوستان کی بارش موسمی ہوتی ہے ایک زمانے میں تو پے درپے چار پانچ خطوط آجاتے ہیں اور پھر وہ خشک سالی ہوتی ہے کہ الاماں۔ اپریل میں جب کہ میں علیل تھا اور یونیورسٹی کے متعلق معروف بھی۔ ان کے چند خطوط آئے جن میں تمام دنیا کی شکایت تھی کہ میموریل چھاپنے میں دیر کر دی حالانکہ میں صرف انھیں کو ذمہ دار سمجھتا ہوں خواہ وہ کتنے ہی

ناراض کیوں نہ ہو جائیں۔ جو کام شروع دسمبر تک ہو جانا چاہیے تھا اس کا آخر مارچ میں طے
پانا اور وہ بھی بری طرح ہرگز کسی اور کی لاپرواہی کا نتیجہ نہیں ہے۔ لیکن وہ اس میں بالکل بے قصور
سہی تاہم اس کا ذمہ وار کون ہے کہ آج تک مجھے اس کی اطلاع نہیں ملی کہ جواب کیا ملا یہی
باتیں ہیں جو مجھے تنگ کر دیتی ہیں نہ معلوم کس شخص نے ان سے کہہ دیا کہ معظم نے ان کی وجہ سے شکایت کی اب
معظم کو بھی بار بار شکایت لکھی اور مجھے بھی حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے میرے مہر دلی چھوڑنے
کے بعد سے اخبار اور پریس کا جو حشر ہوا سو ہوا۔ اب اس کا دکھڑا رونا فضول ہے مگر ایک ممبر ریل کا
بھجوانا تھا سو اس کا اس طرح انتظام ہوا۔ خیر وہ بھی سہی۔ مگر یہ [illegible]
مطلع کریں۔ ناکامی پہلے ہی یقینی تھی مگر جو جواب ملا اس
اطلاع کہ اس کا مطلب کیا تھا۔ اب تک صرف اس
کہ گورنمنٹ ہند کی جانب سے ایک لفافہ جالب صاحب
کچھ عرصے بعد معظم نے پھر لکھا تھا کہ ہمدرد کے اپیل کا جو فیصلہ ہوا وہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گیا [illegible]
اس کو معلوم نہ تھا کہ اس فیصلہ کی اطلاع دینے والے جالب صاحب جیسے شخص تھے۔ برا ہو۔ اوس کالی
کالی شے کا جس کی ڈبیا لینڈون تک ساتھ آئی تھی۔ جس نے اس راستہ کو جس کو اور لوگ ایک دن
میں طے کرتے ہیں تین دن میں طے کرایا اور پھر بھی جس نے سوار کو پیدل چلوایا غالباً جالب صاحب
کا خیال ہے کہ وہ اس کی اطلاع فیصلہ ملتے ہی مجھے کر چکے ہیں۔ بھائی ان سے کہہ دو کہ یہ تمام
مکر و فریب چینا بیگم صاحبہ کا ہے ورنہ میں تو آج تک اس معاملہ سے بے خبر ہوں۔ ان سے سلام
کہنا اور یہ کہہ دینا کہ یہ پنشن وغیرہ پر اس قدر نظر عنایت کیوں ہے دنیا میں واقعات کا قحط نہیں ہوا ہے۔
کی کمی نہیں۔

اب اپنی سنو۔ علی گڑھ کالج کے معاملات ضرور تمہاری توجہ کے مستحق ہیں مگر واقعات سے
بہتر کوئی شے نہیں رائے کو کم کرو۔ واقعات کو زیادہ کرو۔ کیا چودھری غلام حیدر خان کو علی گڑھ
کے متعلق کاغذات دستیاب نہیں ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب کی انگلش ہاؤس ماسٹری کا معاملہ کیا

ہے کہ اس کا جواب ہی نہیں۔ پھر انسپکٹر کی رپورٹ۔ پھر اس پر نواب اسحاق خاں صاحب کا ایک کمیٹی مقرر کرنا تاکہ اولڈ بوائز والی کمیٹی اور ٹرسٹیوں کا کمیشن نہ بننے پائے پھر اس کمیٹی میں خواجہ کا بھی نام ہونا مگر آخرش صاحبزادہ صاحب کا تحقیقات کرنا اور رپورٹ تیار کرنا پھر امسال اسکول کے امتحانوں میں طلبہ کو ترقی نہ دینا۔ پھر یونیورسٹی کے نتائج۔ یہ سب توجہ کے مستحق ہیں۔ تم اسحاق خاں صاحب سے پوچھ سکتے ہو کہ گذشتہ پانچ سالوں میں اسکول کے ہر درجہ کے سالانہ امتحان میں کیا Percentage[1] ترقی دیا گیا اور امسال ہر درجہ میں کیا percentage[2] ترقی دیا گیا ہے گذشتہ پانچ سال کے اسکول کے نتائج کیسے تھے اور اب کیسے ہیں۔ یہ تو یقین ہے کہ سنہ ۱۹۱۶ء تک تین چار سال کے نتائج خراب تھے چنانچہ اس سال میں نے بجٹ کے جلسہ میں یہ اعداد پیش کئے تھے گذشتہ سالوں کے جلسوں کی روداد یں اور بجٹ منگا رکھو اور کبھی کبھی مطالعہ کر لیا کرو۔ جو رائیں میں نے اور شوکت نے گذشتہ دو اجلاسوں میں دی ہیں انھیں دیکھو اور خصوصاً خواجہ سے منگا کر وہ رپورٹ جو میں نے Old Boys[3] کے جلسے میں بحیثیت ٹرسٹی من جانب ایسوسی ایشن اپنی سالانہ کاروائی پیش کی تھی یہ وہ چیزیں ہیں جن سے تمہیں اپنے پیارے کالج اور اس کے اسکول کے حالات صحیح صحیح معلوم ہوں گے۔ یعقوب کی تحریک اور اس پر ان کی رائے میں رطب و یابس دونوں تھے اور جو کمیٹی بنوانا چاہتے تھے وہ محض بیکار اور صفر ہوتی اگر کچھ اصلاح کر سکتے ہو اور کرنا چاہتے ہو تو اصل کو پکڑو۔ فروع سے زیادہ بحث نہ کرو اور پھر دو عملی بیکار نہیں بلکہ مضر ہے یا .... کو .... کو قوم کا دشمن سمجھو کہ کسی نیت سے بھی ہو قوم کا نقصان کر رہے ہیں اصلاح کا کام دوسروں پر چھوڑ دو۔ بل عجلت سے یہ کام نہیں چلے گا۔ ارے ہاں خوب یاد آیا یہ تم سے کس نے کہ دیا کہ .... مسئلہ تعلیم کا بڑا اکسپورٹ ہے۔ یہ شخص محض احمق ہے۔ اسے اتنی عقل ہی نہیں ہے کہ کچھ سمجھے۔ اسے تو سازش آتی ہے اور غریب طلبا کا گلا گھونٹنا اور غداری مسکرو

(۱، ۲) فی صدی۔ (۳) اولڈ بوائز

خیبہ نویسی۔ رہا یونیورسٹی کا معاملہ۔ اس کی مجھے کچھ بھی اطلاع نہیں۔ اطلاع دے تو کون۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن۔ پی ایچ ڈی ساکت و صامت ہیں۔ انصاری کچھ ناراض کچھ مصروف اور بالکل خاموش اسحاق خاں محض مطبوعہ کاغذات ایسوسی ایشن اور کالج کے بھیج دیتے ہیں۔ ہمدرد کے نامزد کردہ نام کو ایسوسی ایشن سے خارج کرنا چاہتے تھے۔ مجھے لکھا کہ اس میں آپ کو تو عذر نہیں میں نے اپنے عذرات لکھ بھیجے اور یہ بھی کہ اگر یہ مسئلہ چھڑ جائے تو یہ امر لفیصلہ ممبروں کی خدمت میں رسال کر دیا جائے۔ اس کے بعد سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی

جو تم نے لکھا ہے وہ بالکل متوقع تھا ہرگز غیر متوقع نہ تھا

بے ایمان میں کسی امر کو مبہم اور ان کے اعتبار پر نہ چھوڑ :

Ex-officio کا سوال اسی وقت طے کر دینا چاہیے۔

کے متعلق ریزولیشن میں کچھ درج نہیں کوئی شخص Ex officio نہیں بن سکتا یونیورسٹی کے مسئلہ میں جناح پر ہرگز اعتبار نہ کرنا دیہ جناح کیوں کر دیا ہے۔ اصل میں یہ لفظ جھینا یعنی تپلا ہے اور انگریزی Jheena ہونا چاہیئے تھا انھوں نے اس کو Jinnah کر دیا تم جناکر دو یا خباہتر ہے کہ جنہ کر دو مگر خباح کیوں کہو) میں بے اعتمادی نہیں برتتا بلکہ تجربہ سے معلوم ہو گیا کہ جنہ کی رائے ہے کہ یہ مسئلہ زیادہ اہم نہیں جس طرح Compromise ہو سکے کر لیا جائے۔ مسئلہ تعلیم پر جنہ Expert کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ کالج کے ٹرسٹی کی حیثیت سے وہ نہایت بے توجہ اور لاپروار ہے ہیں۔ اس کی روایات سے نہ انھیں واقفیت نہ دلچسپی وہ تو پولیٹکل مسائل میں کام کے آدمی ہیں اور وہ بھی کاغذی کارروائیوں میں۔ یہ مسئلہ تعلیمی ہے اور اس میں عبدالرحمٰن ہی پر بھروسا کرو وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ سرگرمی اور مستعدی سے وہ کام کرے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ

---

(۱) ماہر

(۲) بر بنائے عہدہ درکن وغیرہ)

ولایت سے آنے کے بعد سرگرم رہا یا نہیں۔ بھائی اب اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ ہاں اتنا اور لکھنا ہے
کہ جب آپ نے شریف مکہ کی غداری پر (نہ معلوم یہ واقعہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ بظاہر صحیح نہیں ہے،
میری ایک عزیزہ چار سال بیت اللہ شریف رہ کر ابھی واپس آئی ہیں) جو رائے دی تھی، اس
میں ہمارے مقدس مذہب سے ناواقفیت کا کافی سے زیادہ اظہار کیا تھا۔ چونکہ میرے عنایت فرما
ہیں میں نے بحیثیت ایک مسلمان کے اس معاہدہ کے مذہبی نوٹ پر ان کو ایک خط لکھا ہے۔ مسٹر صاحب
نے اس امر کو مذہبی تسلیم کر کے (کیونکہ میں نے سیاسی یا فوجی رخ سے بحث کرنے سے احتراز کلی کیا تھا)
میرا خط بلیب خاطر روانہ کر دیا۔ غالباً تم کو اس خط کی چند دن میں نقل روانہ کر دوں۔ دیکھ کر واپس
کر دینا۔ میں خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ ہم میں ہمارے مرشد مولانا عبدالباری صاحب مدظلہ تعالیٰ جیسے
بزرگ اور مذہبی پیشوا موجود ہیں۔ لیگ نے بھی اس بار تو کچھ مذہبی خدمت ادا کی اور مسلمانان کلکتہ
نے بھی ہم مسلمانوں کو ان کا بھی مشکور ہونا چاہیئے جنھوں نے ہمارے مذہبی احساسات کا اس موقع
پر لحاظ کیا۔ جنگ پر رائے زنی کرنا ماہرین فن جنگ کا کام ہے۔ سیاسات پر میں نظربندی کے
باعث بحث کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ البتہ مذہبی معاملات میں ہمیشہ آزاد ہوں اور رہوں گا اور
خدا سے دعا اب نہیں بلکہ ہمیشہ سے مانگا کرتا ہوں کہ الہم (عز السلام) والمسلمین و اخذل الکفرۃ و
المبتدعۃ والمشرکین دام سلطنۃ عبدک السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان سلطان البحرین
وخاقان البرین خادم الحرمین الشریفین الغازی المجاہد فی سبیل اللہ سلطان الاسلام خلد اللہ تعالیٰ ملکہ
وسلطنۃ الہم انصرہ وانصر عساکرہ وکن لہم حافظاً ومویدہ وناصرہ واقطع لسبہ الرقاب الطایفۃ الباغیۃ الفرق
الکفرۃ یامن بیدہ امر الدنیا والاخرۃ۔ خداوند کریم فرماتا ہے کہ انی اجیب دعوۃ الداع اذا
دعان فلیستجیبوالی ولیؤمنوابی۔ چنانچہ ہماری دعاؤں کا تو قرآن پاک ہی نے فیصلہ کر دیا۔ کل تلاوت
کر رہا تھا کہ یہ آیات باعث تسکین ہوئیں۔ و مالہم الا یعذبہم اللہ وھم یصدون عن المسجد الحرام

---

(۱) سمجھتا

عز الاسلام

وما كانوا اولياءه۔ ان اولياؤه الا المتقون ولكن اكثرهم لا يعلمون ۝ وما كان صلاتهم عند البيت الا مكاءً وتصديةً۔ فذوقوا العذاب بما كنتم تكفرون ۝ ان الذين كفروا ينفقون اموالهم ليصدوا عن سبيل الله فسينفقونها ثم تكون عليهم حسرةً ثم يغلبون ۝

بھائی ہمارا تو خدا پر بھروسہ ہے اور وہ فرماتا ہے کہ وان تولوا فاعلموا ان اللہ مولٰکم نعم المولیٰ ونعم النصیر ۝

اے صاحب یہ .... والے سردار تو بڑے [illegible] ۵

[illegible]

تمنے ہماری تازہ غزلیں بھی سنیں؟ نہیں سنی ہوں:
ایک خط مجھ پر ضرور قرض ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ
مجھے بالکل بھلا دیں۔

تمھارا

محمد علی

۵ حسینوں کے کنھیا۔

ادب الجاحظ

(گزشتہ سے پیوستہ)

اعتزال اسلام میں قبل اس کے کہ جاحظ کا مسلک اعتزال پیش کیا جائے، نامناسب نہ ہوگا اگر اعتزال کے نشوونما وغیرہ پر بھی ذرا بسط کے ساتھ کچھ عرض کر دیا جائے۔

معتزلہ یا قدری یا اہل عدل و اسلام جو چاہئے کہئے وہ جماعت ہے جو مضبوط اور صاحب فکر و عمل جماعت ہے۔ اس کے شیوخ طلیق اللسان اور صاحب بیان تھے۔

یہ جماعت پہلی صدی ہجری کے اواخر میں پردۂ ظہور پر آئی۔ یہ زمانہ ہے کہ خوارج کا ایک فرقہ "ازارقہ"[1] زوروں پر ہے۔

بصرہ اور اہواز میں خاص طور سے اس کے اثرات ونقوش قائم تھے۔ ان کا معاملہ بہت زیادہ خطرناک ہوگیا تھا۔ عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت اور حجاج بن یوسف کے زمانۂ ولایت (عراقین) میں یہ صورت اور زیادہ سخت ہوگئی تھی۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کیا سمجھا جائے؟ یہ ایک سوال پیدا ہوا۔ ہر جماعت، ہر فرقہ اور مذہب نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، جن میں سے "ازارقہ" کا خیال یہ تھا کہ گناہ خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ اس کا مرتکب مشرک ہے۔ چونکہ اس فرقہ کے نزدیک مشرک کی اولاد بھی مشرک ہوتی تھی اس لئے عورتوں اور بچوں کا قتل واجب تھا، عام اس سے کہ وہ اہل اسلام سے ہوں یا کسی اور مذہب سے مگر ہوں "مشرک"۔ "صفریہ"[2] نے بھی ان کی موافقت کی لیکن ان کے خیال میں بچوں کا قتل ناجائز تھا۔ "نجدات"[3]

---

[1] خوارج کا سب سے بڑا فرقہ، نافع بن ازرق کی طرف منسوب ہے۔

[2] خوارج کا ایک فرقہ زیاد بن اصفر کی طرف منسوب ہے۔

[3] خوارج کا ایک فرقہ جو نجدہ بن عامر کی طرف منسوب ہے۔

کا فتویٰ یہ تھا کہ وہ گناہ کبیرہ جس پر امت نے اجماع کر لیا ہو اس کا مرتکب تو بلاشبہ مشرک و کافر ہے لیکن جس گناہ پر امت میں اختلاف ہو تو اسے اہل فقہ کے اجتہاد پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ "اباضیہ"[۱] کا قول یہ ہے کہ جس گناہ میں خدا کی طرف سے وعید ہو اور کرنے والا اسے جانتا ہو جو خدا کی طرف سے وعید آئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہو تو وہ کفران نعمت کا مرتکب ہوگا لیکن ایسا کافر نہیں ہوگا جس نے کفر یا شرک کیا ہو۔ حسن بصری اور ان کے ہم خیال بزرگوں کا خیال یہ ہے کہ مرتکب گناہ کبیرہ منافق ہے

لیکن جمہور امت کا فیصلہ یہ ہے کہ اس امت مومنہ کا مرتکب گناہ کبیرہ مسلمان تو ہے اپنے اس

اعتقاد کی بنا پر جو اس کو اللہ سے ہے اس کی نازل کی ہوئی

البتہ وہ اگر کوئی کبیرہ گناہ کرتا ہے تو وہ فاسق ہے لیکن

لوگ انھی تخیلات میں تھے کہ اسی زمانہ میں ایک

مسجد میں اپنی مجلس میں رونق افروز تھے۔ اس نے سوال کیا

جماعت پیدا ہو گئی ہے جو گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتی ہے۔ کبیرہ ان کے نزدیک ایسا کفر ہے کہ امت سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ تو ہوئے "وعیدیہ" (خوارج)۔ ایک دوسری جماعت ہے وہ کہتی ہے کہ ایمان کے ساتھ معصیت کچھ نقصان نہیں پہونچاتی اور کفر کے ساتھ اطاعت بے سود۔ یہ لوگ "مرجیہ" کہلاتے ہیں۔ پھر آپ اس بارہ میں کیا فرماتے ہیں؟" حسن بصری نے جب یہ سنا تو وہ غور کرنے لگے قبل اس کے کہ وہ کوئی رائے قائم کر کے جواب دیں واصل بن عطا جواب دے بیٹھے کہ صاحب گناہ کبیرہ نہ تو مومن مطلق ہے نہ کافر مطلق بلکہ وہ ان دونوں کے درمیانی راستہ میں ہے۔ حضرت حسن کو ان کی اس جلد بازی سے غصہ آگیا۔ وہ اس جرأت نازیبا پر خفا ہوئے تو واصل اپنے ساتھیوں کو لے کر اٹھ گئے، اور مسجد کے ایک ستون کے پاس بیٹھ کر اپنی رائے ظاہر کرنے لگے، اسباب و علل بیان کرنے لگے مقدمات و نتائج ترتیب دینے لگے۔ حسن بصری نے ایک شاگرد عمرو بن عبید کو واصل کے پاس مناظرہ کے لئے

---

[۱] خوارج کا ایک فرقہ جو عبداللہ بن اباض کی طرف منسوب ہے۔

پہلا مناظرہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمرو بن عبید بھی واصل سے مل گئے۔

معتزلہ نام کیوں پڑا؟ اس میں کئی اقوال ہیں مثلاً حسن بصری سے جب واصل نے مفارقت اختیار کی تو انھوں نے کہا "واصل ہم سے جدا ہو گئے"۔ قتادہ بن دعامہ حسن بصری کی وفات کے بعد جب ان کی مجلس میں بیٹھے تو انھوں نے عمرو بن عبید اور ان کے معتقدین کو "معتزلہ" کہا۔ وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ عمرو بن عبید اور ان کے اصحاب جب حسن بصری سے الگ ہو گئے تو "معتزلہ" کہلانے لگے۔

معتزلہ کے فقہا نے پانچ اصول بتائے ہیں کہ یہی مذہب اعتزال کی اساس و بنیاد ہیں جس نے ان کو پورے طور سے مانا وہی "معتزلی" ہے اور جس نے ان میں کچھ کم یا زیادہ کیا وہ اس "شرف" کا مستحق نہیں ہے۔

(۱) التوحید:۔۔۔ یعنی اس بات کا اعتقاد کہ خدا ایک ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے وہ قدیم ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے حادث ہے، جو اس کا ادراک کسی طرح بھی اس دنیا میں نہیں کر سکتے ہیں اور نہ آخرت میں وہ کسی طرح بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ایجاد کیا۔ وہ اشباہ و امثال سے قطعاً بری ہے، نہ کوئی مکان اس کا حصر کر سکتا ہے، نہ کوئی زمانہ اس کو محدود کر سکتا ہے۔ نہ وہ جسم ہے، نہ عرض ہے، نہ عنصر ہے، نہ جزو ہے، نہ جوہر ہے۔ وہ تمام چیزوں کا صورت گر ہے۔ وہ عالم بالذات ہے عالم بعلم نہیں۔ وہ قادر لذاتہ ہے، حی بالذات ہے۔ اس کے صفات بھی قدیم ہیں اور معانی اسی کے ساتھ قائم ہیں، قدم (قدامت) میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ اصول اقوال فرقۂ "مجسمہ"[۲] کے رد میں وضع کیا گیا ہے۔

(۲) العدل ۔۔۔ یعنی اس بات کا اعتقاد کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، فساد کو نہیں پسند کرتا ہے، اور شر کا صدور اس سے اسی وقت ہوتا ہے جب بندوں کے لئے اس میں کوئی مصلحت ہو اور اس سے

---

[۱] اعتزال کے معنی ہیں ترک کر دینا، چھوڑ دینا، الگ ہو جانا۔

[۲] ایک قدیم فرقہ جو اعضاء انسانی کی طرح اللہ کو بھی صاحب اعضا مانتا ہے۔

جو کچھ صادر ہوتا ہے وہ بندوں کی مصلحت کے لئے ہوتا ہے۔ بندوں سے جو خیر و شر، صلاح و فساد کے حرکات سرزد ہوتے ہیں ان کا انھیں پورا پورا بدلہ دیا جائیگا یعنی اچھی باتوں پر ثواب اور بری باتوں پر عذاب اس لئے کہ ان کو جو قدرۃ تفویض کی گئی ہے اس کی بنا پر وہ خلق افعال پر قادر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو وہ قوۃ و قدرت جب چاہتا سلب کر لیتا اور جب چاہتا باقی رہنے دیتا۔ اگر چاہتا تو مخلوق کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا تھا اور معصیت سے روک سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اپنے بندوں کو اس نے ایسی تکلیف نہیں دی جو ان کی طاقت سے باہر ہو اور نہ ایسی بات چاہتی جو ان کی مقدرت [illegible] ہو، اور اللہ تعالیٰ نے حسنات کے کرنے کا حکم دیا ہے [illegible]
جن سے اس نے منع فرمایا ہے کوئی شخص کسی چیز پر قادر نہیں

ہے۔

یہ اصول "مجبرہ"[1] کے خلاف وضع کیا گیا ہے جن کے

(۳) الوعد والوعید ـــــ یعنی اس بات کا اعتقاد کہ اللہ تعالیٰ سادق الوعد اور وعید کا نافذ کرنے والا ہے۔ جو مسلمان طاعت و استقامت پر وفات پاتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ نوازتا ہے۔ اگر کسی شخص نے گناہ کبیرہ کیا ہو اور بغیر توبہ کے مرگیا ہو تو وہ دائمی طور سے جہنم کا مستحق ہے لیکن اس کا عقاب کافر کی سزا سے کم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشادات بدلتے نہیں ہیں۔

یہ اصول ان لوگوں کے خلاف وضع کیا گیا ہے جو جواز کذب باری کے قائل ہیں۔

(۴) اسماء و احکام ـــــ یعنی اس کا اقرار کرنا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ کافر ہے نہ مومن بلکہ بین بین ایک چیز ہے لیکن اس کا شمار کفر و اسلام کے درمیانی راستہ یعنی "فسق" میں ہوگا۔ اگر وہ اسی

---

[1] ایک فرقہ جس کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان مجبور محض ہے۔

[2] جہم بن صفوان ترمذی، فارسی الاصل، فرقۂ جبریہ کے سردار، فرقۂ "جہمیہ" انھی کی طرف منسوب ہے۔ سنہ ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔

فسق کی حالت میں مرگیا تو جہنم کا دائمی عذاب ہے اور وہ ہے۔ ہاں کافروں کا سا خلود فی النار نہیں ہوگا۔

یہی وہ اصل الاصول ہے جسے اعتزال کی جڑ کہنا چاہیئے اس لئے کہ واصل بن عطا اور عمرو بن عبید کے نزدیک عبارت ہے عادات وخصائل خیر سے۔ اگر خصائل خیر کسی شخص میں جمع ہیں تو بلاشبہ وہ مومن ہے۔ مومن ایک اسم مدح ہے اور فاسق چونکہ اس خیر سے خالی ہوتا ہے اس لئے وہ اس کا مستحق کب ہے کہ وہ بھی اس شرف سے مشرف ہو؟ اس لئے نہ اسے مومن کہتے ہیں نہ کافر اس لئے کہ خصائل خیر اور اس کی ماتحت چیزوں کا وہ انکار نہیں کرتا لیکن اگر دنیا سے بغیر توبہ کئے ہوئے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے بعد رخصت ہو جائے تو بلاشبہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اس لئے کہ دار الجزا میں "یا تو جنت ملے گی یا دوزخ" (فریق فی الجنۃ وفریق فی السعیر)[ؔلہ]۔

(۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر — یعنی اس بات کا اقرار کہ اہل ایمان حدود خداوندی کے بجالانے پر مکلف ہیں اور یہ جو تکالیف ہیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر لطف ہے۔ مقصد صرف امتحان ہے اور اس کی آزمائش کہ وہ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں یا نہیں؛ اور ہر مسلمان پر یہ واجب ہے کہ ان باتوں کی طرف دعوت دے اور جو مخالفت کرے اُسے خدا سے ڈرائے۔

یہ اصول اس آیۂ پاک کی تعمیل ارشاد ہے "ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر"

یہ ہیں وہ اصول پنجگانہ جنھیں فقہاء معتزلہ نے ترتیب دیا ہے لیکن امام وامامت کے بارے میں بھی ان کا ایک خاص مسلک ہے یعنی انتخاب امام امت کا حق ہے وہ جس میں اس کی صلاحیت دیکھے کہ احکام خداوندی کا اجرا کر سکتا ہے اور حدود شریعت نافذ کر سکتا ہے خواہ وہ قریش سے ہو یا کسی اور قبیلہ سے اسے وہ منتخب کرے اس لئے کہ معتزلہ کسی شخص یا قبیلہ کے لئے امامت کو مخصوص نہیں سمجھتے ہیں۔ "نجدات" کے علاوہ تمام خوارج اور "زیدیہ" کی ایک جماعت معتزلہ سے متفق ہے

ؔلہ اس سے خلود فی النار کہاں سے ثابت ہوتا ہے؟ (مترجم)

وہ یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت فرمایا کہ اگر سالمؓ موجود ہوتا تو میں بلا تامل
خلافت اسے سونپ دیتا۔ سالمؓ ایک انصاریہ عورت کے غلام تھے، عام طور سے سالمؓ "مولی ابی حذیفہؓ"
کے نام سے مشہور ہیں تو حضرت عمرؓ اگر امامت کو سارے مسلمانوں کے لیے جائز نہ سمجھتے ہوتے تو یہ بات
کیسے فرماتے؟ اور سالم کی وفات پر اظہار تاسف کیوں کرتے؟ اس باب میں امام ابوحنیفہؒ اکثر مرجیہ،
زیدیہ میں سے بھی غالب تعداد، تمام شیعہ اور راوندیہ کا اختلاف ہے، یہ لوگ سوا قریش کے اور کسی
کو امامت کا مستحق نہیں سمجھتے ہیں اور دلیل یہ لاتے ہیں "الامامۃ فی قریش"۔

فرقہ معتزلہ کے بانی واصل بن عطا اور عمرو بن عبید کی جب وفات ہوئی ... اس وقت تک
کتب فلسفہ، حکمت، منطق، طبیعیات اور الٰہیات وغیرہ کا یونانی ...
زبانوں سے ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں نے اپنی وفات کے
حالت میں چھوڑا تھا، دلائل و براہین سے محکم کرنے کی کوئی ضرورت
فصاحت بدویت، قوت بیان اور زور زبان پر اس عمارت کی تعمیر ہوئی ... جب ...
عباسیہ میں یہ علوم عربی میں منتقل کئے گئے تو لوگوں نے بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ اسی زمانہ
میں علم کلام کی ابتدا ہوئی جس میں ابوالہذیل علاف، ابواسحٰق ابراہیم بن سیار النظام خاص طور سے معروف
و ممتاز ہیں، پھر ہمارے "ہیرو" جاحظ کی باری آتی ہے جس کا سارا عالم معترف ہے۔

جاحظ اور اعتزال تفصیل بالا سے معلوم ہوچکا ہے کہ اسلام میں اعتزال کی نشو و نما کیوں کر ہوئی،
واصل بن عطا اور عمرو بن عبید نے اپنے استاذ حسن بصری سے کیوں مفارقت اختیار کی، معتزلہ نام
کیوں پڑا، ان لوگوں کے عقائد کیا ہیں، اصول کیا ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوچکا کہ ابتدا میں یہ مسئلہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا، لیکن اس کے باوجود بعد میں
اس میں بھی فرقے بنے، جماعتیں قائم ہوئیں، جتھہ بندی ہوئی اور جدل و بحث کا بازار گرم ہوا۔

جاحظ چونکہ شیوخ معتزلہ میں سے تھا وہ مخصوص رائے کا مالک تھا اور اپنی رائے میں
بہتوں سے منفرد بھی تھا اور ایک جماعت کی جماعت اس کی پیرو بھی تھی اس لئے ایک پورا فرقہ

"جاحظیہ" کے نام سے قائم ہو گیا" اس کی کتابوں میں اعتزال کے متعلق جو کچھ ملتا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو اس کے "عنایت فرماؤں" نے ازراہ عداوت و خصومت اس کے سر تھوپا ہے۔
ابن راوندی[1]، بغدادی[2]، ابن حزم اور شہرستانی[3] کو اس سے خاص طور سے عداوت تھی۔
ان لوگوں نے جاحظ کی طرف طرح طرح کے قول منسوب کئے ہیں جو اس کے ہرگز نہیں ہیں۔ اور انہی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ آگے بھی یہ سلسلہ جاری رہنے دیا۔ بعض کا اس کے انصار و احباب نے جواب بھی دیا ہے مثلاً مقریزی نے شہرستانی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاحظ کہا کرتا تھا کہ قرآن منزل از قبیل اجسام و اجساد ہے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ آدمی ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حیوان، ظاہر ہے اس سے بڑھ کر کذب صریح اور افترا محض کیا ہو سکتا ہے؟ کون اسے یقین کر سکتا ہے کہ جاحظ ایسی گری ہوئی باتیں بھی کر سکتا ہے؟ حیرت ہے کہ شہرستانی نے ابن راوندی سے ایسی سخیف بات روایت کیسے کر دی؟ اگرچہ ابو الحسین خیاط نے اپنی کتاب "الانتصار" میں ان تمام مطاعن کی تردید کر دی ہے جو ابن راوندی نے معتزلہ پر عائد کئے تھے، بالخصوص جاحظ کی بہت صفائی دی ہے، جاحظ کے نقائص و معائب جو مشہور کئے تھے ان کا ایک ایک کا چن چن کر جواب دیا ہے، جوابات حد درجہ دلائل و براہین سے مستحکم ہیں لیکن اس قول کا اشارہ بھی اس نے نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ابو الحسن اشعری نے اپنی کتاب "مقالات الاسلامیین" میں وہ تمام روایات جمع کر دیے ہیں عام اس سے کہ وہ اہمیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن اس قول کا ذکر کا انھوں نے ذکر بھی نہیں کیا ہے۔

---

[1] ابو الحسین احمد بن یحییٰ الراوندی، انشا پرداز اور فیلسوف تھے۔ ان پر زندقہ کا الزام لگایا جاتا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ توبہ کے بعد ان کا انتقال ہوا، سنہ وفات ۲۹۰ھ۔

[2] ابو منصور عبد القاہر بن طاہر التمیمی البغدادی صاحب کتاب "الفرق بین الفرق" ۴۲۹ھ میں بمقام بغداد فوت ہوئے۔

[3] ابو الفتح محمد بن عبد الکریم الشہرستانی صاحب کتاب الملل والنحل عالم فاضل فقیہ محقق متکلم سب ہی کچھ تھے ۴۷۹ھ میں بمقام شہرستان تولد ہوئے، ۵۴۸ھ میں بمقام شہرستان وفات پائی۔

ابن قتیبہ' ابن حزم اور بغدادی سب کے سب جاحظ کے دشمن ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی یہ قول نہیں نقل کیا ہے۔ اگر ان لوگوں میں سے کوئی شخص اشارۃً یا تعریضی کے طور پر جاحظ سے اس لغزش کا صدور پالیتا تو ساری دنیا اس کے طعن وتشنیع اور تحقیر واہانت سے بھر جاتی۔ لہذا ثابت ہوا کہ یہ قول بالکل غلط ہے اور کوئی عقلمند ایسی احمقانہ بات نہیں کہہ سکتا۔

ابن راوندی کا ایک اور افترا جاحظ پر یہ ہے کہ اس کا قول ہے کہ یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اجسام کو ان کے وجود کے بعد معدوم کرسکے۔ اس پر ابن راوندی کہتے ہیں کہ اگر وجود کے بعد کسی جسم کا معدوم کر دینا محال ہے تو عدم کے بعد اس کا وجود بھی ممکن نہیں ہے۔"

خیاط کہتا ہے' جاحظ غریب پر یہ بھی یہ بہت بڑا کذب ہے' کسی آدمی [illegible] منسوب ہوتا ہے اس کی صداقت جانچنے کے دو ہی معیار ہیں ایک تو یہ

روایت کرتے ہوں' دوسرا یہ کہ اس کی کتابوں اور رسالوں

کی کتابوں میں یہ قول پایا جاتا ہے؟ اس کی کتابیں تو مشہور عالم ہیں

اصحاب میں سے اس کی کوئی روایت کرتا ہے؟ یہ بھی نہیں' کسی آدمی کی وفات کے بعد یہی دو صورتیں ہیں جن سے صداقت معلوم ہوسکتی ہے اور جب ان سے پتہ نہیں چلتا تو ظاہر ہے یہ بالکل کذب ہے' بہتان ہے۔

اس کی کتابیں "نظم القرآن" "اثبات النبوۃ" وغیرہ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسے اسلام سے کتنی محبت تھی اور خدائے تعالیٰ اس کے اس عمل خیر کو ضائع نہیں فرمائے گا۔

ابن راوندی ہمیشہ معتزلہ کو تشنیع وطعن سے بدنام کیا کرتے تھے' انھوں نے جاحظ پر ایک الزام یہ بھی لگایا تھا کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض تھا' نعوذ باللہ من ذالک۔

خیاط نے اس کی بھی تردید کی ہے کہ ابن راوندی کا جاحظ پر بغض رسول اللہ کا الزام لگانا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دوست ودشمن میں تمیز نہیں کرسکتے اس لئے کہ جاحظ سے زیادہ کسی متکلم نے نظم قرآن اور احتجاج نبوت پر ایسی کتابیں نہیں لکھیں جو مدلل ومل ہوں' اثبات رسالت

اور صحیح احادیث و اخبار میں اس کی کتابیں مشہور ہیں اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس سے زیادہ موکد چیز حب رسول اور تصدیق نبی پر پیش نہیں کی جا سکتی۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ بڑے قوی دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ اس پر الزام لگایا جاتا ہے وہ سراسر بہتان ہے۔ وہ جاحظ ہی تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی تصحیح کی (جو غلط فہمی کی وجہ سے غلط سمجھا جاتا تھا) اور ثابت کر دیا کہ سب سے زیادہ اشرف و اطہر نسب حضور ہی کا تھا (کسی گزشتہ باب میں جہاں ام نضر کے نسب سے بحث کی گئی ہے اس سے حضور کا نسب ثابت ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

جاحظ اور ابن زیات و ابن داؤد[1] امراء دولت عباسیہ میں جاحظ ایک ممتاز مرتبہ کا مالک تھا۔ وہ سب کے سب اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے تھے اسے پسند کرتے تھے اور اس کے درجہ کو بلند سمجھتے تھے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ جاحظ اس کی پارٹی میں شریک ہو جائے۔ اس نے بجائے ابوداؤد کے جو قاضی تھے ابن زیات کو جو وزیر تھے ترجیح دی اور انہیں کے ساتھ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حیلہ جوؤں اور چغلخوروں کی گرم بازاری ہو گئی اور وزیر و قاضی دونوں ہی متاثر کئے جانے لگے۔ ابن زیات کے اتنے کان بھرے گئے کہ اس نے جاحظ کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ جاحظ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس سے پوچھا گیا تم بھاگے کیوں؟ اس نے کہا بھائی میں ڈرا کہ تنور میں نہ جھونک دیا جاؤں۔ (ابن زیات نے ایک تنور بنوایا تھا۔ جس سے خفا ہوتا تھا اسے اس میں ڈلوا دیتا تھا۔ جب تک وہ مر نہیں جاتا تھا تنور سے گلو خلاصی ممکن نہیں تھی۔) آخر پھر وہ پکڑے گئے اور قاضی ابوداؤد کے حضور میں پیش کئے گئے' اس حالت میں کہ گردن زنجیر سے بندھی ہوئی تھی' پیر بھی جکڑے ہوئے تھے' اور ایک پھٹی پرانی قمیص زیب بر تھی۔ قاضی کی جب اس پر نظر پڑی تو انہوں نے کہا خدا کی قسم تو بڑا فراموش کنندۂ نعمت ہے' لیکن شکر ہے زمانہ نے تجھے زیادہ مہلت نہیں دی۔

---

[1] یا ابن دواد (؟) مترجم۔

جاحظ : اگر آپ مجھے بخش دیں تو انتقام سے یہ کہیں اچھا ہوگا۔

ابن ابی داؤد : خدا تجھے غارت کرے کمبخت، خدا کی قسم تو بہت بڑا لفاظ ہے۔ بتلا اس آیت کی تاویل کیا کرتا ہے؟ "وکذلک اخذ ربک اذا اخذ القری وہی ظالمۃ ان اخذہ الیم شدید"

جاحظ : خدا قاضی صاحب کو اعلیٰ مرتبہ دے۔ اس کی بہترین تاویل اس کی تلاوت ہے۔

ابن ابی داؤد : آہنگر کو بلاؤ۔

جاحظ : خدا قاضی کو سربلند کرے۔ کس لئے؟ زنجیریں توڑنے کے لئے یا اس میں اور اضافہ کے لئے؟

قاضی : تاکہ تجھ سے دور کردی جائیں۔

پس آہنگر لایا گیا۔ اہل مجلس میں سے بعض نے اشارہ کیا کہ زنجیر اتارتے وقت ... ذرا دیر تک کام کرے۔ بس پھر کیا تھا جاحظ نے ایک آفت برپا کردی اور کہنے لگا ... بلکہ ایک دن کا ایک گھنٹہ میں، بلکہ ایک گھنٹہ کا ایک منٹ میں ... جسم اور جبہ کی پرواہ نہیں ہے۔ اس پر قاضی صاحب اور دوسرے ... محمد بن منصور سے کہا میں اس کے ظرف پر تو اعتماد کرتا ہوں لیکن اس کے دین پر نہیں ... سے کہا اسے حمام میں لے جاؤ۔ پھر زنجیر وغیرہ اتار دی گئی اور وہ حمام میں داخل کیا گیا۔ پھر اچھے اچھے کپڑے پہنا کر مجلس میں لایا گیا۔ قاضی نے کہا ابو عثمان اب کیا کہتے ہو؟ جاحظ بڑی دیر تک خوشامد اور تملق کی باتیں کرتا رہا۔

عروض و شعر سے دلچسپی | جاحظ کی خواہش تھی کہ فن عروض و شعر میں بھی وہ مرتبہ کمال پر پہونچے، لیکن طبیعت کو زیادہ مناسبت تھی نہیں، اس لئے وہ اپنی اس آرزو میں ناکام ہی رہا۔ پھر اس کی جولانگہ نثر ہی رہی۔ وہ کہا کرتا تھا اصمعی سے میں نے شعر حاصل کرنا چاہا سوا غریب و نادر اشعار کے اسے اور کچھ نہیں آتا تھا، پھر میں اخفش کے پاس پہونچا اسے سوا اعراب کے اور کچھ نہیں معلوم تھا، پھر میں نے ابوعبیدہ کا رخ کیا وہ اخبار، انساب اور لڑائیوں کے علاوہ ہر چیز میں کورے تھے۔ جو کچھ میں چاہتا تھا اس میں سوا انشا پردازوں کے اور کسی سے اپنا مطلب نہ حاصل کرسکا۔

جس زمانہ میں اس کو اس فن کے حاصل کرنے کا جنون سوار تھا وہ کہا کرتا تھا عروض شعر کے لئے میزان و معیار رکھتا ہے۔ صحیح و سقیم اور خوب و زشت کا فرق اسی سے معلوم ہو سکتا ہے۔
لیکن جب اپنی اس تمنا میں ناکام رہا اور کامیابی کی کوئی صورت بظاہر نظر نہ آئی تو کتنی دلچسپ بات کہی، کہتا ہے:

عروض ایک مردود علم ہے، ایک مجہول کلام ہے، عقول پر برا اثر ڈالتا ہے۔ مستفعل اور مفعول کے سوا اس میں رکھا کیا ہے؟ اس سے نہ حاصل نہ محصول۔"

شعر کے متعلق اس کی رائے کتنی نپی تلی ہے، کہتا ہے:

"شعر کی فضیلت تو بس عرب ہی کے لئے ہے اور وہی کہہ سکتا ہے جو عربی جانتا ہو شعر کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے کسی دوسری زبان میں نقل کیا جا سکتا ہے اور اگر ایسا کیا بھی جائے تو اس میں پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے اس کی پسندیدگی رخصت ہو جاتی ہے اور وہ نثر کی طرح ہو کے رہ جاتا ہے۔ ہندوستان کی کتابوں کا ترجمہ ہوا، یونان کی حکمتیں عربی میں منتقل کی گئیں، فارسی زبان کا ادب بھی لیا گیا، اس ترجمہ کے بعد بعض کے حسن میں تو اضافہ ہوا اور بعض یونہی ناقص، الخ۔"

کتابوں کی تعداد اور ان کا مختصر تعارف | مسعودی کا قول ہے کہ جاحظ کی کتابوں سے ذہن میں جلا پیدا ہوتی ہے، اس کی کتابیں ہر اعتبار سے بے نظیر و لاجواب ہیں۔ جب اسے شبہہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس سنجیدہ مضمون کو پڑھتے پڑھتے اکتا گیا ہوگا، تو وہ سنجیدگی سے ظرافت کا روپ بدل دیتا ہے اور ایسی پر مذاق باتیں کرتا ہے کہ آدمی کا سارا تکدر رفع ہو جاتا ہے۔ اس کی تمام کتابیں اسی خصوصیت سے مخصوص ہیں۔ جماعت معتزلہ میں سلف و خلف کسی میں بھی ایسا فرد فرید نہیں پایا جاتا۔

میں نے اس کی کتابوں کی استقصا میں اس کی کتاب "الحیوان" پر اعتماد کیا ہے۔ یاقوت نے اپنی "معجم الادباء" میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس سے بھی میں نے خوشہ چینی کی ہے، اس کے علاوہ دوسری کتب و اسفار بھی پیش نظر رہی ہیں۔ میں نے اس کی بھی کوشش کی ہے کہ بعض نساخوں نے جاحظ کی

کتابوں کے جو مختلف عنوانات دے کر لوگوں کو اس تکرار کی وجہ سے مغالطہ میں ڈال دیا ہے اسے بھی رفع کروں، میں نے چاہا ہے کہ فہرست بہت صحیح ثابت ہو ترتیب حروف ہجا کا لحاظ رکھا ہے ملاحظہ ہو:

(۱) کتاب آل ابراہیم بن المدبر: فن مکاتبت میں۔

(۲) کتاب آی القرآن: جاحظ کہتا ہے اس کتاب میں میں نے وہ تمام آیات قرآنی جمع کردی ہیں جن سے ایجاز و حذف اور زوائد و فضول واستعارات کا فرق معلوم ہو سکے۔

(۳) رسالہ فی اثم السکر: بدمستی کے گناہ کے بیان میں۔

(۴) رسالہ الی ابی النجم وجوابہ

(۵) کتاب احالۃ القدرۃ علی الظلم

(۶) کتاب الاحتجاج لنظم القرآن

(۷) کتاب احدوثۃ العالم

(۸) کتاب الاخبار۔ دو کتابیں اور ذکر کی۔

دوسری "تصحیح الاخبار" غالباً ایک ہی کتاب ہے

(۹) کتاب الاخطار والمراتب والصناعات۔

(۱۰) کتاب اخلاق الشطار۔

(۱۱) کتاب اخلاق الفتیان وفضائل اہل البطالۃ: کتاب التاج میں ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی طرف غلط طور سے منسوب کردی گئی ہے۔

(۱۲) کتاب اخلاق الملوک

(۱۳) کتاب الاخوان

(۱۴) کتاب الاستبداد والمشاورۃ فی الحرب

(۱۵) کتاب الاستطاعۃ وخلق الافعال: یہ کتاب ان کتابوں میں ہے جن میں جاحظ نے مذہب اعتزال کو ثابت کیا ہے۔

(۱۶) کتاب استطالۃ الفہم:۔ قاضی شہاب الدین خفاجی نے اپنی کتاب طراز المجلس میں لکھا ہے
کہ جاحظ نے اس میں حکما و شعرا کا ذکر کیا ہے۔

(۱۷) رسالہ فی استنجاز الوعد

(۱۸) کتاب الاسد والذئب

(۱۹) کتاب اصحاب الالہام

(۲۰) کتاب الاصنام:۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں جاحظ نے جاہلیت عرب کے اصنام کا تذکرہ
کیا ہے اور اسی میں نضر بن کنانہ جد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصحیح کی ہے۔

(۲۱) کتاب اصول الفتیا والاحکام

(۲۲) الاعتزال وفضلہ:۔ شاید یہ وہی کتاب ہے جو جاحظ نے "فضیلۃ المعتزلہ" کے نام سے
ابن راوندی کی "فضیحۃ المعتزلہ" کے جواب میں لکھی تھی۔

(۲۳) کتاب افتخار الشتا والصیف

(۲۴) کتاب افعال الطبائع

(۲۵) کتاب اقسام فضول الصناعات ومراتب التجارات

(۲۶) کتاب الامامۃ علیٰ مذہب الشیعہ:۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی رسالہ ہو جو اس نے "بیان مذہب
الشیعہ" کے نام سے لکھا تھا۔

(۲۷) کتاب امامت معاویہ بن ابی سفیان:۔ اس میں رجال مروانیہ کا ذکر ہے اور بنی امیہ
کی تائید ہے۔

(۲۸) کتاب امامت ولد العباس:۔ اس میں وہ مذہب پر دلیلیں لایا ہے اور قصہ فدک کا
بھی ذکر کیا ہے، حضرت فاطمہ اور حضرت ابوبکر کی گفتگو بھی نقل کی ہے، یہ اور اس کے
علاوہ اور بہت سی چیزیں جو اس موضوع سے تعلق رکھتی ہیں بیان کی ہیں۔

(۲۹) رسالہ فی امتحان عقول الاولیاء

(۴۰) کتاب الامثال

(۴۱) کتاب الامصار:۔ شاید یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر مسعودی نے "البلدون" کے نام سے کیا ہے۔ ہم نے احتمال مغائرت کے سبب یہاں ذکر کر دیا۔

(۴۲) رسالہ فی الامل والمامول

(۴۳) کتاب امہات الاولاد

(۴۴) کتاب الانس والسلوۃ

(۴۵) کتاب الاوفاق والریاضیات

(۴۶) کتاب البخلا:۔ جاحظ کی نہایت بدیع کتا
تدبیر منزل کے اصول اس سے استف
نفع اٹھایا جائے؟ یہ اور بہت سی
بمقام مصر طبع ہو چکی ہے۔

(۴۷) کتاب بصیرۃ غنام الرشد۔

(۴۸) کتاب البلدان:۔ جیسا کہ گزر چکا ہے کیا عجب کہ "کتاب الامصار" یہی ہو۔ ہم نے احتمال مغائرت کے سبب یہاں بھی لکھ دیا۔

(۴۹) کتاب البیان والتبیین:۔ جاحظ نے یہ بے نظیر کتاب لکھی اور قاضی احمد بن ابی داؤد کے حضور میں پیش کی جس کا صلہ پانچ ہزار دینار کی صورت میں ملا متقدمین میں سے اکابر علما اور اعاظم ادبا کا اس پر اجماع ہے کہ ادب میں سب سے بہتر کتاب ہے۔ مسعودی کا قول ہے کہ جاحظ کی بہت بے نظیر کتابیں ہیں لیکن "البیان والتبیین" سب میں فائق ہے اس لئے کہ اس میں نثر و نظم منتخب و چیدہ اشعار بلیغ سے بلیغ خطبے بہتر خوبی کے ساتھ جمع ہیں۔ ابن خلدون کا قول ہے کہ مکتب درس میں ہم نے اپنے اساتذہ سے سنا ہے کہ فن ادب کے اصول وارکان میں چار چیزیں سب سے

زیادہ خصوصیت رکھتی ہیں ایک تو "کامل اللمبرد" دوسری کتاب البیان والتبین للجاحظ تیسرے "کتاب النوادر لابی علی القالی" چوتھے "ادب الکاتب لابن قتیبہ"۔ ان چار کے علاوہ جو کچھ ہے اسے انھیں کا "فروع" سمجھنا چاہئے۔ مطبع جوائب نے ۱۳۰۱ھ میں بہ مقام قسطنطنیہ اسے شائع کیا۔ پھر ۱۳۴۵ھ-۱۹۲۶ء میں میرے اہتمام سے مصر سے شائع ہوئی۔

(۴۰) رسالہ فی بیان مذاہب الشیعہ :۔ دیکھو نمبر ۲۶

(۴۱) کتاب تحصین الاموال

(۴۲) کتاب التربیع والتدویر :۔ یہ بھی نہایت عجیب وغریب کتاب ہے۔ اپنے ایک کرمفرما احمد بن عبدالوہاب کی بدصورتی کا جواب دیا ہے اور ثابت کیا ہے وہ نہایت حسین وجمیل تھے۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے خرافات واساطیر ہیں لیکن عبارت کی شستگی اور معانی ومفاہیم کی دقت نظر بہت زیادہ داد طلب ہے۔ ۱۹۰۳ء میں بمقام لندن رسالہ "مناقب الترک" ورسالہ "فخر السودان علی البیضان" کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔

(۴۳) کتاب تصویب علیؓ فی تحکیم الحکمین :۔ یہ کتاب اب ناپید ہے۔ صرف ایک ٹکڑا ہماری ہاتھ لگا ہے جس میں حضرت علی کے قبول تحکیم کا ذکر ہے۔

(۴۴) کتاب التفاح

(۴۵) کتاب تفضیل صناعۃ الکلام :۔ مسعودی کہتا ہے کہ "ہاشمیہ" کے نام سے بھی یہ رسالہ مشہور ہے۔

(۴۶) رسالہ فی تفضیل النطق علی الصمت :۔ ۱۳۲۴ھ میں بمقام مصر طبع ہو چکا ہے۔

(۴۷) کتاب التفکر والاعتبار

(۴۸) کتاب التمثیل

(۴۹) کتاب جمہرۃ الملوک

(۵۰) کتاب الجوابات

(۵۱) کتاب جوابات کتاب المعرفہ

(۵۲) کتاب الجواری

(۵۳) رسالۃ الحاسد والمحسود :۔ ۱۳۲۴ھ میں بمقام مصر طبع ہو چکا ہے

(۵۴) کتاب حانوت عطار

(۵۵) کتاب الحجات :۔ قاضی شہاب الدین خفاجی نے اپنی کتاب "طراز المجالس" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۵۶) کتاب الحجۃ فی تثبیت النبوۃ

(۵۷) کتاب الحجر والنبوۃ

(۵۸) کتاب الحزم والعزم

(۵۹) کتاب حکایۃ قول اصناف الزیدیہ

(۶۰) رسالۃ الحلیہ

(۶۱) کتاب حیل اللصوص :۔ ابو منصور بغدادی نے اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جاحظ نے اپنی اس مہمل کتاب کے ذریعہ سے چوری کی تعلیم دی ہے۔ ظاہر ہے یہ اس کے ایک دشمن کا قول ہے۔ اگر کتاب ہمارے پاس موجود ہوتی تو صدق و کذب کا پتہ چلانا آسان تھا۔

(۶۲) کتاب حیل المکدین :۔ ابو منصور بغدادی نے اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۶۳) کتاب الحیوان :۔ جاحظ نے یہ کتاب محمد بن عبد اللہ الزیات کو بھیجی، تو اس نے اس پر پانچ ہزار دینار مرحمت فرمائے۔ جاحظ کی نہایت بہترین کتابوں میں سے ہے۔ ابو منصور بغدادی جن کو جاحظ پر تہمت تراشیوں اور معتزلہ کی عیب جوئیوں میں کمال حاصل ہے، یہاں بھی باز نہیں آئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ بھی "خوشہ چینیوں" کا نتیجہ

ہے کچھ ارسطو سے لے لیا کچھ رائی سے اور کتاب الحیوان تیار کردی لیکن یہ دعوے محض ہے عبداللطیف بغدادی کی تلخیص "اختصار کتاب الحیوان" کے نام سے اور ابن سینا کی تلخیص "اور دمع الحیوان" کے نام سے موجود ہے اور خود کتاب الحیوان بھی ۱۳۲۵ھ میں بہ مقام مصر ۷ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے اس سے تو جاحظ کے مفاخر و محاسن کا پایہ بلند ہی ثابت ہوتا ہے۔

۶۴۔ رسالۃ فی الخراج

۶۵۔ کتاب خصومۃ الحول والعور۔

۶۶۔ کتاب خلق القرآن

۶۷ کتاب الدلالۃ علی ان الامامۃ فرض

۶۸۔ کتاب ذکر ما بین الزیدیۃ والرافضۃ

۶۹۔ رسالۃ فی ذم اخلاق الکتاب مطبع سلفیہ نے ۱۳۴۴ھ میں اسے شائع کیا ہے،

۷۰ کتاب ذم الزنا۔

۷۱ کتاب فی ذم النبیذ

۷۲ رسالہ فی ذم الوراقۃ

۷۳ رسالہ فی الرد علی الجہمیہ

۷۴ رسالہ فی الرد علی القولیہ

۷۵ کتاب الرد علی النصاری ۱۳۴۴ھ میں مطبع سلفیہ اسے شائع کر چکا ہے

۷۶ کتاب الرسائل الہاشمیات۔

۷۷ کتاب الرد علی من الحد فی کتاب اللہ

۷۸ کتاب الرد علی من زعم ان الانسان جزء لا یتجزی

۷۹ کتاب الرد علی العثمانیہ

۸۰. کتاب الرد علی الشیعہ

۸۱. کتاب الرد علی الیہود

۸۲ کتاب الزرع والنخل والزیتون والاعناب جاحظ نے یہ کتاب ابراہیم بن عباس الصولی
کو دی جو میر منشی تھا، بیجی اس نے پانچ ہزار دینار عنایت کئے،

۸۳ کتاب السلطان و اخلاق اہلہ

۸۴ رسالۃ الشارب والمشروب

۸۵ کتاب الفرحا والبخار۔

۸۶ کتاب لصناعۃ الکلام۔ شاید یہ وہی کتاب
سلسلہ میں ہو چکا ہے۔

۸۷ کتاب الصوالجۃ۔

۸۸ رسالہ فی طبقات المغنیین جس کا ایک ٹکڑا ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے

۸۹ کتاب الطفیلیین

۹۰ کتاب العالم والجاہل

۹۱ کتاب العباسیہ۔ شاید یہ کتاب وہی ہے جس کا ذکر "امامۃ ولد العباس" کے سلسلہ
میں ہو چکا ہے۔

۹۲ کتاب العثمانیہ۔ میرے پاس یہ کتاب اور اس کا نقض "نقض العثمانیہ للاسکافی" موجود
ہے۔ عنقریب میں دونوں کو شائع کرنے والا ہوں

۹۳ کتاب العرب والعجم

۹۴ کتاب العرب والموالی

۹۵ کتاب العرجان والبرصان

۹۶ رسالہ فی العشق والنساء ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے

۹۷ رسالۃ فی العفو والصفح

۹۸ کتاب عناصر الآداب

۹۹ کتاب غش الصناعات۔ ابومنصور بغدادی کا خیال ہے کہ جاحظ نے اس کتاب سے
تاجروں کی تجارت کو بہت نقصان پہنچایا۔

۱۰۰ رسالۃ فی فخر السودان علی البیضان ۱۳۲۴ھ میں شائع ہو چکا ہے

۱۰۱ کتاب فخر عبد شمس مخزوم

۱۰۲ کتاب فخر ہاشم و عبد شمس۔ میرے پاس یہ کتاب موجود ہے، عنقریب میں اسے شائع
کرنے والا ہوں

۱۰۳۔ رسالہ فی فرط جہل الکندی[1]

۱۰۴ کتاب فرق بین الجن والانس

۱۰۵ کتاب فرق بین الملائکۃ و الجن

۱۰۶ کتاب فرق ما بین النبی والمتنبی

۱۰۷ رسالۃ فی فضل اتخاذ الکتب

۱۰۸ کتاب۔ فضل ما بین الرجال والنساء

۱۰۹ کتاب فضل العلم

۱۱۰ کتاب فضل الفرس علی الھملاج

۱۱۱۔ کتاب فضیلۃ المعتزلۃ۔ ابوالحسین خیاط نے اپنی کتاب "الانتصار" میں اس کا ذکر کیا ہے

۱۔ ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق الکندی، اسلام کا مشہور فیلسوف سلسلۂ نسب ملوک کندۃ تک پہنچتا ہے، وہ پہلا شخص ہے
جس نے مسلمانوں میں علوم فلسفہ میں بہت شہرت حاصل کی ہے۔ حدوث عالم کے بارے میں مذہب افلاطون کا پیرو تھا
مختلف علوم و فنون میں اس کی متعدد تصانیف موجود ہیں اپنی وسعت علم کے باوجود بخیل حد درجہ کا تھا، اور جاحظ نے کتاب

کیا عجب کہ یہ وہی کتاب ہو جس کا ذکر الاعتزال وفضلہ کے نام سے ہو چکا ہے،
ابن اراوندی نے اس کا رد "فضیحۃ المعتزلہ" کے نام سے لکھا تھا۔

۱۱۲ کتاب فضیلۃ الکلام۔ یہ ان کتابوں میں ہے۔ جو کئی ناموں سے مشہور ہیں

۱۱۳۔ کتاب القحاب۔ ابومنصور بغدادی نے اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں ذکر کیا ہے

۱۱۴۔ کتاب القحطانیہ والعدنانیہ۔

۱۱۵۔ کتاب القضاۃ والولاۃ

۱۱۶۔ رسالۃ فی القلم۔

۱۱۷۔ کتاب القواد۔ قاضی شہاب الدین خفاجی۔
کا ذکر "القواد واسباب الصناعات" کے

۱۱۸۔ رسالۃ فی القیان ۱۳۴۴ھ میں مطبع سلفیہ

۱۱۹۔ کتاب الکبر المستحسن والمستقبح

۱۲۰۔ رسالہ فی کتمان السر

۱۲۱۔ رسالہ فی الکرم

۱۲۲۔ کتاب الکلاب۔ ابومنصور نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے

۱۲۳۔ رسالۃ فی الکیمیار

۱۲۴۔ کتاب المخاطبات فی التوحید

۱۲۵۔ رسالۃ فی مدح التجار وذم عمل السلطان ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے

۱۲۶۔ رسالہ فی مدح الکتاب[1]

تو وہ کنجوسوں کا امام تھا ۲۵۳ھ میں وفات پائی

[1] ان تینوں چیزوں کے ذم میں بھی ایک ایک رسالہ جاحظ کے قلم سے نکل چکا ہے۔ (مترجم)

۱۲۷۔ رسالہ فی مدح النبیذ
۱۲۸۔ رسالہ فی مدح الوراقہ } ۱
۱۲۹۔ کتاب المزاح والجد
۱۳۰۔ کتاب المسائل
۱۳۱۔ کتاب مسائل الشانیہ۔
۱۳۲۔ کتاب مسائل کتاب المعرفتہ
۱۳۳۔ کتاب القرآن۔
۱۳۴۔ کتاب المضاحک۔ ابومنصور نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے
۱۳۵۔ کتاب المعاد والمعاش۔
۱۳۶۔ کتاب المعاون
۱۳۷۔ کتاب معارضتہ الزیدیہ
۱۳۸۔ کتاب المعرفتہ
۱۳۹۔ کتاب المعلمین
۱۴۰۔ کتاب المغنین والغناو الصنعتہ۔
۱۴۱۔ کتاب مفاخرۃ السودان والحمران۔
۱۴۲۔ رسالہ فی مفاخرۃ المسک والرماد۔ صلاح الصفدی کا قول ہے کہ یہ نہایت بدیع، رسالہ ہے
۱۴۳۔ کتاب الملح والطرف۔
۱۴۴۔ کتاب الملوک والامم السالفہ والباقیہ
۱۴۵۔ رسالہ فی مناقب الترک وعامتہ جند الخلافتہ۔ جاحظ نے یہ رسالہ فتح بن خاقان وزیر اعظم المتوکل باللہ کے حضور میں گزرانا تھا۔ لیڈن سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوچکا

ہے، پیر ابراہیم بک موہلی نے اپنے اخبار "مصباح الشرق" میں اسے شائع کیا ۱۳۲۲ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے۔

۱۴۶۔ رسالۃ فی من یسمی من الشعراء عمراً۔

۱۴۷۔ رسالۃ فی موت ابی حرب الصفار البصری۔

۱۴۸۔ رسالۃ فی المیراث۔

۱۴۹۔ کتاب التاشی والتلاشی۔

۱۵۰۔ کتاب النرد والشطرنج۔

۱۵۱۔ کتاب النصرانی والیہودی

۱۵۲۔ کتاب النخل۔

۱۵۳۔ کتاب نقض الطب۔ ابوبکر رازی [illegible] طرح ابن مندویہ نے بھی ایک مستقل رسالہ [illegible]

۱۵۴۔ کتاب نوادر الحسن

۱۵۵۔ کتاب النوامیس۔ ابومنصور اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ حیلہ گروں کے جلب زر کا ایک عمدہ رہنما ہے۔

۱۵۶۔ کتاب وجوب الامامۃ۔

۱۵۷۔ کتاب الوعد والوعید۔ ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہوئی۔

۱۵۸۔ کتاب الوکلاء

۱۵۹۔ رسالۃ الیتیمیہ۔

دوسروں کی کتابیں جاحظ کے نام سے

۱۔ کتاب الابل۔ یاقوت کا قول ہے کہ یہ کتاب بہت زمانہ سے جاحظ کے نام سے منسوب

چلی آرہی ہے۔

۲۔ کتاب التاج یا اخلاق الملوک۔ احمد ذکی پاشا نے ۱۳۳۲ھ میں ایک طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب جاحظ ہی کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جاحظ اس سے بری ہے۔ اس کے قلم سے یہ کتاب ہرگز نہیں نکلی (اس کے بعد مولف کتاب حسن السندوبی صاحب نے دونوں کتابوں کے مقدمے لکھے ہیں اور ہر دو کتابوں کے اسلوب بیان اور طرز ادا کے تخالف اور تباین سے ثابت کیا ہے کہ جاحظ کا رنگ اس کتاب سے بالکل ظاہر نہیں ہوتا، مثالیں چونکہ عربی کی ہیں اس لئے ان کا ترجمہ یہاں بے کار نظر آیا۔ بہرحال ثابت انھوں نے بھی کیا ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی نہیں ہے) اس طویل موازنہ کے بعد فاضل مولف فرماتے ہیں، کون ایسا شخص ہوگا۔ جسے عقل سلیم یا ذوق صحیح سے ذرا بھی مناسبت ہو وہ اسے باور کرے گا کہ یہ کتاب جاحظ کی ہے؟ ان دونوں کا فرق اسلوب اسی طرح نمایاں ہے، جس طرح صدق و کذب، نور و ظلمت اور حق و باطل کا فرق محتاج بیان نہیں ہوا کرتا، بہرحال یہ واقعہ ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی نہیں اور جو شخص اس پر اصرار کرے، وہ جاحظ کو منزلہ رفیع سے گرانا چاہتا ہے، یا پھر وہ جاحظ کا قدر شناس نہیں ہے، ہماری مستقل رائے تو یہی ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے کسی آدمی نے اس کی کسی کتاب میں یہ نام دیکھ لیا اور جھٹ ایک مصنوعی مقدمہ تیار کر کے شائع بھی کر دیا تاکہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں (سندوبی صاحب مولف کتاب نے جس شد و مد اور جوش خطابت سے اس دعوی کو پیش فرمایا ہے کم از کم اس طرح تو ان کا دعوی ثابت نہیں ہوتا، واللہ اعلم بالصواب،

(۳) کتاب تنبیہ الملوک والمکائد۔ یہ کتاب بھی جہل و حماقت سے اسکی طرف منسوب کر دی گئی ہے

(۴) کتاب الحنین الی الاوطان جس شخص کو جاحظ کے طرز سے ذرا بھی مس ہے۔ اور جو اس کے طریقہ تالیف

وتصنیف سے واقف ہے وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ وراقوں نے ادھر ادھر کے چند
اوراق جمع کر کے اس کے نام سے منسوب کر دئے ہیں تاکہ رواج عام حاصل ہو جائے
تعجب ہے کہ شیخ طاہر جزائری رحمۃ اللہ نے بھی دھوکا کھایا اور یہ کتاب جاحظ
ہی کی سمجھتے رہے۔ حالانکہ یہ بالکل کذب و افترا ہے۔ مطبع المنار نے ۱۳۳۰ھ میں
شائع کی ہے۔

۵۔ کتاب الدلائل والاعتبار علی الخلق والاثار۔ یہ کتاب بھی جاحظ کے نام سے غلط طور پر
منسوب ہے۔

۶۔ کتاب سلوۃ الحریف بمناظرۃ الربیع والخریف
مطبع تھا اسے شائع کیا تھا۔ استنبول
پڑھی بغیر یہ تحقیق کئے کہ اس نسخہ کا کاتب کون ہے
نہیں؟ صرف یہ دیکھ کر کہ اس میں جاحظ کا نام ہے شائع کر دی گئی۔ میرا یہ دعوی
کہ جاحظ کی کتاب نہیں ہے اور نہ اس کی زندگی میں اس کے نام سے
یہ چھاپی گئی۔ مثلاً مقدمہ کے بعد دیباچہ میں اپنے ممدوح کو "قوام الملک" اور "نظام الدین"
وغیرہ القاب سے یاد کیا ہے۔ اور "قوام الملک" "نظام الدین" "حجۃ الاسلام" "نور
الملک" "جمال السلطنۃ" اور "بہاء الدولہ" وغیرہ جیسے القاب و خطابات عہد
سلاجقہ کی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے شعرا اور انشا پردازوں
کا ذکر ہے جو چوتھی صدی ہجری کے تھے، پھر جاحظ نے ان چیزوں کو کہاں اور کیسے
پایا؟ لہذا ثابت ہوا کہ یہ کتاب جاحظ کی نہیں ہے۔

۷۔ کتاب المحاسن والاضداد اس کے متعلق تو بہت سے لوگ فریب میں مبتلا ہیں
اور غلطی سے جاحظ کی ہی کتاب سمجھ رہے ہیں، قدما میں شیخ محی الدین عربی
بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جاحظ بیچارہ اس الزام سے قطعاً

تبری ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چوتھی صدی کے وراقین میں سے کسی نے یہ کتاب تیار کی ہوگی، اور دیکھا ہوگا کہ یوں تو اس کی اشاعت ہوتی نہیں جاحظ ہی کی طرف منسوب کردو۔ اس طرح یہ جاحظ کے نام سے مشہور ہوگئی؛
سب سے بڑی دلیل ہے کہ میں یوں ہی اس کتاب کے ورق الٹ پلٹ رہا تھا کہ میری نظر صفحہ ۳۸ پر پڑی تو اس میں بھی ابن المعتز کے چند شعر دکھائی دیئے، مجھے حیرت ہوئی کہ جاحظ ابن المعتز کے اشعار کیسے روایت کر رہا ہے، حالانکہ ابن المعتز ابھی سات برس کا بھی نہ ہوا تھا۔ کہ جاحظ کی وفات ہو چکی تھی، شعبان ۲۴۹ھ میں ابن معتز کی ولادت ہوئی اور محرم ۲۵۵ھ میں جاحظ کی وفات، تو اب عرفاً عقلاً عادتاً کسی طرح بھی یہ ممکن ہے کہ ایک سات برس کا بچہ اتنا بڑا شاعر بے بدل ہو جائے کہ جاحظ جیسا شخص اس سے روایت کرنے ہاں صفحہ ۱۴۴ پر ایک شعر میں قرامطہ اور حجاج کی جنگ سے تلمیح کی گئی ہے حالانکہ یہ واقعہ جنگ جاحظ کی وفات سے پورے چالیس بعد پیش آیا۔ لہذا یہ کتاب قطعًا جاحظ پر افترا ہے اور ابو عثمان اس سے قطعًا ناواقف ہے؛

۸ کتاب الہدایا۔ یاقوت کا قول ہے کہ ایک زمانۂ دراز سے یہ کتاب جاحظ سے منسوب چلی آ رہی ہے۔

نوادرات جاحظ

جاحظ اپنے جلالت شان اور عظمت عام کے باوجود بالکل ایک خشک سا انشا پرداز نہیں

لہ۔ ایک طرح اس کتاب کے ایک حصہ کو الحاقی یا مصنوعی سمجھا جا سکتا ہے، لیکن پوری کتاب کا انکار کر دینا بہت بڑی جرأت ہے (مترجم)

تھا مگر وہ ایک زندہ دل، شوخ طبع، اور دلچسپ و دل آویز خصائل کا مالک تھا، اس کے اس متانت بیان، قوت زبان، اور دوسرے خصائل علمی کے ساتھ لطائف و ظرائف نوادر و ظرائف اور طنز لطیف کے بہت سے نمونے ملتے ہیں چند درج ذیل ہیں۔

(۱)

محمد بن ابراہیم بغداد جا رہے تھے، میں بھی ان کا ہمرکاب ہو گیا، ہم لوگ ایک بجرے میں سوار ہوئے اور اس نے مغنیہ کو گانے کا حکم دیا، اس نے ستار سنبھالا اور گانا شروع کیا

کل یوم قطیعة وعتاب　　ینقضی دہرنا و
لیت شعری انا خصصت بہذا　　دون ذا الخلق

پھر وہ خاموش ہو گئی، اب حکم پاکر طنبوریہ نے گانا شروع

وارحمتا للعاشقینا　　ما ان اری لہم
کم یہجرون ویصرمون　　ویقطعون فیصبرونا

عود بجانے والی نے پوچھا پھر عاشق کرتے کیا ہیں؟ اس نے جواب دیا یہ کرتے ہیں یہ کہہ کے اس نے ستار پھینک دیا د اس وقت معلوم ہوتا تھا، وہ چودھویں رات کا چاند ہے اور فوراً اپنے تئیں سپرد دریا کر دیا، محمد کے پاس ایک غلام ہاتھ میں مورچھل لئے کھڑا تھا، وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ دیکھ کر مبہوت ہو رہا تھا، وہ بھی اس جگہ پر آیا، دیکھا وہ پانی میں ہچکولے کھا رہی ہے، اس لئے یہ شعر پڑھا

انت التی غرتنی　　بعد القضا لو تعلمینا

یہ کہہ کے خود بھی دریا میں پھاند پڑا، دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے پھر ایسے ڈوبے کہ ابھر نہ سکے، محمد نے جو یہ اندوہ ناک منظر دیکھا تو بہت موثر ہوا، اس نے کہا، جاحظ کوئی ایسی بات کرو جو میرے تسکین و تسلی کا سبب ہو، ورنہ تجھے بھی ابھی ان دونوں کے پاس پہنچائے دیتا ہوں، مجھے ایک واقعہ یاد آگیا کہ یزید بن عبدالملک عدالت میں بیٹھا ہوا عرضیاں دیکھ دیکھ کر

فیصلے کر رہا تھا، ایک درخواست کا مضمون یہ تھا کہ امیرالمومنین اپنی فلاں لونڈی کو حکم دیں کہ وہ مجھے تین مختلف راگ سنا دے اور بس، یزید بہت برہم ہوا اسی وقت اس نے حکم دیا جس نے یہ عرضی دی ہو اس کا سر اڑا دو، حکم کی تعمیل ہونے ہی والی تھی کہ ایک دوسرا قاصد پہونچا کہ امیرالمومنین اس مغضوب بارگاہ کو یاد فرما رہے ہیں، وہ آدمی اس کے سامنے کھڑا کیا گیا امیرالمومنین نے دریافت فرمایا، ایسی گستاخی کی جرأت تجھے کیسے ہوئی، اس نے جواب دیا" امیرالمومنین کے حلم وعفو سے، یزید بن عبدالملک نے اسے بیٹھنے کا حکم دیا، یہاں تک کہ مجلس برخاست ہو گئی پھر اسی لونڈی کو بلوایا، وہ عود لے کر حاضر ہوئی، اس نوجوان نے اس سے کہا، یہ شعر گاؤ

افاطم مهلا بعض هذا التدلل   وان كنت قد ازمعت صرمی فاجملی

اس نے اسے گایا، یزید نے نوجوان سے کہا اور؟ اس نے کہا یہ شعر گاؤ

تالق البرق نجدیا فقلت له   یا ایها البرق انی عنک مشغول

اس نے اسے بھی گایا، خلیفہ نے کہا ابھی اور بھی باقی ہے؟ نوجوان نے کہا جہاں پناہ! مجھے ایک رطل شراب منگوا دیجئے" وہ حاضر کی گئی، ابھی پورے طور سے وہ پی بھی نہیں چکا تھا کہ دفعتہ وہ اپنی جگہ سے اچھلا، اور ایک بلند جگہ پر چڑھ گیا، اور وہاں سے کود پڑا، اور ختم ہو گیا، خلیفہ نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون، دیکھا اس احمق کو، وہ بیوقوف یہ سمجھا کہ میں اس جاریہ کو اس سے لے لوں گا اس لونڈی کو اس کے اہل واقربا تک پہنچا دو اور اگر کوئی نہ ہو تو اسے بیچ کر اس کی قیمت اس نوجوان پر صدقہ کر دو" لوگ اسے پکڑ کر لے چلے، جب وہ گھر کے وسط میں پہونچی، تو اس نے ایک تالاب دیکھا جس میں بارش کا پانی جمع ہوا کرتا تھا، وہاں پہنچ کر اس نے لوگوں سے اپنے آپ کو چھڑا لیا، اور یہ شعر

من مات عشقا فلیمت   هكذا   لا خیر فی عشق بلا موت

پڑھ کر اپنے آپ کو اس میں ڈال دیا، اور ختم ہو گئی،

محمد نے یہ قطعہ سن کر خوشنودی کا اظہار کیا، اور مجھے گراں بہا انعام مرحمت فرمایا،

محمد بن زیات نے فصد لی تو جاحظ عیادت کو حاضر ہوا اور کہا،
"خدا آپ کو صحت عطا فرمائے، آپ کی نعمتیں اسی طرح برقرار رہیں"

ابن زیات۔ اچھا تو بتاؤ تم نذر کرنے کو کیا لائے ہو؟

جاحظ۔ میں نے سوچا کہ آپ کی خدمت میں کچھ ہدیہ پیش کروں لیکن غور کرتا ہوں، تو ہر چیز خدا نے آپ کو دے رکھی ہے، میرے پاس ایک نہایت بلند مرتبہ چیز کتاب سیبویہ ہے، کسائی نے اسے لکھا ہے اور فرائی کی میراث سے میں نے خریدا ہے

ابن زیات۔ خدا کی قسم اس سے زیادہ پسندیدہ ہدیہ کوئی اور ہو؟

۳

جاحظ کہتا ہے مجکو عمر میں کسی سے شرمندگی نہیں اٹھ[illegible]
بہت خجل کیا، جن میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے دروازہ پر تھا
آئی اور کہنے لگی، مجھے ایک بڑی سخت ضرورت درپیش ہے، ذرا تھوڑی دور تک میرے ساتھ چلے چلئے میں اس کے ساتھ ہولیا، ایک یہودی سنار کی دکان پر جاکر کھڑی ہوگئی، اور اس سے مخاطب ہوکر کہا "ایسا ہی" اور یہ کہ کے چلتی بنی، میں نے سنار سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے، اس نے کہا کہ اس عورت نے ایک انگوٹھی مجھ سے بنوائی، اور فرمائش کی کہ میں اس پر شیطان کی صورت نقش کردوں، میں نے کہا میں کیا جانوں شیطان کیسا ہوتا ہے؟ یہ سن کے وہ چلی گئی اور اب یہاں آکر جو کچھ اس نے کہا، تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے؟

۴

ایک آدمی میرے پاس آیا اور فرمائش کی کہ اپنے دوستوں کو ایک سفارشی خط لکھ دیجئے مجھے ضرورت ہے، میں نے ایک خط لکھا، اور اس پر مہر لگا کے اس کے حوالہ کیا،
رقعہ لے کے جب وہ باہر پہونچا، تو اس نے رقعہ کا لفافہ پھاڑا، اور خط پڑھ لیا، اس میں میں نے لکھا تھا۔

یہ خط اللہ کے [illegible] جس قدر مجھ سے ہو سکا [illegible] میں ذرا بھی نہیں پہنچا تھا' اگر آپ اس کی حاجت پوری کردیں تو میں آپ [illegible] ہوں گا' اور اگر اسے ناکام واپس کردیجے' تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

وہ آدمی فوراً میرے پاس واپس آیا' میں نے کہا شاید تم نے میرا خط پڑھ لیا' اس نے کہا جی ہاں:

میں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے تمہیں گزند نہیں پہنچ سکتا' میں نے اپنی یہ علامت مقرر کرلی ہے کہ جب میں کسی کی سفارش کرتا ہوں تو ایسے ہی الفاظ لکھتا ہوں۔

اس نے کہا۔ خدا تجھ پر لعنت کرے' تیرے ہاتھ پاؤں بیکار کردے'

میں۔ یہ کیا؟

اس نے جواب دیا۔ یہ میری علامت ہے جب میں کسی شخص کا شکریہ ادا کرتا ہوں' تو ایسے ہی الفاظ استعمال کرتا ہوں۔

۵

میں اپنے ایک دوست کے ہاں گیا' دروازہ کھٹکھٹایا' تو ایک سندھی لونڈی نکلی

میں اپنے آقا سے کہدو جاحظ دروازہ پر کھڑا ہے۔

لونڈی، کہدوں جاحد (جھگڑنے والا) دروازہ پر کھڑا ہے؟

میں۔ نہیں۔ اس سے کہو حدقی دروازہ پر حاضر ہے،

لونڈی کہدوں حلقی دروازہ پر ہے؟

میں۔ بس بھر پایا' کچھ نہ کہو ...... یہ کہ کے میں واپس ہوگیا'

۶

میرے پاس بعض لوگ آئے، اور کہا کہ تمہارے پاس ایک ہزار ایسے جوابات ہیں جو دوسروں کو خاموش کردیتے ہیں' کچھ ہمیں بھی سکھاؤگے؟ میں نے کہا' ضرور' ایک نے کہا

اگر کوئی شخص کسی نا ملائم اور مکروہ الفاظ میں مخاطب کرے تو کیا جواب دیا جائے؟ میں نے کہا جو کچھ وہ برا بھلا کہے تم صرف یہ کہو "بجا ارشاد"

۷

علی بن عبیدہ ریحانی بیمار پڑے تو میں ان کی عیادت کو گیا۔ میں نے ان سے پوچھا "کس چیز کو جی چاہتا ہے" ابوالحسن؟
انہوں نے کہا۔ "رقیبوں کی آنکھیں، چغلخور کی زبان، اور حسد کرنے والوں کا جگر چاہتا ہوں۔"

۸

تین مرتبہ ایسا اتفاق پیش آیا کہ میں کنیت بھول گیا۔ میں نے اپنے خاندان والوں سے پوچھا کہ بھائی میری کنیت کیا ہے۔؟ انھوں نے کہا ابوعثمان۔

اقوال جاحظ

جاحظ کے جن اقوال بدیع نے شہرت عام، اور ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر لی ہے وہ لوگوں کی زبانوں پر ہے، ہم آج اس صحبت میں اس کے بعض اقوال سے آپ کو روشناس کرانا چاہتے ہیں، جو کسی نہ کسی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔

۱

آدمی کو لازم ہے کہ سخی ہو، فضول خرچ نہ ہو، بہادر ہو لیکن سریع الغضب نہ ہو، شجاع ہو، لیکن بزدل نہ ہو، گفتگو خوب کرتا ہو لیکن عامیانہ باتوں سے پرہیز کرتا ہو، خاموش ہو لیکن گونگا نہ ہو، حلیم اور بردبار ہو، لیکن ذلت نہ قبول کرتا ہو، لوگوں کی مدد سے دریغ نہ کرتا ہو لیکن ظلم بھی نہ کرتا ہو، باوقار ہو لیکن احمقانہ طور سے نہیں، حاکم ہو لیکن غصہ میں نہ آجاتا ہو،

۲

ہر عشق کو محبت کہہ سکتے ہیں، لیکن ہر محبت کو عشق نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ عشق محبت سے

الگ ایک مستقل چیز ہے، جس طرح فضول خرچی اور سخاوت ایک نہیں، یا بخل و میانہ روی میں جو فرق ہے، یا بزدل اور حوصلہ مند میں جو تفریق ہے، جلد غصہ آجانے والے آدمی اور شجاع میں جس طرح تفریق ہے اسی طرح یہ بھی الگ چیز ہے،

۳

یہ چیزیں ان آدمیوں میں ضرور پائی ہیں، گونگے میں لڑکاپن، لانبے آدمی میں غصہ کی سرعت، پستہ قد میں غرور، میانہ قد آدمی میں شرافت، احوال میں روشنی علم، افرس میں ذکاوت اندھوں میں قوۃ حافظہ، اعور میں ثقالت، زبان، لنگڑے میں مسرت،

۴

جاحظ کا قول ہے، جس نے اپنے مال کی حفاظت کرلی، اس نے دو بزرگ چیزوں کو بچالیا، ایک تو مذہب کو دوسرے آبرو کو

جاحظ کی شاعری

نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت نوادرات زمانہ ہے، اور اگر یہ دونوں وصف کسی شخص میں جمع بھی ہوتے ہیں تو پلہ برابر نہیں رہتا، نظم دلکش ہوگی تو نثر روکھی سوکھی، اور اگر نثر کا پلہ بھاری رہا تو نظم بس یوں ہی رہتی ہے، ظاہر ہے جاحظ نے نثر میں بالخصوص کمال حاصل کیا تھا اپنے اسلوب خاصہ سے وہ ماہر تھا اور کوئی اس تک نہیں پہنچ سکا۔ لیکن بایں ہمہ وہ شعر شاعری کے میدان میں بالکل مبتدی نہیں ہے بلکہ اچھا خاصہ ہے،

۱

راویوں کا بیان ہے کہ اس نے ایک قصیدہ ابوالفرج نجاح بن سلمہ کی تعریف میں لکھا اور اس میں اپنے ماہانہ کے کھول دینے کی درخواست کی تھی تو قصیدہ تو اب نایاب ہے، ہاں چند اشعار باقی ہیں جن کا نمونہ یہ ہے،

اقام بہرا، الخفض راضی بخفضہ　　وذوالحزم یسری حیث لا احد یسری
یضن الرضا شیئا یسیرا مہونا　　ودون الرضا کاس امر من الصبر
سوار علی الایام صاحب حنکہ　　وآخر کلب لا یریش و لا یبری

۲

علم اور علماء کے فضائل ومناقب میں کہتا ہے۔

یطیب العیش ان تلقی حکیما　　غذاہ العلم والفہم المصیب
فیکشف عنک حیرۃ کل جہل　　وفضل ۔۔
سقام الحرص لیس لہ شفاء　　و ۔۔

ہجو

بعض شعراء نے جاحظ کی ہجو بھی کی ہے، لیکن یہ شعراء پست درجہ کے ہیں، شعراء میں جو لوگ صاحب اثر واقتدار تھے وہ جاحظ کی منزلت سے واقف تھے، ان کی تو یہ تمنا رہتی تھی کہ جاحظ اپنی کسی کتاب میں ان کا ذکر کردے، خواہ وہ برسبیل تنقید یا بصورت ظرافت ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ جاحظ کا ذکر کردینا شہرت دوعالم کا ضامن ہے۔

۱

ایک ہجوگو جو معتزلہ کا بہت بڑا دشمن تھا کہتا ہے،

لو یمسخ الخنزیر مسخا ثانیا　　ماکان الا دون قبح الجاحظ

یعنی اگر سور کی صورت موجودہ صورت سے بھی زیادہ مسخ کردی جائے جب بھی جاحظ کا مقابلہ کیا کرسکے گی۔

(اس ناخوشگوار عنوان کی زیادہ مثالیں غیرضروری سمجھ کر حذف کردی گئیں)

(مترجم)

بیماری اور وفات

متوکل علی اللہ کے عہد میں جاحظ کی بیماری کا آغاز ہوتا ہے، اپنی علالت کے سارے زمانہ میں تصنیف و کتابت کا کام اس نے برابر جاری رکھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کس قدر تنومند اور مضبوط جسم کا مالک تھا، ۲۴۷ھ سے ۲۵۵ھ تک پورے آٹھ سال وہ فالج جیسے نامراد مرض میں مبتلا رہا لیکن اپنے کسی کام سے غافل نہیں ہوا، اب حالات سنئے،

۱

ابن بطلان طبیب کے خط سے ابن ابی اصیبعہ نقل کرتے ہیں کہ جاحظ اور یوحنا بن ماسویہ ابن بطلان کے قول کے مطابق اسمعیل بن بلبل کے ہاں ایک دسترخوان پر بیٹھے، میرے نزدیک صحیح واقعہ یہ ہے کہ دعوت ابن ابی داؤد کے ہاں تھی نہ کہ اسمعیل بن بلبل کے ہاں، بہرحال تو دسترخوان پر بہاں اور لذیذ لذیذ کھانے لائے گئے، دودھ دہی بھی آیا، لیکن مچھلی کے ساتھ یوحنا نے دونوں کے استعمال سے منع کیا اس لئے کہ نقصان کا اندیشہ تھا، جاحظ نے کہا خوب یا تو مچھلی اور دودھ ملبغا، ایک دوسرے کے منافر ہیں، اگر ایسا ہے تو علاج بالضد تو خوب ہوتا ہی ہے، اور اگر منافرت نہیں ہے ایک ہیں، تو گویا ایک ہی چیز کھائی ہرج کیا ہوا؟ یوحنا نے کہا میں بحث مباحثہ کا تو عادی نہیں ہوں کل دیکھ لینا کیا ہوتا ہے؟ جاحظ نے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے خوب ہی خوب کھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ رات کو فالج کا جب حملہ ہوا تو کہنے لگا، خدا کی قسم یہ قیاس محال کا نتیجہ ہے، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟

۲

ابو معاذ عبدان النحوی کہتے ہیں کہ ہم جاحظ کی عیادت کو گئے، وہ فالج میں مبتلا تھا، ہم مجلس میں بیٹھے ہی تھے کہ متوکل باللہ کا ایک قاصد آیا، پھر جاحظ ہماری طرف متوجہ ہوا اور کہا: اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو، جس کے دو پہلو ہیں ایک کی یہ حالت ہے کہ اگر آرہ سے چیر ڈالا جائے تو بھی ذرا احساس نہ ہو، اور دوسرے کا یہ حال ہے کہ اگر مکھی بھی بیٹھ جاتی ہے تو درد والم

کی انتہا نہیں رہتی۔

۳

داہنے نصف حصہ بدن کا یہ حال تھا کہ شدت حرارت کی وجہ سے اس پر صندل اور کافور کی مالش کی جاتی تھی، اور دوسرے نصف حصہ کی یہ کیفیت تھی کہ اگر قینچی سے کاٹ دیا جائے جب بھی کچھ اثر نہ ہو۔

۴

ابوالعباس مبرد کہتے ہیں کہ میں جاحظ کی عیادت کو گیا۔ [illegible]
[illegible] سے مفلوج ہوں، اگر قینچی سے تراش دو تو مجھ پر اثر نہ [illegible]
مکھی بھی اڑ کر بیٹھ جائے تو درد و کرب کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔

۵

ابوطاہر کہتے ہیں میں جاحظ کے ہاں گیا، میرے ساتھ رفیقوں کی ایک جماعت تھی؛ جاحظ اپنی آخر عمر کو پہونچ چکا تھا، ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا، مگر کوئی جواب نہیں ملا، سامنے روشن دان سے اس نے جھانکا اور کہا، میں بہت زیادہ بوڑھا ہو گیا۔ ضعف و نقاہت کا دور دورہ ہے، تم لوگ اب مجھ سے کیا کروگے؟ میرا دعا اور آخری سلام قبول کرو، ہم نے بھی سلام کیا، اور واپس چلے آئے۔

۶

جاحظ کا جب انتقال ہوا، اور خبر وفات قصر خلافت میں پہونچی، تو خلیفہ معتز باللہ نے حد درجہ رنج و تاسف کا اظہار کیا، اور یزید بن مہلبی سے پوچھا اے ابو یزید کیا جاحظ کی خبر وفات آئی ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں! خدا امیر المومنین کو ہمیشہ سلامت رکھے، ابو شراعہ القیس نے بہت دردناک مرثیہ لکھا، اور اس طرح بالآخر تاریخ اسلام کا وہ زبردست رکن ختم ہو گیا۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

جاحظ کے خصائص و ممیزات

ظہور جاحظ سے پیشتر بالعموم لوگوں کا فضل و کمال کسی ایک فن تک محدود رہتا تھا لیکن جاحظ کا رنگ سب سے الگ ہے، وہ ادیب بھی ہے شاعر بھی ہے، متکلم بھی ہے فلسفی بھی ہے منطقی بھی ہے۔ غرض کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں جاحظ پایۂ اجتہاد نہ رکھتا ہو تحقیق علم و تجارب نظریات کے لئے اس نے دور و دراز کی مسافتیں کیں تکلیفیں اٹھائیں، اور ہر قسم کے آفات و مصائب سے دوچار ہوا، وہ پہلا شخص ہے جس نے تقلید اعمیٰ سے گلو خلاصی حاصل کی، اور رائے عامہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے معتقدات و خیالات علی الاعلان ظاہر کئے، سب سے بڑی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس کی جو کتاب بھی اٹھا کر دیکھئے ہر ہر سطر سے اس کی شخصیت اپنی غیر معمولی طلاقت اور شیریں بیانی، دقت نظر و وسعت علم کا پرتو آپ پر ڈالے گی، اسے خود بھی اپنی عظمت و بزرگی کا احساس تھا، اس لئے اس میں "انانیت" بھی کافی تھی، وہ اپنا جیسا بجا طور پر کسی کو نہیں سمجھتا تھا اور اپنا ہم پایہ اور مستحق عزت و تعظیم بھی اس کی نظروں میں کوئی نہیں تھا، یہ تو اس کے خصائص و ممیزات پر ایک سرسری اظہار خیال ہے، ورنہ

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے!

مکالمۂ ارواح

۲

رسالہ جامعہ نمبر ۲ جلد ۱۸ ماہ فروری ۱۹۳۴ء میں مکالمہ ارواح پر خلیل زیدان صاحب کا ایک مقالہ اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ جس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر موقع ہوا تو دوسری قسط بھی شائع کی جائے گی۔ چنانچہ اسی رسالہ نے دوسری قسط حسب وعدہ شائع فرمائی ہے۔ ناظرین کی خدمت میں پیش ہے۔

خاکسار

(مترجم)

یہ موضوع ان لوگوں کے لئے جو مکالمہ ارواح پر یقین کرتے اور ان لوگوں کے لئے جو صحیح نہیں خیال کرتے برابر دلچسپ ہے۔ اس موضوع پر جو مضامین لکھے جا رہے ہیں کم سے کم انھوں نے افکار و اذہان انسانی کے لئے غور و فکر کا ایک جدید دروازہ کھول دیا ہے اور ہر شخص کو حق ہے کہ وہ اپنے نقطۂ خیال کے ماتحت اس میں غور کرے اس کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے دلائل فراہم کرکے ایک مفید نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس موضوع پر جو مضامین ہیں ان سے یہ قطعی ثابت ہو گیا ہے کہ ہمارا علم روح انسانی کے متعلق ہمارے جہل کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔

ناظرین نے سابقہ مضمون میں وہ نمونہ مکالمہ ملاحظہ کیا ہوگا جو میرے اور میرے والد مرحوم کی روح کے درمیان ہوا تھا۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے والد مرحوم کی روح کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے کہ مرحوم کی روح نہ ہو میں اپنے پورے یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ

والد مرحوم ہی کی روح تھی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ نہ تھی۔ ابھی تک یہ معاملہ یقینیات کے حد میں نہیں ہے۔

وجہ یہ ہے کہ جو کچھ اب تک کے معلومات ہیں وہ قطرہ اور دریا کی نسبت سے ہے۔ جب جہل کی یہ کیفیت ہو تو یقین کے ساتھ کیسے کہا جا سکتا ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ علماء کے لئے غور و فکر کے وسیع میدان اس موضوع پر پیش کر دئے گئے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس کے موافق مخالف دلائل فراہم کریں اور ایک نتیجہ پر پہونچیں۔ ممکن ہے کہ انسانیت کی سب سے اعلیٰ خدمت یہ ہی ہو۔

میں یہ کہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو گفتگو میرے اور میرے والد صاحب مرحوم کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ سوائے میرے والد مرحوم کے اور کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا اور بعض بعض اشارات تو موصوف نے ایسے فرمائے تھے جن کو حاضرین جلسہ میں سے کوئی نہیں جانتا تھا میں نے جب ان کی تحقیقات کی تو وہ بالکل صحیح ثابت ہوئے آج میں اس گفتگو کا خلاصہ پیش کروں گا جو میرے اور میرے سب سے بڑے شفیق دوست جبران خلیل جبران صاحب کی روح کے درمیان ہوئی۔ مرحوم ملک لبنان (شام) کے بہت مشہور صاحب قلم تھے گزشتہ سال موسم بہار میں داغ مفارقت دے گئے۔ میں نے اپنے ان عزیز دوست کی روح سے شرف مکالمہ حاصل کیا۔ مجھے مرحوم کی دوستی پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ میں ان کا طرز اور طریقۂ استدلال خوب سمجھتا ہوں۔ میں نے ان کی روح سے جو گفتگو کی اس میں وہی بات میں نے محسوس کی جو خود مرحوم میں تھی

اس طریقہ کے مطابق جو ہم پہلے مضمون میں بیان کر چکے ہیں درمیانی لوگوں کے توسط سے ہم نے ایک جلسہ میں جبران خلیل جبران صاحب کی روح کو بلایا جب ہمیں معلوم ہو گیا کہ مطلوبہ روح آگئی ہے۔ تو ہمارے اور روح کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ جبران صاحب کی روح جو جواب دیتی تھی ہم نے اس کو حرف بحرف نقل کر دیا ہے۔

میں۔ آپ کون صاحب ہیں؟

روح جبران۔ ایک ایسی روح ہے جو اپنے وفادار دوست کے ساتھ سرگوشی کر رہی ہے بس شخص کے متعلق آپ کیا کر رہے ہیں کہ جس کی بات آپ سنتے اور خود اس کو نہیں دیکھتے ہیں کیونکہ آپ کی رائے پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

میں اب کچھ کچھ شک میں کمی اور اسی نسبت سے یقین میں بیشی ہوتی جا رہی ہے

وہ تم کو یقین کرنا چاہیئے تمہاری آنکھیں بند ہیں تمہارا بھائی دینی خود وہ عالم بالا سے تم سے گفتگو کر رہا ہے۔ بہت عرصہ تک میں اس عالم کا تصور کرتا [illegible] عالم [illegible] نہایت آرام سے ہوں۔

میں شاید آپ کو اس عالم میں کامل سکون و کا

وہ کامیابی۔ بھائی یہ وہ لفظ ہے جس کا مفہوم سو

میں کیا آپ کوئی پیغام دیں گے؟

وہ میں چند پیغام بھیجوں گا۔ میں نے تمہارے ہاتھ سے ایک مضمون تو لکھا دیا ہے (یہ اشارہ اس مضمون کی طرف تھا جو رسالہ کل شئی کی نمبر ۲۰۳ میں زیر عنوان صورت من عالم الارواح "عالم ارواح سے ایک آواز" شائع ہوا ہے جس میں جبران خلیل کی گفتگو درج ہے)۔ چند روز ہوئے میں نے ایک اور پیغام بھی ارسال کیا ہے۔

(ایک اور جلسہ میں جہاں میں موجود نہ تھا مرحوم نے یہ پیغام جس کا اشارہ ہے لکھا یا تھا۔ اور حاضرین جلسہ میں سے ایک شخص نے حرف بہ حرف نقل کر لیا تھا۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ پیغام آپ کے سامنے پڑھوں اور آپ چاہیں تو عبارت میں مناسب تغیر فرمائیں۔

میں نے مندرجہ ذیل مضمون سنایا۔ جب میں نے مضمون سنایا تو مجھے محسوس ہوا کہ روح کچھ تغیر کرنا چاہتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ عبارت ذیل سے معلوم ہوگا یہ پیغام ایک سوال کے

جواب میں لکھوایا گیا تھا جو مرحوم کے جنازہ کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا۔ وہ عظمت بزرگی اور شہرت تین دیوتا ہیں جو کل تک تاریکی میں اور اس پردے کے نیچے مستور تھے جو لاشی اور کل شی کے درمیان فصل کرتا ہے جب یہ پردہ اٹھا تو یہ دیوتا عالم وجود کے سامنے ایک ایسے شخص کی یادگار قائم کرتے ہوئے نظر آئے۔ جو کل تک تو کچھ نہ تھا اور آج موت کے بعد سب کچھ بن گیا۔

موت! آہ موت!! تاریکی سے نور کی جانب صرف ایک قدم کے روح نے ترمیم کی، قدم جس نے میرے لئے غیر فانی زندگی مہیا کر دی جس کا میں منتظر رہتا تھا۔ مگر نہ اسے دیکھ سکتا تھا نہ محسوس کر سکتا تھا اور نہ حقیقت میں سمجھ ہی سکتا تھا۔ اب میں نے اسے اس طرح چھوا جس طرح کسی چیز کو ہاتھ سے چھوتے ہیں میں اس سے فائز المرام ہوا اور کامیاب و غیر فانی بن گیا۔ تم موت سے کیوں خوف زدہ ہو اور کیوں ڈرتے ہو۔ تم مرنے والے کے وارث کس طرح بن جاتے ہو حالانکہ وہ تو بقیہ حیات ہے؟ کیا تم نے میرا وہ مرثیہ پڑھا ہے جو میں نے زیدان کے لئے کہا ہے۔

روح نے کہا۔ تم کو معلوم ہے میں نے یہ سوال کیوں کیا۔

میں نہیں۔

وہ جب لوگ مجھے بڑا آدمی سمجھتے ہیں جیسا کہ وہ تمہارے والد مرحوم زیدان کو سمجھتے تھے تو ان کو چاہئے کہ وہ میرے اس مقولہ کی پیروی کریں جو میں نے زیدان مرحوم کی نسبت کہا تھا۔ یقیناً بڑے آدمی سے فائدے حاصل کئے جاتے ہیں اسے فائدہ پہونچایا نہیں جا سکتا۔ بڑے آدمی سے میرا مقصد وہ جو عوام سمجھتے ہیں۔

میں مجھے جناب سے جو شرف تکلم حاصل ہے اس کو میں اپنی بڑی کامیابی سمجھتا ہوں

وہ تم زمین کے باشندے لفظ کامیابی کو نہیں جانتے حقیقت میں کامیابی اس عالم میں ہے میرا نفس اس ابدی زندگی کے لئے کس قدر مشتاق تھا میں نے کتنی مرتبہ اپنے تصور میں اس کی تصویر کھینچی۔ اب میں نے اس چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جس کے لئے میرا نفس تڑپتا تھا میں اپنے مشاہدات کی خوبی الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

میں ۔ کیا آپ کسی کے نام کوئی اور پیغام پہنچانا چاہتے ہیں ؟

وہ ۔ میری بہن مریانا کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ وہ اس قدر رنج نہ کرے کیونکہ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جن پر رنج کیا جائے۔

میں ۔ جناب کو میں یاد دلاتا ہوں کہ آپ نے مجھ سے مصر تشریف لانے کا وعدہ فرمایا تھا آپ کے تشریف نہ لانے کا کیا باعث ہے۔

وہ ۔ مجھے وقت نہیں ملا لیکن کچھ پرواہ نہیں اب تم جہاں ...

میں ۔ کیا آپ کی مرضی ہے کہ مس ... کو آپ کا پیغام پہنچا ...

امتحان کی غرض سے کیا تھا کیونکہ مجھے مرحوم کے اور اس کا ...

وہ ۔ اس سے کہ دنیا کہ جبران نے جو کچھ پیشین گوئی کی تھی وہ پوری ہو چکی اور جو کچھ اُس نے عالم خیال میں دیکھا تھا اُسے اپنے حواس ظاہری سے محسوس کر لیا ۔ تم خلود کے نغمہ گاتی رہو اور میرے نتائجِ فکر کا مطالعہ کرتی رہو تاکہ ہماری روحیں اس عالم میں بھی اسی طرح متحد رہیں جس طرح عالم مادی میں ہمارے افکار یکساں تھے ۔ (یہاں پر یہ محسوس ہوا کہ روح نے پھر عبارت میں کچھ تغیر کیا) ۔

میں ۔ کیا آپ ان لوگوں کو کچھ نصیحت فرمانا چاہتے ہیں جو اپنی زندگی میں کامیابی چاہیں ۔

وہ ۔ ان کا مقصدِ حیات صداقت اور عزم راسخ ہونا چاہیئے ۔ یہ اُس شخص کی رائے ہے جس نے تمھاری مادی دنیا کو خوب آزمایا ہے ۔

میں ۔ آپ نے شر کا وجود زیادہ پایا یا خیر کا ۔

وہ ۔ برادرمن ! شر بہت زیادہ ہے بلکہ اکثر شر، خیر کے پردہ میں چھپا ہوتا ہے ۔

میں ۔ شر کے وجود میں کیا حکمت ہے

وہ ۔ خالق اکبر نے انسان کو عقل کامل عطا فرما کر اپنے اعمال و افعال میں بالکل آزاد کر دیا ہے ۔

اس کو اختیار ہے کہ برائی اور بھلائی سے جو راستہ چاہے پسند کر کے عمل پیرا ہو۔

میں لیکن یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اکثر لوگوں میں نیکی کرنے کا خیال ہی بہت کم ہوتا ہے۔

وہ میں نے پہلے آپ سے کہا تھا کہ شاید انہیں بہت کم نیکی کی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں غیر اختیاری طور پر کسی راستہ پر ڈال دئیے جاتے ہیں۔ غالباً روح شریرہ (شیطان) انہیں برائی کے راستہ پر ڈال دیتی ہے روح شریرہ جب بجز تمہیں کسی برائی کی طرف دھکیلتی ہے اور تم مدافعت نہیں کرتے جب کہ تم کو کامل اختیار ہے تو گویا تم شر کا راستہ خود اختیار کر لیتے ہو۔

میں لیکن تمام لوگ عقل و فہم میں برابر نہیں ہوتے۔

وہ بے شک لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جرم سے بری ہو جائیں۔

میں کیا جناب حیات جاوید پر کوئی مضمون ہمارے لئے تحریر فرمائیں گے۔

وہ (کچھ دیر بعد) حیات جاوید یہ الفاظ ایک زمانہ سے تحریروں اور تقریروں میں مستعمل ہیں لیکن اس کے حقیقی راز کو بہت کم سمجھا گیا عام عقل انسانی اور افکار بشری اس کے تصور و تخیل سے ابھی محروم ہے۔ ان کے تصور میں اس کا مفہوم نہیں آسکتا مگر تھوڑی غور و فکر سے وہ یہ ضرور معلوم کر سکتے ہیں کہ اس چند روزہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی جس کا نام ہم نے حیات جاوید رکھا ہے شروع ہونے والی ہے

(اس جگہ پہنچ کر گفتگو ختم ہو گئی)

لبنان کے قیام میں میں نے والد مرحوم اور جبران خلیل جبران کی ارواح سے جو گفتگو کی وہ مفصل بیان کر دی گئی لیکن ان کے علاوہ بھی میں نے بعض ارواح کو طلب کیا مثلاً ڈاکٹر یعقوب صروف سابق ایڈیٹر رسالہ "المقتطف" سعد زغلول پاشا مشہور (مصری لیڈر) اور نقولا تو ما بیک بیرسٹر (یہ صاحب میرے خسر تھے) ان کے علاوہ اور لوگ بھی تھے جن کی روحوں کو بلا کر میں نے گفتگو کی لیکن میں ان گفتگوؤں کو ناظرین کے سامنے پیش کرنا ضروری نہیں خیال کرتا کیونکہ اس گفتگو کا زیادہ حصہ جو ہمارے اور روحوں کے درمیان میں ہوا پرائیویٹ اور ذاتی معاملات

ے متعلق تھا جس سے ناظرین کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ سعد زغلول
پاشا مرحوم نے ہدایت کی تھی کہ میں اپنے رسالہ میں اس مضمون کو ضرور جلد شائع کروں یہ گفتگو
لبنان سے روانہ ہونے کے ایک روز پہلے ہوئی تھی ۔ اس لئے میں اس کی یادداشت جلد مرتب نہ
کرسکا۔ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ڈاکٹر یعقوب صروف ایڈیٹر المقتطف اپنی زندگی میں مکالمات ارواح
وغیرہ کے امکان کے قائل نہ تھے اور المقتطف میں اس موضوع کے خلاف ان کے مضامین شائع
ہوچکے ہیں جب ان کی روح آئی تو باہمی تعارف کے بعد حسب ذیل گفتگو ہوئی ۔

وہ - تمہارے والد مرحوم کس قدر خوش نصیب ہیں کہ انھوں نے تمہارے ذریعہ سے اس موضوع
کے انکشاف میں بڑی کامیابی حاصل کی ہم سب خوش قسمت تھے
غور و فکر کر کے گہری نظر ڈالتا مگر میں ان لوگوں میں تھا جو اس خیال
ذرائع موجود نہ تھے جو آج تمہارے پاس موجود ہیں ۔

میں غالباً جناب روحوں کے متعلق معلومات کی اشاعت میں آپ ہماری مدد فرمائیں گے

وہ ضرور ضرور

میں کیا آپ اپنی بیٹی کے نام کوئی پیغام ارسال فرمائیں گے ؟

وہ بہت بہت سلام کہہ دیجئے اور یہ پیغام پہونچا دیجئے کہ فواد کا بہت بہت خیال رکھیں (استاد
فواد صروف ایڈیٹر المقتطف سے مراد تھی) غریب انیس (انیس استاد فواد کے حقیقی بھائی تھے اور
یورپ سے ان کے انتقال کی خبر آئی)

میں کیا آپ کو ان کے انتقال کی اطلاع ہے ۔

وہ ہاں مجھے معلوم ہے لیکن ابھی تک وہ تنہا ہیں (پچھلے مضمون میں والد صاحب مرحوم کی
روح سے جو مکالمہ درج ہے اس میں یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ روح جسم سے جدا ہو کر کچھ عرصہ تک تنہا
رہتی ہے ۔)

میں پھر آپ کو ان کے انتقال کا حال کیسے معلوم ہوا ؟

و ہ۔ میں نے روتے ہوئے لوگوں کو دیکھا

میں مجھے جناب سے توقع ہے کہ عالم ارواح حالات لکھنے اور ان امور کی اشاعت میں آپ میری مدد کریں گے۔

و ہ ہم فرصت میں سب سے پہلے تمہاری مدد کے لئے حاضر ہیں اور ہم سب تمہاری مدد کریں گے اور تمہارے مضامین کی اشاعت کی آرزو رکھتے ہیں۔

میں کیا آپ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیں گے جسے میں وہاں استعمال کر سکوں کیونکہ میں مصر کی واپسی پر بھی جناب سے ملاقات و گفتگو کی آرزو رکھتا ہوں۔

و ہ یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے۔ اگر تم کو درمیانی لوگ اس غرض کے لئے دستیاب ہو گئے تو ہم ہمیشہ تمہاری ملاقات کے لئے تیار رہوں گے۔

جب میں ایک مرتبہ جلسہ مکالمہ ارواح میں جانے لگا تو مجھے نقولا بک مرحوم کی ایک صاحبزادی نے فرمائش کی کہ میں ان کی روح کو بلاؤں اور ان سے سوال کروں کہ کیا وہ نقولا بک اور ان کی صاحبزادی پر جب کہ وہ موتی جھرہ سے اٹھنے کے بعد نقاہت کی حالت میں تھیں ظاہر ہوئے تھے کیونکہ انہیں ایسا خیال ہوا کہ مرحوم کی روح ان پر ظاہر ہوئی اور اس روح نے ان سے گفتگو بھی کی۔

جب میں جلسہ میں پہونچا تو میں نے نقولا بک مرحوم کی روح کو طلب کیا اس وقت مجھے یہ خیال نہ تھا کہ میں ان واقعات کا سوال کروں جو ان کی بیٹی نے مجھ سے کہا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ سخت بیماری اعصاب پر اثر کرتی ہے اور انسان جلد فریب میں آکر اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ کچھ دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتا۔

جب میں اور نقولا بک مرحوم کی روح گفتگو کر رہے تھے تو دوران گفتگو میں ہمارے افراد خاندان کے متعلق تذکرہ آیا۔ جب ان صاحبزادی کا ذکر آیا جن کے متعلق میں پہلے اشارہ

کر چکا ہوں اور ان کا نام سنڈ ہے تو مرحوم نے بے ساختہ یہ الفاظ کہے کہ میں نے اس کو اولڑکے بھائی کو بلایا تھا لیکن ان میں سے کوئی نہیں آیا میں نے اس سے دریافت بھی کیا تھا کہ کیا وہ آئے گا۔ تو اس نے آنے سے بھی انکار کر دیا۔

میں آپ نے سنڈ کو کیوں طلب کیا تھا۔

وہ میں نے اس لئے اس کو بلایا تھا کہ وہ شدید مرض میں مبتلا تھی اور میں چاہتا تھا کہ میں اس کے مرض کے متعلق مفید مشورہ دوں۔

میں نے اس جلسہ کے بعد سنڈ سے نقولا یک کی ملاقات کا ذ...

ظاہر ہو کر اسی قسم کا اشارہ کیا تھا۔

غالب میرے مشاہدات و مکالمات نقولا ئک مرحوم ...

چاہیئے کہ نقولا یک مرحوم میرے خسر تھے ہمارے خانگی معاملات میں بہت کچھ گفتگو میرے اور نقولا یک کی روح کے درمیان ہوئی۔ ایک روز میری بیوی بھی جلسہ مکالمہ ارواح میں شامل تھی اور انہوں نے مجھ سے چاہا کہ میں ایک ایسی بات کے متعلق سوال کروں جس کا نہ مجھ سے تذکرہ کیا گیا تھا نہ کسی دوسرے شخص سے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن شام کے وقت جب کہ میری بیوی تنہا بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سامنے والد مرحوم کی قد آدم روغنی تصویر تھی اس کو ایسا معلوم ہوا کہ تصویر زندہ ہو گئی ہے اور رنج و ملال کے آثار اس کے چہرے سے عیاں ہیں۔ بلکہ میری بیوی نے اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو گرتے ہوئے دیکھے اس کا علم مجھے اور حاضرین جلسہ میں سے کسی کو نہ تھا نقولا یک کی روح سے جب دریافت کیا فلاں دن کیا ہوا تھا تو روح نے کہا کہ اس نے آنکھوں سے کیا دیکھا تھا۔ اس سے ان آنسوؤں کی طرف اشارہ تھا جو میری بیوی نے اپنے والد کی روغنی تصویر کی آنکھوں میں دیکھے تھے۔

اس سے بھی زائد عجیب بات یہ ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ کیا آپ کوئی پیغام اپنی بیوہ کو دینا پسند فرمائیں گے

وہ میلانہ (بیوہ کا نام) کو میرا سلام شوق پہونچا دو اسے اگر میری تصویر دیکھنا چاہیئے وہ تصویر کو اپنے کمرہ میں کیوں نہیں رکھ لیتی۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حاضرین میں سے کسی کو بھی تصویر اور اس کے جائے وقوع کا علم نہ تھا۔

ہیلانہ اس زمانہ میں کچھ دن ہوئے موسم گرما بسر کرنے لبنان آئی ہوئی تھی جب ہم نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سفر لبنان کے وقت تصویر لانا اپنے ساتھ بھول گئی ہے۔

یہ واقعات جو میں نے بیان کئے ہیں بہت کافی ہیں میری غرض صرف یہ ہے کہ میں اس معاملہ میں ناظرین کے سامنے کچھ نمونے جو خود میں نے دیکھے ہیں پیش کردوں ان لوگوں کو جو اس پر یقین نہیں کرتے اور ان لوگوں کو جو یقین کرتے ہیں۔ ظاہر کردوں یہ حالات ہیں جو خود میں نے مشاہدہ کئے اور تحقیقات سے صحیح ثابت ہوئے۔

میرے نہایت سچے دوستوں نے جو واقعات اپنے چشم دید بیان کئے ہیں ان کے چند نمونے پیش کرکے اپنے مضمون کو ختم کردوں گا ...... یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ میں ان جلسوں میں جن کا ذکر آگے آئے گا خود حاضر نہ ہوسکا۔ اس لئے صحت واقعات کی ذمہ داری راویوں پر ہے۔

پہلا واقعہ۔ ایک جلسہ میں ایک عورت (ج) نے درمیانوں کی معرفت ایک روح کو طلب کیا اور اس سے سوال کیا کہ (ج) کا بھائی جس کا گھر اس جلسہ گاہ سے قریب تھا اس وقت کیا کر رہا ہے روح نے جواب دیا کہ اس وقت اس نے گھڑی دیکھی ہے جس میں ۷ بجکر ۲۰ منٹ گئے ہیں اور اپنے ایک دوست کے ساتھ جو فلسطین سے مہمان آیا ہے قہوہ پی رہا ہے۔ اس کے

کپڑے پر ذرا سا تھوہ ابھی گرا ہے۔ حاضرین میں سے ایک شخص فوراً عورت کے بھائی کے گھر گیا اور تحقیقات سے معلوم ہوا کہ روح نے جو خبر دی تھی بالکل صحیح اور مطابق واقعہ تھی۔

دوسرا واقعہ۔ ایک جرمن خاتون کا لڑکا جنگ عظیم میں مارا گیا۔ خاتون نے لڑکے کو درمیانیوں کے واسطے سے طلب کیا اور چند سوالات جرمنی زبان میں کئے حاضرین میں سے جرمنی زبان کوئی نہیں جانتا تھا جواب عربی زبان میں دیا۔ جرمن خاتون عربی نہیں جانتی اس لئے حاضرین میں سے ایک شخص نے انگریزی میں جواب کا ترجمہ پیش کیا خاتون نے کہا کہ ... [illegible]

تیسرا واقعہ ایک عورت نے ایک شخص مرحوم کا نام بتا کر خواہش کی اور کہا کہ وہ شخص میرا قدیم جاننے والا ہے جب ... تم اس جلسہ میں کسی کو جانتے ہو تو روح نے جواب نفی میں دیا۔ دوبارہ پھر سوال کیا۔ روح نے پھر جواب نفی میں دیا۔ جس وقت یہ سوال وجواب جاری تھے گھر کی کھانا پکانے والی خادمہ پانی لیکر جلسہ میں آئی اس کو دیکھ کر روح نے اقرار کیا کہ یہ عورت اس کی والدہ ہے۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ خادمہ نے اپنی مالکہ سے کہا تھا کہ کسی جلسہ میں اس کے مرحوم لڑکے کی روح کو بلایا جائے اس نے نام معلوم کر کے اس کو بلایا اور اتفاق سے اس کی ماں کے آنے پر روح نے اس کو شناخت کیا جلسہ میں اس کا کوئی اور شناسا نہ تھا۔

میں نے یہ واقعات ناظرین کے لئے مہیا کر دئے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ عجائبات اکثر و بیشتر ایسے ہیں جن کی آسانی سے تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ جب یہ واقعات میرے سامنے گزر رہے تھے تو اس وقت میں اگر متحیر نہیں کر رہا تھا تو کم سے کم متبسم ضرور تھا۔

واقعہ جو کچھ بھی ہو بہرحال میں نے اپنا یہ مضمون ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے جس میں میں نے اپنے ذہنی اثرات اور ذاتی مشاہدات کو بیان کردیا ہے فی الحال میں اس کی کسی توجیہہ کے درپے نہیں ہوتا نہ ابھی کسی آخری فیصلہ کے قبول کرنے کے لئے تیار ہوں ممکن ہے کہ یہ گفتگو درحقیقت اصلی ارواح سے ہوئی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ نفس انسانی میں کوئی طاقت پوشیدہ ہو جو اس قسم کے واقعات پیش کرتے ہیں۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ اپنی حیرت وتعجب میں ناظرین کو شامل کروں میں اپنی جگہ اس کی معلومات کر رہا ہوں ناظرین جن کو اس موضوع سے دلچسپی ہو امید ہے کہ وہ بھی اس کی معلومات کرکے کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل کریں گے۔ علماء اور مفکرین کو ان روحانی مباحث کی طرف توجہ کرنا چاہیئے اور نیک نیتی سے وقت نظر کے ساتھ۔ اس کی تحقیقات کرنی چاہیئے ہمیں جلد بازی کرکے ابھی کوئی فیصلہ کن نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے نہ ان عقائد وآراء پر بھروسہ کرنا چاہیئے جو صحیح مباحث پر مبنی نہ ہوں۔

یہاں ہم فلاسفر ہملٹ ہوراسیو کے قول پر اپنی مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ "زمین وآسمان میں لاکھوں کروڑوں ایسی چیزیں ہیں کہ ہمارا فلسفہ ابھی تک ان کا تخیل بھی نہیں کرسکا ہے"۔

امیل زیدان

نوٹ:۔ جب ہمارا پہلا مضمون اس موضوع پر شائع ہوا تو ہمارے پاس کثرت سے ایسے خطوط آئے کہ اس موضوع کے متعلق مزید روشنی ڈالی جائے اور اس کے متعلق اور امور بھی جہاں تک معلوم ہوسکیں پیش کی جاویں ہم ان خطوط کا خلاصہ بیان کرنا ضروری خیال کرتے ہیں زیادہ ترجن لوگوں نے خطوط روانہ کئے ان میں ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اس طریقہ کی زیادہ تفصیل کی جائے جس کے ذریعہ وہ خود بھی بلا مدد غیرے ارواح کو طلب کرسکیں اور وہ خود اس طریقہ

کا تجربہ کریں بعض نے اپنے خطوط میں بیان کیا کہ طریقہ مذکورہ کے مطابق عمل کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ بلا واسطہ درمیانی لوگوں کے اس معاملہ میں کامیابی ممکن نہیں اگر دست نے مساعدت کی تو میں اس معاملہ میں اور تجربات کے بعد مزید روشنی ڈال سکوں گا۔

بعض لوگوں نے متحرک میز کے ذریعہ سے تجربات کا ذکر کرکے اس کے متعلق میری رائے دریافت کی ہے۔ میں اس کا یہ جواب دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اس قسم کے فیصلہ کن تجربات کا موقع نہیں ملا۔

بعض علماء نے سلسلہ تنقید اس کو یقین کا درجہ عطا د
لاج کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی رائے میں بھی یہ عوا
ممکن ہے کہ یہ یقینی واقعات ہوں لیکن ابھی تک ایک گروہ
میری ذاتی رائے میں ابھی صحیح فیصلہ کا وقت نہیں آیا۔ فقط

ابوحمزہ سید محمد زبیر حسنی؛
(بھوپال)

نقش بدیوار

ای، وی، لوکس کے قلم سے

کل شام ڈیبنے (Dabney) کے مکان پر جو واقعہ پیش آیا اس کے خیال سے اس وقت بھی بدن پر سنسنی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اطمینان ہے تو محض اتنا کہ اس واقعہ میں اور لوگ بھی میرے شریک ہیں۔ مجھے یاد ہے ہمارے درمیان فوق العادۃ واقعات کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ یہ عنوان اگرچہ بےحد دلچسپ ہے لیکن حقیقتاً بالکل بے کار مگر بہر حال ہم میں سے بعض نے ایک آدھ واقعہ بیان کیا مگر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ میرے سامنے جو اجنبی صورتیں تھیں ان میں سے ایک کوتاہ قامت شخص بھی تھا جس کا چہرہ سفید تھا اور جسے رڈسن وائٹ (Rudson Wayte) اپنے ساتھ کھینچ لایا تھا۔ وہ ہر شخص کی بات کو بڑے غور سے سنتا مگر خود کچھ نہ کہتا تھا۔ ڈیبنے Dabney چاہتا تھا کہ دوران گفتگو میں اس کا تعارف ہو جائے۔ اس نے اجنبی سے پوچھا "کیا آپ کو بھی کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس میں کوئی ناقابل تصریح عنصر موجود ہو یا آپ نے کوئی ایسا قصہ ہی سنا ہو؟"

ایک لمحہ تک اجنبی سوچتا رہا "خیر" اس نے کہا میں کوئی کہانی یا بازاری گپ تو بیان نہیں کروں گا جیسا کہ آپ میں سے بعض نے کیا میری رائے میں سچی بات ہمیشہ افسانے کی نسبت زیادہ تعجب انگیز ہی نہیں بلکہ زیادہ دلچسپ بھی ہوتی ہے' میں آپ سے ایک واقعہ بیان کر سکتا ہوں جس کا تعلق میری ذات سے ہے اور جو ایک عجیب انداز میں آج ہی سہ پہر کو ختم بھی ہوا ہے۔

ہم نے بڑے اشتیاق سے اس سے اپنا واقعہ بیان کرنے کی استدعا کی۔

'ایک یا دو سال ہوئے' اس نے کہا میں گریٹ آرمنڈ اسٹریٹ Great Ormand Street) میں ہالبرن (Holbourne) کی سمت ایک پرانے مکان میں مقیم تھا جس کرایہ

میں سویا کرتا تھا اس کی دیواریں کسی گذشتہ مکاندار کے ہاتھوں صدری اور رنگ آمیز ہو گئی تھیں
دنکہ جگہ مرطوب تھی اس لئے دیوار پر بڑے بڑے دھبّہ نمایاں ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک جیسا
لتر ہوتا ہے۔ بالکل انسانی چہرہ سے مشابہ نظر آتا تھا بلکہ معمول سے زیادہ ہوبہو اور نہایت عجیب
صبح کے وقت بستر میں پڑے پڑے، روشنی گل کرتے وقت، خواب سے بیدار ہوتے ہوئے میں
ہمیشہ اسے دیکھا کرتا اور بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ
کسی وہم یا تخیل کا نتیجہ نہیں بلکہ حقیقتاً میرا سہم ممکن ہے عجیب امر یہ تھا کہ جہاں دیوار کے دوسرے
نقش بالعموم بڑھتے اور اپنی حدود بدلتے رہے وہاں اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی بلکہ
ہمیشہ جوں کا توں رہا۔

اسی زمانہ میں میں انفلوئنزا میں گرفتار ہو گیا شدید ...
سارا دن سوائے اس کے کچھ اور کام ہی نہ تھا کہ پڑے جاؤں۔
اس چہرہ نے مجھ پر اور زیادہ اثر کیا اب یہ بالکل حقیقی اور ایک عجیب شخص ...
اسی کا میرے خیالات پر قبضہ تھا۔ اس کی ناک میں ایک عجیب کجی آگئی اور ماتھے کا ڈھال بھی
انوکھا ہو گیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک انسان کا چہرہ تھا، ہزاروں میں سے ایک انسان کا۔

خیر، میں مرض سے سنبھل گیا، لیکن چہرہ کا اثر اب بھی مجھ پر غالب تھا رفتہ رفتہ میرے دل
میں یہ احساس پیدا ہوا کہ گویا میں اس جیسے کسی شخص کی جستجو میں ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شخص حقیقتاً
کسی نہ کسی جگہ موجود ہے اور میں کبھی نہ کبھی اس سے ضرور ملوں گا۔ یہ محض گمان ہی نہ تھا مجھے یقین تھا
کہ میں اور وہ کسی نہ کسی طرح آپس میں منسلک ہو چکے ہیں میں ہمیشہ ان مقامات پر جہاں لوگوں کی
بھیڑ بھاڑ رہتی ہے آیا جایا کرتا تھا۔ سیاسی مجالس، فٹ بال میچ، ریلوے اسٹیشنوں پر جہاں
شہر کے اطراف کی گاڑیاں صبح کے وقت جوق در جوق لوگوں کو شہر میں اتارتی ہیں اور شام
کو پھر ان کو ان کی منزل مقصود پر لے جاتی ہیں، لیکن بے سود ۔ اس سے پہلے مجھے کبھی
یہ خیال نہیں آیا تھا کہ انسانوں کے چہرے کتنے مختلف ہوتے ہیں مگر باوجود ان اختلافات کے

ہم ان کی متعدد قسمیں قرار دے سکتے ہیں جنکو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

بہرحال یہ جستجو میرے لئے ایک خبط سا ہو گئی تھی، میں ہر چیز کو بھول گیا مشغلہ صرف یہ تھا کہ اکثر معروف گوشوں میں کھڑے ہو کر مجموں کو جانچا کرتا تھا یہاں تک کہ لوگ مجھ کو دیوانہ خیال کرنے لگے۔ پولیس بھی مجھے پہچان گئی اور مشتبہ سمجھنے لگی عورتوں پر میں نے کبھی نظر نہیں ڈالی ہر وقت میں صرف مردوں، مردوں اور مردوں کو دیکھا کرتا تھا۔

اس نے قدرے تکان کے ساتھ اپنے ابرو پر ہاتھ پھیرا اور تب اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آخر کار میں نے اسے دیکھ لیا، وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھا پکیڈلی (Piccadilly) کی طرف مشرقی سمت میں جا رہا تھا میں بھی مڑا اور اس کے ساتھ کچھ دور تک دوڑا۔ ایک خالی گاڑی میری طرف آ رہی تھی "اس ٹیکسی کا تعاقب کرو" میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور کود کر گاڑی کے اندر سوار ہو گیا۔ ڈرائیور نے تھوڑی دیر ٹیکسی کا پیچھا کیا بالآخر وہ مجھے چیرنگ کراس (Charing cheering) لے گیا میں لپک کر پلیٹ فارم پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص دو خاتون اور ایک چھوٹی لڑکی کے ساتھ وہاں موجود ہے۔ دو بجکر بیس منٹ والی گاڑی سے اسے فرانس جانا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ اس سے کوئی بات کروں مگر اس کا امکان نہ تھا اس لئے کہ اس کے دوسرے احباب بھی آگئے تھے اور اب وہ سب ایک گروہ کی شکل میں گاڑی کی طرف حرکت کر رہے تھے۔

میں نے جلدی سے فوک سٹون (Folkstone) کا ٹکٹ خریدا۔ اس امید پر کہ میں ان لوگوں سے جہاز پر ملوں گا قبل اس کے کہ وہ روانہ ہو۔ لیکن فوک سٹون پر بھی اس کا موقعہ نہ ملا میرے آنے سے پہلے ہی وہ احباب سمیت جہاز میں سوار ہو چکا تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک بڑے سیلون میں داخل ہو گئے ہیں جو شاید کئی کمروں پر مشتمل تھا، بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص دولتمند ہے

"میری تدبیریں ایک دفعہ پھر باطل رہیں، لیکن میں نے بھی عزم کر لیا کہ اسی جہاز پر سفر کروں گا

مجھے یقین تھا کہ بحری سفر شروع کرنے پر وہ عورتوں کو چھوڑ کر تختۂ جہاز پر چہل قدمی کی غرض سے ضرور آئے گا۔ میرے پاس بولون تک Boulogne ایک طرفہ ٹکٹ کے لئے کافی رقم تھی۔ بہرحال کوئی شے مجھے اس ارادہ سے پھیر نہیں سکتی تھی۔ سیلون کے دروازہ کے سامنے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ قریب آدھ گھنٹہ کے بعد دروازہ کھلا اور وہ شخص باہر نکلا لیکن چھوٹی لڑکی کو ساتھ لے کر میرے دل کی حرکت تیز ہوگئی معلوم ہوتا تھا اس کی دھڑکن جہاز کے انجن سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اسے ہلا سکتی ہے۔ میں فی الواقع اپنے سامنے اس چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہی خط وہی نقشہ۔ اس نے مجھ پر نگاہ ڈالی اور بالائی تختہ پر جانے کے لئے [illegible]

میں نے محسوس کیا کہ اگر یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا تو پھر [illegible]

"معاف فرمائیے گا" میں نے ہکلا کر کہا "ذرا آ[illegible]

متعارف ہونے کی خواہش ہے اور اس کی ایک اہم وجہ [illegible]

وہ بے حد متحیر معلوم ہوتا تھا اور حقیقت میں اسے ہونا بھی چاہیئے تھا لیکن اس نے میری درخواست کو رد نہیں کیا۔ کافی فکر و تامل کے بعد اس نے اپنا کیس نکالا اور اپنا کارڈ مجھے دے کر تیزی کے ساتھ زینے کی طرف چلا صاف ظاہر تھا وہ مجھے پاگل جانتا ہے

کارڈ لے کر میں جلدی سے جہاز کے ایک گوشہ میں چلا آیا میں نے کارڈ کو دیکھا تو میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور سر چکرانے لگا اس کے الفاظ یہ تھے "مسٹر آرمنڈ وال (Wall) Mr. Ormand اور آگے Pittsburg پٹسبرگ یو ایس اے۔

مجھے پھر کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ البتہ ہوش آنے پر میں نے اپنے آپ کو بولون کے شفاخانہ میں پایا وہاں چند ہفتے شکستہ حالی میں گذرے۔ ابھی ایک ہی مہینہ ہوا ہے کہ واپس آیا ہوں"

وہ خاموش ہوگیا۔

ہم اسے دیکھ رہے تھے اور انتظار میں تھے کہ وہ کیا کہتا ہے شام کی تمام مجلسیں اس کوتاہ قد زرد رو آدمی کے قصہ کے مقابلہ میں ہیچ تھیں۔

"میں گریٹ آرمنڈ اسٹریٹ Great Ormond street میں واپس گیا" اس نے لمحہ دو لمحہ بعد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا" اور اس امریکن کی بابت جو کچھ بھی معلوم کر سکتا تھا کرنے لگا، میں نے پٹسبرگ Pittsburg لکھا۔ امریکن ایڈیٹروں سے خط و کتابت کی اور جو امریکن لندن میں مقیم ہیں، ان کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا شروع کیا لیکن جو کچھ کہ ہمیں معلوم ہوا وہ صرف یہ تھا کہ وہ ایک لکھ پتی ہے جس کے والدین انگریز ہیں اور لندن ہی میں کہیں رہتے ہیں۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہاں۔

اور اس طرح کل صبح تک دن پہ دن گزرتا گیا۔ میں معمول سے زیادہ تھک کر لیٹا تھا اور دیر تک پڑا سوتا رہا۔ جب جاگا تو کمرہ میں دھوپ آرہی تھی۔ جیسا کہ معمول تھا میں نے دیوار پر نظر ڈالی، چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ میں نے آنکھوں کو ملا اور خوف سے اچھل کر بیٹھ گیا چہرہ کا نقشہ اسقدر دھندلا کیوں ہو گیا تھا۔ گذشتہ رات تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس قدر نمایاں تھا کہ میں تقریباً اسے بولتے ہوئے سن سکتا تھا، لیکن اس وقت اس کی کیفیت ایک سائے کی سی تھی۔

میں اسی ادھیڑ بن اور تشویش میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور باہر چلا گیا، شام کے اخبارات کی پہلی اشاعت نکل چکی تھی فہرست مضامین پر نگاہ ڈالی تو یہ الفاظ نظر آئے" امریکن لکھ پتی کی موٹر کا حادثہ" آپ سب لوگوں نے بھی اس خبر کو پڑھا ہو گا۔ میں نے اخبار خرید لیا اور بیتابی سے پڑھنا شروع کیا خبر کے الفاظ یہ تھے: "مسٹر آرمنڈ وال پٹسبرگ کے لکھ پتی اپنے رفقا کے ساتھ اسپیزیا Spezzia سے پیسا Pisa سفر کر رہے تھے کہ ان کی موٹر کی ایک ارابہ سے ٹکر ہو گئی مسٹر وال کی حالت نازک ہے،"

میں پھر چوندھیایا ہوا کمرہ میں داخل ہوا اور پلنگ پر بیٹھ کر نابینا آنکھوں سے دیوار کے چہرہ کو دیکھنے لگا اور تعجب یہ ہے کہ اب میرے دیکھتے ہی چہرہ اپنی جگہ سے غائب ہو گیا تھا۔

بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر وال Mr. Wall زخموں کی تکلیف سے جانبر نہیں ہو سکے میرا خیال ہے کہ شاید اسی لمحہ۔۔۔۔۔۔

وہ پھر خاموش ہوگیا

"بڑا تعجب ہے" ہم نے کہا" اور نہایت غیر معمولی واقعہ ہے۔" "بیشک" اعظمی نے کہا" میری
کہانی میں تین عجیب اور غیر معمولی باتیں ہیں۔ اول یہ کہ لندن کے کسی مکان کے داغ یا دھبہ
کے لئے یہ کیونکر ممکن ہوا کہ امریکہ کے ایک لکھ پتی کی شکل سے مشابہ ہو جائے اور اس کی
زندگی سے اس قدر ارتباط پیدا کر لے یقیناً سائنس کو بھی اس کی تشریح کرنے میں آسانی
نہ ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ شاید اس شخص کے نام کا اس جگہ سے کوئی ایسا تعلق ہو۔ لہذا
اس کی شکل کسی غیبی استعانت کے ذریعہ اس قدر عجیب و غریب انداز میں کھینچی گئی ہو۔" میں
غلط تو نہیں کہتا ہوں' اس نے ہم سے سوال کیا،

ہم سب نے اس کی تائید کی اور فوق العادت ...
خروش سے شروع ہوگئی اسی دوران میں اس عجیب ...
ہوا اور خدا حافظ کہ کر رخصت ہوگیا لیکن وہ دروازہ ہی پر پہونچا تھا ...
نے ——— میں خوش ہوں کہ وہ اسپٹن تھا، اسے روک لیا اور ہماری توجہ اس کی عجیب
و غریب کہانی کے تیسرے عنصر کی طرف منعطف کرائی۔ اسپٹن نے کہا آپ کو یاد ہوگا" آپ
نے تین باتوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ تیسری بات کیا تھی!
"ہاں تیسری بات" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ میں تو اسے بھول ہی
گیا تھا۔ اس کہانی کے متعلق تیسری غیر معمولی بات یہ ہے کہ اس کہانی کو گھڑتے ہوئے
مجھے ابھی آدھ ہی گھنٹہ ہوا ہے۔ خدا حافظ

Rudaon Wayte
کچھ ہوش میں آنے کے بعد ہم لوگ چاروں طرف رڈسن وائٹ
کی تلاش کرنے لگے جو اس سانپ کو ہمارے سینوں میں کلوانے اپنے ساتھ لایا تھا۔ لیکن اب وہ
بھی غائب تھا۔ (ترجمہ)

ایچ ایچ عثمانی سنبھلی بی اے مہاراجہ کالج جے پور

دنیا کی رفتار

عالم اسلام

شریف دشمن اور فیاض دوست

"یہ الفاظ تھے جنھیں سفیر برطانیہ نے پچھلے مہینہ معرکہ گیلی پولی کی سرکاری تاریخ صدر جمہوریہ ترکیہ کی خدمت میں ہدیۃً پیش کیا، بین الاقوامی نگاہوں میں انگریزوں کا یہ فعل دوستانہ التفات اور مودت و محبت کی ایک مسرت بخش علامت ہے اور اس سے مقصود فرمانروائے ترکی کے تعلق خاطر اور جنگی قابلیتوں کا اعتراف کرنا ہے۔ فنی اعتبار سے نظارت حربیہ کی یہ تاریخ گیلی پولی کے معرکہ ہائے جنگ کی ایک اہم دستاویز ہے اس لئے کہ اس کی ترتیب میں ترکی اور جرمن افسر بھی شامل تھے۔ مصنف کتاب یعنی بریگیڈیر جنرل اسپنال راوگ لینڈر نے لکھا ہے ..... مجھے خوش قسمتی سے کرنل ولمارسے گفتگو کرنے کا موقعہ ملتا رہا ..... جو سلوا میں ترکی افواج کے سپہ سالار تھے اور ...... کمال عنایت و مہربانی کے ساتھ ۶ اور ۸ اگست ۱۹۱۵ء کے خونفشاں واقعات کو بیان کرتے رہے ....."

یہ گیلی پولی ہی کا خوفناک معرکہ تھا جس میں دنیا مصطفےٰ کمال پاشا کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی جنگی قابلیتوں سے آشنا ہوئی غازی موصوف آج سے کئی سال پہلے جنرل راوگ لینڈر کے دل پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھا چکے تھے ان کا اندازہ ان سطور سے (جو اس وقت لکھی گئی تھیں جب حکومت برطانیہ کو اس قسم کے تہدیہ کا مطلق خیال بھی نہ تھا) سے کیا جا سکتا ہے، جنرل روگ لینڈر کی رائے ہے کہ لیمان فاں سانڈرس کو جو امداد اس "مالک تقدیر" یعنی موجودہ فرمانروائے ترکی سے ملی اس کی پوری پوری تعریف کرنا ناممکن ہے مصطفیٰ کمال پاشا اس وقت ایک پیدل دستے کی کمان کر رہے تھے اور ان کی وہ خداداد قابلیت جو ان کو قیادت و سپہ سالاری میں

عملاً ہوئی ہے ، رہ رہ کر عیاں ہو رہی تھی۔ یہ صرف جنرل موصوف ہی کی معاملہ فہمی کا نتیجہ تھا جنہوں
نے صورت جنگ کا نہایت صحیح اندازہ کرتے ہوئے انزک کور کو پہلے ہی دن اپنا مقصود حاصل کرنے
میں ناکام رکھا پھر یہ انہیں کی زبردست مدافعت تھی جب ۹ اگست کو انہوں نے شمالی ملقے
کی قیادت کرتے ہوئے جس کا انہیں صرف ایک لمحہ پہلے حکم ملا تھا کور نمبر ۱۱ کی پیش قدمی کو روک دیا
ٹھیک چوبیس گھنٹہ بعد اطلاع رسانی کی خدمت بھی خود ہی انجام دیتے ہوئے چناق بائر پر
اپنے جوابی حملے کی ابتدا اس کامیابی سے کی کہ تھوڑی ہی دیر میں ترکوں کا اس پہاڑی پر پورا
قبضہ ہو گیا۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ محض ایک دستے کے کمانڈر [illegible]
ذات کا اس قدر گہرا اثر چھوڑا ہو جس سے محض اس جنگ ۔
ایک پوری قوم کا مستقبل معین ہوا ہو"

جنرل اوگ لینڈر نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ذرا [illegible]
سے کہہ سکتے تھے کہ مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت کا اثر واقعات عالم پر موجود ہے اس لئے اگر
انگریزی عساکر گیلی پولی پر قابض ہو جاتے تو پھر ان کا راستہ قسطنطنیہ تک صاف تھا اور قسطنطنیہ
کا سقوط خاتمہ جنگ کا مرادف ہوتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء کے واقعات پیش
ہی نہیں آتے، بہر حال مہم گیلی پولی میں مصطفےٰ کمال پاشا کی بے نظیر جنگی قابلیتوں کے خلاف انگریزی
فوج سے انتہائی کمزوری اور نالائقی کا اظہار ہوتا رہا مثلاً خلیج سلوا ہی پر جو معرکہ ہوئے ہیں ان کے
متعلق جنرل راوگ لیڈر نے لکھا ہے "سلوا میں دوسرے روز بھی کور نمبر ۱ سے کچھ نہ ہوا حالانکہ بائیس
بٹالین ساحل پر موجود تھے اور مقابلہ صرف ۱۵۰۰ ترکوں سے تھا۔" ظاہر ہے کہ ان حالات کے
ہوتے ہوئے مصطفےٰ کمال ایک ایسے اولوالعزم اور بے خوف سپہ سالار سے لڑنا گویا تقدیر کے خلاف
جنگ کرنا تھا۔

۲۔ ترکی میں مسیحی مدارس

ذیل کا اقتباس جو کسی ترکی اخبار کے حوالے سے "مسلم ورلڈ" میں شائع ہوا ہے۔ ان لوگوں کیلئے غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہوگا جن کو اپنی قوم کی تعلیم و تربیت میں غیروں کی مداخلت گوارا نہیں یا جن کے سینے پر ترکوں کا الحاد اور لامذہبیت کا بوس سوار ہے :۔

"صلحنامہ لوزاں کی رو سے اس سال مسیحی مبلغین کو ترکی میں تعلیم و تدریس کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔ اگر حکومت چاہے تو وہ یک قلم تمام مدارس کو بند کر سکتی ہے لیکن موجودہ صورت حالات اس کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ہمارے ملک میں تعلیم کے لئے کافی مدارس موجود نہیں وزارت تعلیم کی خواہش غالبا یہ ہے کہ وہ اس مقصد کی طرف رفتہ رفتہ قدم بڑھائے۔ اس کے لئے دو تدبیریں اختیار کی گئی ہیں اول یہ کہ ہم اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم کے لئے ان مدارس میں نہ بھیجیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسیحی مدارس کو ابتدائی تعلیم کے درجے بند کردینا پڑینگے ثانیا یہ کہ یونیورسٹی ان مدارس کی اسناد کو تسلیم نہ کرے لیکن اس میں دقت یہ ہے کہ جو طالب علم ان مدارس کی سند لے کر براہ راست یورپ یا امریکہ چلے جاتے ہیں وہ برابر انہیں درسگاہوں میں تعلیم پاتے رہیں گے۔ بہرحال ان تبلیغی مدارس سے جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ ظاہر ہے ہمیں امید ہے کہ حکومت جلد سے جلد کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے گی جس سے ہمارے بچے مزید نقصان سے محفوظ رہیں۔"

۳۔ دستور افغانستان

اعلیٰ حضرت شاہ نادر غازی اور ان کی حکومت نے گذشتہ دو برس میں اپنے وطن عزیز اور ملت کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کا تذکرہ جامعہ کے صفحات میں اکثر آچکا ہے لیکن کسی ملک کی ترقی کا حقیقی انحصار اس پر ہے کہ اس کی حکومت کی بنیادیں استوار ہوں اور اس کے اور قوم کے درمیان ایک زندہ ربط قائم ہو جائے۔ بحمداللہ کہ جلالت مآب کی حکومت اس اہم ذمہ داری سے بھی نہایت مستحسن طریق پر عہدہ برا ہوئی ہے۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ افغانستان

اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں کاملاً آزاد ہے حکومت کا مذہب اسلام ہے اور بادشاہ
کا فرض ہوگا کہ وہ دستور حکومت اور شریعت اسلامیہ کا پابند رہے سوائے شرعی معاملات یا
قوانین حکومت کے ریاست کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اہل افغانستان کی ذاتی آزادی میں مداخلت
کرے غلامی اور بیگار ممنوع قرار دی گئی ہیں. کسی شخص کی ذاتی جائداد ضبط نہ کی جائے گی الا
یہ کہ کوئی شخص افغانستان سے فرار کر جائے. ابتدائی تعلیم جبری ہوگی اور اس کی نگرانی حکومت
کرے گی. ایک دارالشوریٰ قائم کیا گیا ہے جس کے اراکین تین سال کے لئے منتخب ہوں گے.
دارالشوریٰ کی غیر حاضری میں پادشاہ ہنگامی قوانین نافذ کر سکتا ہے لیکن دارالشوریٰ کے آئندہ اجلاس
میں ان کا پیش کرنا ضروری ہوگا. نئے نئے قوانین صرف
پر مہر تصدیق ثبت کرے گا اور پادشاہ دستخط.
دارالشوریٰ سے الگ ایک ایوان بالا اقائم کیا گیا
کے ہاتھ میں ہوگا. اس ایوان کی سفارشات دارالشوریٰ کے سامنے پیش ہوں گی
ایسے مسائل جن میں دارالشوریٰ اور ایوان روسا کو اختلاف ہوگا جس میں اراکین کی ایک مجلس
میں پیش ہوا کریں گے جن کا انتخاب دونوں جماعتوں سے عمل میں آئے گا. اس مجلس کی سفارشات
اول دارالشوریٰ اور اس کی نامنظوری پر بادشاہ کے سامنے پیش ہوں گی.
مغربی اہل الرائے کا خیال ہے کہ یہ نظام حکومت اعلیحضرت شہریار غازی کی غیر معمولی
قابلیت اور بصیرت کا نتیجہ ہے. انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کے صحیح
حالات اور ان کے واقعات کا اندازہ کرنے میں شاہ معزول کی نسبت کہیں زیادہ حق بجانب
ہیں معلوم ہوتا ہے کہ امان اللہ خاں کی نگاہیں مغرب کی ظاہری آب و تاب سے بہت جلد خیرہ ہوگئیں
لیکن نادر شاہ غازی جو پانچ برس تک پیرس میں قیام کر چکے تھے مغربیت کے جلبے سے بیجا طور
پر متاثر نہیں ہوئے.
ہماری رائے میں دستور افغانستان میں صرف ایک ہی سقم ہے اور وہ یہ کہ اس میں شخصیت

اور قانون حکومت کے دو لفظ الگ الگ استعمال کئے گئے ہیں اور یہ اصولی اعتبار سے ایک شدید غلطی ہے اس لئے کہ شریعت کا تعلق محض "مذہبی اعمال سے نہیں بلکہ دنیوی" اعمال و افعال بھی اس میں شامل ہیں اور اسی لحاظ سے "قانون حکومت" شریعت ہی کا ایک جزو ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بالفعل اس قسم کی تفریق سے ممالک اسلامی کی ترقی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا لیکن اس بات کا ہر شخص کو اقرار کرنا پڑے گا کہ حیات قومی کا انحصار مادی وسائل یا نظام سیاست سے بڑھ کر رفعت تخیل پر ہے بشرطیکہ اس کی ترجمانی عمل میں ہو سکے۔ مسلمانوں کی یہ خواہش کہ وہ مادی وسائل کی فراہمی اور اس قدیم اور فرسودہ نظام اجتماعی کے ترک سے جو صریحاً تعلیمات اسلامی کے خلاف ان کے گلے منڈھ دیا گیا تھا اپنی حیات قومی میں پختگی پیدا کریں سراسر حق بجانب ہے لیکن ایسا کرنے میں انھیں غیر معمولی بصیرت اور رفعت نظر کی ضرورت ہو گی ہمیں فلسفۂ تاریخ کے اس عبرت آمیز نکتے کو یاد رکھنا چاہیے کہ جب ایک دفعہ شجر قومی کا رشتہ اس کی اصل سے منقطع ہو جاتا ہے تو پھر ایک شاخ بریدہ کی طرح اس میں زندگی کے آثار پیدا نہیں ہو سکتے۔ ہمیں امید ہے کہ افغانوں کی غیور ملت اس سبق کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

۴۔ ڈاکٹر ٹیگور بلاد اسلامیہ میں

پچھلے مہینے بنگال کے نامور شاعر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور جنہوں نے اپنی شاعری اور بین الاقوامی درسگاہ کے علاوہ سیاحت و تقریر آرائی میں بھی ایک قابل رشک شہرت حاصل کر لی ہے دولت ایران کی دعوت پر اس سرزمین میں تشریف لے گئے جس کو جہان شاعری کا فلک الافلاک تصور کیا جاتا ہے حکومت ایران نے دلی محبت اور گرم جوشی سے ان کو خوش آمدید کہی اور وہ جہاں کہیں بھی گئے ایرانیوں نے بڑے تپاک اور مسرت کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ ان کے اعزاز میں جلسے ہوئے دعوتیں دی گئیں، تقریریں ہوئیں اور یہی کیفیت اہل عراق کی تھی جہاں شاعر نے سیاحت ایران سے فارغ ہو کر شاہ فیصل کی دعوت پر قدم رکھا تھا۔ ڈاکٹر ٹیگور حال ہی میں وہاں سے واپس

تئے ہیں اور اس عجیب و غریب سفر کی مسرت بخش یاد ابھی تک ان کے دل میں باقی ہے بلادِ اسلامیہ کی وسعت و رواداری اور اہم اسلامیہ کی اخلاقی اور روحانی عظمت سے وہ کہاں تک متاثر ہوئے اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے کراچی میں ہوائی جہاز سے اترتے ہی فسادات بمبئی کے سلسلہ میں دیا تھا۔ ایسے ہی طلبہ بغداد کی ایک دعوت میں انھوں نے عراق کی قدیم تہذیب اور اہلِ عراق کی زندہ دلی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"..... نوعِ انسانی میں اتحاد پیدا کرنے کی ذمہ داری اہلِ قلم پر عائد ہوتی ہے .....
میں اسی جذبہ سے سرشار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں ..... آئیے ہم نوعِ انسانی کے
شکوک اور خفیہ سازشوں کو ختم نہیں کریں ..... عرب کبھی بعض .....
ہندوستان میں مسلمانوں کی کثرت کی وجہ سے ہم .....
کرتے ہیں آپ پھر ایک دفعہ جزیرۂ عرب کے پار ہندوستان .....
اور اہلِ ایمان کو ہمارے درمیان بھیجئے۔ اپنے حقِ ہمسائیگی کو اس .....
رواداری کا وجود نہ رہے ....."

مقامِ مسرت ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور نے اسلام اور مسلمانوں کی روحانی عظمت سے انکار نہیں کیا اور وہ عرب کے اس عالمگیر اثر کا اعتراف کرتے ہیں جو ہندوستان پر بھی حاوی ہے اگرچہ بین السطور میں مسلمانانِ ہندوستان کی ذم کا پہلو برابر موجود ہے۔ بہرحال ہم اپنی حمایت میں کچھ نہیں کہیں گے۔ البتہ ڈاکٹر ٹیگور سے صرف اس امر کی التجا کریں گے کہ وہ ہندوستان پر عرب کے عالمگیر اثر کا اندازہ کرنے میں اور زیادہ وسعتِ نظر اور رواداری سے کام لیں اور پھر نوعِ انسانی میں ربط و تعلق پیدا کرنے کی جو ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے اس کے ادا کرنے میں اپنی قوم کی صحیح رہنمائی فرمائیں۔

ہندوستان

۱۔ فرنچائز رپورٹ

بالآخر فرنچائز کمیٹی کی رپورٹ جس کی صدارت لارڈ لوتھین نے فرمائی تھی شائع ہو گئی حالیہ دستوری نظام میں یہ دولت برطانیہ کے حسن نیت اور مدبرین ہند کی آئینی جد جہد کا پہلا ثمرہ ہے جس سے ان عزائم کی تکمیل میں جو گول میز کانفرنس نے اپنے ذمے لئے تھے غیر معمولی مدد ملے گی رپورٹ کا ملخص یہ ہے:-

"فرقہ وارانہ مسئلہ لوتھین کمیٹی کے حلقۂ بحث سے خارج تھا۔ اس کے علاوہ کمیٹی نے حق رائے دہندگی کے مسئلہ پر ہر پہلو سے غور کیا اور وہ اس نتیجے پر پہونچی کہ صوباتی مجالس قوانین ساز کے رائے دہندگان کی موجودہ تعداد (۷۰ لاکھ آٹھ ہزار) کو بڑھا کر تین کروڑ چھ لاکھ کر دینا چاہیے گویا بہا کو مستثنیٰ کرتے ہوئے۔ اس طرح ہندوستان میں بہ نسبت سابق ۱۴۱ء۶ فی صدی رائے دہندوں کا اضافہ ہو جائے گا اور مردوں میں ۴۳ء۶ ۔

لوتھین کمیٹی کی دوسری تجویز یہ ہے کہ فیڈرل اسمبلی کے لئے برطانوی ہند کے رائے دہندوں کی تعداد گیارہ لاکھ پنتالیس ہزار سے چوراسی لاکھ چالیس ہزار کر دی جائے گویا اگر پہلے مردوں کی ایک فی صدی آبادی کو حق رائے دہندگی حاصل تھا تو اب اس کے مقابلہ میں ان کی تعداد دس فی صدی ہو جائے گی۔ لوتھین کمیٹی نے عورتوں کے حق رائے دہندگی میں خاص طور پر اضافہ کرنے کی سفارش کی ہے قرار داد یہ ہے کہ ان کی تعداد تین لاکھ بارہ ہزار کی بجائے چھپن لاکھ کر دینی چاہیے علاوہ ازیں ان کے لئے ہر مجلس میں ۲ سے ۵ فی صدی تک کچھ نشستیں محفوظ کر دی جائیں گی۔

اچھوت اقوام کے لئے کمیٹی نے خاص طور سے سفارش کی ہے کہ ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد فہرست رائے دہندگان پر درج کی جائے۔ مزدوروں کے حصہ نیابت کو بڑھا دیا

گیا ہے. البتہ اہل تجارت، زمینداروں اور یونیورسٹیوں کی نیابت میں مطلق اضافہ نہیں ہوا
کمیٹی کی رائے میں حق رائے دہندگی بالغان کا اصول موجودہ حالات میں ناقابل
عمل ہے. اول تو ہندوستان کی آبادی بہت زیادہ وسیع ہے. ثانیاً ملک میں جہالت
کا زور ہے اور فریقانہ انجمنوں کا وجود کالعدم
صوبجات میں حق رائے دہندگی کے لئے کمیٹی نے جو معیار قائم کئے ہیں وہ یہ ہیں
اول ایک عام معیار یعنی جائداد جس کی مقدار کو اتنا کم کر دیا گیا ہے کہ زمینداروں کاشتکاروں
اور شہریوں کی زیادہ سے تعداد کو حق رائے دہندگی حاصل ہو سکے اور تعلیم جس کا درجہ مردوں
کے لئے زیادہ اور عورتوں کے لئے کم رکھا گیا ہے!

عورتوں، مزدوروں، اچھوت، جاتیوں، اہل صنعت و
کے لئے خاص صلاحیتیں مقرر کی گئی ہیں، تجویز یہ ہے کہ آئندہ
کا ۱/۵ حصہ عورتوں پر مشتمل ہو.
مزدوروں کے لئے کمیٹی نے ہر مجلس میں ۳۸ نشستوں کی سفارش کی ہے. اب تک غیر سرکاری طور
۹ نشستیں ملتی تھیں. کمیٹی نے اس بات کی حمایت کی ہے کہ یوروپین، ہندوستانی عیسائیوں اور
اینگلو انڈین جماعتوں کے لئے خاص نیابت کا انتظام کیا جائے لیکن چونکہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہنوز طے
نہیں ہوا. لہذا کمیٹی کسی جماعت کے حصۂ نیابت کو متعین نہیں کر سکی۔
اچھوت جاتیوں کا حق رائے دہندگی بڑھانے کے لئے کمیٹی نے چھ مختلف تجویزیں پیش کی ہیں
یعنی. ۱۔ ہر دیہاتی کو حق رائے دہندگی دیا جائے ۲. ہر رائے دہندہ دو رائیں دے
سکے. ۳. ہر گھر کو ایک رائے کا حق حاصل ہو. ۴. محض تعلیم کو معیار رائے دہندگی بنا دیا جائے
۵. یا جائداد کی مقدار ان کے لئے اور بھی کم کر دی جائے ۶. یا یہ کہ جس اچھوت کو حق رائے دہندگی
ملے اس کی بیوی کو بھی یہی حق حاصل ہو.
صوبجاتی مجالس قانون ساز کے متعلق کمیٹی کی رائے یہ ہے کہ ان کے منتخب اراکین

کو بڑھا کر دو یا سہ چند کر دیا جائے۔ وفاقی مجلس کے لئے کمیٹی کی رائے میں چھ سو نشتین کافی ہوں گی اس کے لئے حق رائے دہندگی کا معیار وہی رہیگا جو اب صوبجاتی مجالس کے لئے ہے البتہ تعلیمی صلاحیتوں میں کسی قدر ردوبدل کر دیا جائے گا یعنی مرد رائے دہندگان انٹرنس پاس ہوں اور عورتیں اپر پرائمری کمیٹی کی رائے ہے کہ فیڈرل مجلس کے انتخابات براہ راست ہونا چاہئیں اور صوبجاتی مجالس کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے نمائندے خود انتخاب کر کے بھیجے البتہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ صوبجاتی اور فیڈرل مجالس میں ان کی میعاد رکنیت ایک ساتھ ختم ہو جائے۔

ایوان بالا کے اراکین کے انتخاب کے لئے کمیٹی نے اسی طریق کو پسند کیا ہے جس کی مجلس ترکیب وفاق نے حمایت کی ہے۔ لیکن کمیٹی کی رائے میں فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہند کا حصہ نیابت ۲۰۰ کی بجائے ۳۰۰ ہونا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ اگر لوتھین کمیٹی کی سفارشات پر عمل کیا گیا اور اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایسا کیوں نہ کیا جائے، تو اس سے آئندہ مجالس قانون ساز کی ترکیب اور ملک کی مختلف جماعتوں کی نیابت پر غیر معمولی اثر پڑے گا۔ لوتھین کمیٹی کی رپورٹ پر دو پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے اول نظری اعتبار سے یعنی یہ دیکھا جائے کہ لوتھین رپورٹ اور اس کی ہم مثل چیزوں کی بنا پر آئندہ جو نظام سیاست قائم ہو گا اس کے نتائج اس ملک کی عام اخلاقی اور تمدنی زندگی کے لئے کیا ہوں گے۔ اس وقت ہماری اجتماعی روح پر مغربی اثرات نہایت تیزی سے غالب آ رہے ہیں لیکن چونکہ برہمن کو ان پر کوئی خاص اعتراض نہیں اور دو تیخ میں ابھی ان کے فہم و ادراک کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی لہذا ان معاشرتی تبدیلیوں کا جائزہ لینا بیکار ہو گا جو دن بدن ہمارے نظام جماعت کی تبدیلیوں سے مترتب ہو رہی ہیں دیکھنا صرف یہ ہے کہ عملی لحاظ سے لوتھین رپورٹ اس مسئلے کے حل میں کہاں تک مفید ثابت ہوتی ہے جو ہندوستان کے موجودہ افسوسناک اور یاس انگیز حالات کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

"نیشلسٹ" پریس یعنی ہندی صحافت کے اس حصہ سے قطع نظر کرتے ہوئے جس کو کانگریس کی آواز کا ترجمان سمجھا جاتا ہے، لوتھین رپورٹ کے متعلق تقریباً ہر جگہ اطمینان و مسرت کا اظہار کیا گیا ہے

اور واقعہ بھی یہ ہے کہ لارڈ لوتھین اور ان کے رفقاء نے جس محنت اور سرگرمی کے ساتھ مسئلہ حق رائے
دہندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا ہے وہ قابل داد ہے کانگریس نے اب تک حق رائے دہندگی بالغان
کے اصول پر زور دیا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کو لوتھین رپورٹ مسترد کر چکی ہے تو م پرور جماعت
کا دعوی یہ ہے کہ لوتھین کمیٹی کی تجاویز نے "غریب کسانوں" کو بدستور حق رائے دہندگی سے محروم
رکھا ہے۔ اس کے متعلق لارڈ لوتھین کا عذر کہ موجودہ حالت میں "غریب کسانوں" کو دفعۃً اس سطح
پہ لے آنا جو کانگریس کے زیر نظر ہے ناممکن ہوگا کچھ بہت زیادہ لائق سماعت نہیں اس لئے کہ یہ جواز
ے کا وہ ثبوت ہے جو واعظ کی طرف سے پیش ہوا ہے کانگریس کو اپنی جگہ پر ہندوستان کی ایک ... تما
نمائندہ اور غریبوں اور کاشتکاروں کی سب سے بڑی جماعت ہونے کے علاوہ ... کہ حکومت
ہند بالچون و چرا تمام اختیارات اس کے سپرد کر دے لہذا ظاہر ہے کہ
بھی قابل قبول نہیں ہوں گی۔
لیکن چونکہ کانگریس کے ادعائے نمائندگی پر اقلیتوں کو اعتر...
میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مزید براں اس کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ برطانوی پارلیمنٹ
حکومت ہند کے تمام اختیارات کسی ایک سیاسی جماعت کو تفویض کر دے۔ لہذا بہتر ہوگا کہ اہل ہند بالخصوص
مسلمان اپنی پوری کوشش کے ساتھ ان فروگذاشتوں کے خلاف آواز بلند کریں جو لوتھین رپورٹ
میں جابجا موجود ہیں اول تو حلقہ رائے دہندگی کی توسیع سے انتخابات کا خرچ اتنا بڑھ جائے گا کہ صوبجاتی
حکومتیں مشکل سے اس کی متحمل ہو سکیں گی ثانیاً لوتھین کمیٹی کا حلقہ انتخابات کو دفعۃً وسیع کر دینا اور وہ
بھی ایک ایسے ملک میں جہاں ابھی سیاسی تعلیم و تربیت کی غیر معمولی ضرورت ہے ایک خطرناک اقدام
ہے جس کے نتائج بہت ممکن ہے کچھ بہت زیادہ خوشگوار نہ ہوں۔ اکثر لبرل رہنماؤں کا خیال یہ ہے کہ
اس معاملہ میں کمیٹی کو ان اراکین کی تجاویز قبول کرنی چاہئیے تھیں جن کو اس مسئلہ میں اختلاف تھا ہمارے
نزدیک کمیٹی کا مزدوروں کے لئے خاص حلقے قائم کرنا اور عورتوں کے لئے مردوں کی نسبت جداگانہ
معیار پر زور دینا ایک شدید غلطی ہے جس سے بعض جماعتوں کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ سکتا ہے۔

ان عام نقائص کے علاوہ لوتھین رپورٹ میں ایک بہت بڑا سقم یہ ہے کہ اس کی تجاویز کے ماتحت کسانوں کا سواد اعظم حق رائے دہندگی سے محروم رہ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے بعض جماعتوں کے رائے دہندگان کی تعداد کم ہو جائیگی۔ گو جداگانہ انتخابات کی صورت میں اس سے قوموں کے حصہ نیابت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن چونکہ فہرست رائے دہندگان پر ہمیشہ ان کی تعداد کم رہے گی اس لئے ہر قوم کو دوسری قوم کے خلاف شور و غوغا کرنے کا موقعہ ملتا رہے گا بسلمانوں اور بالخصوص مسلمانان پنجاب کو اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ غور کرنا ہے

بہر حال یہ امر قابل اطمینان ہے کہ لوتھین کمیٹی نے حلقۂ رائے دہندگی کی توسیع کی طرف قدم بڑھایا ہے ۔ اس وقت ہندوستان کو ایک پختہ اور وسیع تر نظام رائے دہندگی کی ضرورت ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اقوام ہند اپنی سیاسی تربیت اور جذبۂ عمل کی بدولت ایک روز اس نیک مقصد میں بھی کامیاب ہو جائیں گی۔

۲۔ ایک ناواجب اعلان

چند دن ہوئے مسلم کانفرنس کے بعض اراکین کی طرف سے جریدۂ ٹائمز میں ایک اعلان شائع ہوا جس میں حکومت برطانیہ سے درخواست کی گئی تھی کہ فرقہ دارانہ مسئلے کے تصفیے میں وہ مسلمانان ہند کا خصوصیت سے خیال رکھے اس لئے کہ مسلمانان ہند ہمیشہ حکومت برطانیہ کے وفادار رہے ہیں۔ ان کی طرف کسی سیاسی سازش یا قتل و دہشت انگریزی کی تحریک منسوب نہیں کی جاسکتی۔ قانون شکنی کی مہم میں انھوں نے مطلق حصہ نہیں لیا وغیرہ وغیرہ۔ ہز ہائینس سر آغا خاں نے اس اعلان کے الفاظ میں جہاں ضروری سمجھا مناسب ترمیمات بھی کر دیں

اس اعلان کا شائع ہونا تھا کہ ہمارے "قومی" یا "قوم پرور" جرائد نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہا گیا کہ یہ ایک نہایت ہی ذلیل اور نفرت انگیز دستاویز ہے جس کا مطلب ہندو قوم پر ناواجب اتہامات قائم کرنا ہے۔ جہاں تک اعلان کا تعلق ہے اس سے ہمیں بھی اختلاف ہے اور یہ دیکھ کر

مسرت ہوتی ہے کہ اسلامی صحافت نے بحیثیت مجموعی اس کی مذمت کی یقیناً کوئی خود دار مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی اس قسم کے کسی اعلان کی تائید نہیں کرے گا خود مسلم کانفرنس کے صدر و معتمد نے اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ کانفرنس کا اس اعلان سے کوئی تعلق نہیں اگر بعض ممبران کانفرنس نے اس قسم کی غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی یا کانفرنس کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھایا تو یہ ایک نہایت ہی ناواجب حرکت ہے جس کا انھیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ مگر یہاں بحث "قومی صحافت" کے انداز تنقید سے ہے۔ اگر بعض مسلمانوں نے اپنے سیاسی مسلک یا عقائد کے مطابق اس قسم کا کوئی اعلان شائع کر دیا تو اس سے یہ کہاں لازم آتا تھا کہ برادران وطن ساری قوم پر طعن دراز کرتے آخر مسلمانوں کے علاوہ جو قومیں ہندوستان میں بستی ہیں ان کی طرف سے بھی تو برابر اپنے سیاسی خیالات [illegible] کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ کتنی وطن پرست اور قوم پرور ہستیاں ہیں جنہوں نے قانو[illegible] سے ہمیشہ بریت کا اظہار کیا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ قانون شکنی یا [illegible] اور کون نہیں لیتا ملک کے جو بھی واقعات ہیں وہ سب کے سامنے [illegible] کی سیاسی اور اخلاقی ترقی اور اس کے امن و امان میں کون سی چیز حارج ہے۔ [illegible] بے لاگ تنقید اور شرافت اور دیانتداری سے کام لیں تو کیا اچھا ہو۔ گذشتہ دو ڈھائی برس سے ہمارے ملک کی سیاسیات نے جو رنگ اختیار کر رکھا ہے وہ ہمارے سامنے ہے کیا ہمیں اس بات سے رنج نہیں ہوتا کہ ہم نے اپنے باہمی اختلافات سے ترقی اور کامرانی کے کتنے موقعے کھو دئے ہیں۔ کیا فسادات بمبئی اور اس قسم کے دوسرے المناک حوادث کو دیکھتے ہوئے ابھی اس امر کی ضرورت ہے کہ ہندو مسلم مناقشات کا سلسلہ بدستور جاری رکھا جائے یہ کہنا غلط ہوگا کہ یہ سب کچھ انگریزی حکومت کا نتیجہ ہے۔ یا یہ کہ ہندو اور مسلمانوں کی باہمی لڑائی دراصل اقتصادی لڑائی ہے۔ دراصل ہندو اور مسلمانوں کا اختلاف ایک طرح کا تمدنی اور روحانی اختلاف ہے اور ضرورت اسی امر کی ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے اعمال و افعال کا اندازہ کرنے میں غیر معمولی وسعت نظر اور تحمل و رواداری سے کام لیں جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہم اقوام ہند کی باہمی رقابتوں کو عقیدہ وطنیت کی بدولت مٹا سکتے ہیں ان کے لئے تو اور بھی ضروری

ہے کہ وہ ہر موقعہ پر اپنی وسعت قلب اور جماعتی تعصبات سے بالاتر ہونے کا ثبوت دیا کریں ورنہ توحیت و وطن دوستی کا وہ عقیدہ جس کا اظہار عمل کی بجائے محض صفحۂ قرطاس تک محدود ہو" فرقہ واری" سے بھی زیادہ مضرت کا باعث ہوگا۔

پارلیمنٹ کی "بچی"

انگریزوں کا خیال ہے کہ دنیا کی تمام جمہوری مجالس در اصل برطانوی پارلمنٹ کی نقل ہیں اس لئے کہ جمہوریت کا نشو و نما سب سے پہلے انگلستان میں ہوا۔ گویا انگریزی پارلیمنٹ ہر اس جمہوری ادارے کی ماں ہے جو کتم عدم سے وجود میں آئے اور چونکہ صوبہ سرحد کی قانون ساز مجلس حال ہی میں قائم ہوئی ہے اور وہ بھی انگریزوں کی کوشش سے، وہ پارلمنٹ کی "بچی" ہوئی۔ یہ امر کہ اب تک وہ لوگ جن کے درمیان یہ بچی پرورش پا رہی ہے اور جو سرڈینس برے کی رائے میں تمام ہندوستانیوں کی نسبت جمہوری ادارات کے کہیں زیادہ اہل ہیں انگریزوں کی نظر التفات سے کیوں محروم رہے افسوسناک ضرور ہے مگر اب جو یہ "بچی" دفعتاً وجود میں آگئی ہے (بعض لوگوں کا اب تک خیال ہے کہ اس کی ولادت قبل از وقت ہے) تو حکومت نے ازراہ نوازش و توجہ اس کو بہتر سے بہتر سربراہوں کے سپرد کر دیا ہے تاکہ وہ اس کی تربیت اور نگرانی کا خاص طور سے خیال رکھیں۔

صوبہ سرحد کی کونسل ہر اعتبار سے بچی ہے کیا بہ لحاظ عمر اور کیا بہ لحاظ جسم۔ اس کے اراکین کی تعداد صرف چالیس ہے چونکہ شمالی ہند میں ادہر گرمی کا سخت زور رہا ہے اور پشاور کی آب و ہوا اس زمانہ میں کچھ بہت اچھی نہیں رہتی لہذا بہتر یہ سمجھا گیا کہ اس نوخیز کونسل کا اجلاس ایبٹ آباد کی روح پرور اور فرحت بخش ہواؤں میں منعقد ہو۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ "بچی" ماشاء اللہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی صحت اور اس کے قویٰ نہایت اچھے ہیں اور چشم بد دور اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

بالفعل اس کونسل میں پانچ جماعتیں قائم ہوئی ہیں۔ اول سرکاری جماعت جس کے

نیشنل آنریبل مسٹر سی. ایچ گڈنی اعلیٰ درجے کے مقرر اور با رسوخ مدبر ہیں. صاحب موصوف کے بعد صاحبزادہ سر عبدالقیوم کا نمبر آتا ہے جن کو شاید اسی کونسل کی سربراہی کے صدقے میں "پیر سرحد" کا لقب دیا گیا ہے پھر نواب مظفر خاں صاحب جنہوں نے کونسل کا سارا تارپود تیار کیا اور جو اسٹیشین کے نامہ نگار کی رائے میں گویا کونسل کے "باپ" ہیں.

سرکاری جماعت کے علاوہ دوسری جماعت ہندوؤں کی ہے تیسری "حامیان ترقی" کی اور چوتھی لبرل پارٹی جو بڑے بڑے خوانین پر مشتمل ہے مگر افسوس یہ ہے کہ وہ مقرر بہت "چھوٹے" ہیں راوی کہتا ہے کہ وہ اپنی قوم یا پبلک کی کسی خدمت کا دعویٰ نہیں کر سکتے

پانچویں اور آخری جماعت انڈی پینڈنٹ کی ہے لیعنی

بڑی شکایت یہ ہے کہ انکے اراکین صدر کی بجائے زیادہ تران لوگوں

کا تماشہ دیکھنے کے لئے گیلریوں میں آ جمع ہوتے ہیں. ان کی

عادت ہے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ کونسل کے پہلے ہی اجلاس میں ان سب

بہرحال یہی جماعت رائے عامہ کی ترجمان ہے اور کونسل کے اجلاس اول ہی میں ان کا طرز عمل نہایت کامیاب رہا. انہوں نے تمام سیاسی حالات کا جائزہ لیا نظم ونسق حکومت پر نکتہ چینی کی. صوبہ سرحد کی ضرورتوں پر زور دیا اور آبادی اور رجسٹریشن کے مطالبے کے خلاف ایک فتح بھی حاصل کی البتہ ان کا کونسل سے "اٹھ جانے" کا فعل یعنی "خروج من المجلس" کچھ بہت زیادہ مستحسن نہیں تھا. ممکن ہے "یہ زمانہ جہالت" کی یاد کا نتیجہ ہو اس لئے کہ آزاد جماعت کے رہنما ایک زمانہ میں کانگریس کے ممبر تھے. اور اپنے سابق مرشد کے تتبع میں حکومت کو "شیطانی حکومت" کے نام سے یاد فرمایا کرتے تھے. بہرکیف یہ امر موجب مسرت ہے کہ اب وہ پرانی غلط فہمیاں دور ہو چکی ہیں اور وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا.

آزاد جماعت کو حکومت کی نگہ التفات پر جو تبدیلی قلب کی سب سے بڑی علامت

ہے اتحاد ہے اب اس بات کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ وہ پرانی روش سیاست جو کبھی راعی اور رعایا دونوں کو مضطرب رکھتی تھی ختم ہوئی اور اس کی بجائے عیش و کامرانی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے. قصہ مختصر یہ ہے کہ خدا اس نومولود بچی کو صحت و عافیت عطا فرمائے اور اس کے دولت واقبال میں اضافہ کرے.

ممالک غیر

تخفیف اسلحہ جنیوا کانفرنس کوئی چار مہینے سے اوپر ہونے آئے کہ تخفیف اسلحہ کانفرنس جنیوا میں ہو رہی ہے لیکن ہنوز کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا پہلے ہی دن سے مختلف قوموں کے مقاصد کا اختلاف ظاہر ہونے لگا۔ لیکن ایک دوسرے کی اور ساری دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی یہ کوشش ابھی جاری ہے اور چار مہینے کی کاوشوں کے بعد ابھی یہی مسئلہ زیر بحث ہے۔ جارحانہ اسلحہ کون سے ہوتے ہیں اور مدافعانہ کون سے۔ یا اسلحہ میں کمی کیف کے لحاظ سے ہو یا کم کے اعتبار سے؟ اول الذکر قسم کی تخفیف کے اسلحہ کو یک قلم ممنوع کر دیا جائے یا ان میں معتد بہ کمی کا معاہدہ ہو جا اسلحہ کی تعداد اور مقدار میں کمی کی جائے، آدمیوں میں مصارف میں آ

سچ یہ ہے کہ ہر قوم چاہتی ہے کہ تخفیف اسلحہ کی وہ تجویز مان لی جائے ... قوت کو کم سے کم نقصان ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ فرانس نہ ایک طرح کی تخفیف چاہتا ہے۔ نہ دوسری قسم کی۔ اسے آج بھی وہی تحفظ فرانس کی رٹ لگی ہے جو معاہدہ ورسائی کے وقت سے شروع ہوئی تھی۔ فرانس یہ کہتا ہے کہ اسلحہ میں تخفیف بھی ہوگئی تب بھی یہ تحفظ حاصل نہیں ہوتا ہم دودھ کے جلے ہیں چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پئیں گے۔ اگر استعمال اسلحہ یعنی جنگ کو روکنا ہے تو کسی بین الاقوامی جماعت کو مسلح کرو جو موثر طریق پر جنگ کو روک سکے۔ فرانس کی اس ہٹ نے جنیوا کانفرنس کے کام کو روک سا رکھا تھا کہ اپریل میں امریکن نمائندے نے ہمت کر کے یہ تجویز پیش ہی تو کر دی کہ بم پھینکنے والے ہوائی جہاز، ٹینک، زہریلے گیس اور متحرک بھاری توپیں بالکل ممنوع قرار دے دی جائیں فرانس، پولینڈ، اور ائتلاف صغیر کی حکومتوں کے علاوہ اور سب نے اس تجویز کی تائید کی۔ روس کا نمائندہ تو اس سے بہت زیادہ آگے بڑھنے کو آمادہ تھا، مگر فرانس کے سابق وزیر اعظم تار دیو نے اس کی سخت مخالفت کی اور جتلایا کہ مدافعانہ اور جارحانہ اسلحہ میں تمیز کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے اگر قوموں کے نام نہاد

جارحانہ اسلحہ میں کمی کر بھی دی گئی تو اس سے دراصل ان کی حملہ آوری کی قوت میں زیادہ فرق نہ آئیگا اور وہ ممنوعہ اسلحہ کو بھی برابر چھپ چھپ کر تیار کرتی رہیں گی۔ اس لئے جمعیتہ اقوام کے پاس خود اتنی زبردست فوجی قوت ہونی چاہیئے کہ وہ امن شکن دول کی بروقت سرکوبی کر سکے۔ امریکن تجویز میں جنگی جہازوں کا ذکر نہ ہونے پر فرانسیسی خاص طور پر چہ میگوئیاں کرتے رہے۔

امریکن تجویز پیش ہونے کے دو ہی روز بعد اٹلی کے وزیر خارجہ سینور گراندی نے ممنوعہ اسلحہ کی مجوزہ فہرست میں بڑے جہازوں، آبدوزوں اور ہوائی جہازوں کو ادھر ادھر لے جانے والے جہازوں، نیز جراثیم کے ذریعہ محاربہ کی تمام تدبیروں کا بھی اضافہ کر دیا۔ اور فرانس کے شبہات کے جواب میں جتلا کر کہ اگر قوموں کی بدعہدی کے امکان کو سامنے رکھ کر ہی گفتگو کی گئی تو پھر تو تحفظ کے سارے خیال خواب ہو کر رہ جائیں گے فرانس کے ایک اور چٹکی لی۔

اس کشاکش میں سرجان سائمن نے کوشش کی کہ کوئی ایسی بات نکالیں جس پر سب متفق ہوں اور ایک قرارداد پیش کی کہ یہ کانفرنس خاص خاص قسم کے اسلحہ کی ممانعت کے اصول کو پسند کرتی ہے یعنی اس اصول کو کہ اسلحہ کی بعض قسمیں متعین کر کے بین الاقوامی معاہدہ کے ذریعہ ان کا رکھنا یا استعمال کرنا ممنوع قرار دیدیا جائے بظاہر تجویز معقول تھی، اور پندرہ نمائندوں میں سے ۱۴ اس سے موافق بھی تھے۔ مگر فرانس اور روسانیا نے اس تجویز کو بھی نہ مانا اور اسی وقت تسلیم کیا جب اپنی ہٹ پوری کر لی یعنی ممنوع قرار دینے کے ساتھ یہ لفظ بھی بڑھوالئے کہ "یا بین الاقوامی قابو میں دیدیے جائیں" اس قرارداد سے کوئی بات طے تو پائی نہیں، ظاہر میں ایک چیز پر سب متفق ہو گئے اور اس کی منظوری کے بعد ہی سب ممتاز نمائندوں نے اپنے اپنے ملک کی راہ لی۔ نشستند و گفتند و برخاستند۔

ہاں گھر جاتے جاتے یہ لوگ ماہرین کے چند کمیٹیں مقرر کرتے گئے کہ مختلف اسلحہ کے جارحانہ یا مدافعانہ ہونے، ان میں کمی کے امکانات وغیرہ پر اپنی رپورٹیں تیار کریں یہ ماہرین مہینوں سے بحث کر رہے ہیں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہونچے۔ جنگ عظیم کے بعد صلح ورسائی کے وقت جرمنی کو جارحانہ اسلحہ رکھنے سے منع کرنا تھا تو ۴۸ گھنٹہ کے اندر ماہرین نے طے فرما دیا تھا کہ کون کون سے اسلحہ اس میں

شامل ہیں اور ان کے فیصلہ پر عمل بھی ہوگیا۔ اب دو مہینے سے زاید کی جستجو میں اس کا پتہ نہیں چلتا!

البتہ ان چار ماہ کی کارروائیوں کا یہ نتیجہ ضرور ہوا ہے کہ فرانس اپنے چند چھوٹے چھوٹے یورپی حلیفوں کے علاوہ تخفیف اسلحہ کے معاملہ میں ساری دنیا سے الگ ہوگیا ہے، امریکہ اس کے خلاف ہے، انگلستان اس کے خلاف ہے، اٹلی اس کے خلاف ہے، جرمنی اور بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اس کے خلاف اس جدائی کا اثر فرانس کے مستقبل پر کچھ بہت اچھا نہیں پڑے گا۔ دنیا کی قوموں میں نکو بکر رہنا ذرا مشکل ہے اگرچہ اس وقت فرانس نے اپنی فوجی قوت کے بعد یورپ کی نو آزاد ریاستوں کی مدد سے اپنی حیثیت ایسی کرلی ہے کہ اس اہم معاملہ میں یا کسی اہم معاملہ میں اس کی رضامندی بغیر کوئی فیصلہ کرنا اس فیصلہ کو ناقابل عمل بنا دیتا ہے اور آج ضرور یہ حال ہے کہ سیاست عالم کی ترا...

وہی پلہ جھک جاتا ہے اس سے ابھی تو اسے کوئی نظر انداز نہ کرسکے گا لیکن...

ہے فرانس ہی اٹلی کے توسیعی منصوبوں میں حائل ہے اور انگریز دوں کو...

ہیں بہت معنبوط نہیں دیکھ سکتے، فرانس ہی خار کی طرح کھٹک رہا ہے یہ چیز...

دنیا سے الگ کرکے اس کی آئندہ سرکوبی کے لئے اچھا سامان مہیا کر رہی ہیں!

تاوان اور قرضہائے جنگ۔ لوزان کانفرنس ادھر جنیوا میں تخفیف اسلحہ کے مسئلہ پر ماہرین جھگڑ رہے ہیں اور ادھر دنیا کی تمام حکومتیں مالی دشواریوں میں مبتلا ہیں۔ قریب قریب دیوالیہ ہو رہی ہیں اور بقول وزیر اعظم انگلستان معلوم ہوتا ہے سارا کا سارا نظام معاشی بنیادوں سے بیٹھا جا رہا ہے، اس میں انگلستان فرانس، جرمنی اور امریکہ کا سوال نہیں بلکہ ساری دنیا کا حال تباہ ہے بین الاقوامی قرضوں کے التوا سے سال بھر تک جو دم ملا تھا وہ مدت بھی ختم ہو رہی ہے ادھر جرمنی کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے، مالی تباہی کے ساتھ ساتھ ملک میں انتہا پسند جماعتوں کا اقتدار بڑھ رہا ہے اور اکثر قوموں کے لئے تردد کا باعث ہے چنانچہ تاوان جنگ اور قرضہائے جنگ کے مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس ہو رہی ہے ان سطور کو لکھتے وقت اس کی کارروائیوں کا کوئی مختتم نتیجہ نہیں نکلا ہے۔

اس کانفرنس کی کارروائیاں سمجھنے والے کیلئے جرمنی انگلستان، فرانس، اور امریکہ کے نقطہائے نظر کو

سمجھنا ضروری ہے۔ جرمنی کا حال تو اس بیل کا سا ہے جو تھک کر کندھا ڈال دے' یہ اب صاف صاف کہتا ہے کہ تم لوگوں سے جو بن پڑے کرو ہماری مالی حالت اتنی خراب ہے کہ ہماری طرف سے تاوان کے مسئلہ کو ختم سمجھو۔ ہم اب کچھ ادا نہیں کر سکتے۔ اور نہ کریں گے' اس لئے کہ اگر تاوان کا سنگ گراں ہماری گردن میں بندھا رہا تو ہم کسی طرح اپنے اندرونی مالی اور معاشی مصائب کا سدباب نہ کر سکیں گے۔

فرانس جس کی سرزمین کو ۵۰ سال میں دو مرتبہ جرمن افواج نے تباہ و برباد کیا' کچھ ڈرا ہوا ہے' کچھ ڈرا ہوا بنتا ہے۔ کچھ واقعی نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کی جائز خواہش رکھتا ہے کچھ اپنی مظلومیت کو سرمایہ بنا کر اصل نقصان سے زیادہ وصول کرنا چاہتا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ صلح نامہ ورسائی کی رو سے تاوان کی ایک ایسی توقع قائم کر چکا ہے کہ اسے چھوڑتے دل دکھتا ہے چنانچہ پچھلے انتخاب عام کے موقعہ پر تقریباً سب سیاسی جماعتوں کے اکابر نے یہ بات بہت صاف طور پر بتلادی تھی کہ اگر واقعی جرمنی اس وقت کچھ ادا نہیں کر سکتا تو اس کی وجہ خود [illegible] فضول خرچی ہے' خیر مجبوری ہے اس وقت ادا نہ کرے لیکن ہمیشہ کے لئے اپنے مطالبہ کو ہٹا نہیں [illegible] نہیں [illegible] گے۔

[illegible] جسے یورپ میں فرانس کا فوجی تفوق ایک آن نہیں بھاتا چاہتا ہے کہ فرانس اور جرمنی میں [illegible] ہو جائے' وہ جرمنی کا دوست بنتا ہے اور وہ کرنے کو تیار ہے جسے وہ خوب جانتا ہے کہ فرانس نہیں [illegible] سکتا۔ چنانچہ اس کی تجویز ہے کہ تمام جنگی قرضوں کو جس میں جرمنی کا تاوان بھی ہے' کالعدم کر دیا جائے اور اس [illegible] اور اس کے قابل عمل ہونے پر اسے اتنا بھروسہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے انگریزی وزیر مالیہ نے حکومت کا میزانیہ پیش کیا تو اس میں نہ جرمن تاوان کو آمدنی میں شامل کیا نہ اس رقم کو جو انگلستان امریکہ کو ادا کرتا ہے خرچ میں دکھایا۔

امریکہ جو ان سب کا ساہوکار ہے خود مالی دشواریوں میں پڑ گیا ہے وہ اپنے قرضے معاف کرانے کے لئے آسانی سے آمادہ نہیں' ہاں آمادہ ہو سکتا ہے تو اسی وقت کہ یورپ میں تخفیف اسلحہ سے عام سکون اور سیاسی تعاون سے معاشی حالات پر ایسا اثر پڑے کہ امریکہ کا لین دین بھی بڑھ سکے اور قرضے معاف کر کے وہ جو کھوئے اسے تجارت اور مالی لین دین میں کچھ تو وصول کر لے۔

چنانچہ اُدھر کانفرنس انگریزوں کی اس تجویز سے شروع ہوئی کہ سب بین الاقوامی قرضے کالعدم کر دیے جائیں۔ جرمنی نے ہر طرح کی ادائگی سے معذوری ظاہر کی۔ اٹلی نے ان دونوں کا ساتھ دیا لیکن فرانس کے وزیر اعظم نے باوجودیکہ انگریزی وفد نے پہلے سے بہتری ہوا باندھی تھی صاف صاف کہہ دیا کہ ہم ہمیشہ کیلئے تاوان کے مطالبہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ بظاہر معاملہ یہاں آ کر رک سا گیا تھا کہ امریکہ نے اپنے نمائندے کی معرفت یہ اطلاع پہونچائی کہ وہ قرضوں کی منسوخی یا ان میں تخفیف کے سوال پر اسی وقت غور کر سکتا ہے کہ دول یورپ اپنے اسلحہ پر مصارف میں ... فی صدی کی کمی کر دیں جو لوگ اسلحہ پر اس قدر فضول خرچ کر سکتے ہیں انھیں ضرور اپنے قرضے بھی ادا کر سکنا چاہیے۔

اس تجویز نے قرضہائے جنگ اور تاوان کے مسئلہ کو تخفیف اسلحہ کا نفرنس کو جھنجھوڑ کر ایک بار بیدار کر دیا مگر اس تجویز نے مسئلہ کے حل کو ... کی پوری پوری تائید انگریزوں نے بھی نہیں کی۔ انگریز چاہتے تھے ... قوت کے لیے بڑا خطرہ ہے یکسر ممنوع ہو جائے، امریکہ کی تجویز ان میں صرف تخفیف ... پھر انگریزوں کے نزدیک سب قوموں کی بحری قوت میں ایک ہی انداز سے تخفیف بھی درست نہیں کہ کوئی قوم کسی قسم کے جہازوں کو ضروری سمجھتی ہے کوئی دوسری قسم کو۔ جاپان بھی انگریزوں کا ہمنوا ہے ادھر فرانسیسی چراغ پا ہیں اور کہتے ہیں کہ تخفیف اسلحہ کے معاملہ کو قرضہائے جنگ سے کیا تعلق، خصوصاً جب کہ امریکہ بار بار یہ جتلا چکا ہے کہ قرضہ جنگ کے مسئلہ کو تاوان کے مسئلہ تک تعلق نہیں ہے! اٹلی نے امریکہ کی تجاویز کو بلاکم وکاست اور بلاکسی شرط کے منظور کر کے فرانس کو اور بھی چھیڑ دیا ہے اس لئے کہ ان تجاویز کا اثر یہ ہے کہ فرانس اور اٹلی کی قوت میں باہم نسبت وہی قائم رہے جو اس وقت ہے اور اس پر راضی نہیں۔ اگر فرانس اس پر راضی ہو سکتا تو اٹلی اور فرانس اس بحری معاہدہ میں کیوں شریک نہ ہو جاتے جو برطانیہ، امریکہ اور جاپان میں ہوا تھا اور جو اس وقت تک تخفیف اسلحہ کی سالہا سال کی گفت و شنید کا تنہا ثمرہ ہے۔

غرض اس نئی تجویز سے پیچیدگیاں کچھ کم نہیں ہوئیں بڑھ ہی گئی ہیں البتہ یہاں بھی تاوان کے معاملہ میں فرانس کو اکیلا کر دیا گیا ہے۔ انگریزی سیاست تو کسی طرح یہ نہیں چاہتی کہ فرانس اور جرمنی میں کوئی

معقول سمجھوتہ ہو..... اور اس وقت تو بظاہر اٹلی بھی اس خواہش میں شریک ہے، فرانس یہ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ جرمنی سے اس وقت یا عرصہ تک کچھ وصول کرنا ناممکن ہے اور اگر اس نے اپنی رائے عامہ بہلانے کے لئے اس وقت کسی متعین یا غیر متعین مدت کے لئے تاوان کا لینا ملتوی ہی کیا اور اس قضیہ کو بالکل ختم نہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جرمنی میں فرانس کے خلاف جوش بدستور بڑھے گا انتہا پسند سیاسی جماعتوں کو جو فرانس کے خلاف ہیں فروغ ہوگا اور یورپ کے کاروبار میں بھی وہ اطمینان اور یقین کی صورت نہ پیدا ہو سکے گی جس کی اسے اس وقت سخت ضرورت ہے اور جس کے فقدان کے اثر سے فرانس بھی اب زیادہ دن تک بچ نہیں سکتا دوسری صورت فرانس کے لئے یہ ہے کہ جرمنی کا تاوان تو معاف کرے لیکن جرمنی سے کوئی ایسا معاشی معاہدہ کرے جس سے یورپ کی معاشی زندگی میں ان دونوں ملکوں کا تعاون ممکن ہو جائے اور اس تعاون کے فوائد سے تاوان کی منسوخی کی کچھ تلافی ہو سکے۔ فرانس ان دو راہوں میں سے کونسی راہ اختیار کرتا ہے اس کا فیصلہ اگلے چند ہفتوں میں ہو جائیگا۔

ڈانزگ اور پولینڈ — ناظرین کو معلوم ہوگا کہ صلحنامہ ورسائی کی بہت سی عجیب و غریب کارروائیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ جرمنی کی سب سے بڑی ریاست پرشیا کے مشرقی حصہ کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ان دونوں کے بیچ کا علاقہ پولینڈ کو دیدیا گیا تھا، تاکہ مشرق میں پولینڈ کی قوت بڑھے اور جرمنی تقریباً بے بس ہو جائے اس علاقہ سے متصل جرمنی کی مشہور بندرگاہ ڈانزگ ہے یہ پولینڈ کو دیا تو نہیں گیا لیکن علیحدہ ایک آزاد شہر بنا کر جمعیۃ اقوام کا ایک کمشنر یہاں متعین کر دیا گیا اور پولینڈ کو یہ آسانی بہم پہونچائی گئی کہ وہ کچھ عرصہ تک اس بندرگاہ کو اپنے امدادی جنگی بندرگاہ کے طور پر کام میں لائے اس غرض سے جو معاہدہ شہر ڈانزگ اور ریاست پولینڈ میں ہوا تھا اس کی مدت یکم مئی کو ختم ہو گئی۔ ڈانزگ کی حکومت نے پولینڈ کو اطلاع دیدی کہ اب آئندہ اس شہر کو جنگی بندرگاہ کی حیثیت سے استعمال نہ کیا جا سکے گا: تجدید معاہدہ کی ضرورت اس لئے اور بھی نہیں کہ پولینڈ نے گڈنگن میں خود اپنا جنگی بندرگاہ بنالیا ہے پولینڈ نے اس پر بہت کچھ احتجاج کیا لیکن ہیگ کی بین الاقوامی عدالت نے ڈانزگ کی موافقت میں فیصلہ دے دیا۔

لیکن بین الاقوامی معاملات میں انصاف کے ساتھ ساتھ بہت کچھ مکر و فریب اور خود غرضی کو بھی

دفن ہوتا ہے پولینڈ نے عدالت کے اس فیصلہ سے پہلے اور شاید اس فیصلہ پر اثر ڈالنے کے لئے یہ شور کرنا شروع کیا کہ
بلدیہ کا جو نیم فوجی لشکر منتشر کر دیا گیا ہے اسکا نیا مرکز ڈانزگ بنا ہے اور بیاسی فرانس کے خلاف تمام کارروائیوں کی جال
پھیلائے جائیں گے اور پہلے ہیں تو یہ شہر ہٹلر کے ساتھیوں اور جرمنی کی اشتراکی جماعت میں ایک سخت معرکہ کا جولانگاہ بنیگا
اس خبر سے اکثر ممالک میں خاصا تردد پیدا ہوا۔ اخباروں کے نمائندے جوق جوق آنے لگے لیکن آکر دیکھا کہ جرمنی سیاسی جماعتوں
میں تو کسی قسم کے تصادم کا اندیشہ نہیں البتہ جرمن آبادی میں یہ اندیشہ عام ہے کہ مدت معاہدہ کے ختم ہوتے ہی پولینڈ کی فوج باضابطہ
نہیں تو بے ضابطہ تو ضرور شہر ڈانزگ پر قبضہ کر لے گی نظاہر تو یہ اندیشہ بعید از قیاس معلوم ہوتا تھا لیکن ۱۹۲۰ء کے اکتوبر میں
اسی پولینڈ کا ایک فوجی افسر جنرل زلی گوفکی "بے ضابطہ طور پر شہر ولنا پر قابض ہو گیا"
کہ کر پولینڈ نے اس کے فعل کے نتائج سے اپنے کو بری الذمہ ٹھہرانا چاہا تھا
کہ اس نے سب کچھ حکومت کے ایما بلکہ حکم سے کیا تھا۔ چنانچہ پولینڈ کے سابق
میں صاف صاف اقرار کیا ہے کہ ولنا پر چڑھائی "باضابطہ سرکاری حکم"
اس تجربہ کی وجہ سے اس اندیشہ کو اور بھی تقویت ہوئی اور مختلف ممالک کے نامہ نگار روس اپنے اخباروں تک
اس کی اطلاع بھیجد ی ایک حکومت نے تو اس کا اعلان بھی کر دیا کہ اسکا ایک فوجی جہاز شاید کیم مئی کو ڈانزگ بھیجا جائے
قبل از وقت افشا ہو جانے سے پولینڈ کے "بے ضابطہ" فوجی حلقوں کے منصوبے سرد پڑ گئے؟ شہور مثل ہے کھسیانی بلی کھمبا نوچے اس
ارادہ میں ناکامی ہوئی تو پولینڈ کے سارے کے سارے اخبار جمعیۃ اقوام کے متعینہ کمشنر کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کی غیر جانبداری نے
ہی انکے منصوبہ کو روبراہ آنے سے بہت کچھ روکا۔ اب اس غریب پر طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہیں اور اسے نام کرنیکے تمام
جتن کئے جا رہے ہیں۔

اسی زمانہ میں پولینڈ نے یہ عجیب و غریب مطالبہ بھی باضابطہ پیش کیا ہے کہ ڈانزگ میں محاصل برآمد و درآمد کا سارا نظام
اسکے سپرد کر دیا جائے یہ مطالبہ صلحنامہ ورسائی کی دفعات تک کے خلاف ہے لیکن پولینڈ کے اخبارات نہایت شدومد سے اسکی تائید
کر رہے ہیں شہر ڈانزگ نے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کیا ہے اور اپنے جواب میں صاف صاف لکھدیا ہے کہ "نظام محاصل کے
پولینڈ کو دینے کے بعد ڈانزگ کا آزاد شہر فوجی سیاسی اور معاشی اعتبار سے بالکل پولینڈ کے ہاتھ میں چلا جائیگا اور کسی طرح آزاد
شہر کہلائے جانے کا مستحق نہ رہے گا"۔ اور ظاہر ہے کہ وہ اسکے لئے تیار نہیں! دیکھئے آگے کیا ہو!

شذرات

کارکنان اردو اکادمی چاہتے تھے کہ جامعہ ملیہ میں گرمی کی تعطیل ہونے سے پہلے اکادمی کا ایک اور جلسہ منعقد کیا جائے لیکن ایک تو جامعہ کے امتحانات شروع ہوگئے تھے دوسرے گرمی کی بڑی شدت تھی اس لئے یہ خیال ترک کردیا گیا اب امید ہے کہ ستمبر سے جلسوں کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا اور اپریل سنہ ۱۹۳۳ء تک جاری رہے گا۔ اس عرصہ میں انشاء اللہ چند لکچر اور دو مباحثے منعقد ہوں گے۔

اکادمی کی طرف سے مولوی حفیظ الدین صاحب جوائنٹ منیجر جولائی کے مہینے میں ممالک محروسہ حیدر آباد اور بہار کا دورہ کریں گے تاکہ علم دوست حضرات کو اکادمی کا رکن بنائیں ہمیں امید ہے کہ جامعہ ملیہ کے ہمدرد اور علم ادب کے قدردان موصوف کو ہر طرح سے مدد دیں گے اور کارکنان اکادمی اور جناب شیخ الجامعہ صاحب کو زیر بار احسان فرمائیں گے حیدر آباد آج کل اردو زبان کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے انجمن ترقی اردو کی کوشش سے اور جامعہ عثمانیہ جیسے عظیم الشان ادارے کی بدولت اردو داں طبقہ میں صحیح علمی مذاق پیدا ہوگیا ہے اور اس طبقے میں بہ خلاف ہندوستان کے اور حصوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی داخل ہیں بہار میں اردو جاننے والوں کی آبادی بہت کم ہے لیکن جو تھوڑے سے لوگ ہیں وہ جامعہ ملیہ کی تعلیمی اور علمی خدمات کے بہت بڑے قدرداں ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ مولوی حفیظ الدین صاحب کا یہ سفر کامیاب ہوگا۔

۱۸ر جون کو عورتوں کی یونیورسٹی کا اٹھارھواں سالانہ جلسہ بمبئی کے کاوس جی جہانگیر ہال میں بابو رام چندر چٹرجی کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یونیورسٹی کے ماتحت چار کالج پونا۔ بمبئی۔ بڑودہ۔ اور احمد آباد میں ہیں۔ طالبات کی مجموعی تعداد پچھلے سال شروع میں اور اب ۱۰۷ ہے۔ بمبئی کالج اسی سال قائم ہوا ہے اس کے پہلے سال میں ۱۱ اور تیسرے میں چار طالبات ہیں۔ پونا کالج کی پرنسپل کے عہدے سے اتماؤے صاحب نے استعفا دیدیا ہے۔ اب ڈاکٹر مسز کملا بائی ڈیشپانڈے جی۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پرنسپل مقرر ہوئی ہیں۔ یونیورسٹی کے ماتحت متعدد اسکول بھی ہیں جن میں سے پونا کے اسکول میں ۳۱۳ لڑکیاں پڑھتی ہیں بمبئی میں دو اسکول ہیں جن میں سے ایک یعنی بمبئی گنیاشالا میں طالبات کی تعداد ۲۶۳ ہے۔ پچھلے سال ۱۵۸ لڑکیاں انٹرنس کے امتحان میں شامل ہوئی تھیں۔ اس سال ان کی تعداد ۲۵۳ تک پہونچی۔ پچھلے سال ۹۱ نے کالج کے امتحانات دیے تھے اس سال ۱۲۲ نے دیے۔ چار نئے اسکولوں کا الحاق یونیورسٹی سے ہوا ہے جن میں سے دو صوبہ متوسط میں ہیں، ایک گجرات میں اور ایک ... نے بھی الحاق کی درخواست دی ہے۔

بابو راجندر پرشاد صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں ... نے تعلیم یافتہ لوگوں کا ذریعہ معاش محدود چند پیشوں میں محدود کردیا ہے اور ان پیشوں ... یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے کی شرط ہے اس لئے نئے تعلیمی اداروں کو جو مفید تجربات کرنا چاہتے ہیں پبلک کی طرف سے مدد نہیں ملتی اس کی وجہ سے تعلیمی ترقی مسدود ہوگئی ہے چنانچہ عورتوں کی یونیورسٹی کو جو تعلیم کا نہایت اہم اور مفید تجربہ کر رہی ہے ابھی تک وہ مدد اور ہمدردی نصیب نہیں ہوئی جس کی وہ مستحق ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ عورتوں کی تعلیم کی ضرورت عام طور پر تسلیم کرلی گئی ہے۔ اب سوال زیادہ تر یہ ہے کہ یہ تعلیم کن اصول پر مبنی ہو۔ یہ خیال تنگ نظری پر مبنی ہے کہ عورتوں کو مغربی تعلیم نہ دی جائے۔ علم مشرق و مغرب کا پابند نہیں۔ یہ ہوا اور پانی کی طرح خدا کی ایک نعمت ہے جو ہر ملک کے لئے اور ہر فرد کے لئے عام ہے۔ البتہ اخلاقی تربیت ہر قوم کی اس کی مخصوص روایات کے سایہ میں ہونا چاہئے خصوصاً عورتوں کی تعلیم میں اس کا اور بھی خیال رکھنا چاہئیے

ذریعہ تعلیم کے متعلق موصوف نے فرمایا کہ تعلیم انگریزی زبان میں ہونے سے ہمارے ملک میں پڑھے

اور بن پڑھے طبقوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگیا ہے جسے عبور کرنا ناممکن ہے شکر ہے کہ عورتوں کی تعلیم میں یہ افسوسناک طریقہ اختیار کرنے پر کوئی چیز ہمیں مجبور نہیں کرتی ۔ عورتوں کو انگریزی پڑھانے میں کوئی حرج نہیں لیکن اس کی تعلیم کا معیار اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے جتنا انگلستان ۔ فرانس وغیرہ میں ہوتا ہے جہاں یہ زبان بقدر ضرورت پڑھائی جاتی ہے ۔

بابو صاحب کا یہ خطبہ ہر لحاظ سے نہایت معقول اور مدلل ہے ، اس کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف ملک کی تعلیمی ضروریات کے پورے نبض شناس ہیں ۔ ہمیں امید ہے کہ سب ذی ہوش حضرات خصوصاً مسلمان ماہرین تعلیم اس خطبہ کا مطالعہ نظر غور سے کریں گے مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی جس قدر شدید ضرورت ہے اس کی طرف ہم پچھلے مہینے کے شذرات میں اشارہ کر چکے ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ فی الحال اعلیٰ تعلیم کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی ہے لیکن یہاں بھی وہی صورت ہے جو لڑکوں کی تعلیم میں پیش آئی تھی کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم شروع ہونے کے لئے سب سے پہلے کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت محسوس ہوئی جو معلمی اور تعلیمی رہنمائی کا کام کر سکیں ۔ ملکہ لڑکوں کی تعلیم میں تو ابتدا میں انگریز معلموں سے کام چلتا رہا مگر لڑکیوں کی تعلیم میں غیر ملکی معلمات کو زیادہ دخل دینا مختلف وجوہ سے مناسب نہیں اس لئے مسلمان عورتوں کی ثانوی تعلیم کا مسئلہ اعلیٰ تعلیم کے مسئلے سے وابستہ ہے ۔ اور اس پر بہت جلد غور کرنے کی ضرورت ہے ۔

منشی جی کو انکار کرنا پڑا۔ ان کی جیب میں اس وقت ایک روپیہ تو تھا۔ مگر وہ اسے دینا نہیں چاہتے تھے جمل
اصرار کرنے لگا اور منشی جی بہت گھبرا گئے۔ اتفاق سے سینما ختم ہوا۔ تماشائیوں میں منشی جی کے ایک پرانے
بھی تھے۔ انھوں نے منشی جی کو تانچ دکھانے کا وعدہ کرکے موٹر پر بٹھالیا۔
پرانا دوست، موٹر کی سواری، "گانا"، ناچ، جنت نگاہ، فردوس گوش، منشی جی لپک کر موٹر میں سوار ہوئے۔ جمل
کی طرف ان کا خیال بھی نہ گیا۔ جب موٹر چلنے لگی تو انھوں نے دیکھا کہ وہ وہاں اسی طرح چپ کھڑا ہے۔
"دلاری" اور "گرمیوں کی ایک رات" اس مجموعے کے بہترین افسانے ہیں۔ "جنت کی بشارت" میں شوخی
بہت ہے، اور شرعی پارسائی کی قلعی کھولی گئی ہے۔ ایک مسن مولوی صاحب ہیں جنھوں نے عمر کا خیال کئے بغیر اور
آٹھ بچوں کے باپ ہونے کے باوجود دوسری شادی کی ہے ان نئی مدوحہ کی وجہ سے مولانا کی جان ضیق میں تھی
.... گو کہ مولانا انھیں یقین دلایا کرتے تھے کہ ان کی داڑھی کے چند بال عمر کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں لیکن ان
کی جوان بیوی فوراً دوسرے ثبوت پیش کرتیں اور مولانا کو چپ...
شب قدر کو مولانا مسجد میں گئے۔ عشا کے بعد ڈیڑھ دو بجے...
سحر گہی کی حاضر لذت سے جسم نے نمو پائی، اور مولانا گھر واپس...
صحن کے ایک کونے میں ان کی بیوی کا پلنگ تھا۔ مولانا دبے...
سا شانہ ہلایا .... مولوی صاحب کی جوان بیوی گہری نیند سو رہی تھیں ...
آدھے جاگتے آدھے سوتے ہوئے دھیمی آواز سے پوچھا: "اے کیا ہے؟"
مولانا اس نرم آواز کے سننے کے عادی نہ تھے۔ ہمت کرکے ایک لفظ بولے: "دیاسلائی"
مگر مولوی صاحب کی بیوی کے شباب پر "رات کی تاریکی، ستاروں کی جگمگاہٹ، اور ہوا کی خنکی نے اپنا طلسم
کر دیا تھا" دیاسلائی کی درخواست کا انھوں نے جو جواب دیا اس سے مولانا کو "حوا کی آرزو، آدم کا پہلا گناہ

زلیخا کا عشق، یوسف کی چاک دامانی، غرض عورت کے گناہوں کی تمام فہرست یاد آگئی.... مولانا فوراً
اپنی بیوی کے ہاتھ سے نکل کر اٹھ کھڑے ہوئے اور تیلی آواز سے پھر پوچھا: "دیاسلائی کہاں ہے؟"
مولانا کو دیاسلائی مل گئی، اگرچہ نوجوان بیوی کی زہر سے بجھی ہوئی زبان نے ان کا دل بہت دکھایا،
اور وہ ایک تخت پر جانماز بچھا کر قرآن خوانی میں مشغول ہو گئے۔ لیکن سورہ رحمٰن پڑھتے پڑھتے نیند کا ایسا
غلبہ ہوا کہ وہ سو گئے۔ خواب میں وہ جنت پہنچے، وہ ایک کمرے میں تھے جس کی دیواروں پر قد آدم کھڑکیاں
تھیں، ہر کھڑکی کے سامنے ایک دریچہ جس میں ایک برہنہ حور کھڑی تھی۔ مولوی صاحب پہلے تو شرمائے
پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتے ہوئے ایک کھڑکی کی طرف بڑھے ...... لیکن انسان ایک ابھی

ان کی وہ عزت اور قدر نہیں کرتا۔ تنقید کی آزا[illegible]ی کی گنجائش نہیں رہتی، اور وہ نخوت اور تکبر
جو تنقید کو توہین، اختلاف کو [illegible] کے بے تکلف اظہار کو بدتمیزی قرار دے خلوص اور سچی تنقید
کا سب سے کٹر دشمن ہے لیکن اس پر غور کرنا زندگی کے ہر مصور کا فرض ہے کہ تنقید اور نکتہ چینی کا اس نے جو انداز اختیار
کیا ہے وہ اس کے مطلب کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔ گالی دینا بھی خیالات اور جذبات ظاہر کرنے کا ایک طریقہ
ہے، اور جسے خدا نے زبان دی ہے اس سے ہم گالی دینے کا حق نہیں چھین سکتے۔ مگر یہ سب جانتے ہیں کہ گالیاں
دینے سے مطلب کہاں تک نکلتا ہے ہنسی اڑانے کے بھی بہت سے طریقے ہیں بعض بات کو اس طرح ذہن نشین
کر دیتے ہیں کہ کوئی ناصحانہ انداز ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا بعض آدمی کو اتنا خفا کر دیتے ہیں کہ وہ پھر اور کوئی بات
سننا گوارا نہیں کرتا۔ یہ ایک موٹی سی بات ہے، مگر افسوس ہے "انگارے" کے مصنفوں کو اس کا خیال نہیں رہا۔

سجاد ظہیر صاحب کے افسانوں میں سے ایک 'دلاری' اس زمانہ کی تصنیف ہے جب وہ آرٹسٹ تھے
کسی نئے فلسفۂ حیات کے مبلغ نہیں تھے کوئی نئی ذہنیت پیدا کرنے کی فکر میں نہیں پڑے تھے۔ اس افسانے
کا موضوع بالکل معاشرتی ہے اور اس میں ایک آبرو دار خاندان کی بے حیائی، بد اخلاقی اور سنگدلی دکھائی گئی
ہے۔ زبان، افعال، انداز ہر لحاظ سے یہ تصویر مکمل اور دلکش ہے اور آخری منظر کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے
"گرمیوں کی ایک رات" میں امین آباد پارک کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اور ایک منشی برکت علی کی جمن چپراسی سے
پیچھا چھڑانے اور قرض دینے سے بچنے کی کوشش کا قصہ نہایت ظرافت آمیز طریقے سے سنایا گیا ہے۔ منشی
جی کو جمن نے دیکھا۔ سلام کیا اور ان کے پیچھے لگ گیا۔ منشی جی سوچنے لگے کہ اس کا سبب آخر کیا ہے۔ انھوں
نے جمن سے حال احوال پوچھا تو اس نے اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیا۔ منشی جی اس کا مطلب تاڑ گئے، اور اس
ارادے سے کہ روپیہ مانگنے کا موقعہ ہی نہ ملے وہ جمن سے مذہب پر گفتگو کرنے لگے؛ اور نبی اسرائیل پر جو
مصیبتیں نازل ہوئیں ان کا ذکر کیا۔ جمن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ "آخر یہ نبی اسرائیل بیچارے کون تھے"۔ اس

پر منشی جی کو بہت حیرت ہوئی۔ انھوں نے جمن کو بہت لعنت ملامت کر کے پوچھا:
"حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا نام بھی تم نے سنا ہے؟"
"جی کیا فرمایا آپ نے؟ کلیم اللہ؟"
"ارے بھئی حضرت موسیٰ۔ مو......سا!"
"موسیٰ...... وہی تو نہیں جن پر بجلی گری تھی؟"
منشی جی ٹھٹھا مار کر ہنسے؛ مگر مذہبی گفتگو کا سلسلہ کہاں تک دکھا جا سکتا تھا۔ انھوں نے سنیما کے قریب پیچھا چھڑانے
کی کوشش کی مگر جمن کو واقعی روپے کی ضرورت تھی، وہ کب انھیں جانے دیتا۔ آخر میں وہ مانگ ہی بیٹھا اور

اسلام - ایک تاریخی عقدہ

ہم لوگ لفظ ' اسلام ' کو مختلف معنوں میں استعمال کیا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم اس سے
دین اسلام مراد لیتے ہیں، خواہ وہ محمد کی ابتدائی تعلیمات ہوں یا متکلمین کا نظام عقاید جو بنیادی طور پر
مختلف ہے، یا ایشیا اور افریقہ میں بسنے والے مسلمانوں کے موجودہ مذاہب۔ ہم ایک ہی لفظ
' اسلام ' استعمال کرتے ہیں خواہ ہم ترکوں کی دینی تحریکات کا ذکر کر رہے ہوں یا حبشیوں کی، خواہ
غزالی سے بحث کر رہے ہوں یا سوڈانی مہدی سے
یک عظیم الشان مشرقی سلطنت کو بھی موسوم کرتے ہیں
سلطنت کے کھنڈر پر تعمیر ہوئیں اور آج کل کی مسلم
ریاستوں کے لیے ہی لفظ ' اسلام ' استعمال نہیں کرتے بلکہ ایسے
دنیاوی تعلیمات کا نتیجہ ہو یا اخروی تعلیمات کا۔ پھر آخر میں ہم اس لفظ سے وہ تمدنی 'کل' مراد لیتے
ہیں جو دین اور ریاست دونوں پر حاوی ہے۔ ایک ایسا تمدن جو باوجود تمام مکانی اور زمانی اختلافات
کے بھی بظاہر ایک واحد رنگ رکھتا ہے۔ اسلامی دین، اسلامی تمدن یا اسلامی حکومت سے
وابستہ ہونے کو ہم ایک ایسا امتیازی نشان اور اتحادی عنصر سمجھتے ہیں کہ آری، سامی اور حبشی جیسی
مختلف نسلوں کے افراد کو ہم ایک مشترک نام ' اسلام ' سے موسوم کر دیتے ہیں۔

لیکن ہم اس مسئلے پر جتنا زیادہ غور و خوض کرتے ہیں یہ حقیقت واضح تر ہوتی جاتی ہے کہ ہمیں
امتیازات قائم کرنے کی ضرورت ہے اور اس امر پر جہاں تک زور دیا جائے کم ہے کہ خصوصاً ایسی
حالت میں جب کوشش تفصیلی اقدار کے متعین کرنے کی ہو اس کی اشد ضرورت ہے کہ ہم صاف
صاف بتا دیں کہ لفظ ' اسلام ' سے ہماری کیا مراد ہے۔ پھر بھی باوجود ہر قسم کی احتیاط اور تحدید کے
اس مشترک اور مجموعی لفظ ' اسلام ' کے استعمال سے بچنا ممکن نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ

جائزہ یعنی کیا تمام پہلوؤں پر یہ لفظ اسلام جو درحقیقت ایک دین کا نام ہے حاوی ہو سکتا ہے۔

اس لفظ کے تجزیے کے سلسلے میں ہم ان عناصر کا ذکر کر چکے جو مل کر اسلام کا مجموعی تصور پیدا کرتے ہیں یعنی ایک مشترک ایمان، ایک مشترک سیاسی مطمح نظر اور ایک تمدن جو باوجود مقامی اختلافات کے کم از کم اپنے نظریے میں تو ضرور اور ایک حد تک اپنے عمل میں بھی ایک رنگ اور ایک آہنگ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مختلف عناصر کو یکجا کرنے والی قوت "دین" ہی ہے اور دین ہی پر تمدن اور سیاسی نصب العین کی بنیاد ہے۔ اس زمانے میں تو ضرور ہی دین اسلام اتحاد کا ایک ایسا رشتہ ہے جو قومیت کی رو کا مقابلہ کر کے مختلف اقوام کو ایک رشتے میں منسلک رکھنے پر ایک حد تک قادر ہے۔ اگر مشرقی افریقہ کے "وانگنڈو" قبیلے کا کوئی رکن دین اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس کے بعد وہ اپنی قوم کا نام وانگنڈو نہیں اسلام بتاتا ہے۔ عرب مسلم حبشی مسلم کا بھائی ہو جاتا ہے اور یہ مختلف لوگ ایک دینی مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں۔ مسیحی یورپ کے خلاف بالخصوص تمام دنیا کے مسلمان متحد نظر آتے ہیں۔ چونکہ دین کی اہمیت روزمرہ زندگی کو ہر جگہ کم و بیش ایک ہی رنگ دے دیتی ہے اس لئے ہم ایک ایسے مشترک تمدن کے وجود کو تسلیم کر سکتے ہیں جس میں دین فیصلہ کن عنصر ہو۔

زمانۂ موجودہ کی اس ناقابل انکار صورت حال کی بنا پر اسلام کے تاریخی ارتقا کو سمجھنا اور زیادہ دشوار ہو گیا ہے۔ چونکہ آج کل دین ہی ایسا عنصر ہے جس پر ہر چیز کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور چونکہ اسلام کا تاریخی ظہور ایک دین کے بانی کا رہین منت ہے اس لئے اس سے زیادہ اور کیا بات قرین قیاس ہو سکتی تھی کہ دین ہی وہ عنصر ہو گا جس نے اسلام کے مشترک تمدن کو اگر کلیتاً نہیں تو کم از کم بہت بڑی حد تک پیدا کیا۔ دوسرا سبب ہر چیز کو مولویانہ نظر سے دیکھنے کی عادت ہے جو ہم کو ازمنۂ وسطیٰ سے ورثے میں ملی ہے اور اب تک اسلام سے متعلق یہی نقطۂ نظر عموماً قائم ہے۔ نہ صرف اس زمانے میں بلکہ عہد جدید کی ابتدا میں بھی اسلام کو محض اس نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ وہ ایک مخالف دین ہے جس نے مسیحیت کی اشاعت کو روکا اور اس کے امن اور ملجا تک کو خطرے میں ڈال دیا۔ اسلام کے تاریخی ارتقا کا جو تصور قائم کیا گیا وہ یہ تھا کہ نئے دین نے عربوں میں جوش

پیدا کیا۔ تبلیغ دین کے جذبے نے انھیں اپنے گھروں سے باہر نکالا۔ تلوار کے ذریعے انھوں نے اپنا
دین پھیلایا۔ محمد ایک ہی قالب میں نبی اور سیاسی دونوں تھے اور اسی وجہ سے ایک عالمی سلطنت کا
تخیل پیدا ہوا۔ اس نئی سلطنت میں قدیم عربی تہذیب اور جدید اسلامی دین نے مل کر عربی اسلامی
تمدن کی تعمیر کی اور اگرچہ ظہور اسلام سے پہلے کے بہت سے تصورات اور ادارے قائم رہے لیکن
دین نہ صرف تمدن کی پیدائش کا سبب اول تھا بلکہ اسی نے اس کی تعمیر اور تنظیم بھی کی۔ اسی وجہ
سے فطری طور پر دین نے پورے تمدن کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا یہ تھا "یک رنگ اسلامی
تمدن" کا تصور۔

اگر کوئی اس تصور کو لے کر جو مسیحیت کی ارتقا کی نظر...
مطالعہ کرے تو اس کے تصور کی تصدیق فوراً ہو جاتی...
موجود ہے۔ وہاں بھی یہی خیال موجود ہے کہ اسلام کی تا...
راشدین کے عہد زریں کا۔ ریاست اور معاشرت، علوم اور معا...
ہیں۔ اگر نظریے کے اس مرتب باغ میں کبھی کوئی جنگلی پودا اگ آتا ہے تو وہ "بدعت" کہہ کر اکھاڑ دیا
جاتا ہے۔ کم از کم نظری طور پر تو ضرور ہی اسلامی دنیا پر— ماضی اور حال دونوں میں — دین ہی
کی حکومت ہے۔

ابھی بہت دن نہیں گزرے ہیں — اور آلفرڈ فان کریمر کی قابل قدر تاریخ تمدن کے شائع
ہونے کے بہت دنوں بعد کی یہ بات ہے — کہ جدید اصول تنقید نے اس میدان میں قدم رکھا ہے۔
تحقیق نے آہستہ آہستہ اسلامی روایات کی پابندی سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا اور ہم نے سیاست اور
قانون، مذہب اور زندگی، نظریہ اور عمل میں امتیاز کرنا سیکھا۔ ہم نے تکالیف شرعی اور قومی عادات کی
جنگ میں بیشتر مؤخر الذکر کو فتح پاتے دیکھا اور یہ بھی محسوس کیا کہ تصورات کی کشمکش میں بے شمار مواقع
پر دینی رنگ اسلوب بیان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ہم نے معلوم کیا کہ فقہ کی بنیاد عمل پر نہیں رکھی
گئی بلکہ عمل سے الگ ہو کر اور بیشتر اس کے خلاف۔ اور آخر کار ہمیں یہ بھی یقین آ ہی گیا کہ عربی سلطنت

کے بانیوں نے اپنے دین کی تبلیغ نہیں کی بلکہ صرف عربوں کی دنیاوی طاقت کو پھیلایا۔ کیا یہ انفات ہمارے لیے سامانِ فکر نہیں فراہم کرتے اور کیا ان کی موجودگی میں ہمیں اپنے اس روایتی تصور کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے جو اسلامی تمدن پر دین کے اثر کا ہم نے قائم کر لیا ہے۔

یہ عقدہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جیسا کہ پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے۔ اس سے تو کوئی بھی انکار نہیں کرے گا کہ اسلام کی ابتدا ایک مذہبی وجدان سے ہوئی ہے لیکن محمدؐ کی اس ذہنی کیفیت کے، جو بنیادی طور پر مذہبی تھی، اور عہد حاضر کی اسلامی اتحاد کی تحریکوں کے بیچ میں ایک بہت بڑا فاصلہ ہے جسے ایک ناواقف بلا کسی خیال کے بہت جلد طے کر جاتا ہے۔ بانیِ اسلام کے مذہبی تخیل نے تمام موانع کو کس طرح رفع کیا یا ایک فرد کے مذہبی خیالات نے کس طرح ارتقائی منازل طے کر کے ایسے عالمی اور یک رنگ تمدن کی شکل اختیار کر لی جس میں دین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے؟ اگر ہم اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے اپنے ذہن کو روایات سے آزاد کر لیں تو دین کی عظمت اور اہمیت تو ہمیں ضرور تسلیم کرنی پڑے گی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کے دوش بدوش سیاسی طاقت کا جذبۂ بے پایاں اور معاشی ارتقا کے نتائج بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ تو گویا ہمارے عقدے کا حل اس سوال میں مضمر ہے کہ ' اسلام کا ایک رنگ تمدن کس طرح وجود میں آیا اور اس ارتقا میں مذہبی جذبے کو کتنا دخل رہا ہے ' ؟

ہم دینِ اسلام کی اشاعت کے مطالعے سے ابتدا کرتے ہیں۔ یہ فرض کرنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ کم از کم یہ کلیتاً نہ سہی تو بڑی حد تک ضرور دینی جوش اور جذبہ تبلیغ کا نتیجہ ہوگی۔ مکی عہد میں بے شک ایسا ہی تھا۔ میں اس مورخ کی رائے کو تسلیم نہیں کر سکتا جو محمدؐ کو ایک ایسا سیاسی سمجھتا ہے جو شروع ہی سے مسیحیت اور بت پرستی کے درمیان محض داؤگھات کی تلاش میں ادھر سے ادھر پھر رہا ہو۔[۵۱]

---

[۵۱] *Hugo Winckler, Arabisch - Semitisch - Orientalisch, 1901, pp 52 et seq.*

کا سیاسی جذبہ کامیابی کے زمانے میں بیدار ہوا۔ ایسا استقلال اور ایثار جیسا کہ محمدؐ سے مکہ میں ظاہر ہوا محض سیاسی خواہشات کا نتیجہ نہیں ہو سکتا بلکہ صرف مکمل ایقان اور ایمان سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں ہمیں ایک باخلوص اور پرجوش انسان کی آواز سنائی دیتی ہے جس میں ممکن ہے تخیل کی بلند پروازی نہ ہو لیکن وہ ہرگز محض ایک طالب جاہ و حشمت انسان نہیں ہے۔ محمدؐ کی خواہش تھی کہ اہل مکہ کو بھی اپنے مذہبی وجدان میں شریک کریں۔ اسلام کی عالمی سلطنت کا خیال اگر ان کے ذہن میں پیدا ہوا بھی تو ان کی عمر کے بالکل آخری ایام میں۔ ان مصنفین کی طرح جو ہماری معلومات کا ذریعہ ہیں ہم لوگ بھی اس زمانے کا نقشہ بعد کے واقعات کی روشنی میں کھینچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ تو گویا اسلام کی ابتدا بلاشبہ دینی تھی۔

مدینہ میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی سیاسی طاقت کا
میں جذبۂ دین کا مددگار بن کر غالباً غیر شعوری طور پر پیدا ہو
تو یہ سیاسی جذبہ صاف صاف نظر آنے لگا۔ اس وقت سے
گیا اعتبار رسول خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر ممکن ہے قریب کے
لوگوں نے طلب صادق کی وجہ سے اسلام قبول کیا ہو لیکن اس میں تو شبہ نہیں کہ قبائل کا مجموعی حیثیت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہونا بالکل سیاسی رنگ رکھتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دین اسلام کی اشاعت مدینہ کی سیاسی طاقت کی وسعت کے ساتھ وابستہ تھی اور اس سے پہلے ہی کہ اسلام جزیرۂ عرب سے باہر قدم رکھتا یہ دینی تحریک ایک سیاسی تحریک ہو گئی تھی۔ لیکن جب تک اسلام عرب میں محدود رہا اس جدید ریاست کی تمام رعایا یا کم از کم بہت بڑی اکثریت نے اس جدید دین کو بھی اختیار کر لیا خواہ یہ قبول اسلام کتنا ہی خارجی اور رسمی کیوں نہ رہا ہو۔

اس کے برخلاف جیسے ہی اس نئی ریاست نے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ان خطوں کو فتح کیا جو عرصۂ دراز سے تہذیب اور تمدن کا مرکز تھے صورت حالات بالکل بدل گئی۔ اس وقت سے اسلامی حکومت اور اسلامی دین کی اشاعت میں ایک بیّن فرق نظر آتا ہے۔ وہ بڑی بوڑھیوں کی

داستان یکہ عربوں نے مشرق قریب میں اپنا دین بہ زورِ شمشیر پھیلایا ایسی تمکین کے لئے کتنی ہی کارآمد کیوں
نہ ہو لیکن اس موقع پر اس کی تفصیلی تردید کی چنداں ضرورت نہیں ۔ ہر جگہ مفتوحہ اقوام کو اپنے دینی ارکان
کے ادا کرنے کی پوری پوری آزادی تھی بہ شرطیکہ سیاسی حیثیت سے وہ عربی۔اسلامی ریاست کے
فرماں بردار رہے۔ اس صورت حال سے یقینی طور پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلام اب محمدؐ مکی کا محض تبلیغی
دین نہیں رہا تھا۔ ممکن ہے کہ سیاسی امکانات کا اثر اس پر پڑا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا
کہ اس عہد میں عربی قومی عنصر عالمی دینی عنصر پر غالب آگیا تھا۔ بعض مستثنیٰ افراد سے قطع نظر عام طور پر
عربوں نے مفتوحہ اقوام کو تبلیغ دین کی ہی نہیں۔ دورِ حاضر کے مستعمرین کی طرح وہ بھی خراج ادا کرنے
والے ذمیوں کے اوپر ایک اعلیٰ طبقے کی حیثیت رکھتے تھے۔ 'شہری' صرف عرب ہو سکتا تھا جو حلقۂ
اسلام میں کم و بیش اسی طرح داخل ہوتا تھا جس طرح آج کل قومیت حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح
مشرق قریب پر عربی حکومت کا قیام کیفیت اور زمانے دونوں کے لحاظ سے دین اسلام کی اشاعت سے
متمیز اور مختلف ہے۔ ان دونوں میں کہیں ایک اور کہیں دو یا تین صدیوں کا فرق ہے۔ اس لئے
ہمیں چاہیئے کہ ہم ان دونوں عناصر کے تاریخی ارتقا کا۔ جنھوں نے مل کر اسلام کے یک رنگ تمدن کو
ترکیب دیا ہے۔ الگ الگ مطالعہ کریں۔

وجوہ مذکورہ بالا سے یہ تو کہا ہی نہیں جا سکتا کہ ریاست اسلامی کی توسیع محض جذبۂ دینی کی
رہین منت ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں مشرق میں جو واقعات رونما ہوئے ان کو سمجھنے میں جو تصور
ہمیں سب سے زیادہ مدد دیتا ہے وہ 'ہجرت اقوام' کا تصور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پہلے بھی عربوں کے
فاتحانہ اقدام کو ایک حد تک قومی ہجرت سمجھا گیا ہے اور اس کی توجیہ میں معاشی اسباب بھی پیش کئے
گئے ہیں لیکن تھوڑے دنوں پہلے تک دین ہی کو عام طور پر سبب اصلی قرار دیا جاتا تھا۔ یہ
ہیوگو ونکلر کی قابلیت تھی کہ اس نے سب سے پہلے عربی قومی ہجرت کی تاریخی حیثیت کو نمایاں
کیا۔ اس کے اشارات سے فائدہ اٹھا کر بعد میں لیونے کائتانی نے اپنا مشہور لیکن مختلف فیہ نظریہ
پیش کیا۔ اس نظریے کی رو سے عربی ہجرت وہ آخری بڑی سامی ہجرت ہے جو جزیرہ نمائے عرب

یعنی ساميوں کے مرکز سے متمدن دنیا کی طرف ہوئی۔ اس نظریے میں نئی بات یہ ہے کہ اس کی رو سے یہ تمام ہجرتیں۔ جیسا کہ عام قاعدہ ہے۔ ہزاروں سال کی تدریجی موسمی تبدیلی یعنی ملک کی تدریجی خشکی کا نتیجہ تھیں[1]۔ وہ جذبہ دینی نہیں تھا بلکہ بھوک کی شدت تھی جس نے عربوں کو اپنے وطن کے حدود سے باہر نکالا بالکل اسی طرح جیسے ہزاروں سال قبل سامی قبائل نے ہجرت کی تھی۔

میں اس نظریے سے بالکل متفق ہوں اس لئے کہ اس کا ثبوت تاریخی واقعات سے ہوتا ہے۔ محمدؐ سے صدیوں پہلے سے عرب میں ایک ہیجانی کیفیت رونما تھی۔ جنوبی قبائل شمال میں آکر آباد ہو رہے تھے۔ سرحدی قبائل متمدن ممالک پر چھوٹے چھوٹے حملے کرتے رہتے تھے اور غالباً یہ صحیح ہے کہ عرب میں اس وقت سے کبھی امن ہوا ہی نہیں جب کہ پہلی جماعت [illegible] ملک سے ہجرت کی ہمیں اس ملک کے تدریجی معاشی تنزل کی تاریخی شہادت کم ہونے کا خاص طور پر ذکر ہے اور جیسا کہ قدیم مصنفین اور قدر سے ہو رہا تھا۔ یہ تو فرض نہیں کیا جا سکتا کہ پانی کی کمی اور ہو[illegible] کو پہنچ گئی اس لئے کہ یہ صورت حال تو ہزاروں سال میں پیدا ہوتی ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض موسمی تبدیلیاں بہت تیزی سے ہوئی ہوں، جن کا سبب جنگلوں کا کم ہو جانا یا سمندر کے دھاروں کی تبدیلی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اقوام میں ان تبدیلیوں کا ردعمل بھی جلد نہیں ہوا کرتا۔ غالباً عرب اپنے ملک سے باہر نہ جاتے اگر ان کی پشت پناہی کے لئے اسلامی فوجی طاقت نہ ہوتی اور ٹھیک اسی زمانے میں ایران اور بازنطین کی حالت دعوت فتح نہ دیتی ہوتی۔

اس نظریے کی صحت کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ اس عظیم الشان قومی ہجرت کا اور کوئی سبب بجز معاشی سبب کے باقی ہی نہیں رہتا اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ دینی سبب بہت جزوی

---

[1] نظریہ 'Inaridimento' ملاحظہ ہو:- *Annali dell' Islam II a, Volume 12, paras 105-117.*

حیثیت رکھتا تھا۔ اگر عربوں کی معاشی حالت اچھی ہوتی تو وہ غنیمت کی امید میں اپنے وطن سے باہر ہرگز نہ جاتے۔ ہاں جذبہ دینی کی ایک لہران کو اپنے گھروں سے نکال سکتی تھی لیکن اس حالت میں جدید اسلامی ریاست کا رویہ ملک عرب سے باہر ایسا نہ ہوتا جیسا فی الواقعہ تھا۔

اسلامی حکومت کی توسیع کے محرک معاشی اسباب تھے لیکن یہ ایک سلطنت قائم کرنے کے لئے کافی نہ تھے۔ عربی قبائل پر حرکت پیہم طاری تھی لیکن اگر وہ الگ الگ باہر نکلتے تو زبردست فوجی طاقت کے مقابلے میں کیا کر سکتے تھے خصوصاً ایسی حالت میں کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا اور کسی قسم کا اتحاد عمل ممکن نہ تھا۔ اس کمی کو اسلام نے پورا کر دیا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام نے قبائلی منافرت کو کمسر مٹا دیا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ شمالی اور جنوبی عربوں کی منافرت عہد اسلامی میں ہی پایۂ کمال کو پہنچی تھی۔ محمدؐ نے جب دور کے قبیلوں کو اپنے عَلَم کے نیچے جمع کیا تو اس وقت سیاسی طاقت حاصل کرنے کی خواہش دینی جذبے پر غالب آ چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ دین ہی کی وجہ سے ابتدائً مدینے کا سیاسی نظم ممکن ہوا اور دینی جمعیت پر ہی ریاست کی بنیاد رکھی گئی لیکن اس کے بعد جمعیت نے نہیں بلکہ ریاست نے اپنے سیاسی اغراض کے لئے عربی قومی ہجرت سے، جو اس کے قیام سے پہلے شروع ہو چکی تھی، فائدہ اٹھایا۔ ان لوگوں کی سیرت کا مطالعہ کیجیے جنھوں نے عربی سلطنت کی بنیاد رکھی خالد بن الولیدؓ اور عمرو بن العاصؓ فطرتاً فاتح اور حکمراں تھے۔ دین کا اثر ان پر بہت کم ہوا تھا اور دین سے ان کو سروکار تھا تو اتنا کہ اپنے اغراض کے لئے اس کو استعمال کرنا جانتے تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ یا ان کی جیسی طبیعت رکھنے والے اور دینی مسائل میں غور و فکر کرنے والے افراد نے اس توسیع سلطنت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ مدینے کی حکومت اور اس کے سپہ سالاروں نے اس تحریک کو اٹھایا لیکن بہت جلد یہ چیز ان کے بس سے باہر ہو گئی۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ شروع میں مرکزی حکومت اپنی کامیابی سے خود ہی پریشان ہو گئی تھی لیکن پھر بھی ناقابل انکار سیاسی دوربینی اور انتظامی قابلیت سے کام لے کر اس نے قبائل کی حرص غنیمت پر حدود عاید کئے اور آہستہ آہستہ مفتوحہ علاقے کے نظم و نسق کی ایک طرح ڈالی۔

کلمۂ اتحاد ضرور اسلام تھا لیکن اس کے معنی تھے عربوں کا قبضہ تمام دنیا پر۔ اس قومی شعار میں
بلاشبہ دینی عنصر موجود تھا جیسا کہ مشرقی اقوام کی ہر بڑی تحریک میں ہوتا ہے لیکن باریک بین نظریں قومی
اور دینی عناصر میں بہت آسانی سے امتیاز کر سکتی ہیں خصوصاً تبلیغ دین کے معاملے میں یہ بات بالکل
صاف ہو جاتی ہے۔ غیر عرب کے لیے حلقۂ اسلام میں داخل ہونا اسی وقت ممکن تھا جب وہ کسی عربی
قبیلے سے منسلک ہو جائے۔ قومی عنصر غالب تھا۔ نہ تبلیغ دین کے جذبے نے اور نہ رسولؐ کے پرجوش
الفاظ نے عربوں کو اپنے وطن سے نکالا تھا اور نہ ان کی غرض یہ تھی کہ تلوار اور زبان کی قوت سے
تمام دنیا کو حلقۂ اسلام میں داخل کر لیں بلکہ خروج کی وجہ تو معاشی تکلیف اور قبائل کی بے چینی تھی۔
اس محیر العقول کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کی خوش قسمتی سے ان...
جدید ریاست کا جذبۂ جہاں گیری تھا اور ان کی باگ باعظمت
اس طرح اسلامی سلطنت قائم ہوئی۔ لیکن سوال یہ
کہ دین اسلام مفتوحہ اقوام میں کس طرح پھیلا۔ جب اشاعت دین...
وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ تبلیغ دین میں بہت جد و جہد کی گئی ہو۔ یہی رائے سر ٹامس آرنلڈ کی ہے جن
کی اچھی اور مکمل تصنیف[1] سے لوگ کما حقہٗ واقف نہیں ہیں۔ لیکن آرنلڈ کو جا بہ جا یہ دشواری محسوس
ہوتی ہے کہ اس تبلیغی جد و جہد کی شہادت بہت کم ملتی ہے۔ شہادت کی کمی بالکل تعجب انگیز بات
نہیں ہے اس لئے کہ تبلیغ دین اسلام مقصود بالذات نہیں تھی بلکہ وہ تو ایک ضمنی نتیجہ تھی اہل اسلام
کے امصار و دیار میں پھیلنے کا۔ دین اسلام کی ابتدائی تبلیغ غالباً آج کل کی تبلیغ سے کچھ بہت زیادہ
مختلف نہیں تھی بلکہ اُس زمانے میں دشواریاں زیادہ تھیں۔
دین اسلام کی اشاعت مرادف تھی حکمراں طبقے میں اضافے کی جس کا لازمی نتیجہ تھا خراج

---

[1] The Preaching of Islam ۔ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔ مترجم

ادا کرنے والی رعایا ہی کی۔ یہ نہ تو حکومت کے لئے مفید تھا اور نہ عرب حکمراں طبقے کے لئے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدا ہی سے ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کو اشاعت دین کے مقابلے میں خراج کی کمی کی پروا نہیں تھی لیکن ظاہر ہے کہ ان افراد کا کیا اثر ہو سکتا تھا جب ریاست کی بنیاد سراسر مسلم اور غیر مسلم کے فرق پر تھی۔ یہ بات کہ عربوں کو اشاعت دین کی بہت کم توقع تھی اور انھوں نے اس کے لئے بہت کم کوشش کی۔ اسی سے ظاہر ہے کہ جب کثرت سے لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تو ان کو اپنا سارا نظام مالیات و معاشیات بدل دینا پڑا۔ یہ واقعہ ہے کہ عربی ریاست کی خرابی کی صورت خود اس کی تعمیر میں مضمر تھی۔ وہ اس طور پر کہ اس نے شروع سے ہی حلقۂ اسلام میں غیر عرب کا داخلہ ممنوع نہیں قرار دے دیا۔ یہ ظاہر ہے کہ جب رعایا کو راعی بننے کے لئے بس اسی کی ضرورت ہو کہ کسی دین کو خارجی طور پر اختیار کرے تو امتیاز طبقات کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن غیر عرب کا اسلام لانا ممنوع نہیں قرار دیا جا سکتا تھا اس لئے کہ یہ اسلام کے دینی رجحان کے خلاف ہوتا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ دین محمدی کا دروازہ کسی کے لئے بند کر دیا جاتا۔ یہاں پہنچ کر عالمی دین کے تصور نے قومی ریاست کے اصول کو توڑ دیا حالانکہ ابتدا میں یہ دونوں عناصر ایک دوسرے میں ضم تھے۔ ریاست کی طاقت اور دینی تبلیغ کی کمی کی یہی دلیل ہے کہ یہ نتیجہ قرن اول ہی میں نہیں ظاہر ہوا۔ اہل ریاست کو تبلیغ دین کے اس تخریبی عنصر کا اس وقت احساس ہوا جب وقت گزر چکا تھا۔

چند ہزار افراد تھے تو غالباً فتح کے بعد فوراً ہی دین اسلام قبول کر لیا۔ شہری آبادی نے ضرور یہ کوشش کی ہوگی کہ جلد سے جلد حکمراں طبقے میں شامل ہو جائے۔ جب تک ملک کے لاکھوں افراد نے دین تبدیل نہ کیا تھا بعض افراد کی تبدیلی عربوں کے لئے نہ صرف فوجی بلکہ معاشی حیثیت سے بھی بہت زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ خصوصاً اعلیٰ طبقے کے چند ہزار افراد نے تو مصلحت اسی میں دیکھی کہ عربوں سے گہرا تعلق پیدا کیا جائے۔ اسی حلقے میں مسلم اور مسیحی علما کے درمیان مناظرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ہمارے ذہن میں ان مناظروں کی ایک دھندلی سی تصویر یوحنا دمشقی کی تصانیف سے قائم ہو سکتی ہے۔ مگر ان مناظروں سے دین اسلام کی اشاعت میں غالباً بہت کم مدد ملی۔ زیادہ اثر تبلیغی کوشش کا

ہوا لیکن اس وقت جب یہ کام عربوں کے ہاتھ سے۔ جن میں دینی جذبہ بہت زیادہ نہ تھا نکل کر آرامیوں کے ہاتھ میں۔ جن کی دینی تعلیم و تربیت عرصے سے ہوئی تھی۔ پہنچا۔ ہم اس پہلو پر بعد میں نظر ڈالیں گے۔

ان مبلغین کی تبلیغ و ارشاد سے زیادہ محرک وہ معاشی فوائد تھے جو کسی نومسلم کو عرب کا مولیٰ بن جانے سے حاصل ہوتے تھے۔ مولیٰ کو ابتداء میں گراں بار خراج سے معافی مل جاتی تھی۔ اس موضوع پر یہاں تفصیلی بحث ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شہری زندگی کے بہت سے منافع بھی حاصل ہوتے تھے اور عربی معاشرت میں داخل ہونے کا شرف بھی مل جاتا تھا۔ نئے دین کا قبول کرنا کچھ اتنا زیادہ دشوار بھی نہیں تھا اس لئے کہ اس زمانے میں جب عقاید کی ترتیب میں کچھ بہت زیادہ فرق نمایاں نہیں تھا۔ یہ بظاہر ایک نیا مذہب اور سامی ذہن اس زمانے کی مسیحیت کے مقابلے میں تھی اسلام میں ایک روحانی مناسبت پاتا تھا۔ پھر اسلام حکمراں جماعت کا دین تھا جس کو یہ کامیابی بغیر تائید ایزدی کیسے حاصل ہوسکتی تھی۔ ان وجوہ سے اسلام کی ذہنی مخالفت اتنی قوی نہیں تھی کہ مادی فوائد کی موجودگی میں لوگوں کو اپنا دین بدلنے سے روکتی۔ معاشی منافع کو اپنا خوشگوار اثر آزادی سے پھیلانے کا موقع ملا۔ پھر بھی قدیم ادیان کی مضبوط گرفت کی وجہ سے یا ممکن ہے ذرائع آمد و رفت کی کمی کی بنا پر فتح کے تقریباً نصف صدی بعد لوگوں نے حلقۂ اسلام میں اتنی تعداد میں داخل ہونا شروع کیا جس سے ریاست کے نظام مالیات میں ابتری واقع ہوئی۔ مدبر اعظم حجاج کے زمانے میں ہی ایسے ذرائع کی تلاش شروع ہوگئی تھی جو دین اسلام کی اشاعت کے مہلک اثرات کو روک سکیں۔ عہدِ اموی کا آخری زمانہ تمام تر اسی کوشش میں صرف ہوا کہ عربی ریاست کے اصول اور دین اسلام کی کثیر اشاعت میں مطابقت پیدا کی جائے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ قوانین مالی میں بہت سی بنیادی تبدیلیاں ہوئیں۔ ابھی تک ہم لوگ ان تبدیلیوں سے برائے نام واقف ہوسکے ہیں[1]۔ اس کے بعد قبول اسلام

---

[1] ملاحظہ ہو: Wellhausen, Das Arabische Reich p. 297 et seq.

کا نتیجہ خراج سے آزادی نہیں ہوتا تھا اگرچہ کچھ معاشرتی منافع اور حکمراں طبقے کی یک گونہ مساوات ضرور حاصل ہوتی تھی۔

دین اسلام کی اشاعت بڑے پیمانے پر دراصل اس وقت شروع ہوئی جب عربی قومی ریاست کی دیواریں منہدم ہوگئیں اور نظام معاشرت کی بنیاد قومیت پر باقی نہ رہی۔ یہ عظیم الشان تبدیلی بنی عباس کے ابتدائی عہد میں واقع ہوئی۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ سب سے زیادہ اہم سبب یہ تھا کہ آہستہ آہستہ مفتوحہ اقوام کی ذہنی اور مادی تمدنی فوقیت نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ جب تک عرب اپنے معسکر میں مجتمع رہے، مفتوحہ اقوام سے الگ تھلگ رہے، اور فوجی سرداروں کی حیثیت نہیں بدلی۔ اس وقت تک ان کی فوقیت بھی قایم رہی لیکن جب یہ لوگ کثیر تعداد میں اپنا مرکز چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں آباد ہونے لگے اور امن قایم ہوگیا، جب عربوں کو حکومت سے وظیفہ ملنا بند ہوگیا اور انھیں خود کسب معاش کرنا پڑا، جب موالی کی کثرت سے عرب عجم کا امتیاز مٹ گیا تو پھر ان کے پاس کوئی چیز ایسی نہیں رہ گئی جو مفتوحہ اقوام کی عظیم الشان فوقیت کے اظہار کو روک سکتی۔ یہ شہر میں بھی ہوا اور دیہات میں بھی۔ جب عرب کی حیثیت زمیندار کاشتکار یا ادنیٰ تاجر کی ہوگئی جس میں یا تو وہ نومسلم کاریگروں کا دست نگر ہوتا تھا یا زیادہ سے زیادہ ان کا ہم چشم تو پھر اسے اپنی شان امتیاز قائم رکھنے میں بڑی دشواری پیش آنے لگی۔

جو حالت معاشی زندگی کی ہوئی بعینہ وہی ذہنی زندگی کی بھی ہوئی۔ آرامی یونانی اور ایرانی تہذیب اور روایات کے لحاظ سے عربوں پر اس درجہ فوقیت رکھتے تھے کہ عرب بے چارہ ناشائستہ دیہاتی شمار کیا جانے لگا اور اسے مشرق قریب کے تمدنی عادات اختیار کرنے میں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۳) (2) Becker, Beiträge zur Geschichte Agyptens II p. 81 et seq.

(3) Becker, Papyri Schott Reinhardt 39 et seq.

بڑی وقعت ہوئی[1]۔ اب اس ردعمل کے مقابلے میں عرب کے پاس نہ تو حقیقی طاقت تھی اور نہ کوئی تمدنی
عنصر۔ لے دے کر ایک دین رہ گیا تھا جو بلاشبہ عربی تھا۔ ان حالات میں دین کی اہمیت عربوں پر آشکارا
ہوئی اور وہ لوگ بھی جو پہلے بے پروا تھے دین کی قدر کرنے لگے۔ دین کی رونق ہی ایک چیز تھی جس کو
عربوں سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔

عربوں کی فوقیت اتنی جلد معرض زوال میں نہ آتی اگر حکومت نے عرب ریاست کے سیادتی
اصول کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہوتی لیکن حکومت بھی مجبور تھی کہ رعایا کی اکثریت کے سیاسی خیالات
کی رعایت کرے اور یہ خیالات ایک فرد غالب کے لئے مفید تھے بھی۔ عہد اموی میں ہی ابتدا
ہو چکی تھی لیکن عہد عباسی میں تو پوری طرح قدیم مشرقی مطلق العنان
حاکم کی خداوندی، آداب و مراسم شاہی کی حفاظتی دیواریں، غلا
اور غلاموں اور دربانوں کے فوجی دستے شامل ہیں، جلوہ آرا ہو
شان خود حاکم اعلیٰ کو ناگوار ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم مشرقی ریاست
اور اب بجائے حاکم اور محکوم اقوام کے صرف ایک فرد حاکم رہ گیا اور باقی سب اس کے محکوم
خواہ وہ عرب ہوں یا عجم۔ یوں فرق مراتب بالکل اٹھ گیا اور رعایا نے حاکم کے دین کو قبول کرنے
میں سبقت کی۔ اس کے علاوہ جب حاکم اور محکوم طبقوں میں میل جول بڑھا تو عربی زبان بھی رائج
ہوئی اور عربی دین بھی۔

اب اشاعت دین بہت تیزی سے ہونے لگی۔ عربوں نے مفتوحہ اقوام کو حلقۂ اسلام میں
داخل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب تبلیغی کام ان کے ہاتھ میں نہیں رہا بلکہ نومسلم اور ان
کی اولاد نے یہ کام شروع کیا۔ ان لوگوں کی روایات بالکل مختلف تھیں۔ یہ پہلے عیسائی رہ چکے

---

[1] ملاحظہ ہو: Goldzihers Studien über die Šuʿūbiya in: Muhammedanische Studien I, 147 ff.

سے علاوہ کلیسائی نگاہ رکھتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آرامیوں کو دینی مسائل سے بے حد مناسبت تھی۔ ایرانی نسل کے افراد بھی ریاستی کلیسا کا تجربہ رکھتے تھے اور دین کو زندگی کے ہر شعبے میں دخل دیتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ جب کسریٰ کی مطلق العنان حکومت کا احیا ہوا تو اس کے ساتھ درباری علما بھی پیدا ہوئے حالانکہ باوجود اپنی دینی فوقیت کے دعوے کے یہ عنصر عربی طبیعت کے بالکل مخالف تھا[1]۔ غیر مسلموں کا حلقۂ اسلام میں داخل ہونا اب حکومت وقت کے لئے اتنا ہی مفید تھا جتنا بنی امیہ کی عربی ریاست کے لئے مضر ثابت ہوا تھا۔ حکام کو ایک نئے طبقے کی مدد حاصل ہوئی جو پہلے نہیں حاصل تھی یعنی متکلمین اور فقہا یا بالفاظ دیگر علما کا طبقہ۔ جب یک گونہ معاشرتی مساوات پیدا ہو گئی تو ان لوگوں کو، جو دینی جذبے سے متاثر تھے طبعاً غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ ایسی کامیابی جو عرب فاتحین کو اس لئے نہیں حاصل ہو سکی تھی کہ وہ غیر عرب اقوام کو اپنے حلقے میں داخل کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ عہد بنی عباس میں ایک عالم دین کی عظمت کا اندازہ اس پر تھا کہ ہزار ہا افراد نے اس کی تبلیغ وارشاد سے دین اسلام قبول کیا[2]۔ ان حالات کی بنا پر سمجھ میں آتا ہے کہ اس زمانے میں دین اسلام تیزی سے پھیلا ہوگا اور غالباً چوتھی صدی ہجری کے آخر تک دین اسلام کی مشرق میں تقریباً اتنی ہی اشاعت ہو گئی تھی جتنی آج کل ہے۔ گویا اس زمانے میں پھر اشاعت اسلام کا محرک جذبۂ دین ہو گیا جیسا کہ محمدؐ کے مکی عہد میں تھا لیکن درمیانی زمانے میں معاشی اور سیاسی عناصر اگر خالصتاً نہیں تو بڑی حد تک ضرور کارفرما تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام کی یک رنگ دینی تہذیب کے وجود کا واحد سبب یہی ہے کہ مشرق میں دین اسلام پھیل گیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اگر ایسا خیال کیا جائے تو اس کے

---

[1] Goldziher, Islamisme et Parsisme (Reveu de l'histoire des religion, 43, 1901.)

[2] Arnold, The Preaching of Islam, p. 65.

یعنی یہاں یہ کہ سبب کو نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے۔ دین محمدی نے یک رنگ اسلامی تہذیب نہیں پیدا
کی بلکہ عباسی سلطنت کی یک رنگ تہذیب نے جو بالکل دوسرے اسباب کا نتیجہ تھی ایسی حالت پیدا
کی جس میں دین اسلام کی اشاعت ممکن ہوئی۔ واقعات کی رفتار پر عربی تہذیب کی عظمت کے افسانے
کی وجہ سے پردہ پڑ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عہد خلافت کی تہذیب عربوں نے پیدا کی اور بعض لوگ تو
ملوکی عمارات اور الحمرا کو بھی عربوں سے ہی منسوب کر دیتے ہیں۔ یہ صریح غلط فہمی ہے۔ یہ تاریخ کا
لسانی نظریہ ہے اور اتنا ہی غلط ہے جتنا دینی نظریہ جس کی تردید کی جا چکی ہے۔ محض اس وجہ سے کہ
خلفا کے عہد سے مشرق قریب میں عربی زبان رائج ہو گئی ہے اور ابتدائی زمانے میں ادبی
زبان بھی عربی ہی تھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تہذیب بھی عربی ہی ہے۔ جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے اندازہ
ہوا ہوگا کہ ایسا ہونا طبعاً ناممکن تھا، واقعتاً یہ کہاں تک صحیح ہے؟

خلفاء کے تمدن میں کون سے خصوصی عربی عناصر پائے
میں پائے جاتے ہیں؟ ابتدائی عہد میں ایسا ضرور تھا لیکن ابھی
ریاست کو عرصے تک نہیں قائم رکھ سکے۔ کیا یہ عناصر سلطنت کے نظم ونسق یں
شخص جس نے قدیم نوشتوں کا مطالعہ کیا ہے اور عدم تعصبی سے عربی اور یونانی ماخذ کا مقابلہ کیا ہے
یہ کہہ دے گا کہ "عربی" نظام حکومت خلفاء کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ بازنطینی اور ایرانی دفتریت کا
رہین منت ہے۔ یہی کیفیت تہذیب و تمدن کے ہر شعبے کی ہے حتیٰ کہ دین عربی کے نظام اعتقادات
میں بھی مسیحی کلیسا کے اعتقادی مباحث اور نوفلاطونی اور ہندی روحانیت کے اثرات نمایاں ہیں۔
علوم طبعی اور فلسفہ یونان سے آیا، فن تعمیر ایران اور بازنطین سے اور علم تاریخ ایران سے۔ یہ صحیح
ہے کہ اسلامی سلطنت کے تمدن میں بعض عربی اثرات بہت نمایاں ہیں مثلاً شاعری میں یا فقہ کے
بعض اجزا مثلاً قانون وراثت اور قانون ازدواج وغیرہ میں لیکن یہاں بھی بس یہی ہوا کہ حکمراں
قوم کے قدیم رسوم اور قرآن کی تعلیمات کو جگہ دے دی گئی۔ رہے فقہی اجتہادات تو ان پر بالکل
دوسرے اثرات نظر آتے ہیں۔ یہ حقیقت قابل لحاظ ہے کہ اصول فقہ کے ماخذ تو عربی ہیں لیکن اصول

موضوعہ اس تمدن سے حاصل کئے گئے ہیں جو عربوں سے پہلے موجود تھا۔ ایسی حالت میں اس سے
زیادہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلامی تہذیب و تمدن پر عربی اثرات بھی پڑے ہیں۔ جو عناصر سراسر عربی
سمجھے جاتے ہیں مثلاً ادب اور حدیث سے متعلق بے شمار تصانیف وہ بھی محض عربی نہیں ہیں بلکہ تمام
مغربی ایشیا اس میں حصہ دار ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عربی بھی ہے لیکن بیشتر
تو وہ بھی غیر عربی ہے۔ ہمیں اس عربی اسلوب سے دھوکا ہوتا ہے جس کی بنا پر ہر قول اور ہر عمل کے
کے لئے رسول کے اقوال اور اعمال سے سند پیش کی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربوں نے ایک ایسی
تہذیب کو اختیار کرلیا جو اس زمانے میں موجود تھی۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہ تہذیب کیسے
وجود میں آئی۔

سب سے اہم سبب جس سے یک رنگ اسلامی تہذیب و تمدن کا ظہور ممکن ہوا وہ یونانی رو
ہے جو تاریخ عالم میں دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ممکن ہے یہ دعویٰ عجیب و غریب معلوم ہو لیکن یہ واقعہ
ہے کہ اگر سکندر اعظم نہ پیدا ہوا ہوتا تو اسلامی تہذیب بھی وجود میں نہ آتی۔ جب سے وسط ایشیا اور
ہندوستان میں یونانی اثرات کا صحیح اندازہ ہوا اس وقت سے ہمیں اس کا بھی پتا چلا کہ دیادوشی[1] کے
زمانے میں مغربی ایشیا میں مختلف تمدنوں میں کیسا خلط ملط واقع ہوا تھا۔ میں اس بحث میں تو پڑنا نہیں
نہیں چاہتا کہ یہ نام نہاد 'قدیم مشرقی تہذیب' اس قدر عام تھی یا نہیں جتنی اسلامی تہذیب لیکن
یہ ضرور ہے کہ دیادوشی کے زمانے کے بعد مغربی ایشیا کی تہذیب کی یک رنگی بہت زیادہ نمایاں
نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک نئی تفریق اس وقت پیدا ہوگئی جب یہ علاقہ پہلے تو رومی اور پارسی
سلطنتوں میں اور بعد کو بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں میں تقسیم ہوگیا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ رومی علاقے
پر مغربیت کا اثر زیادہ تھا اور مشرق میں یونانی اثرات ایشیائی خصوصیات میں گم ہوتے جارہے تھے
لیکن تیسری صدی عیسوی سے بلکہ غالباً اس سے پہلے سے ہی رومی علاقے پر آہستہ آہستہ ایشیا

---

[1] Diadochi یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں خلفا یا پیرو۔ ان سے وہ سردار اور ان کے ورثا مراد ہیں جنھوں نے سکندر اعظم
کی موت کے بعد اس کی سلطنت آپس میں بانٹ لی تھی۔

کا رنگ چڑھنے لگا اور آخر میں بازنطینی سلطنت نے ساسانی اثر قبول کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت سے مشرق کا وہ ردِ عمل شروع ہوا جس کا اثر یونان اور روم پر بھی پڑا۔

مشرق اور مغرب کی حدِ فاصل آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئی اور بالآخر سیاسی تفریق بھی ایران اور بازنطین کی آئے دن کی کشمکش کی وجہ سے قایم نہ رہی۔ خسرو ثانی اور ہرقل کی لڑائیوں کا بھی چھوٹے پیمانے پر وہی اثر ہوا جو سکندرِ اعظم کی فتوحات کا ہوا تھا یعنی یہ کہ ایک مخلوط لیکن یک رنگ تمدن کی بنیاد پڑ گئی۔ مشرق ادنیٰ میں تمدنوں کے اس عجیب و غریب اختلاط کا کامل اظہار آرامی مسیحیت میں ہوتا ہے[1]۔ حتیٰ کہ آرامی زبان بھی نہ صرف الفاظ میں بلکہ طرزِ ادا میں بھی یونانی اور ایرانی عناصر کا معجون مرکب ہے۔ اس کے علاوہ آرامی کلیسا ایک ایسا [illegible]
سیاسی سرحدوں کو پار کر کے دوسرے ملک میں برابر پہنچتے رہتے [illegible]
حقیقت ہے کہ باوجودیکہ آرامی عیسائیوں کی نسل بھی مخلوط [illegible]
رہتے تھے ان میں ایک قسم کا نوعی اتحاد پایا جاتا تھا جو اسی خط [illegible]
کہ عربی فاتحین کو مشکلات کا سامنا صرف وہیں ہوا جہاں قومی عناصر کا مقابلہ تھا یعنی ایران و شمالی افریقہ میں۔ اس حقیقت کو میں اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ اس علاقے کی تمدنی یکسانیت ظاہر ہو جائے جس میں آرامی زبان بولی جاتی تھی۔ فرینکل اور نولڈیکے کی تصانیف سے[2] یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ عرب زمانۂ قبل اسلام میں بھی آرامی تمدن سے بے حد متاثر تھے۔ یہ کیفیت اس وقت بھی قایم رہی جب انھوں نے مغربی ایشیا کو فتح کیا۔ انھوں نے آرامی تمدن کو بہ تمام و کمال اختیار کر لیا اور اس میں اسی طرح زندگی بسر کرنے لگے جیسے اسلام سے پہلے کیا کرتے تھے۔

---

[1] ملاحظہ ہو میری کتاب 'Christentum und Islam' ص ۱۸۔ یہی کیفیت قبطی اور شمالی افریقہ کی مسیحیت کی بھی تھی لیکن آرامی اثر غالب تھا۔

[2] Fraenkel, Die Aramaischen Fremdwörter im Arabischen.

خاص عربی عناصر کا ذکر تو پہلے آہی چکا ہے۔

بایں ہمہ اگر ہم یہ سمجھیں کہ اسلامی تمدن عبارت ہے محض آرامی تمدن اور چند عربی عناصر سے تو یہ خیال بالکل غلط ہوگا اور ہمارے ذہن میں اسلامی تمدن کی بالکل مسخ شدہ صورت قائم ہوگی۔ یہ کیفیت ابتدائی زمانے میں ضرور تھی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلامی تمدن کی بنیاد آرامی تمدن پر ہے لیکن بنیاد سے زیادہ نہیں۔ اسلامی تمدن آرامی تمدن کی بہت زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے لیکن اس کی ارتقا کا رجحان وہی رہا جو آرامی تمدن کا ساتویں صدی عیسوی تک تھا۔ یہ تو پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ محمدؐ سے قبل چند صدیوں سے شرق ادنیٰ کا رجحان آہستہ آہستہ ایشیا کی طرف ہوتا جارہا تھا۔ رائج الوقت تمدن کا مرکز ثقل اور اس کے مآخذ آہستہ آہستہ بحر روم سے ہٹ کر اندرون ایشیا کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔ یہ رفتار مسلسل اسلامی عہد میں قائم رہی۔ اس کا سبب معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ یہ سبب دین اسلام میں نہیں ملے گا بلکہ مغربی ایشیا کے سیاسی اتحاد میں یا بہ الفاظ دیگر تاریخ عالم کی اس حقیقت میں کہ مغربی ایشیا میں یک رنگ و یک آہنگ سلطنت قائم ہوگئی۔ اس سے پہلے بھی باوجودیکہ مشرق ادنیٰ دو سیاسی حصوں میں تقسیم تھا اور سیاسی رجحان زیادہ تر مغرب کی طرف تھا ایک اتحاد قائم ہو چکا تھا لیکن اب تو یک بیک یہ تمام علاقہ اور سلطنت ایران ایک واحد ریاست کے رشتے میں ساتھ ساتھ منسلک ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کی قدیم تہذیب سے تعلق قطع ہوگیا اور ایشیائی اثرات کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں وہ سب کی سب ہٹ گئیں۔ تاریخی واقعات کے اس رجحان کا صحیح اندازہ اس زمانے میں نہ تو عربوں کو ہوا اور نہ آرامیوں کو اور بنی امیہ کے عہد میں دارالسلطنت سرحد کے قریب ہی رہا۔ دمشق کی فوقیت کچھ تو اتفاقی تھی اور کچھ عربی عنصر کے غلبے کی وجہ سے لیکن اس زمانے میں بھی عراق کی معاشی اور تمدنی اہمیت دن بدن واضح ہوتی جاتی تھی۔ دارالسلطنت کا بغداد کو منتقل ہوجانا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ارتقا کا جو خاکہ کھینچا گیا ہے وہ لازمی تھا۔ اس زمانے سے خلافت سلطنت کسریٰ کے سلسلے کی ایک کڑی ہوگئی جس کا سیاسی حلقہ وسیع تر تھا۔ چنانچہ طبعاً اس سلطنت کے تمدن میں ایرانی اثر زیادہ نمایاں ہوا اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا وسط ایشیا، ترکستان اور چین کا اثر بھی اس پر

پڑا۔ یہ تمدن نہ عربی تھا نہ خالص ایرانی اور نہ خالص آرامی بلکہ ایک ایسا مخلوط ایک رنگ تمدن تھا جس کی بنیاد ایک متحدہ ریاست پر تھی۔ چونکہ یہ ریاست اسلامی تھی اس لئے اس تمدن کو بھی اسلامی کہنا صحیح ہے۔

ابھی ضرورت ہے کہ سلطنت کے اتحاد کا جو اثر تہذیب و تمدن پر پڑا اس کو اور واضح کیا جائے۔ اس سے قبل میں نے اکثر لکھا ہے کہ عربوں کی حالت بہت کم بدلتی ہے لیکن اس موقع پر اتنے ہی زور کے ساتھ یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ باوجودیکہ مقامی آزادی حاصل تھی محض اتحاد حکومت کی وجہ سے مختلف عناصر میں بہت تیزی سے خلط ملط واقع ہوتا رہا۔ سب سے پہلے یہ کیفیت معاشی زندگی میں نمایاں ہوئی۔ اگرچہ محاصل درآمد و برآمد کی سرحدیں قائم رہیں لیکن تجارت کو ۔جو تمدنی اثر کے پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے ۔بہت وسیع علاقے
جو تجارت کی آخری حد سمجھے جاتے تھے اب مال کو آگے روانہ کر
کا پڑا وہی اس وقت جب ایک طرح کا سرمایہ داری نظام قائم
بڑے سرمایہ دار سٹے یا لین دین کی صورت میں کرتے تھے ۔ یہ اثرات علاوہ ... ن ...
میں سلطنت کے ہر گوشے تک پہنچے ۔ پھر سب سے بڑھ کر خود حکومت نے جب مقامی عہدہ داروں کے نظام کو وسیع کر کے تمام سلطنت میں پھیلا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک حصہ سلطنت کے تمدنی اثرات دوسرے حصے پر جلد از جلد اور زیادہ زیادہ پڑنے لگے اور اس سے جو کیفیت پیدا ہوئی اس کا تصور بھی سلطنت عباسیہ کے قیام سے پہلے نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا قصد تھا کہ اس ارتقا کو ذرا تفصیل سے بیان کرتا لیکن ارنسٹ ہرسفیلڈ[1] کے مضمون کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اس مضمون کے نتائج سے بہ تمام و کمال متفق ہوں۔ ہرسفیلڈ نے اسلامی فنون لطیفہ کی مثال لے کر یہ بہت خوبی سے دکھایا ہے کہ یک رنگ اسلامی تہذیب کی تعمیر میں معاشی اسباب کا کتنا بڑا حصہ ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ Der Islam ج ۱ ص ۹۰ الخ۔

بالکل یہی کیفیت ذہنی زندگی کی بھی تھی لیکن یہاں مبادلہ خیالات اس وقت شروع ہوا جب معاشی اور سیاسی عناصر اپنا کام کر چکے تھے۔ اس وقت ایک ایسا ایک رنگ دین پیدا ہوا جو سلطنت کی آبادی کے مختلف اور آزاد عناصر میں ایک مضبوط رشتہ 'اتحاد' ثابت ہوا۔ پرانی مذہبی دیواریں بھی اسی طرح مسمار ہو گئیں جس طرح سیاسی دیواریں۔ اب کہ دین اسلام میں مذکورہ بالا طریقے پر زور پیدا ہو گیا تھا اور اس نے قدیم ادیان کے ذہنی ترکے پر قبضہ کر لیا تھا طلب حدیث شروع ہوئی اور اس نے ایسا ذہنی اتحاد پیدا کیا جس پر اسلامی رنگ غالب تھا۔ اب بحر محیط سے لے کر چین تک ایک ہی قسم کے علوم دین کی اشاعت شروع ہوئی اور ارسطو کی تصنیفات اور دوسری علمی فتوحات کو علمائے اسلام نے اپنا جامہ پہنا کر سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا بلکہ سلطنت کے حدود سے باہر لاپ نار (Lop Nor)، اور خلیج شاد (Lake Chad) تک یہ علوم پہنچ کر رہے۔

ایک سلطنت کے قیام کا بہت ہی اہم نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممالک بھی جن تک آرامی تہذیب و تمدن نہیں پہنچا تھا مثلاً ایران، مصر اور افریقہ، اس جدید اتحاد میں شریک ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ ممالک مرکزی سلطنت سے بہت جلد الگ ہو گئے لیکن اتحاد کا مطمح نظر قائم رہا اور ان حصوں میں بھی باہمی رشتہ قائم رہا جو ایک بین قومی خصوصیت کے مالک تھے مثلاً اندلس اور ایران۔ اس طرح آرامی تمدن کی چھوٹی سی جھیل میں ہر طرف سے معاون دریاؤں کے آ آ کر گرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تمدن کا بحر زخار موجیں مارنے لگا۔ اب دین کا غلبہ شروع ہوا اور وہ ارتقائی منازل طے کر کے اس جدید 'کل' کا غالب عنصر بن گیا۔ یہاں اس بیان کے اعادے کی ضرورت ہے جو اشاعت دین اسلام سے متعلق پہلے دیا جا چکا ہے۔ مولویانہ رجحان کے پیدا ہونے کا واحد سبب محمدؐ کی تعلیم نہیں ہے بلکہ وہ قدیم رجحانات کا نتیجہ ہے جس میں مسیحی کلیسائیت اور ایرانی ریاستی کلیسا کو خاص طور پر دخل ہے۔

عباسی 'خلافت' کی فتح اموی 'ملک' پر صرف یہی معنی نہیں رکھتی کہ محمدؐ کی دینی تعلیمات کو شرفاء مکہ کے دنیاوی رجحانات پر فتح حاصل ہوئی بلکہ وہ بڑی حد تک ایرانی اور مسیحی ریاستی کلیسا اور مشرق قدیم کے شدید دینی نقطۂ نظر کی فتح ہے خالص دنیاوی عربی قومی ریاست پر۔ اسلام کا نام تو قائم

رہا لیکن اس کی کیفیت بالکل بدل گئی۔

اب جا کر کہیں اسلام ایک دین، ایک سیاسی مطمح نظر اور ایک تمدن کا مجموعہ بنا اور عالمی تبلیغ کی صلاحیت اس میں پیدا ہوئی اگرچہ بعد کو بعض مقامی اثرات سے مختلف فرقے پیدا ہو گئے مثلاً ایران میں فرقۂ شیعہ، اگرچہ خوارج بھی موجود تھے اور صوفیوں کے سلسلے بھی، اگرچہ چین کے دور افتادہ علاقے میں اسلام قومی تمدن پر غالب نہ آسکا مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک عظیم الشان اسلامی وحدت قائم رہی۔ یہ وحدت یورپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے مقابلے میں بہت زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہوئی اس کا اظہار لفظ "شریعت" سے ہوتا ہے جسے زندگی کے ہر شعبے میں دخل ہے۔

یہ حقیقت بہت زیادہ قابل لحاظ ہے کہ دین جس کی ا...
نے مدد کی اس وقت بھی قائم رہا بلکہ بڑھتا ہی رہا جب خود ا...
کی جگہ ایک ریاست کے مطمح نظر نے لے لی۔ عام طور پر یہ خیال ...
کے عہد زریں کی صورت حال پر مبنی ہے لیکن میری رائے میں یہ صحیح نہیں اس ... اموی اور عباسی عروج کے زمانے سے لے کر خلفاء راشدین کے عہد کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس قسم کے بیشتر نظریے بنی امیہ کی مخالفت میں پیدا ہوئے اور بنی عباس کے عہد میں جو خود کو خلفاء راشدین کا جانشین کہتے تھے ان نظریوں نے اعتقادات کی صورت اختیار کر لی۔ واحد ریاست کے تخیل نے اس زمانے میں بھی جب خلافت برائے نام رہ گئی تھی سلاطین کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بے بس خلیفہ سے پروانۂ حکومت حاصل کریں۔ ابتدائی زمانے میں دین ریاست کا خادم تھا۔ عہد عباسی میں سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے ریاست کو دینی حیثیت دے دی گئی اور بعد کے سلاطین کو یہ حیثیت تسلیم کرنی پڑی۔ اس خیال کی اہمیت آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے لیکن اب بھی مسلم حکمراں خلیفہ بننے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

سیاسی مطمح نظر سے زیادہ اہم زندگی اور تہذیب کا وہ نصب العین ہے جو شریعت اسلامی نے

پیش کیا ہے۔ یہ دین سے سراسر وابستہ ہے۔ اس میں عہد عروج کے عمل کو نظری نظام کی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ عمل اس زمانے کے معاشرتی ماحول کے لئے نہایت درجہ موزوں اور مناسب تھا لیکن جب آخری زمانے میں اسلام بغیر سیاسی طاقت کے محض دین اور تمدن کی شکل میں حدود خلافت سے باہر نکلا اور زیادہ تر تاجروں کے ذریعہ دوسرے ممالک میں پہنچا تو ان ممالک کے عمل اور شریعت اسلامی میں کم و بیش وہی نسبت باقی رہی جو اس عہد کی قابل افسوس سیاسی حالت اور سیاسی مطمح نظر میں تھی اس طرح 'شریعت' اور 'عادت' کا وہ اختلاف نمایاں ہوا جو ان ممالک میں نظر آتا ہے[1]۔ اس سرزمین میں بھی جہاں 'شریعت' نے نشو و نما پائی اس کی حیثیت عمل سے زیادہ مطمح نظر کی ہی تھی اور دوسرے ممالک میں تو یہ سراسر مطمح نظر ہی رہی۔ شریعت کے خالص دینی ارکان پر تو ضرور عمل ہوا اور یہی وجہ ہے کہ آج کل اسلام کا دینی پہلو ہی اہم اور موثر پہلو ہے اور مختلف ممالک کے مسلمانوں میں جو رشتہ قائم ہے وہ محض اعتقادات اور واحد نصب العین کا رشتہ ہے۔ پس ماندہ ممالک میں آج کل بھی اسلام کی اشاعت تیزی سے ہو رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام بیک وقت ایک دین اور ایک تمدن پیش کرتا ہے اور ریاست کے قیام کی صلاحیت بھی پیدا کرتا ہے۔ رشتۂ اتحاد دین ہے جس پر ابھی تھوڑے عرصے سے قومیت اور نئی روشنی کا اثر پڑنا شروع ہوا ہے۔

اسلام کے ارتقا کو سمجھنا اس قدر آسان نہیں ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ جو لوگ اسلام کو 'عربی تہذیب' کے تصور کی مدد سے سمجھنا چاہتے ہیں وہ ابھی اس عقدے کے صحیح حل سے بہت دور ہیں اور جو لوگ جو قرآن اور سیرت محمدی کو موجودہ اسلام کے سمجھنے کے لئے کافی سمجھتے ہیں تو ان کا بس خدا ہی حافظ ہے۔ چونکہ اس قسم کے خیالات آج کل بھی عام طور پر پھیلے ہوئے ہیں اس لئے غالباً میری یہ کوشش بے سود نہ سمجھی جائے گی جو میں نے ارتقاء اسلام کا ایک ابتدائی خاکہ کھینچنے میں صرف کی ہے۔ ممکن ہے اس میں بہت سے نتائج محل بحث ہوں اور بعض چیزیں محض موضوعی

---

[1] ملاحظہ ہوں سنوک ہرگرونیے (Snouck Hurgronje) کی متعدد تصانیف۔

ہوں لیکن اہم حصوں کی بنیاد تفصیلی مطالعے اور غور و فکر پر ہے۔ امید ہے کہ میرے بعد آنے والے محقق اس خاکے کے نقائص کو دور کریں گے اور اگر یہ صحیح ثابت ہوا تو اس میں تفصیلات کا اضافہ کریں گے۔

(پروفیسر بیکر مرحوم جن کا انتقال گذشتہ سال ہوا اس زمانے کے مستشرقین میں بہت نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ تاریخ اسلام میں ان کو بہت زیادہ شغف تھا اس کے مسائل کو حل کرنے اور اشکالات کو رفع کرنے میں ہی انھوں نے اپنی تمام عمر صرف کی۔ جنگ عظیم کے بعد جب جرمنی کی تشکیل نو ہوئی تو وہ اس ملک کے سب سے بڑے صوبے پروشیا کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے تھے اور تقریباً دس سال تک اس عہدے پر متمکن رہے۔ سنہ ۲۹ء
تو جامعہ برلن میں تاریخ اسلام کے استاد کی حیثیت سے ور
نے وفات کی اور تقریباً ۵۵ سال کے سن میں انتقال۔
مضامین کا ایک مجموعہ Islam-studien کے نام سے شائع ہوا تھا ... میں بیشتر مضامین اسلام کی تمدنی اور دینی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اس پر جو مقدمہ انھوں نے لکھا تھا وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مضمون اسی مقدمے کے ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ باقی تین حصوں کے ترجمے کا بھی ارادہ ہے جو آئندہ پرچوں میں شائع ہوں گے۔ Islam-studien کی دوسری جلد بھی شائع ہوگئی ہے۔ دوسری جلد کے شائع ہونے کے بعد ہی مصنف کا انتقال ہوگیا اور اس کی مقبولیت کو وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔

اس مضمون میں تمدن اسلام کی ارتقا کا جو خاکہ انھوں نے کھینچا ہے اس میں انھوں نے ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ مجھ کو ان سے ذاتی طور پر نیاز حاصل تھا اور مجھے یقین ہے کہ تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ وہ بے تعصبی اور ایمانداری سے اسلام اور تمدن اسلام کا مطالعہ کرتے تھے اور بہت غور و فکر کے بعد کچھ لکھتے تھے۔ اس مضمون کے ترجمے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان

کے مسلم مفکرین کو ایک ممتاز مستشرق کے خیالات سے آگاہی ہو۔ بسا اوقات اپنی چیز کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھنا بہت مفید ہوتا ہے۔ ع۔ ع]
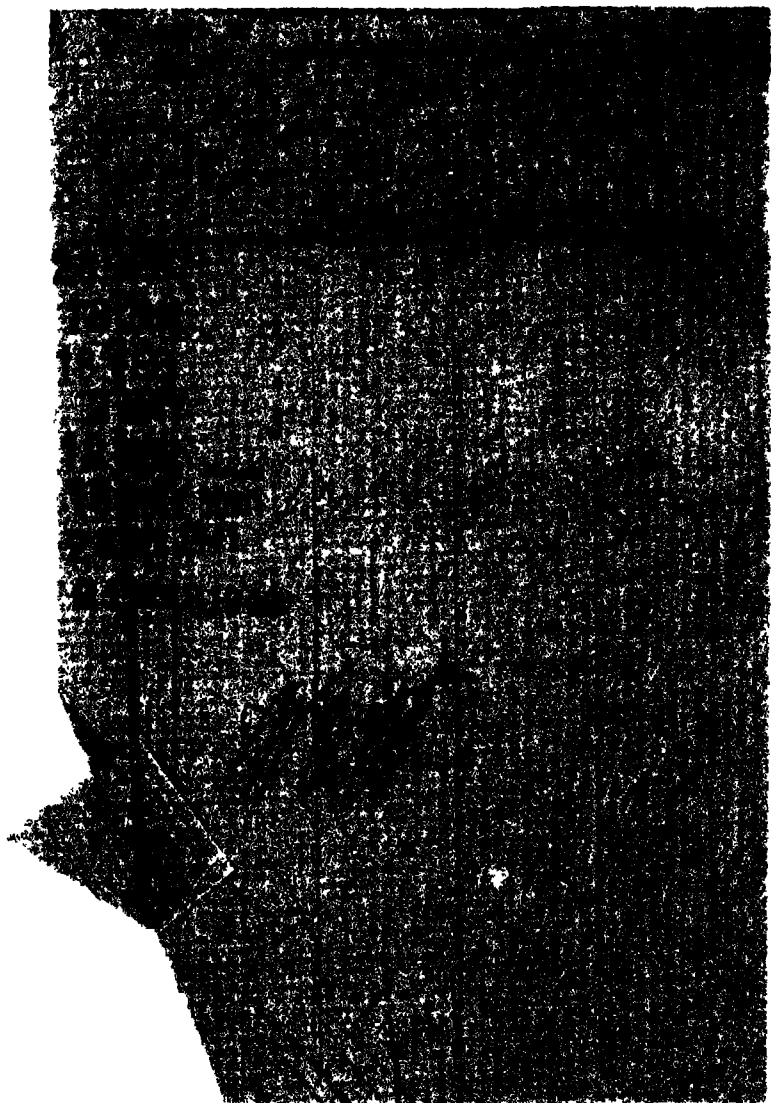
چندہ سالانہ پانچ روپیہ
قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر، پبلشر: محمد مجیب بی، اے (آکسن)

نے

جامعہ برقی پریس دھلی مین چھپوا کر شائع کیا ۔